معالم القرآن

جلد چہارم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ملکیت ــــ ادارہ تعلیماتِ قرآن، سیالکوٹ

تالیف ــــ حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی

عناوین ــــ ۴۹۶

آیات ــــ ۱۳۲

طابع ــــ حافظ عبدالرشید خاقان

تزئین و آرائش ــــ سید انور حسین نفیس رقم، لاہور

کتابت ــــ محمود احمد، گوجرانوالہ

ناشر ــــ قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے

صفحات ــــ ۴۴۰

تاریخ اشاعت ــــ محرم الحرام ۱۳۹۷ھ مطابق جنوری ۱۹۷۷ء

مطبع ــــ زاہد بشیر پرنٹرز

طبع دوم جولائی ۱۹۹۰ء

قیمت ۔ ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ، دارالعلوم الشہابیہ رنگ پورہ روڈ سیالکوٹ شہر

پاکستان

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی چہارم جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیت اور شہادت علی الناس کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

(النساء)

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

معالم القرآن کی تیسری جلد ۳، جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ مطابق یکم جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج پورے چھ ماہ کے بعد اس کی چوتھی جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و انعام ہے کہ مجھ جیسے سیاہ کار سے وہ اپنے دین کا کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسنِ قبول کے لیے کھول دیا ہے۔

میری دو دعائیں ہیں ایک یہ کہ اسے اللہ سبحانہٗ حسنِ قبول کی نعمت سے ہمدوش فرمائے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے خاص فضل سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

معالم القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی، میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بہت بڑی نہر کے کنارے کھڑا ہوں۔ نہر کی چوڑائی تقریباً دو فرلانگ ہے، اس کے کنارے تقریباً ۳۰ فٹ چوڑے ہیں۔ اس میں پانی دودھ سے مشابہ سپید ہے۔ اور جہاں میں کھڑا ہوں وہاں اونچی جگہ پر معالم القرآن رکھی ہوئی ہے اس خواب سے کام کے لیے الحمدللہ میری ہمت جوان ہو گئی ہے۔ جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ میرے بس میں ہے اللہ کی توفیق سے میں اسے انجام دے رہا ہوں۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جب پہلی جلد شائع ہوئی، اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرا یہ قدم کامیاب ہوگا مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اسے شرفِ قبول بخشا اور اربابِ فضل و کمال نے اس کو پسند کیا، اس وقت میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بزرگوں نے اپنے خطوط میں اس کو سراہا۔ اللہ کے بھروسہ پر کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے کافی محنت سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ کام اجتماعی ہے اور میں تنہا کر رہا ہوں۔

چونکہ میرا کام یہ ہے کہ بکھری ہوئی چیزوں کو جمع کروں اس لیے مجھے قدم قدم پر کتابوں کی قلت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ انجمن دارالعلوم الشہابیہ ایک عظیم کتب خانے کی مالک ہے مگر کام

کی عظمت کے سامنے اس کی عظمت بے اثر ہے۔ چنانچہ اسی چوتھی جلد میں جب اسلام کے معاشرتی نظام، نکاح و طلاق کے مسائل سامنے آتے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مختلف مکاتیبِ فکر کا علمی ذخیرہ موجود ہو تاکہ اس سے استفادہ کیا جائے خصوصاً امامیہ کی کتبِ حدیث اور فقہ جعفری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انجمن کے کتب خانے میں ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ احباب کے تعاون سے اہلِ تشیع کی تفسیر و حدیث کی کتابیں مہیا کی گئیں اور تقریباً پانچ ہزار روپے کی کتابیں انجمن کی لائبریری کے لیے خریدی گئی ہیں۔ اگرچہ کتابوں کے بدیر فراہم ہونے کی وجہ سے میں اس جلد میں ان کتابوں سے کوئی استفادہ نہ کر سکا۔ تاہم مجھے پانچویں پارے میں یہ کتابیں قدم قدم پر کام دے رہی ہیں۔

اس جلد میں زیادہ تر زیرِ بحث اجتماعی قوانین ہیں یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ اُمت کی تکوین کیسے ہوتی ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں۔ آخر کے چار رکوع کو چھوڑ کر کہ ان کا تعلق اسلام کے نظامِ معاشرت سے ہے پورا پارہ اجتماعی قوانین کا ایک خوانِ نعمت ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان قوانین کو کھول کر پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی علمی کم مائگی کا اعتراف ہے اور یہ افسوس کی بات ہے کہ اس موضوع پر کوئی علمی کام نہیں ہوا اس لیے کوئی خاص علمی کتاب موجود نہیں ہے اور اگر موجود ہے تو میرے مبلغِ علم کی دسترس سے باہر ہے۔

اس سلسلے میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی ہے اور کتابوں کے مطالعوں کے لیے زیادہ وقت نکالنا پڑا۔ کویت کے سفر میں وہاں کی پبلک لائبریریوں میں کافی علمی مواد ملا۔ لیکن کویت کی شبانہ روز کی مصروفیات میں اتنی فرصت نہ ملی کہ کام کیا جاتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر جس انداز سے تفصیلی تبصرہ ہونا چاہیے میں نہ کر سکا۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ اس کمی کو پورا کر دوں۔

احباب سے میری صرف یہ درخواست ہے کہ وہ دُعا کریں کہ قرآن کی تشریح و تفسیر میں میرا قلم صراطِ مستقیم سے تجاوز نہ کرے۔ میں نے اپنے علم کی حد تک اس کی پوری احتیاط کی ہے لیکن اللہ ہی جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں دُعا ہے کہ

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من
لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

مُقدّمہ

باسمہٖ سبحانہٗ

اس میں تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور قوانین اجتماعی اختیار کی ہیں اور جنہیں اس نے سنن، آیات، بیان، ہدایت، اور موعظت سے تعبیر کیا ہے ان میں نمایاں استدلال تکوینِ اُمت کا استدلال ہے۔

تکوینِ اُمت کے سلسلے میں قرآن نے یہ باتیں کھول کر بتائی ہیں کہ

اُمتِ مومنہ ہونے کی حیثیت میں اہلِ کتاب میں سے کسی گروہ کی طاعت ایمان سے محرومی ہے۔

اُمت ہونے کی حیثیت میں تمہاری سیاسی برتری نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستگی پر موقوف ہے۔

نبوت کے علم و عمل سے جُدا ہو کر تمہاری مسلمانہ زندگی کسی صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔

اُمت ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور اسی پر تمہاری دنیوی اور اُخروی فلاح کا دارومدار ہے۔

افتراقِ باہمی اور اختلافِ راہِ حق سے روگردانی ہے اور اس کا نتیجہ عذابِ عظیم ہے۔

مقصد کی راہ میں مصائب و محن ناگزیر ہیں۔ ان کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں قرآن نے غزوۂ اُحد کے تذکرے میں بیان کی ہیں۔ قرآن نے خود یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس بیان سے اس کا مقصود کیا ہے۔ جیسا کہ اسی پارے کی آیت ۱۳۰ میں آ رہا ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ غزوۂ اُحد کی مورخین کی طرح تاریخ بیان کی جائے بلکہ کچھ قوانین ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ واقعات اس کے لیے دلیلیں اور حجتیں ہیں، براہین ہیں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ اُحد کی یہ سرگزشت دلیل و حجت کیوں کر ہوئی۔ بات بالکل صاف ہے کیونکہ خود قرآن نے کھول کھول کر ہر جگہ بتلا دی ہے۔ یہاں بھی اوّلاً صراحۃً فرمایا کہ تلک الایام نداولھا بین الناس اور پھر تکرار کے ساتھ لامِ تعلیل لا کر اس کی طرف اشارات

کیے ہیں۔

مولانا آزاد کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ کائنات ہستی کے جس گوشہ پر بھی نظر ڈالو گے تمہیں ایک حقیقت ابھری ہوئی نظر آئے گی بشرطیکہ دیکھنے سے انکار نہ کرو۔ وہ کیا ہے، قوانین فطرت کی وحدت، یعنی ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح پر کام کر رہا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اپنے قانون میں دوسروں سے ذرا بھی الگ ہو۔ بلاشبہ بھیس بہت ہو گئے اور نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے اور جونہی سامنے کے پردے ہٹاتے ہو اصلیت کی بے لاگ وحدت آکھڑی ہوتی ہے مثلاً تم کہتے ہو کہ حیوان کے لیے موت و حیات ہے، پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے، پتھروں کے لیے بننا اور پامال ہونا ہے۔ اجزا کے لیے ملنا اور بکھر جانا ہے مگر کیا صورتیں بہت ہو گئیں، نام کئی ہو گئے مگر کیا حقیقت بھی متعدد ہو گئی، وہی قانون جو حیوانات میں موت و حیات تھا نباتات میں بھی مرجھانا اور کھلنا ہوا، جمادات میں بننا اور پامال ہونا، اجزا میں ملنا اور بکھرنا، الفاظ بدلتے جاؤ معنے نہیں بدل سکتے۔

غور کرو کہ جب کائنات کے ہر گوشہ میں وحدت قانون کی بنیادی اصل کام کر رہی ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو، اور وہاں بھی کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو اور وہی اور ایسا ہی نہ ہو جیسا گوشوں میں ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ گوشہ بھی دوسرے گوشوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اسی طرح جس طرح یہاں کا ہر گوشہ دوسرے گوشہ سے مربوط ہے۔ عالم معنے میں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کارفرما ہے اور عالم معنے کے بھی وہی احکام اور نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں نظر آ رہے ہیں۔ مثلاً اگر عالم مادی میں تم دیکھتے ہو کہ آگ کا خاصہ جلانا ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے، تو تمہیں اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں بھی کوئی بات آگ کی طرح ہو سکتی ہے اور جب وہ ظہور میں آ جائے تو اس سے گرمی ہی نکلے گی، ٹھنڈک نہیں نکل سکتی۔ یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے۔ اور پھر جس طرح یہاں ہر بات کے لیے فطرت کے مقررہ قوانین ہیں اسی طرح امتوں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و موت کا بھی ایک قانون ہے اور جس طرح فطرت کے تمام قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں، غیر مبدل ہیں، اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر

مختلف نہیں ہو سکتی، جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے خواہ کسی ملک اور عہد میں کھایا جائے۔ اسی طرح قانونِ اجتماعی کے نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ کسی ملک اور عہد میں پیش آئیں یہ نہیں کہ افتراق و اختلاف باہمی اب سے ہزار برس پہلے عذاب عظیم ہو اور اب رحمتِ عظیمہ ہو جائے، جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آ جاتے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ فطرت کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہے۔ قرآن نے جا بجا اس قانون کو سنۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

اجتماعی قوانین کے لیے قرآن کا حوادث و واقعات سے استدلال فی الواقع طبیعتِ انسانی کا وجدانی اذعان ہے۔ انسان کی ذہنی فطرت کا مطالعہ کرو تمہیں معلوم ہوگا کہ انسان حوادث و واقعات سے بالطبع متاثر ہوتا ہے اور اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتلا دیتی ہے کہ ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی مرتبہ کا حادثہ نہیں ہے۔ خواص و نتائج دائمی ہیں۔ ایک بچہ پہلی بار آگ میں انگلی ڈالتا ہے اور انگلی جلنے لگتی ہے۔ پھر جب کبھی اس کے سامنے آگ آتی ہے خود بخود ہاتھ کھینچ لیتا ہے کیوں؟ اسی لیے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتلا دیتی ہے کہ جس چیز نے ایک مرتبہ جلایا ہے وہ ہمیشہ جلاتی گی۔ یہ اعتقاد کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے اسے صرف اتنی بات سے حاصل ہو گیا کہ آگ نے ایک مرتبہ جلایا تھا۔

طبیعتِ انسانی کا یہی وجدانی تاثر ہے جس نے ہمارے ذہن میں استقرا کا اعتقاد پیدا کر دیا۔ اب ہمارے تمام علوم و معارف کا یہی سنگ بنیاد ہے۔

قرآن کا دعویٰ یہی ہے کہ اگر تم وجدانی طور پر یہ بات محسوس کرتے ہو کہ خواص و نتائج کا تسلسل ایک حقیقت ہے تو پھر تم کیسے انکار کر سکتے ہو کہ اعمالِ انسانی کے لیے یہ حقیقت معطل ہو گئی اور یہاں ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ فلاں بات سے ایسا نتیجہ ضرور نکلے گا کیونکہ بار بار ایسا ہی ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ تم ہی پہلی امت نہیں ہو تم سے پہلے بھی اور بے شمار قومیں اسی زمین میں گزر چکی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں، قوتیں اور شوکتیں تھیں، سر بفلک عمارتیں تھیں، فکر و عمل کی سرگرمیاں تھیں۔ دُنیا کی سیر کرو، گزری ہوئی سرگزشتیں سنو، مٹی ہوئی نشانیوں کا کھوج لگاؤ اور پھر دیکھو کہ اجتماعی قانون کا کیا عمل درآمد رہ چکا ہے۔ اور اگر ہمیشہ ایسا ہی ہو چکا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے لیے اپنا قانونِ ہستی معطل کر دے گا یا اس طرح بدل دے گا کہ جو چیز کل تک سنکھیا تھی وہ تمہارے لیے شہد ہو جائے۔

غزوۂ اُحد کے ضمن میں یہ ارشاد کہ قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض پتہ دے رہا ہے کہ قرآن کی موعظت و تذکیر کا یہ ایک خاص دائرہ ہے۔ قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب میں اجتماعی قانون کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ شاید اس کی وجہ بقول سید رشید رضا یہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے انسان کی استعداد اجتماعی نابالغ تھی۔

قرآن کی اس تصریح سے معلوم ہوگیا کہ حوادث اور واقعات کا مطالعہ اس سے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جاسکے یعنی جو کچھ گزر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہے اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم ان سنن کا مطالعہ کریں اور علم و نظر کی کاوشوں کا دوسرے علوم کی طرح اسے مرکز بنائیں۔ بلاشبہ تاریخ میں ابن خلدون پہلا شخص تھا جس نے تاریخ کو فلسفہ کی روشنی میں دیکھا اور اب فلسفۂ تاریخ کی ساری بنیادیں اسی اصل پر چنی گئی ہیں لیکن قرآن نے ہم سے جو مطالبہ کیا ہے وہ فلسفۂ تاریخ نہیں بلکہ علم السنن، یا علم الاجتماع ہے اور یہ گہرے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے قرآن کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا۔

بلاشبہ صحابہ کرام اس علم کی گہرائیوں سے پوری طرح واقف تھے بہرحال ہمیں پارہ چہارم کے ۱۱ رکوعوں میں اجتماعی قوانین کا مطالعہ اس روشنی میں کرنا چاہیے۔

پارہ چہارم ایک نظر میں

اللہ کی صفات

علمِ الٰہی	۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۵۴
اللہ کی صداقت	۹۵
اللہ کا غنا	۹۷
اللہ کائنات کا مالک ہے	۱۰۹، ۱۲۹
تعذیب و مغفرت اللہ کا کام ہے	۱۲۹
مارنا اللہ کا کام ہے	۱۴۵
اللہ کی ولایت، نصرت	۱۵۰
اللہ کی شانِ حلیمی و مغفرت	۱۵۵
اللہ محسنین و متوکلین سے محبت کرتا ہے	۱۴۸، ۱۵۹
اللہ کی رضا اور اس کی ناراضگی	۱۶۲
اللہ کی رحمت	۱۲۹، ۱۵۹، ۱۶
اللہ کی جزا و سزا	۱۲۹
اللہ کی شانِ تخلیق	۱
توبہ قبول کرنا	۱۲۸، ۱۷
اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے	۱۰۸
اللہ کی قدرت، قوت، اختیار، احاطہ اور غلبہ	۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۶۵، ۱۸۹
اللہ کی حاکمیت، اقتدار اور بادشاہی	۱۰۹، ۱۲۹، ۱۵۴، ۱۵۹

توحید الوہیت و ربوبیت

رسالت و نبوت

صحابہ کا جوہر

اُمتِ مسلمہ

دستوری قواعد

اسلامی شعائر

اجتماعی قوانین

اخلاقی قوانین

مالیاتی قوانین

معاشرتی قوانین

سیاسی قوانین

دفاعی قوانین

ایمان و جاہلیت

توکل و تفویض

اذکار و ادعیہ

آخرت کی زندگی

اہل کتاب

اصطلاحات قرآنیہ

اسرائیل :- بروزن ابراہیم و اسماعیل اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ عبرانی میں اس کے معنے اللہ کے برگزیدہ یا اللہ کے بندے کے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے دو نام ہوں، ایک یعقوب دوسرا اسرائیل، ان کی ہی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ حضرت ابراہیم کی تین بیویاں ہیں ایک ہاجرہ، دوسرے سارہ تیسری قطورا، ہاجرہ سے حضرت اسماعیل ہوئے۔ یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی، ان کا وطن عرب رہا، دوسری بی بی سارہ عراقی کے بطن سے حضرت اسحاق ہوئے۔ حضرت اسحاق کے فرزند حضرت یعقوب عرف اسرائیل ہیں۔ یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، ان کا وطن شام رہا، قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا بلکہ شام ہی کا حصہ تھا۔

اسراف :- ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، زیادتی کرنا بروزن افعال مصدر ہے۔ اصل میں اسراف ہر کام میں انسان کے حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے مگر اس کا استعمال خرچ کے بارے میں زیادہ مشہور ہے۔ یہ قرآن حکیم کی جامع اصطلاح ہے اس کا اطلاق ہر ایسے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو لیکن صرف مال اور استعمال ملکیت کے سلسلہ میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں۔ جس غرض کی تکمیل مال و املاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے۔ اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدہ کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے۔

استطاعت :- اس کا مادہ طوع ہے جس کے معنے انقیاد اور فرمانبرداری کے ہیں اور استطاعۃ میں نیت، تصورِ فعل، مادہ قابلہ اور آلہ کا ہونا ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر ان چیزوں کا بتمام وکمال پایا جانا جن کی وجہ سے فعل سرزد ہو سکے استطاعت کہلاتا ہے۔ فرضیتِ حج کی شرطوں میں استطاعت اہم شرط ہے۔ ارشادِ نبوت میں استطاعت کے لیے سواری اور زادِ راہ کی تعبیر آئی ہے، لیکن مقصد حصر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ الجصاص نے لکھا ہے کہ استطاعت صرف یہی نہیں ہے کہ سواری اور زادِ راہ ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ سب چیزیں بتمام وکمال موجود ہوں جن کی وجہ سے

حج کیا جاسکے۔ مثلاً راہ میں امن ہو اور خود صحت اور تندرستی ہو وغیرہ وغیرہ ۔

اعتصام :- عصم کے معنے روکنا اور اعتصام کے معنے اپنے آپ کو روک کر، بچا کر رکھنا ہیں۔ قرآن میں ہے لا عاصم الیوم من امر اللہ آج اللہ کے امر سے بچانے والا کوئی نہیں ہے اور معصوم وہ ہے جسے بچایا گیا ہے۔ اسی سے عصمۃ ہے جس کے اصل معنے اسی کے ہیں اس کی جمع عصَم آتی ہے۔ یہی معنے محمد بن نشوان نے ضیاء العلوم میں لکھے ہیں۔ اور امام ابوبکر عزیزی نزہۃ القلوب میں فرماتے ہیں عصم کے معنے رسیوں کے ہیں اور عصمۃ کے معنے کسی چیز کو روک رکھنے کے ہیں۔ اعتصام باللہ سے مراد ہے کہ اللہ کو پکڑ کر یعنی ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو بچا لینا۔ یہاں قرآن نے دو اعتصام پیش کیے ایک اعتصام باللہ، دوسرے اعتصام بحبل اللہ۔ دُنیا اور آخرت کی سعادت ان دونوں سے وابستہ ہے۔ اعتصام باللہ کے ذریعے انسان ہلاکت سے بچتا ہے اور اعتصام بحبل اللہ ہو تو ضلالت اور گمراہی سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ کو مقصود بنا کر چلنے والا راہ گیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ راہ گیر کو دو چیزوں کی ضرورت ہے راہ کی واقفیت اور سلامتی۔ اعتصام بحبل اللہ راہ گیر کی ہدایت کا سامان ہے اور اعتصام باللہ قوت و طاقت کا ذریعہ ہے۔ سلف صالحین سے اعتصام بحبل اللہ کی تفسیر اسی لیے مختلف آئی ہے۔ دین اللہ، جماعۃ، عہد اللہ، قرآن، امر اللہ، اور ہم نے تفسیر میں ان سب کا خلاصہ یہ بتایا ہے کہ نبوت کا لایا ہوا علم و عمل۔

اطمینان :- اس کے معنے دل کا چین پانا، آرام پانا ہیں۔ اسی سے حدیث میں ہے الصدق طمانینۃ، سچائی سننے والے کے دل کو مطمئن کر دیتی ہے اور نیکی کے بارے میں ہے البر ما اطمان الیہ القلب، نیکی وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو جائے۔

طمانیت وہ سکون ہے جو امن کی قوت سے حاصل ہوتا ہے، طمانیت اور سکینت میں یہ فرق ہے کہ سکینت ایک حالت ہے جو آتی جاتی رہتی ہے لیکن طمانیت کبھی جُدا نہیں ہوتی ہے اور سکینۃ خوف کے بعد ہوتی ہے جبکہ طمانینت کے لیے خوف ضروری نہیں ہے صوفیائے کرام کے یہاں طمانینت کے تین درجے ہیں ایک دل کی طمانینت، دوسرے روح کی طمانیت تیسرے طمانیت حضور و شہود،

ابتلاء : آزمانا، آزمائش کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ امتحان لینے والا اس شخص کی لیاقت و صلاحیت سے پوری طرح باخبر ہو جائے دوسرے یہ کہ اس کی لیاقت و صلاحیت کا تو ممتحن کو پوری طرح علم ہے مگر اوروں کی نظر میں اس کی حالت کو پیش کرنا منظور ہو کہ

وہ کس قابلیت کا مالک ہے ۔ قرآن مجید میں جب ابتلاء کی نسبت اللہ سبحانہ کی جانب ہو تو دوسرے معنے مراد ہوتے ہیں ۔ دراصل زبانیں دو ہوتی ہیں اور دونوں سے یکساں بلند آہنگی کے ساتھ آمنا باللہ کے نعرے بلند ہوتے سنتے ہیں ۔ درآنحالیکہ ایک کا نعرہ پیچھے قلب کی گہرائیوں سے اٹھ کر زبان تک آتا ہے اور دوسرے کا وہیں کا وہیں زبان ہی پر جنم لیتا ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ سچ کو جھوٹ سے الگ کیا جائے اور ایمان صادق و ایمان کاذب کے درمیان امتیاز کی کوئی صورت پیدا کی جائے ۔ اللہ تعالیٰ نے امتیاز کی یہ صورت روز اول ہی سے متعین فرما رکھی ہے ۔ اسی کا نام قرآن میں ابتلاء یعنی قانون آزمائش ہے ۔

امر بالمعروف :- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن حکیم کی دونوں اصطلاحیں ہیں ۔ معروف وہ ہے جو قرآن کی نظر میں اچھا ہو اور منکر وہ ہے جو قرآن کی نظر میں برا ہو ۔ یہ ایک جامع فریضہ ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے ۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اسلامی حکومتیں خصوصی اہتمام کرتی ہیں ۔ یعنی معروف کا حکم دینا اور برائی سے لوگوں کو باز رکھنا ، مسلمان کی نمایاں ہونے والی صفت ہے یہ ایمان کی فطرت ہے ، یہ اسلام کا خاصہ ہے جہاں مسلمان ہوگا یہ کام بھی ضرور ہوگا اور جو مسلمان ہوگا وہ یہ کام ضرور کرے گا ۔ اجتماعی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں قرآن میں ایک سے زیادہ آیات ہیں لیکن یاد رہے کہ جیسے ہر چیز کے اپنی صفت کے لحاظ سے دو درجے ہوتے ہیں ایسے ہی ایمان کے بھی دو درجے ہیں ایک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا مجسمہ بن جائے اور دوسرا کمال یہ ہے کہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنائے ۔ اسی دوسرے کمال کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے پھر اس کے بھی مراتب ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ موم بتی ، بجلی کا قمقمہ ، چاند اور سورج سب ہی روشن کرنے والے ہیں مگر روشنی میں ان کے مدارج الگ الگ ہیں ۔ موم بتی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے بجلی کے بلب کی روشنی ایک مکان تک پھیل جاتی ہے چاند کی روشنی زمین اور اس کی اردگرد کی فضا تک محدود ہے مگر سورج ایک جہان کو منور کر دیتا ہے ۔ اسی طرح مومن اگر اپنے جیسے ایک انسان کے دل میں ایمان کی شمع روشن کر دے تو یہ درجہ حاصل کرے گا لیکن یہ پہلا مرتبہ ہوگا ۔ پھر ایک جماعت ایک قوم ایک ملک میں دعوت الی الخیر کا کام کرے ۔ آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت عالم انسانی کے لیے عام ہو ساری دنیا کو نیکی کی طرف بلائے ۔ پورے ربع مسکون میں اللہ کا فوجدار بن جائے ۔ یہ کمال ایسا

کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ قرآن کا یہی مطالبہ ہے۔

املاء:۔ جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے پیمانے مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آئے۔ اسی صورت حال کو تدریج امہال اور املاء کہتے ہیں۔ املاء کے معنے ڈھیل دینے کے ہیں۔ عمل حق اور عمل باطل دونوں کے نتائج کے ظاہر ہونے کے ایک مدت مقرر ہے دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوں گے اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوں گے البتہ حق کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فاتحانہ حیثیت کی نمائش ہو جائے، اور باطل کے لیے اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے فنا ہونے پر کمزوری کی تکمیل ہو جائے۔ اس املاء کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص تقاضا رکھتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

اجتباء:۔ اس کے معنے پسند کرنے اور انتخاب کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن حکیم میں عام طور پر انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لیکن اُمت اسلامیہ کے لیے بھی بولا گیا ہے۔ ایک ایسا لفظ جو عموماً منصب نبوت کی خاطر کیے جانے والے انتخاب کے لیے بولا گیا ہو۔ اسے اگر اُمت کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تو یہ اُمت کے پیغمبرانہ کام کے ذمہ دار ہونے کی کھلی نشانی ہے۔ اس لفظ کے ذریعے اُمت مسلمہ کی مخصوص ذمہ داری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور یہ اس امت کے ایک ممتاز اور غیر معمولی حیثیت کے مالک ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی آمد سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ اور دُنیا اس بشارت کے ظاہر ہونے کے لیے ایک مدت سے آنکھیں لگائے بیٹھی تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ آپ کی اُمت کا تھا۔ ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا پہلے ہی اعلان کر دیا گیا تھا۔

بر　:۔ بر کے معنے میں چونکہ وسعت کا تصور موجود ہے اس لیے اس سے بِرّ مشتق ہوا جس کے معنے خوب نیکی کرنے کے ہیں۔ اسی رعایت سے اس لفظ کا اصل مفہوم لغت عرب میں کسی

کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو یا ماں باپ کا حق ہو یا اللہ کے بندوں کا حق ہو ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے جو معاہدات قول وقرار، حلف و ولا، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بر اور بار اس سے صفت کے صیغے آتے ہیں برالوالدیہ اس سعادت مند بیٹے کو کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق کا پورا پورا ادا کرنے والا ہو۔ بالقسم کے معنے ہیں۔ اس نے اپنی قسم پوری کر دی۔

البیت :۔ بیت کے معنے گھر کے ہیں۔ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان رات میں بسیرا کرے، یہاں خانہ کعبہ مراد ہے یہی بیت اللہ، البیت الحرام، اور البیت العتیق ہے بیت اللہ اس لیے کہ حضرت ابراہیم کا دستور تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں جس بیت ایل (بیت اللہ) کی تعمیر کا ذکر ہے اس کا مصداق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو مکہ کا بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے نہ بیت المقدس، اس لیے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیم کے سینکڑوں سال کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہی گھر ملت ابراہیمی کی برکتوں کا مظہر ہے۔ البیت الحرام حرمت والا گھر شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں حرام کے معنے جس جگہ بند رہنا چاہیے اس جگہ کئی باتیں بند ہیں آدمی کو مارنا، جانور کو ستانا اور درخت اور گھاس اکھاڑنا اور گرا پڑا مال اٹھانا، البیت العتیق کے معنے بزرگ گھر، آزاد گھر، پرانا گھر، جو چیز زمانہ قدیم یا مرتبہ میں اونچی ہو اس کو عتیق کہتے ہیں۔ اسی لیے عتیق کے معنے قدیم کے بھی ہیں۔ خانہ کعبہ کو البیت العتیق کیوں کہا گیا اس کی تفصیل آپ پارہ ۱۷ میں پڑھیں گے۔

بطانۃ :۔ دلی دوست، رازدار، بھیدی، استر، کپڑے کا باطنی حصہ جو جسم سے ملا ہے۔ بطن سے مشتق ہے۔ بطن کا استعمال ہر شے میں ظہر کے خلاف ہوتا ہے۔ اوپر کی جانب کو ظہر اور اندر کی طرف کو بطن بولتے ہیں۔ اور کپڑے کے اوپر کے حصہ کو ظہارہ اور اندرونی نیچے کے حصہ کو جو جسم سے ملا ہے بطانہ کہتے ہیں جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں کہ وہ تو اس کا

اوڑھنا بچھونا ہے یعنی وہ اس کو نہایت ہی مرغوب و محبوب ہے اسی طرح بطانۃ الثوب سے بطور استعارہ دلی دوست کے متعلق جو باطنی اُمور کا راز دار ہو بطانۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ سبحانہ نے اہل ایمان کو یہ ہدایت کی ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا رازدار نہ بنائیں۔ یعنی اجتماعی زندگی کے اہم مناصب جن کا اہلِ ایمان کی اجتماعی زندگی سے تعلق ہو وہ غیر مسلموں کو نہ دیں۔ قرآن نے اس حکم کو علی الاطلاق نہیں پیش کیا بلکہ اس میں کچھ قیدیں لگائی ہیں اوّل یہ کہ وہ تمہاری خرابی میں کوتاہی نہ کرتے ہیں دوم یہ کہ تمہارا نقصان ان کو محبوب ہو۔ سوم، یہ کہ ان کی دشمنی ان کے منہ سے عیاں ہو۔

بیان :۔ لغت میں بیان بلیغ ترین پیرائے میں اظہار مقصد کو کہتے ہیں، اصل معنے ظاہر ہونے اور کھولنے کے ہیں۔ ہر ایسی تعبیر جو کلام کے معانی کھول کر نمایاں کردے بیان ہے۔ البیان والتبیین میں جاحظ رقمطراز ہے کہ بیان کے لفظ میں بڑی جامعیت ہے۔ معنے کے چہرے سے جو چیز نقاب ہٹادیتی ہے اور ضمیر سے جو چیز پردہ اٹھادے بیان ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ان من البیان لسحرًا غرض کہ لفظ لغت میں اظہار اور ظہور کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

اصولیین نے بیان کی جو تعریف کی ہے اس میں بھی لغوی معنے کی جھلک ہے۔ انہوں نے بیان کی یہ تعریف کی ہے کہ مخاطب کے سامنے معنے کو ظاہر کرنا اور اس کی اس انداز سے توضیح کر پوشیدگی کا نام و نشان نہ رہے۔

بیان کی تعریف میں اصولیین کے یہاں ظہور نہیں بلکہ اظہار معتبر ہے۔ امام شافعی اور احناف میں سے علماء اصول کی اکثریت کا یہی رجحان ہے۔ احناف کی سربراہی فخرالاسلام بزدوی کرتے ہیں [1] چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"بیان سے مراد اس موضوع پر ہمارے نزدیک اظہار ہے ظہور نہیں۔"

شارح اصول بزدوی عبدالعزیز بخاری نے کچھ احناف اور شوافع کی اکثریت کا میلان یہ بتایا ہے کہ یہاں معنے ظہور ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اصل لغت میں بیان کے معنے ظہور کے ہیں بان ھذا المعنی اور بان الھلال ظہور کے معنے میں بولا جاتا ہے۔

---

[1] رسالہ امام شافعی ص ۲۱، اصول بزدوی، کشف الاسرار ۳، ۸۲۴ دیکھو۔

لیکن حضرت امام شافعی اور فخر الاسلام بزدوی کا موقف دلائل اور واقعات کی روشنی میں زیادہ مضبوط ہے۔ جب یہ کہا جاتے گا کہ بین لی بیانا تو اس سے عربی داں یہی سمجھے گا کہ اس نے میرے سامنے ظاہر کیا اور اس طرح واضح کیا کہ کسی شک کی گنجائش نہ رہی اور جب یہ بولا جاتا ہے کہ فلاں ذو بیان تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ فلاں اظہار و توضیح پر قادر ہے۔[1]

خود قرآن حکیم میں لفظ بیان اظہار ہی کے معنے میں آیا ہے ھذا بیان للناس۔ اور ثم ان علینا بیانہ مطلب یہی ہے کہ معانی و احکام کا ظاہر کرنا ہمارا کام ہے۔ اور خلق الانسان علمہ البیان میں بھی یہی معنے ہیں۔

> علامہ عبد العزیز بخاری نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ جو شخص بیان کو ظہور کے معنے میں لیتا ہے اس کو یہ بات ماننی پڑے گی۔ کہ جو شخص قرآن و سنت میں غور و فکر سے کام نہیں لیتا اس پر بہت سے احکام واجب نہیں ہوتے بلکہ آیات الٰہی میں جو غور و فکر سے کام نہ لے گا اس پر ایمان بھی واجب نہیں کیونکہ ظہور نام ہے علم کا اور وہ موجود نہیں۔ یہ سرتا سر غلط ہے۔[2]

اسی کے لگ بھگ بات شمس الائمہ سرخسی نے بھی لکھی ہے اور بڑی لطیف ہے۔

بیان کی قسمیں

لغوی اور اصطلاحی طور پر بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد آیئے اب بیان کی ان قسموں پر ایک نظر ڈال لیجیے جو علمائے اصول نے تحریر فرمائی ہیں۔

بیان تقریر، بیان تغییر، بیان تبدیل، بیان تفسیر اور بیان ضرورت۔

امام شافعی نے رسالہ میں "کیف البیان" کے عنوان کے تحت چار صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ سبحانہ نے خود اعلان کر دیا کہ یہ فرض ہے اور یہ حرام ہے مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج فرض ہیں، زنا، شراب، مردار کا گوشت، خون، فواحش حرام ہیں وضو کے فرائض

---

[1] اصول سرخسی ص ۲۶، کشف الاسرار ص ۳، مراۃ الاصول شرح مرقاۃ الوصول لملا خسرو ۲ ص ۲۴

[2] کشف الاسرار ص ۴ ۸۲ اصول سرخسی ص ۲۶، ۲۸۔

بیان کیے ہیں۔
دوسرے یہ کہ نفسِ فرضیت کا حکم خود بیان کیا لیکن اس کی تفصیل کیفیت کا بیان زبانِ نبوت کے حوالہ کر دیا مثلاً نمازوں کی تعداد مقادیرِ زکوٰۃ اوقات کی تعیین وغیرہ۔
تیسرے یہ کہ خود اپنے رسول کی طاعت فرض قرار دے کر کچھ احکام کو نبوت کے ذریعے بیان کرایا۔
چوتھے یہ کہ اربابِ فکر پر تفکر و اجتہاد کو فرض قرار دے کر اجتہاد کے ذریعے احکام کی تعیین کرائی۔
امام شافعی کے بعد اصولیین نے بیان کی چار قسمیں بیانِ تقریر، بیانِ تفسیر، بیانِ تغییر اور بیانِ تبدیل مقرر کر لی ہیں۔ قاضی ابوزید الدبوسی نے چار ہی قسمیں بتائی ہیں۔
بیانِ تقریر،
بیانِ تفسیر،
بیانِ تغییر، یعنی استثنا
بیانِ تبدیل، یعنی تعلیق بالشرط
علامہ شمس الدین سرخسی نے ان چار میں دبوسی سے ہم آہنگی کرتے ہوئے پانچویں قسم بیانِ ضرورت کا اضافہ کیا۔
فخر الاسلام بزدوی نے بھی پانچ ہی قسمیں قائم رکھی ہیں لیکن دبوسی اور سرخسی جسے بیانِ تغییر اور بیانِ تبدیل کہتے ہیں۔ بزدوی ان کو بیانِ تبدیل کہتے ہیں۔ دبوسی بیانِ ضرورت کو پیش نہیں کرتے ہیں۔
تفسیرِ قرآن میں ان اقسام میں سے کون سی قسم مفید مدعا ہے۔ اس پر بحث کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان میں سے ہر ایک کا ناظرین کے سامنے چہرہ پیش کریں۔ اس کے لیے آپ کو کچھ انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔
توراۃ:۔ اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ علامہ زمخشری کی رائے میں توراۃ اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں۔ قاضی بیضاوی بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ علامہ شیخزادہ حواشی تفسیر بیضاوی میں رقمطراز ہیں۔ لوگوں کا ان دونوں لفظوں کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا یہ اشتقاق اور تصریف کے قانون کے تحت آسکتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ دو مقدس کتابوں کے دو عجمی عبرانی نام ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اسی دوسرے خیال کو اختیار کیا ہے اور جو لوگ ان کے اشتقاق کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ توراۃ وری الزند سے مشتق ہے۔

جس کا استعمال چقماق کی لکڑی کے سلگ کر آگ دینے کے لیے ہوتا ہے چنانچہ وری اللہ زند چقماق کی لکڑی سلگ اٹھی اور اوریت انا میں نے اس کو سلگا کر آگ نکالی دونوں طرح مستعمل ہے۔ چونکہ تورات میں وہ ضیا نور تھا جس کے ذریعے انسان ضلالت سے نکل کر ہدایت پر آجاتا ہے۔ جس طرح کہ اندھیرے سے اجالے میں نکل جاتا ہے اس لیے یہ کتاب تورات سے موسوم ہوئی اور اس کی تائید قرآن کی یہ آیت بھی کرتی ہے ولقد اٰتینا موسٰی وھارون الفرقان وضیاء یہی فراء اور جمہور کا قول ہے۔ فراء کا بیان ہے کہ اس کا وزن تفعلہ عین کے زیر کے ساتھ ہے پھر زیر کو زبر سے تبدیل کر دیا گیا۔ یہ طائی تلفظ یعنی بنی طی کی زبان ہے۔ اور بعض نے اس کا وزن تفعلہ عین کے زبر سے بتایا ہے۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس کا وزن فوعلۃ بتایا گیا ہے اور تفعلہ اس لیے نہیں بتایا گیا کہ یہ کم آتا ہے اور تا واو کا بدل ہے۔

تورات وہ کتاب ہے جو خاص حضرت موسٰی پر نازل ہوئی تھی موجودہ تورات جو حضرت موسٰی علیہ السلام کے بعد تصنیف ہوئی اور جس میں کچھ مضامین اصلی تورات کے بھی بطور یادداشت درج کرکے اس کا نام تورات رکھ دیا گیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث تیسرے پارے میں پڑھیے۔

جنت :۔ اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا۔ قرآن پاک میں عموماً الجنۃ بتایا گیا ہے۔ اور کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے مثلاً جنۃ النعیم نعمت کا باغ جنت الخلد بقائے دوام کا باغ جنۃ الماویٰ پناہ کا باغ۔ جنت کی لذتیں جاودانی اور وہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں۔ جہاں حیات ہے مگر موت نہیں۔ راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں۔ آخرت کے خانۂ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت کا لفظ استعمال کیا ہے نادان یہ سمجھتے ہیں کہ عرب کے شور اور بے حاصل صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنے ہے۔ اصل یہ ہے کہ جہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں۔ یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے۔ جنت ہی مقام رحمت، وہی مقام رضوان ہے اور یہی مقام نور ہے۔ اسی کی طلب پر عبادت گزار مومن کا منتہائے نظر ہے۔ بعض صوفیائے کرام

کا یہ کہنا کہ جس نے قیامت کے اندیشے اور جنت کے لالچ سے اللہ کی عبادت کی اس نے فی الحقیقہ شرک کیا، عالم جذب وشوق اور جوش محبت میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ مجذوبیت ہے۔

حج:۔ لغت میں حج کے معنے ارادہ کرنے کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادے سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کا طواف اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔ حج بھی اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے مرد ہو یا عورت عمر میں ایک بار فرض ہے۔ حج کی کچھ شرطیں، کچھ ارکان، کچھ واجبات کچھ سنن اور کچھ منہیات ہیں۔ ارکان حج کو مناسک حج کہتے ہیں۔

حدود:۔ حد کی جمع ہے۔ حد اس آڑ اور روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کو باہم ملنے سے روکے، قرآن میں یہ لفظ بصیغہ جمع بمعنے قوانین مفروضہ ۱۴ جگہ آیا ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں حدود مقررہ واجب سزاؤں کو کہتے ہیں، اور ان کا تعلق اللہ کے حق سے ہوتا ہے۔ مثلاً: حد ارتداد، حد بغاوت، حد زنا، حد قذف، حد سرقہ، حد قطع طریق، حد شرب خمر، اسلامی قانون میں ان حدود کی حیثیت زواجر کی ہے، اسی بنا پر شبہات سے بھی ان کا دفعیہ ہو سکتا ہے اور متہمین تہمت سے بچ سکتے ہیں۔

دعوت الی الخیر:۔ اصل دعوت کا فریضہ تو نبوّت کا ہے لیکن نبوّت ختم ہونے کی وجہ سے یہی فریضہ اُمت کے سپرد کیا گیا ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس اُمت کو خیر اُمت کہا گیا ہے۔ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعت کے فرض کو انجام دے سکیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اس اُمت کو حق پر استوار رکھنے اور دُنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس اُمت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور باہر بھی انجام دیتا رہا۔ ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا، جو اللہ کی طرف سے عائد کیا گیا تھا اس وقت تک دعوت کا فرض ایک فرض کفایہ تھا۔ اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو

اس فرض کی ذمہ داری سے بری کر دیتا تھا لیکن نظامِ خلافت درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضۂ دعوت اس اُمت کے تمام افراد پر منتقل ہو گیا تھا اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس نظام کو قائم نہ کریں اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے۔

رُشد :- ہدایت، صلاحیت، راہ یابی، بھلائی، راستی، ہوشیاری، حسن تدبیر، رشد یرشد کا مصدر ہے ہدایت کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں رشد سے مراد دین اور مال کے خرچ کرنے میں صلاحیت ہے۔ صلاح دینی سے مراد یہ ہے کہ ان فواحش و معاصی سے مجتنب رہے جو عدالت کو ساقط کر دیتے ہیں اور مال میں صلاح کا مطلب یہ ہے کہ فضول خرچ نہ ہو یعنی ایسی جگہ مال خرچ نہ کرے کہ جہاں دُنیا کی کوئی خوبی اور کوئی ثواب نہ ہو۔ نیز مال کا صرف کرنا جانتا ہو کہ لین دین میں غبن نہ اٹھائے آیتِ قرآنی فان آنستم منھم رُشدًا کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یتیموں سے رشد نہ دیکھا جائے تو ان کو مال سپرد نہ کیا جائے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد کا بھی مذہب ہے لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک چونکہ اٹھارہ برس سن بلوغ کی آخری حد ہے اس لیے سات برس زائد یعنی پچیس برس کے سن تک اور انتظار کیا جائے کیونکہ سات برس کی مدت تغیرِ احوال کے لیے معتبر ہے بچہ کو اس مدت میں تمیز ہو جاتی ہے اور اس پر نماز کا حکم کیا جاتا ہے لہٰذا اس قدر انتظار کے بعد اس کا مال حوالے کر دیا جائے۔ اگرچہ اس میں رشد نہ ہو۔ یہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے ورنہ فقہ حنفی میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ عبدالرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں رقمطراز ہیں، احناف کہتے ہیں کہ ہمارے مسلک میں مختار اور مفتیٰ بہ یہی ہے کہ سفیہ پر حجر کیا جائے گا۔ سفیہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ فرد جو اپنے مال کا بخوبی انتظام نہ کر سکتا ہو اور اسے حرام کاموں اور لغویات میں اور گناہ کے کاموں میں صرف کرے اور اپنے تصرفات میں تبذیر و اسراف سے کام لے۔ ایسے اسراف میں جس کے سبب حجر کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مغنیوں کو مال دینا، گراں قیمتیں دے کر کبوتر اور مرغ وغیرہ خریدنا شامل ہیں اور جوئے بازی میں مال صرف کرنے یا دوسرے ایسے اخراجات کرنے پر بھی حجر واجب ہے جو شریعت اور عقل کے خلاف ہوں۔

حجر کے معنے لغت میں روکنا ہیں اور شریعت میں اس کے معنے انسان کو اپنے مال میں تصرف کر لینے سے روک دینا ہیں۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ رشد کے معنے یہ ہیں کہ مالک اپنے مال کو بے فائدہ کاموں میں صرف ہونے سے بچائے مثلاً غنا، قمار، حرام اشیا اور آلات لہو کے خریدنے سے اور شراب خریدنے سے۔

ربّی :۔ جمع ربیون ہے، خدا کے طالب، خدا پرست، اللہ والے ہزاروں جماعتیں۔ ربّی ربانی کی طرح ہے۔ یہ امام راغب کا بیان ہے۔ امام بخاری نے اس کے معنے جماعتوں کے بتائے ہیں اور ربیون کا واحد بتایا ہے یہ معنے اصل میں امام لغت ابوعبیدہ سے منقول ہیں، اس صورت میں ربی حسب تصریح قاضی بیضاوی ربۃ کی طرف بطور مبالغہ منسوب ہے جس کے معنے جماعت کے ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں "ربیون کثیر" کے معنے عبداللہ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے جماعات کثیرہ کے بیان کیے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے ہزاروں بتائے ہیں۔ کلبی کا قول ہے کہ ایک ربیۃ دس ہزار کا ہوتا ہے، ضحاک ایک ہزار کہتے ہیں حسن بصری نے علماء اور فقہاء ترجمہ کیا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ ربیون پیروکار ہیں، ربانیون حکام اور ربیون رعیت ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ رب کی طرف منسوب ہے یعنی وہ لوگ رب کی عبادت کرتے ہیں اور ابوحاتم احمد بن حمدان لغوی نے کتاب الزینۃ میں تصریح کی ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۔ (الاتقان) امام راغب کا بیان زیادہ قرین صواب ہے اور زمخشری کا بھی یہی بیان ہے۔

عول :۔ اصل میں اس کے معنے انصاف کو چھوڑ کر بڑھتی وصول کرنے کے ہیں۔ عرب والے بولتے ہیں عال المیزان، ترازو جھک گئی۔ عال الحاکم، حاکم نے ناانصافی کی۔ ابن حبان نے حضرت صدیقہ سے ان لا تعولوا کے یہی معنے نقل کیے ہیں کہ تم ناانصافی نہ کرو اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے مگر امام شافعی نے ان لا تعولوا کی تفسیر ان لا تکثر عیالکم سے کی ہے جس کے متعلق محی السنہ بغوی لکھتے ہیں کہ یہ معنے کسی اور نے نہیں بیان کیے، تحقیق تو یہ ہے کہ کثرت عیال کے لیے اعال یعیل اعالۃ بولا جاتا ہے اور قانون وراثت کی اصطلاح میں عول اصل مسئلہ کے مقابلے میں حصص کے زیادہ ہو جانے کا نام ہے وراثت میں مسائل کی تین قسمیں ہیں عادلہ، عائلہ، ناقصہ، عادلہ وہ جن میں مال مقررہ حصص کے برابر ہو، عائلہ وہ جن میں حصص مال سے زیادہ ہوں، ناقصہ وہ جن میں حصص کم ہوں، عول کی بہترین مثال فرائض میں مسئلہ منبریہ ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کوفہ میں ممبر پر ایستادہ تقریر فرما رہے تھے کہ ایک شخص اٹھا اور اس نے دریافت کیا کہ امیرالمؤمنین میری بیٹی کا شوہر انتقال کر گیا، اس کے ترکہ میں میری بیٹی کا آٹھواں حصہ آتا ہے لیکن وارثوں نے اسے نواں حصہ دیا ہے۔ آپ سے انصاف چاہتا ہوں، آپ نے برجستہ جواب دیا فرمایا کیا تیرے داماد نے دو لڑکیاں وارث چھوڑی ہیں؟ وہ بولا جی ہاں، آپ نے پوچھا کہ مرنے والے کے والدین بھی ہیں اس نے کہا جی ہاں، آپ نے بتایا کہ اس صورت میں بوجہ عول کے تیری بیٹی کا حصہ آٹھویں سے نواں ہو گیا اس کے علاوہ میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۥ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

یاد رکھو تم واقعی نیکی کا درجہ [164] اس وقت تک ہرگز نہ پاؤ گے جب
تک راہ خدا میں کچھ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو گے [165] جن
سے تم محبت رکھتے ہو۔ اور دیکھو جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ
تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے [166]۔

واقعی دینداری کا پیمانہ

اس سے پہلے بتایا گیا تھا کہ اللہ کی عدالت میں گناہوں کا کوئی بدلہ اور فدیہ قبول نہ کیا جائے گا۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہی مال و دولت دنیا میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ بلکہ مصنوعی اور حقیقی دینداری کے مابین یہی حدِ فاصل ہے۔ نیکی کا یہ تصور کہ دینداری کی رواجی شکل و صورت اختیار کی جائے، دینداری نہیں ہے۔ چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد زندگی کے سارے تقاضوں اور معاشرے کے سارے حقوق سے بیگانہ رہنا، اور پھر دینداری کا دعویٰ کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ [illegible] صالحہ [illegible] لی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو ماں باپ کا [illegible] کے بندوں کا حق ہو ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف و ولاء اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آتی ہیں۔

انسان یہاں دو گونہ تعلقات لے کر آیا ہے ایک اس کا تعلق اپنے خالق سے ہے دوسرا اس کا تعلق اللہ کی مخلوق سے ہے، اس لیے انسان پر دو قسم کے حقوق ہیں، اللہ کے حقوق

مالک و مولیٰ اور خالق ہونے کی وجہ سے اور مخلوق کے حقوق اس کائنات ارضی کے مکین ہونے کی وجہ سے۔ جب انسان کائنات ارضی کا مکین ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کائنات کی ہر چیز سے متعلق ہے جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع صرف نہ کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشو و نما اور تربیت کا موقعہ دیا جائے۔ حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ دی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔ اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے۔ غرض اسلام نے ان تمام حقوق کو کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

دینداری کی حد تک دینداروں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ دیندار لوگ دینداری کا ایک خاص پیمانہ بنا کر رکھ لیتے ہیں جو صرف چند اوہام، چند رسُوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان رسُوم کی بجا آوری کرنے والے کو دینداری کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے خواہ اس کی پوری زندگی انسانی حقوق سے بالکل بیگانہ ہو چکی ہو قرآن یہاں اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بتا رہا ہے کہ نیک انسان ہونے کا مقام ان سب چیزوں سے بالا ہے۔ نیکی کی اصل رُوح انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان باللہ کا حقیقی امتحان اسی میں ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اس لیے صرف رواجی نیکیوں پر یہودیوں کی طرح "قناعت نہ کرنی چاہیے۔ اصل چیز اپنی محبوبات اور مرغوبات کو اللہ کی رضا کی خاطر اللہ کی راہ میں قربان کرنا ہے۔

۱۶۴۔ یاد رکھو تم واقعی نیکی کا درجہ اس وقت تک ہرگز نہ پاؤ گے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کی نیکی کرنا چاہو تو اپنی محبوب اور عزیز ترین چیزوں میں سے کچھ اللہ کے راستہ میں نکالو۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں یعنی جس چیز سے دل بہت لگا ہو اس کے خرچ کرنے کا بہت درجہ ہے۔ یوں تو ثواب ہر چیز میں ہے۔ شاید یہود و نصاریٰ کے ذکر میں یہ آیت اس لیے نازل فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی جس کی خاطر وہ حضور کی پیروی نہ کرتے تھے اس لیے جب تک وہ بھی اللہ کے راستہ میں نہ چھوڑیں گے درجہ ایمان نہ پائیں گے۔ پہلی آیت سے یہ مناسبت ہوئی کہ وہاں کافر کا مال خرچ کرنا بیکار بتایا تھا۔ اب اس کے مقابلے میں بتایا ہے کہ مومن جو خرچ کرے اس سے نیکی میں کمال حاصل ہوتا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دراصل اس آیت میں لفظ بِرّ لاکر بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ساتھ وفاداری کی لازمی شرط محبوبات و مرغوبات میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ محبت اور وفاداری کے لیے یہ کسوٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو فی الحقیقت ہر مدعی کا بھرم کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ یہودی اس معاملہ میں بالکل صفر تھے۔ وہ محض چند رسُوم کی ظاہر دارانہ پیروی کر کے یہ سمجھتے تھے کہ للہیت اور خدارسی میں جو مقام ان کا ہے وہ نہ کسی کا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ قرآن نے جیسے یہاں ان کے زعمِ باطل پر ضرب کاری لگائی ہے ایسے ہی مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ للہیت اور نیکی کا درجہ کمال صرف دعووں اور چند رسموں کے ادا کر دینے سے حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہے۔ دعویٰ ایمان کا حقیقی امتحان صرف انفاق میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اس لیے صرف رواجی اور رسمی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نیکیاں خالص اور بے آمیزہ نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی مفاد کی خواہش بھی شامل ہو۔ ایمان کا امتحان یہی ہے کہ خدا کی راہ میں اپنی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو خرچ کرو کیونکہ یہ انفاق ہی اعلیٰ درجہ کی نیکی اور ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیتِ گرامی سے یہی سمجھا ہے۔

بخاری و مسلم، ترمذی اور نسائی میں حضرت انس کے حوالہ سے یہ واقعہ آتا ہے کہ ابوطلحہ صحابی کا مدینہ میں نخلستان تھا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے سامنے اس کا محل وقوع تھا۔ خود حضور بھی اس نخلستان میں جاتے پانی نوش فرماتے اور یہ باغ ابوطلحہ کے دل کی ایک کلی تھی۔ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطلحہ حضور انور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اس باغ کا نام بیرحاء تھا۔ حضرت طلحہ نے عرض کیا کہ یا رسُول اللہ مجھے اپنے تمام سرمایہ میں سب سے زیادہ محبوب یہی بیرحاء نخلستان ہے۔ میں اللہ کے راستہ میں خیرات کرتا ہوں، آپ اسے اپنے صوابدید سے جہاں چاہیں خرچ کر لیں۔ حضور نے فرمایا واہ واہ بہت بڑا اور نفع والا سرمایہ ہے۔ میں اس کو تیرے ہی رشتہ داروں میں تقسیم کر دوں گا۔ طلحہ نے کہا کہ جو جی چاہے کیجیے۔ مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ حضور نے یہ باغ حسان بن ثابت اور ابی بن کعب کو دے دیا۔

ابن ابی حاتم نے محمد بن المنکدر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ اپنا سبل نامی گھوڑا لے کر حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور

یوں گویا ہوئے کہ مجھے اپنی تمام املاک میں یہ گھوڑا سب سے زیادہ محبوب ہے اس لیے یہ میری جانب سے راہ خدا میں صدقہ ہے۔ حضور انور نے ان سے گھوڑا لیا اور ان ہی کے صاحبزادے حضرت اسامہ کو دے دیا۔ زید بن حارثہؓ اس پر کچھ اندر اندر منقبض ہوتے۔ حضور نے زید کے چہرے سے انقباض پڑھ کر فرمایا بے فکر رہو اللہ نے تمہارا صدقہ قبول فرما لیا۔

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ اس آیت کے تقاضے سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اپنی ساری املاک پر جائزہ کی خاطر ایک نگاہ ڈالی میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی تمام املاک میں مرجانہ نامی کنیز سے محبت ہے۔ میں نے اسے خالصتہً اللہ کے لیے آزاد کر دیا اور اپنے غلام نافع سے اس کی شادی کر دی ۔۔۔ خود حضرت عمر نے اسی تاثر کے تحت اپنی کنیز کو آزاد کیا تھا۔

اس آیت کے مطالبہ کے تحت صحابہ و تابعین میں ایثار و قربانی اور انفاق کے بے شمار واقعات ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک مہمان آیا۔ آپ کے گھر میں مہمان کی ضیافت کا کوئی سامان نہ تھا۔ ایک انصاری ابوطلحہ اس مہمان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مہمان کے سامنے کھانا رکھ دیا اور بیوی کو چراغ گل کرنے کی ہدایت کر دی۔ تاریکی میں آپ مہمان کے ساتھ کھانے پر ہاتھ بڑھاتے رہے مہمان نے کھانا کھا لیا۔ خود اور ان کی اہلیہ بھوکے ہی سو گئے صبح ہوئی تو حضور انور نے فرمایا کہ ابوطلحہ اللہ سبحانہ کو آج رات مہمان کے لیے تمہارا کردار بہت پسند آیا اور اسی کردار پر شاباش قرآن نے یہ کہہ کر دی ہے ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ اپنے آپ پر دوسروں کو تنگی کے باوجود ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر بیماری سے اٹھے تھے اور بے حد کمزور تھے۔ مچھلی کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مدینہ میں پوری تلاش کے باوجود نہ ملی، ایک روز کے بعد ملی اور ۱½ درہم میں خریدی گئی، روسٹ کی گئی۔ آپ کی خدمت میں نوکر نے لا کر پیش کی، دروازے پر مانگنے والے نے دستک دے دی۔ آپ نے نوکر سے کہا کہ مچھلی روٹی میں رکھ کر مانگنے والے کو دے آؤ۔ نوکر کو دونوں باتیں معلوم تھیں، آپ کا غلبہ اشتیاق اور مچھلی کی دیر بعد دستیابی۔ اس نے فقیر کو دینے میں لیت و لعل سے کام لیا مگر حضرت عبداللہ نے نوکر کو اصرار سے کہا کہ جاؤ فقیر کو دے آؤ۔

نوکر دوڑانے پر گیا اور فقیر کو ایک درہم دے کر آ گیا اور بتایا کہ میں نے فقیر کو پیسے دے دیے ہیں لیجیے مچھلی سے شوق پورا فرمائیے حضرت عبداللہ نے کہا جاؤ دوڑو اور مچھلی فقیر کو دے آؤ۔ اور اس سے پیسے بھی واپس نہ لینا۔ بندہ خدا میں نے حضور انور سے سنا ہے کہ، جو شخص اپنی چاہت اور خواہش کو دبا کر دوسرے کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے اللہ سبحانہٗ اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

حضرت فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ حضور انور کے صحابہ میں سے ایک شخص کو ہدیۃً سری دی گئی اس نے یہ خیال کر کے کہ فلاں صاحب کو اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہوگی، سری ان کے گھر روانہ کر دی۔ انہوں نے بھی اسی خیال سے آگے روانہ کر دی یہاں تک کہ سری سات گھروں کا چکر لگانے کے بعد پہلے ہی شخص کے پاس آ گئی۔

ابو طالب مکی نے قوت القلوب اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

حقوق و فرائض

جیسے لفظ تقویٰ فرائض کی ادائیگی کے لیے آتا ہے ایسے ہی لفظ بِر حقوق کی پاسداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے بِر کی ضد عقوق آتا ہے۔ بَر اور بار اس سے صفت کے صیغے آتے ہیں بَرًّا بوالدیہ اس سعادت مند بیٹے کو کہتے ہیں جو اپنے والدین کا فرمانبردار ہو اور ان کے پورے پورے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے معنے میں صرف حقوق ہی داخل ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ یہ لفظ زیادہ حقوق میں استعمال ہوتا ہے اور فرائض میں کم۔ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچاؤ کے معنے میں ہو تو اس کی ضد فجور آ جاتی ہے۔

انسان کا دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں اور مکینوں سے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اسے صرف کیا جائے جن میں اللہ سبحانہٗ نے ان کو صَرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے۔ اسی ذمہ داری کا نام حق ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک ہرگز ابرار نہ ہو گے جب تک اپنی محبوب ترین چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ بظاہر اس میں صدقات واجبہ اور نافلہ سب داخل ہیں لیکن صحابہ کرام کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا منشا صدقاتِ نافلہ ہیں۔

اس بناپر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ صدقات وخیرات میں واقعی فضیلت اور ان کے ذریعے واقعی نیکی کا درجہ اس وقت ملے گا جب رسمی اور رواجی طرز سے ہٹ کر اللہ کی راہ میں اپنی محبوب اور پیاری چیز کو خرچ کروگے ۔ اور ابوبکر الوراق نے اس آیت کو مکارمِ اخلاق کے لیے رہنما بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ فرمارہے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ نیک معاملہ اس وقت تک نہ کروں گا جب تک تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیک معاملہ نہ کرو اور اپنے اموال ان پر خرچ نہ کرو ۔ جب تم یہ کرلوگے تو میرے کرم اور مہربانیوں کے تم مستحق ہوگے [1]

ایک ارشادِ نبوت جو صحیح مسلم میں نواس بن سمعان کے حوالہ سے آیا ہے اس میں بِر حسنِ اخلاق کو قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے :

> نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بِر صرف اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جس کی تمہارے دل میں کھٹک ہو اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں ۔

مسندِ احمد اور مسندِ دارمی میں حضرت وابصہ کے حوالہ سے جو ارشادِ نبوت آیا اس میں بِر کی حقیقت کو اور زیادہ واضح طور پر پیش کیا ہے :

> وابصہ کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ حضور نے فرمایا کہ وابصہ تو بِر اور اثم کے بارے میں پوچھنے آیا ہے ۔ عرض کی جی ہاں ! فرمایا کہ تو اپنے دل سے پوچھ ۔ بِر وہ ہے جس پر تیرا جی مطمئن ہو اور تیرا دل لگ جاتے اور اثم وہ ہے کہ جس کی کھٹک تیرے جی میں رہے اگرچہ لوگ تجھے کتنے ہی فتوے دیں ۔

یہ دونوں ارشاداتِ نبوت واشگاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ بِر کا سرتا سر تعلق لوگوں کے حقوق سے ہے ۔

انسانی حقوق جیسے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ایسے ہی معاملات میں دیانت وامانت سے بھی تعلق رکھتے ہیں ۔ اسی بنا پر ایک ارشادِ نبوت میں راست گفتار اور سچے کو بار فرمایا ہے چنانچہ مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالہ سے یہ واقعہ آتا ہے کہ :

---

[1] قرطبی

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ جنت کا عمل کیا ہے۔ فرمایا سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو بار (نیکوکار) ہو جاتا ہے۔ اور ایماندار ہوتا ہے اور جب ایماندار ہو جاتا ہے جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے دریافت کیا کہ دوزخ کا عمل کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فاجر ہو جاتا ہے اور جب فاجر ہوتا ہے تو راہِ کفر اختیار کرتا اور کافر ہوتا ہے تو جہنم میں جاتا ہے۔

ایسے ہی بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت اس کی توضیح کرتا ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! راست گوئی کی عادت اختیار کرو کیونکہ راست گوئی بر نیکوکاری کی رہنما ہے اور نیکوکاری یعنی بر انسان کو جنت میں پہنچاتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں اس کا لقب صدیق ہو جاتا ہے اور دیکھو جھوٹ سے بچنا۔ جھوٹ فجور میں مبتلا کرتا ہے اور فجور دوزخ میں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں اس کا لقب کذاب پڑ جاتا ہے۔

ان ارشاداتِ نبوت کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی حقوق یعنی اخلاق و معاملات میں حسن کاری کا نام بر ہے۔ اگر اخلاق میں ہو تو اس کا مقابل فجور ہے اور معاملات میں ہو تو اس کا مقابل اثم ہے اور اگر اقارب میں ہو تو اس کا مقابل عقوق ہے۔ بہرحال جیسے خداوندی حقوق کی پابجائی کا نام تقویٰ ہے ایسے ہی انسانی حقوق کی ادائیگی کا نام بر ہے۔ اسی بنا پر سفر کی دعا میں دونوں کو مانگا ہے۔

اللھم انا نسئلک فی سفرنا ھذا البر والتقوی

اے اللہ ہم آپ سے اپنے اس سفر میں بر و تقویٰ مانگتے ہیں۔

۱۶۵۔ جن سے تم محبت رکھتے ہو۔ اصل ارشاد یہ ہے کہ:

مما تحبون وہ چیز جسے تم محبوب رکھتے ہو۔ محبوب سے مراد یہاں مال ہے۔ مال و دولت اور سرمائے کے لیے ہی مما تحبون کی کنائی تعبیر اختیار کی ہے۔ صحابہ کے واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک بزرگی اور فضیلت کا معیار کیا ہے۔ فرمایا سب سے بڑا درجہ انہی کا ہے جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی محبوبات کی قربانی کی اور ایمان وعمل کی آزمائش میں پورے اترے۔ تمہارے گھڑے ہوئے تقدس و بزرگی کے مناصب اور رواجی بڑائیاں اللہ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ جیسے بنی اسرائیل دینداری کی محض رسوم کی ظاہرداری پیروی کر کے یہ سمجھتے تھے کہ جو سب سے بڑا درجہ انہی کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے غلط ہے۔ ایسے ہی آج کل عام مسلمانوں کی عام ذہنیت یہ ہے کہ وہ بھی حقیقی اور واقعی نیکیوں پر رواجی نیکیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ایک فاسق وفاجر دولت مند محرم میں سبیل لگا دیتا ہے یا ربیع الاول میں دھوم دھام سے مجلس میلاد کر لیتا ہے یا کوئی درگاہ بنا دیتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ بہت بڑی نیکی کر لی ہے۔ اور نہیں جانتا کہ اللہ کے نزدیک رواجی نیکیاں نیکیاں نہیں۔ نیکی کا معیار صرف ایمان وعمل اور اللہ کی راہ میں محبوب ترین چیز کی قربانی ہے۔ محبوبیت کا معاملہ اضافی ہے۔ ایک دولت مند کی محبوب اور ایک غریب کی محبوب چیز میں فرق ہے۔ اسی بنا پر قاضی ثناء اللہ نے ماتحبون کا مصداق مال کی مختلف قسمیں بتایا ہے فرماتے ہیں کہ محبوب سے مراد تمام اصناف مال ہیں۔ کیونکہ مال کی محبت میں لوگوں کے مذاق مختلف ہیں۔

۱۶۶۔ اور دیکھو جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے۔ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کیسی چیز خرچ کی، کتنی محبوب اور پیاری چیز جس طرح کے مصرف میں جس قدر اخلاص اور حسن نیت سے خرچ کرو گے اسی کے موافق اللہ تعالیٰ کے یہاں بدلہ ملنے کی امید رکھو[1]۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں اگرچہ سبب ذکر کیا ہے مگر مراد مسبب ہے گویا علم وخبر سے اس کا لازم مراد ہے یعنی اللہ سبحانہ جب تمہارے خرچ کیے ہوتے پیسے پیسے سے واقف ہے تو کوئی وجہ نہیں اس کا اجر ضائع ہو جائے۔

اس جملے میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کی اصل حقیقت اللہ پر روشن ہے کہ وہ اس کے نزدیک محبوب ہے یا نہیں اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر رہا ہے، یا محض شہرت کے لیے محض کسی کا دعویٰ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ علیم و خبیر جانتا ہے کہ واقعی میں کیوں خرچ کر رہا ہے [1]

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ثواب تو ہر خرچ کرنے سے ملتا ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے مگر زیادہ ثواب محبوب چیز کے خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے [2]

مالِ محبوب، طیّب اور العفو

آپ انفاق کے موضوع پر تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ

انفقوا من طیبات ما کسبتم

اس آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ دیا جائے وہ کوئی نکمی اور بیکار چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی پستی و دنائت ظاہر ہوتی ہے ارشاد ہے ۔

انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض

اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں راہ خدا میں خرچ کرو۔

اور آپ انفاق ہی کے موضوع پر دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں؛

یسئلونك ماذا ینفقون ؟ قل العفو

آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں فرمادیجئے کہ العفو

یعنی عفو خرچ کریں۔ عفو کے معنے امام رازی اور دوسرے علماء نے یہی بتلائے ہیں کہ "آدمی کی ذات اور اہل و عیال سے جو کچھ بچ جائے"، لسان العرب میں لغت کے مشہور امام فراء سے منقول ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو قل العفو ہے اس سے مراد سرمایہ کا فضل اور بڑھوتری ہے۔

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کی آمدنی یا اصل کے منافع کو العفو کہتے ہیں اور اس آیت میں بتایا ہے کہ اپنی محبوب چیزوں میں سے جب تک اللہ کی راہ میں خرچ نہ کروگے البر یعنی نیکی میں کمال نہ پاؤگے تو ان تینوں یعنی العفو، طیب اور ما تحبون میں منافات نہیں بلکہ پوری پوری ہم آہنگی ہے۔ اصول یہ ہے کہ انفاق کی اس ذمہ داری کا تعلق ذاتی مال و

---

[1] معارف م ش [2] بیان القرآن

املاک میں صرف اسی حصہ سے ہے جو اپنی ضروریات سے فاضل ہو۔ کوئی آدمی بھی اس کا مکلف نہیں کہ اپنے سرمایہ یا راس المال کو خیرات کرے۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ اصل کو باقی رکھ کر منافع کو اللہ کی راہ میں دے اور جو کچھ دے وہ اچھی اور ستھری چیز دے گھٹی اور گری پڑی چیز ایسی نہ دے جو خود بھی لینے کو تیار نہ ہو۔ اور صرف اچھی ہی نہیں بلکہ اپنی پسندیدہ دے۔ پسندیدگی اور محبوبیت صدقہ کی صحت اور قبولیت کی شرط نہیں بلکہ نیکی میں درجہ کمال کی شرط ہے۔ ورنہ از روئے قرآن ہر خرچ راہِ خدا کا خرچ اس وقت قرار پاتا ہے جبکہ اس میں خود غرضی نہ ہو، ریاکاری اور نمائش نہ ہو، احسان جتانے اور اذیت دینے کی کوشش نہ ہو۔ اپنا بدتر مال چھانٹ کر نہ دے بلکہ عمدہ اور بہتر مال دے۔ اور اس میں اللہ کی محبت اور اس کی خوشنودی کے سوا کوئی مقصود نہ ہو۔

مقابلہ کا امتحان

اگر آیت میں نیکی میں درجہ کمال کو بتایا گیا ہے تو اس کا صاف اور واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تم محبت الٰہی کے مدعی ہو تو اس دعوے کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ محبوب کی رضا کی خاطر اپنی محبوبات کو قربان کر دو۔

آیت میں حتیٰ تنفقوا کا مفعول مما تحبون ہے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ کمال کے لیے ساری محبوبات کو قربان کرنے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ کچھ کو قربان کرنے کا مطالبہ کیا ہے انسانی محبوبات کیا ہیں یہاں اس کی تفصیل بیان نہیں کی ہے مگر قرآن میں دوسرے مقام پر ان محبوبات کی تفصیل دی ہے۔

تیسرے پارہ میں آیت نمبر ۱۴ میں ہے:

انسان کے لیے دل کی محبت اور چاہت عورتوں میں اولاد میں، چاندی سونے کے ذخیروں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں ہے۔

اسی طرح سورہ برات کی آیت نمبر ۲۴ میں ہے

مسلمانو اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں پسند ہیں اللہ، اس کے رسول اور اللہ کی راہ

میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔
اس سے معلوم ہوا کہ ما تحبّون صرف کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ زندگی کی وہ تمام چیزیں ہیں جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے۔ عام غلط فہمی یہ ہے کہ ما تحبّون سے صرف کھانے پینے کی چیزیں مراد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کی ایک بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ یہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں سے خدا کی راہ میں قربان کرنے کو تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے لیکن تمدن کے وسیع تر معاملات، مناصب اور مراتب میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کرتے کہ ان کو بھی اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہیے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف اسلام ہے اور دوسری طرف تمہاری محبوبات، مقابلے کے اس امتحان میں جو بھی اسلام کی خاطر اپنی محبوبات کو قربان کرتا ہے وہ ہی نیکی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔

اسلامی نظام اور اشتراکی نظام میں امتیاز

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی اصلاح میں محض ضابطہ بندی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اخلاقی تربیت سے بھی اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی چیز اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کے درمیان حدِ فاصل اور وجہ امتیاز ہے۔
اشتراکیت نے معاشی زندگی کو سدھارنے کے لیے صرف خارج میں ضابطہ بندیاں کرنے پر انحصار کرلیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ضابطہ محض جبر اور مادی طاقت کے بل پر قائم ہوتا ہے اور جو نظام محض زور و طاقت اور جبر پر قائم ہو اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ تمدن کے کسی ضابطہ کو بقا و دوام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک جمہور کے اپنے دلوں میں بھی اس مقصد کے حصول کی لگن نہ ہو جسے قانون و ضابطہ بزور و جبر حاصل کرنا چاہتا ہے اشتراکی نظام انسان کی پوری معاشی زندگی کو ضابطہ اور قانون کی بندش میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس کی زندگی کے کسی گوشہ میں بھی انسان کے ارادہ اور مرضی کو آزاد نہیں چھوڑتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطل میں رہیں گے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطل اس کی موت ہے جس دنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقارب کی امداد غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں۔

جہاں کسی شخص کو انفرادی طور سے اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے کسی کے کام آنے کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقع نہ ہو جس جماعت کے افراد باہمی معاملت اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی روح سے خالی ہوں اس میں اخلاقی احساسات کا نشو و نما ناممکن ہے چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہو گا اور نہ کوئی شخص دوسروں کی امداد کر اپنا اخلاقی فرض خیال کرے گا اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غربا کی اعانت، حاجت مندوں کی حاجت روائی، بیماروں کی عیادت و خبر گیری اور اس نوع کے دیگر انسانی خصائل بکسر ناپید ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں اجتماعی ادارے ان فرائض کو سرانجام دیں گے لیکن اول تو اجتماعی امداد شخصی اعانت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے جب افراد میں انفرادی طور پر اس صنف اخلاق کا نشو و نما بند ہو جائے گا تو اجتماعی اداروں کو وہ آدمی کہاں سے مل سکیں گے، جن کے دل دوسروں کے لیے رحم و شفقت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے لبریز ہوں، شخصی اعانت اخلاقی احساس کی بیداری اور حرکت کا پیمانہ ہے۔ اجتماعی امداد اور اخلاقی احساس کے مابین کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کیونکہ قائم شدہ روایات عام رائے کا دباؤ یا محض جذبۂ تقلید اس نوع کی امداد کا محرک ہو سکتا ہے بخلاف اس کے شخصی اعانت کا جذبہ صرف اخلاقی احساس سے تحریک پاتا ہے اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالہ کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور اس کے تصورات کی اصلاح اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل اور ایک مناسب ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ عمل غلط سمت میں نہ جاتے اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور باختیار ارادہ کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دے دیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا موقع باقی نہ رہتا جو شخص قانون کی رو سے اس بات پر مجبور ہو کہ اپنی کمائی ایک لاشخصی ——— ادارہ کے حوالہ کر دے اور پھر اس میں سے صرف اتنا ہی حصہ واپس لے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو

اس پر اخلاقی اچھائی یا برائی کا حکم کس طرح لگایا جا سکتا ہے کیونکہ اس عمل میں اس کا آزاد ارادہ نہیں بلکہ قانون کا خوف کام کر رہا ہے البتہ اگر حکومت اور قانون کے خوف سے بے پرواہ ہو کر اس سے یہ عمل ہوتا تب اس کے اخلاقی نشوونما کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا اس لیے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی پُرزور تلقین کی اور بتایا کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت انسان میں راسخ نہ ہو جائے لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔ گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر اسلام انسان کے اخلاقی احساسات کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دُنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت و دستگیری کو اپنا فرضِ منصبی خیال کرے مسلمانوں کی شناخت بتلاتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے ومما رزقنا ھم ینفقون اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں صرف کرتے ہیں الذین ینفقون اموالھم سراً وعلانیۃ وہ لوگ جو اپنے مال کو ظاہر اور پوشیدہ طور سے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں پورا قرآن انفاق کی تاکید سے بھرا پڑا ہے ۔ اگر وہ سب آیات جمع کر دی جائیں جن میں انفاق کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ نماز اور زکوٰۃ کے بعد اگر کسی عمل کی بتکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے کیونکہ انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے جس جماعت میں انفاق کی روح کام کر رہی ہو گی اس میں غربت و افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سُنی جا سکیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبر گیری اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسرِ کار ہو وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت ناپید ہو گی جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں وہاں گردش زر —— میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہو گی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند ہو جائے گا کیونکہ دُنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں گردش زر جتنی مکمل ہو گی معاشی زندگی اتنی ہی پُرسکون ہو گی۔ اسی طرح معاشی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو اس کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں اور اس میدان میں وہ اشتراکیت سے اس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی طرح پیچھے نہیں ہے البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام مساوات —— سے زیادہ معاشرتی مساوات —— کا حامی اور مؤید ہے معاشی مساوات اسے صرف اس حد تک مطلوب ہے کہ

اجتماعی دولت کسی خاص طبقہ میں محدود نہ ہونے پائے بلکہ جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہو اور ہر شخص کو اتنی روزی میسر آجائے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ابتدائی ضروریات پوری کر سکے اشتراکیت کی طرح اسلام یہ نہیں چاہتا کہ جملہ افراد معاشی حیثیت سے یکساں حالت میں ہوں یا معاشی زندگی کی اونچ نیچ بالکل ہموار اور ہم سطح ہو جائے وہ ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور معاشی نامساوات کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا ہے بشرطیکہ یہ نامساوات ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے البتہ جس چیز کو وہ یکسر مٹا دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت یا تمول کی بنا پر افراد کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق و امتیاز پیدا ہو یا دولت ہی عزت کا واحد معیار ہو جائے اس معاملہ میں اس کی راہ بالکل الگ ہے چنانچہ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جس کے دل میں اس کا سب سے زیادہ خوف ہو۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنے آیا ہے جس میں دولت، علم و ہنر، نسل یا خاندان کوئی بھی عزت کا معیار نہ ہو اور جہاں فرق و امتیاز کی صرف ایک وجہ تسلیم کی جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا ترسی اور خدا پرستی میں کیا درجہ حاصل ہے۔ معاشرتی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے نماز باجماعت کو ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے یہ ایک بڑا نفسیاتی حربہ ہے جس میں وہ اپنے پیروؤں میں معاشرتی مساوات اور اخوت کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز باجماعت کے التزام میں معاشرتی امتیازات پر ایک کاری ضرب پڑتی ہے۔ مندروں میں یکے بعد دیگرے پوجا پاٹ کرنے یا کلیساؤں میں ہفتہ میں ایک روز کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے سے اخوت اور مساوات کا وہ احساس نہیں پیدا ہوتا جو مسجد میں روزانہ پانچ وقت ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے سے پیدا ہوتا ہے یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ کسی مقام کے تمام مسلمان بلافرق و امتیاز روزانہ پانچ وقت مسجد میں اس طرح جمع ہوں اور پھر بھی ان میں باہم وہ بُعد و فصل باقی رہے جو معاشی درجہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اہل ثروت اور اونچے طبقے کے لوگ اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو مساجد میں جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اپنے مکان کے کسی گوشے میں عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو وہ البتہ مسجد میں نظر آتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ان کی صورت مسجد میں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہی ہے اگر وہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز

ادا کرنا شروع کر دیں تو پھر اپنے امتیازات اور معاشرتی مرتبہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرتی مساوات کا قیام معاشی مساوات کے حصول سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے کیونکہ معاشی مساوات کے حصول کے بعد بھی طبقہ داریت ـــــ پیدا ہو سکتی ہے۔ اشتراکیت نے انسانی زندگی کے اس نفسیاتی پہلو کو نظرانداز کر دیا کہ طبقاتی امتیازات مختلف شکلوں میں ظہور کر سکتے ہیں۔ طبقہ داریت تنہا دولت اور معاش کی راہ ہی سے نہیں آتی ہے۔ دوسرے راستوں سے بھی اس مہلک مرض کا پھیلنا ممکن ہے اس کا قوی احتمال ہے کہ انسان معاشی حیثیت سے تو ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں لیکن نسل، خاندان، عہدے یا کسی اور اعزاز کی بنا پر ان میں امتیازات پیدا ہو جائیں۔ اس صورتِ حال کی مثالیں ہمیں ہندوؤں کی معاشرت میں بکثرت ملتی ہیں جہاں برہمنیت کسی معاشی مفاد پر نہیں بلکہ مذہبی اقتدار پر مبنی ہے اسی طرح چھتریوں نے اپنی ایک علیحدہ معاشرت بنا لی ہے ساہوکار اور تجار مالدار ہونے کے باوجود برہمنوں اور چھتریوں سے کمتر درجہ رکھتے ہیں اشتراکیت کے قیام کے بعد بھی ممکن ہے کہ طبقہ داریت کسی اور شکل میں رونما ہو جائے۔ کسان اور مزدور، عالم اور عامی پرولتاریہ اور اشتراکی حکمرانوں کے مابین طبقاتی امتیازات اور معاشرتی درجہ بندیوں کے حدود فاصل قائم ہو جائیں اور معاشی حیثیت یکساں ہونے کے باوجود ان کے آداب و معاشرت میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ اس صورتِ حال کو دفع کرنے کی غرض سے اجتماعی عبادات کا نظام تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا فرق و امتیاز پیدا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشترک نصب العین کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکیں یا ان کے معاشرتی اختلافات سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

بہرحال یہ آیت اپنی شانِ جامعیت کی بنا پر اپنی مثال آپ ہے۔ اس ایک فقرے کے ذریعے مالیات اور معاشیات کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ
عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ
فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ
فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں[١٦٧]، البتہ کھانے کی کچھ چیزیں اسرائیل نے اپنے اُوپر خود ہی تورات کے نازل ہونے سے پہلے حرام کرلی تھیں[١٦٨]۔ اے پیغمبر! اگر اس بارے میں یہود آپ سے جھگڑتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو تو تورات لاؤ اسے پڑھو[١٦٩]۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی اللہ پر جھوٹ کی الزام تراشی کرتا ہے تو وہ ہی فی الواقع ظالم ہے[١٧٠]۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کچھ اعلان کیا ہے

سچا ہے۔ اگر تم میں سچائی کا کچھ نام ہے تو آؤ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک ہی کا ہو رہا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔"

اسلام پر یہود کا اعتراض

یہودیوں کی طرف سے خصوصیت سے یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر اسلام کی دعوت بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیم اور پچھلے نبیوں کی تھی اور آپ فی الواقع ملت ابراہیم کی پیروکاری کے مدعی ہیں تو کیوں قرآن نے بھی ان تمام چیزوں کو حرام نہیں کیا، جو یہودیوں کے یہاں حرام سمجھی جاتی ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اشارہ اونٹ کے ذبیحہ اور اس کی قربانی کی طرف تھا۔ اس لیے کہ اونٹ عرب کے محبوب ترین اموال میں سے تھا اور یہود کی شریعت میں جیسا کہ احبار میں وارد ہے حرام ہے۔ گویا جب علماء یہود اصول کی حد تک لاجواب ہو گئے اور قرآن کی اس صداقت کا کوئی جواب نہ دے سکے کہ قرآن کی تعلیم اور انبیاء سابقین کی تعلیمات میں سر مو فرق نہیں تو انہوں نے اپنے فقہی ترکش میں سے یہ تیر نکالا کہ آپ نے کھانے کی ان چیزوں کو کیوں حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانہ سے حرام چلی آ رہی ہیں؟

اس آیت میں یہودیوں کے اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ جو چیزیں طیبات میں داخل ہیں اور کھانے پینے کی ہیں وہ سب ابتداءً بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں۔ البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب نے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔ چنانچہ تورات دیکھ لو کہ اونٹ یا بعض دوسری چیزیں جن کو تم حرام قرار دیتے ہو ان کی حرمت کا کوئی ذکر عہدِ ابراہیمی میں نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو تورات میں ملتا ہے۔

تورات میں ملتِ ابراہیمی کے برعکس جن طیبات کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ دو قسم کی ہیں، اول، وہ جو یہود کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حرام ہوئی ہیں۔ قرآن ہی میں یہ مضمون سورہ نساء

میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی بنا پر ہم نے بہت سی پاک چیزیں ان پر حرام کر دی ہیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں دیکھو آیت ۱۶۰ سورۃ نسآ اور پھر سورۃ انعام میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کی سرکشیوں کی بنا پر ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام قرار دی دیکھو آیت ۱۴۶ ۔

دوم، وہ چیزیں جن سے احتراز اور اجتناب کا تصور یہودیوں میں حضرت یعقوب سے چلا آرہا ہے۔ حضرت یعقوب نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا۔ اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی اس کی تارک رہی۔ حتیٰ کہ یہودی فقہا نے ان کو قانونی محرمات میں شمار کر لیا۔ زیر تفسیر آیت میں اسی کی طرف اشارا ہے۔

جن مفسرین قرآن کی نگاہ محرمات کی پہلی قسم پر ہے۔ انہوں نے آیت زیر تفسیر میں اسرائیل سے مراد بنی اسرائیل لیا ہے اور جن کی نگاہ دوسری قسم کے محرمات پر ہے۔ انہوں نے اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب لیا ہے۔ یہی مؤخرالذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔

کُلُّ الطعام کیا ہے ؟

۱۶۷۔ کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں۔ اصل ارشاد میں کل الطعام آیا ہے۔ طعام کے معنے کھانا، خوراک، خوردنی کھلانا، جو چیز کھائی جاتے اس کی جمع اطعمہ ہے اور کبھی طعام اسم ہوتا ہے یعنے اطعام یعنی کھلانا جیسے عطاء اسم ہے یعنے اعطاء (دیکھو غرائب القرآن نیشاپوری) یہ بھی واضح رہے کہ کچھ اہل لغت نے طعام کے معنے گندم بتاتے ہیں لیکن گیہوں سے اس کی تخصیص صحیح نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ صدقہ فطر کی حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری کے حوالہ سے آئی ہے اس میں صاعا من طعام آیا ہے۔ یہاں بعض ائمہ نے کچھ قرائن کی وجہ سے طعام سے گندم مراد لیا ہے لیکن اور ائمہ نے اس مراد کو تسلیم نہیں کیا اور طعام سے یہاں بھی اس کے عام اور اصل معنے ہی مراد لیے ہیں۔ بعد کو بعض شافعی لغت نویسوں نے اپنے مذہب کی تائید کے لیے طعام کے معنے گندم بتانے شروع کر دیے۔

کل الطعام سے کیا مراد ہے۔ زمخشری کی رائے میں کھانے کی سب چیزیں مراد ہیں۔ لکھا ہے المطاعم کلھا۔ اور بتایا ہے کہ کھانے کی ساری چیزیں نزول تورات سے پہلے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں۔ نزول تورات کے بعد بنی اسرائیل کی سرکشیوں کی وجہ سے

محرمات کا نزول ہوا ہے۔ قفال مروزی فرماتے ہیں کہ مردار اور خنزیر بنی اسرائیل کے لیے کبھی بھی حلال نہ تھا اس لیے کل الطعام سے کھانے کی ساری چیزیں مراد نہیں ہیں صرف وہ چیزیں مراد ہیں جن کے بارے میں زمانۂ نبوت میں دعویٰ تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں حرام تھیں۔ لیکن علامہ آلوسی کا رجحان زمخشری کی طرف ہے جب کہ متاخرین میں سے مولانا حقانی قفال مروزی کے ہمنوا ہیں۔ مولانا ثناءاللہ امرتسری نے یہاں پر بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ مراد تو کل الطعام سے وہی ہے جس میں بحث تھی لیکن کل الطعام میں لفظ کل آنے کی وجہ سے افراد کا استغراق نہیں بلکہ اجزاء کا استغراق مراد ہے اس لیے ترجمہ یہ ہوگا کہ سارا کھانا بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا یہ نہیں کہ سارے کھانے حلال تھے۔ اصول میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ:

کل جب معرف باللام پر آئے تو احاطہ اجزا کا ہوتا ہے اور جب نکرہ پر آوے تو احاطہ افراد کا ہوتا ہے۔ (نور الانوار)

اور ظاہر ہے کہ ارشاد کل الطعام ہے کل طعام نہیں ہے۔ عام تراجم میں یہی ہے کہ سارے کھانے، سب کھانے، کھانے کی تمام چیزیں۔

اونٹ شریعتِ ابراہیم میں حرام نہ تھا۔

۱۶۸۔ البتہ کھانے کی کچھ چیزیں اسرائیل نے اپنے اوپر خود تورات کے نازل ہونے سے پہلے حرام کر لی تھیں۔ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے کو دینِ ابراہیم پر کیسے کہتے ہو؟ جب کہ وہ چیزیں کھاتے ہو جو ابراہیم کے گھرانے پر اللہ نے حرام کی تھیں جیسے اونٹ کا گوشت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جتنی چیزیں اب لوگ کھاتے ہیں سب ابراہیم کے وقت میں حلال تھیں جب تک تورات نازل ہوئی۔ بے شک تورات میں خاص بنی اسرائیل پر کچھ چیزیں حرام ہوئی ہیں۔ مگر ایک اونٹ تورات کے نازل ہونے سے پہلے حضرت اسرائیل یعقوب علیہ السلام نے اس کے کھانے سے قسم کھالی تھی۔ ان کی پیروی میں ان کی اولاد نے بھی چھوڑ دیا تھا اور اس قسم کا سبب یہ تھا کہ یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا درد تھا۔ اس وقت نذر کی کہ اگر صحت پاؤں تو جو چیز میری رغبت کی ہے اسے چھوڑ دوں گا۔ ان کو یہی اونٹ کا گوشت اور دودھ بہت پسند تھا اسے نذر مان کر چھوڑ دیا۔ اس

قسم کی نذر جو تحریم حلال پر مشتمل ہو، ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے کما قال تعالیٰ یاایھاالنبی لـم تحرم ما احل اللہ لک اگر کرلی تو توڑدے اور قسم کا کفارہ دے (تنبیہہ) پہلی آیت میں محبوب چیز کے خرچ کرنے کا ذکر تھا اس آیت میں حضرت یعقوب کا ایک محبوب چیز کو چھوڑ دینے کا ذکر ہے۔ اس طرح دونوں آیتوں میں مناسبت ہوگئی۔ نیز ان آیات میں متنبہ کر دیا گیا کہ پہلی شریعتوں میں نسخ واقع ہوا ہے جو چیز ایک زمانے میں حلال تھی بعد میں حرام ہوگئی اگر اسی طرح اب شریعت محمدیہ اور پہلی شریعتوں میں حلال وحرام کے اعتبار سے کچھ فرق ہو تو انکار واستبعاد کی کوئی وجہ نہیں [1]

شیخ الاسلام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا اعتراض اونٹ کے گوشت اور دودھ کے بارے میں تھا۔ اور ان کا کہنا یہ تھا کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ شریعت ابراہیم میں حرام تھا۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی یہ کہہ کر تردید کی کہ کھانے کی سب چیزیں حضرت ابراہیم کے زمانے میں حلال تھیں۔ اونٹ کا گوشت تو حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ حضرت یعقوب نے کیوں حرام کیا تھا اس کا جواب شیخ الاسلام نے یہ دیا ہے کہ ان کو عرق النسا کا درد تھا۔ اس درد سے چھٹکارا پانے کے لیے نذر مانی کہ صحت یاب ہو جاؤں تو اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں گا۔

اس واقعہ کا اصل مدار مسند احمد اور حاکم کی وہ روایت ہے جو ابن عباس کے حوالے سے آئی ہے اور جس کی تصحیح کا سہرا حاکم کے سر ہے۔ واقعہ کی یہ تفصیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اسرائیلی ذرائع سے آمدہ ہے۔ اسرائیلی علوم کا خزانہ تورات ہے۔ تورات میں جب ہم اس واقعہ کا کھوج لگاتے ہیں تو ہمیں تورات کی پہلی کتاب پیدائش باب ۳۲ میں یہ ملتا ہے کہ:

> اور وہ اسی رات اٹھا اور اپنی دونوں بیویوں، دونوں لونڈیوں اور گیارہ بیٹوں کو لے کر ان کو یبوق کے گھاٹ سے پار اتارا۔ اور ان کو لے کر ندی پار کرایا اور اپنا سب کچھ پار بھیج دیا۔ اور یعقوب اکیلا رہ گیا۔ پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اس سے کشتی لڑتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر کی جانب سے چھُوا۔ اور یعقوب کی ران کی نس اس کے ساتھ کشتی کرنے میں چڑھ گئی۔ اور اس نے کہا مجھے جانے دے کیونکہ پَو پھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہ دوں گا۔ تب اس نے اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا یعقوب اس نے کہا کہ آگے تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا۔ کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ تب یعقوب نے اس سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں تو مجھے اپنا نام بتا دے۔ اس نے کہا تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے اور اس نے وہاں برکت دی اور یعقوب نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھ دیا اور کہا کہ میں نے خدا کو روبرو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی۔ اور جب وہ فنی ایل سے گزر رہا تھا تو آفتاب طلوع ہوا اور وہ اپنی ران سے لنگڑاتا تھا۔ اسی سبب سے بنی اسرائیل اس نس کو جو ران میں اندر کی طرف ہے نہیں کھاتے۔ کیونکہ اس شخص نے یعقوب کی ران کی نس جو اندر کی طرف سے چڑھ گئی تھی چھو دیا تھا۔

(دیکھو پیدائش از آیت ۲۲ تا آیت ۳۲ باب ۳۱)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی سرکشیوں کی وجہ سے اونٹ کا گوشت حرام ہوا تھا۔ اس کی فقہی توجیہہ ان کے علماء یوں کرتے ہیں کہ چونکہ اونٹ کی ران میں وہ نس ہوتی ہے اس لیے اونٹ کا گوشت حرام ہے۔ قرآن نے اس آیت میں ان کی تردید کی ہے۔ اس صورت میں الطعام سے اونٹ مراد ہے اور کل الطعام کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ جو کھانے میں کام آتا ہے اس کے سارے اجزاء بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے سوائے اس جزء کے جسے حضرت یعقوب نے کسی وجہ سے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ وجہ کچھ ہو جو وجہ روایات میں بتائی گئی ہے تورات نے اس کی تفصیل بتائی ہے یعنی عرق النسا کی وجہ سے اگر حضرت یعقوب نے اونٹ کا گوشت چھوڑ دیا تھا تو تورات نے عرق النسا کی وجہ یہ بتائی کہ حضرت یعقوب کو یہ بیماری اللہ سبحانہٗ سے کشتی میں لگی تھی۔ معاذ اللہ۔

ظاہر ہے کہ تورات کے بیان میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین نے اپنی خداداد بصیرت سے اصل بات ظاہر کر دی اور واقعہ کے اضافی اجزا کو حذف کر دیا۔ اس صورت میں کل الطعام سے کھانے کے اجزاء مراد ہیں اور اسرائیل سے حضرت یعقوب

مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اونٹ کے کچھ اجزا سے جو احتراز فرمایا تھا نزول تورات سے پہلے اونٹ کے وہی اجزا حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کیے وہ اس سے پہلے کچھ حرام نہ تھا بعد کو بنی اسرائیل نے اسے ممنوع سمجھ لیا۔ باقی رہا حضرت ابراہیم تو ان کی شریعت سے تو اونٹ کی حرمت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں بے شک تورات میں اونٹ کی حرمت کا ذکر ہے۔ چنانچہ احبار میں ہے۔

پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا۔ تم بنی اسرائیل سے کہو کہ زمین کے سب حیوانات میں سے جن جانوروں کو تم کھا سکتے ہو وہ یہ ہیں۔ جانوروں میں جن کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہوں۔ اور وہ جگالی کرتے ہیں تم ان کو کھاؤ مگر جو جگالی کرتے ہیں یا جن کے پاؤں الگ ہیں ان میں سے تم ان جانوروں کو نہ کھانا یعنی اونٹ کو کیونکہ وہ جگالی کرتا ہے پھر اس کے پاؤں الگ نہیں سو وہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔ احبار باب ۱۱ ایت ۱ تا ۵۔

اور معلوم ہے کہ تورات شریعتِ ابراہیم نہیں بلکہ شریعتِ موسیٰ ہے۔

یہودی صداقت کا امتحان

۱۶۹ اے پیغمبر اس بارے میں اگر یہود آپ سے جھگڑتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو تو تورات لاؤ اسے پڑھو۔ یعنی اگر تم سچے ہو کہ یہ چیزیں زمانہ ابراہیم سے حرام تھیں تو لاؤ یہ مضمون خود اپنی کتاب میں دکھلا دو۔ اگر اس میں نہ نکلا تو تمہارے کاذب اور مفتری ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ روایات میں ہے کہ یہود نے یہ زبردست چیلنج منظور نہ کیا۔ اور اس طرح نبی اُمی کی صداقت پر ایک دلیل قائم ہو گئی [1]

تورات بتاتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ

ہر چلتا پھرتا جاندار تمہارے کھانے کو ہو گا۔ ہر سبزی کی طرح میں نے سب کا سب تم کو دے دیا۔

(پیدائش باب ۹ آیت ۳)

تورات نے حضرت ابراہیم سے حضرت نوح تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ان کے مطابق حضرت ابراہیم کی ولادت سے حضرت نوح تک ۹۰۸ سال ہوتے ہیں[لہ] ابراہیم کا تورات میں مبسوط ذکر ہے لیکن اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں ہے کہ نوح کے لیے جو جانور حلال ہوئے تھے وہ حضرت ابراہیم کے لیے حرام ہو گئے تھے۔ ہاں اگر ذکر ہے تو احبار میں حضرت موسیٰ و ہارون کی شریعت میں اونٹ کی حرمت کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے کہ اگر تمہارے اس دعوے میں صداقت ہے کہ حضرت ابراہیم پر اونٹ حرام تھا تو آؤ تورات لاؤ اور پڑھ کر بتاؤ کہ ابراہیم کے لیے اونٹ کے حرام ہونے کا کہاں ذکر ہے۔ اگر تورات میں یہ بات نہیں ہے اور فی الواقع نہیں ہے تو یہ جیسے یہودیوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے ویسے ہی حضور انور کی صداقت کی دلیل ہے۔

حافظ ابن القیم کی تحقیق

اس موقعہ پر حافظ ابن القیم نے جو تشریح فرمائی ہے وہ قابل تنقید ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک گمراہی یہ تھی کہ خدا کی جانب سے آمدہ قوانین و شرائع میں نسخ نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ان کے اسی مزعومہ کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ نزول تورات سے پہلے سوائے اونٹ کے گوشت کے جسے حضرت یعقوب نے خود حرام کر لیا تھا کھانے کے سارے جانور بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے۔ تورات آئی تو حرمت آئی۔ اور یہ بات

لہ تورات کی یہ تفصیل کہاں تک تحقیق علمی کے مطابق ہے۔ اس سوال کا جواب لوگوں نے مختلف دیا ہے۔ علمائے یورپ کا ایک فرقہ ان میں سے اکثر کو لغو سمجھتا ہے لیکن اس سے زیادہ محقق فرقہ کہتا ہے کہ یہ تفصیلات نسبی نہیں بلکہ صرف جغرافی ہیں اور یورپ کا وہ گروہ جو معقول اور منقول میں تطبیق کا عادی ہے وہ سفر تکوین کے بیانات اور علم و بحث کے نتائج کو ایک ہی سمجھتا ہے وہ کہتا ہے کہ تورات میں جو نام گنائے گئے ہیں وہ تلاش و تحقیق کے بعد تھوڑے تغیر کے ساتھ قدیم تاریخی ناموں سے خواہ وہ خود اشخاص کے ہوں یا ان کے مقامات کے ہوں بالکل مطابق ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طوفان نوح سے لے کر ابراہیم کی پیدائش تک کا زمانہ اس قدر مختلف ہے کہ اس میں مفاہمت ممکن نہیں ہے۔

سب جانتے اور مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل تورات سے پہلے اپنے باپ کی شریعت کے پابند تھے اور اس شریعت میں جو کچھ حلال تھا وہ اللہ کی جانب سے تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کی وساطت سے تھا۔ بعد ازیں تورات آئی اور حلال چیزوں کو حرام کیا اور اسی کا نام نسخ ہے۔ پھر فرمایا ہے بتاؤ کیا واقعی تورات کے محرمات حضرت یعقوب کے زمانے میں حرام تھے۔ یا صرف اونٹ کا گوشت ہی یعقوب نے اپنے لیے حرام کیا تھا۔ اگر حضرت یعقوب نے صرف اونٹ کا گوشت ہی حرام کیا تھا اور باقی تمام چیزیں نزول تورات سے پہلے حلال تھیں۔ تورات نے آکر حرام کی ہیں تو پھر نسخ کے بارے میں تمہارے انکار کی خود از روئے تورات کیا قیمت ہے؟ اور یہ تم کیوں کہتے ہو کہ شریعت منسوخ نہیں ہوتی۔ نسخ کے ہرگز یہ معنے نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا مگر اس کا انجام اللہ سبحانہٗ کو معلوم نہ تھا اس لیے پھر اللہ سبحانہٗ کی رائے اس کے خلاف قائم ہو گئی اور پہلے حکم کو ختم کر دیا۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں پر انسانی استعداد کے مطابق فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر منسوخ کر دیا جائے گا۔ پھر جب وہ وقت آجاتا ہے اللہ دوسرا حکم روانہ کر دیتا ہے تو درحقیقت یہ پہلے حکم کی مدت کا اعلان ہے لیکن چونکہ ہمارے علم میں پہلے حکم کی مدت اختتام نہیں ہے۔ اس لیے دوسرے حکم کے آنے پر ہم اپنی کوتاہی علم کی وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ حکم میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اگر نسخ یہی ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ دلائل کی روشنی میں یہ ثابت ہو چکا ہے اور خود یہودیوں کو مسلم ہے کہ تورات سے پہلے اسرائیلی زندگی شریعت کی پابند تھی۔ اگر تھی اور یقیناً تھی جیسا کہ خود بنی اسرائیل کو اعتراف ہے تو پھر بتایا جاتے کہ اس شریعت متقدمہ کے احکام کو تورات نے منسوخ کیا ہے یا نہیں۔ اگر نفی میں جواب ہے تو یہ صاف جھوٹ اور افترا ہے اور اگر جواب اثبات میں ہے تو اسی کا نام نسخ ہے اور اسی کے لیے قرآن کا چیلنج ہے فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین۔

آیت کی تفسیریں دونوں ہیں عامہ مفسرین کی بنائی ہوئی بھی اور ابن القیم کی کی ہوئی بھی۔ دونوں میں جوہری فرق ہے۔ مفسرین کی تفسیر پر یہودیوں کا اعتراض یہ ہوگا کہ جب آپ ملت ابراہیم پر ہونے کے مدعی ہیں تو پھر اب ان چیزوں کو حلال کیوں قرار دیتے ہیں جو حضرت ابراہیم پر حرام تھیں۔ اور ابن القیم کی تشریح کی بنا پر ان کا اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن چونکہ شریعت

کے احکام کو منسوخ کرتا ہے اس لیے ہم آپ کو پیغمبر نہیں مانتے۔ پہلے اعتراض کا اس آیت کے ذریعے جواب یہ دیا گیا ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو کہ یہ حضرت ابراہیم پر حرام تھیں۔ نزول تورات سے پہلے کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں اور حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت موسیٰ تک تمام انبیاء نے ان کو حلال سمجھا۔ ان میں سے اونٹ بھی ہے البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کی تھیں اور بس۔ چنانچہ تورات کے اوراق اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ اور دوسرے اعتراض کا جواب اس آیت کے ذریعے یہ دیا گیا ہے کہ نزول تورات سے پہلے سب کچھ حلال تھا۔ تورات نازل ہوئی تو حلال چیزیں حرام ہوئی ہیں۔ خود تورات اس کی گواہ ہے لہٰذا تمہارے دعویٰ کی خود تورات تکذیب کر رہی ہے۔

۹۴۔ اس کے بعد جو اللہ پر جھوٹ کی الزام تراشی کرتا ہے تو وہ بھی فی الواقع ظالم ہے یعنی بڑی بے انصافی ہوگی اگر اس کے بعد بھی وہی مرغ کی ایک ٹانگ رہی کہ نہیں، یہ چیزیں ابراہیم کے زمانہ سے حرام ہیں اور دین ابراہیم کے اصلی پیرو ہم ہیں۔ [1]

جب قرآن نے بطور دلیل اس بات پر زور دیا کہ اگر تمہیں اس بات کی سچائی سے انکار ہے تو تورات سے یہ ثابت کر کے دکھاؤ کہ واقعی حضرت ابراہیم کے زمانہ سے حرمت چلی آرہی ہے فاتوا بالتوراۃ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے کہا ہے کہ اپنی صداقت کے لیے تورات کی کوئی سی آیت تلاوت کرو۔ تو اب بتا رہا ہے کہ اگر یہی حقیقت ہے اور اس کے خلاف تورات کی کوئی شہادت نہیں پیش کی جا سکتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم اللہ پر جھوٹ کا طوفان اٹھاتے ہو اور ظاہر ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والا بہت بڑا ظالم ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ اگر کسی مسئلہ میں کتاب الٰہی رہنمائی نہ کرتی ہو اور کوئی شخص سند کے بغیر اسے خدا کے نام سے پیش کرتا ہے تو وہ افترا علی اللہ کذبا جیسے سنگین جرم کا مرتکب ہے۔

دراصل علم کا رشتہ جب نبوت سے ٹوٹ جاتا ہے تو فکرِ انسانی حلال و حرام کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آزادانہ پیمانے بناتا ہے۔ فکر کی اسی آوارگی کے تحت دعووں اور نعروں کا نام افترا علی اللہ کذبا ہے۔ خدا کی مخلوق اور خدا کے بندے ہوکر اللہ کی املاک میں اپنے تصرف اپنے استعمال اور انتفاع کے لیے خود رائی سے کام لینا کتنا سخت باغیانہ جرم ہے۔ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرف اور اختیارات کی حدیں لسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے۔ اور اس معاملہ میں آقا کو کچھ بولنے کا حق نہیں ہے تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارا اپنا ملازم اگر تمہارے گھر اور تمہارے گھر کی چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لیے اس آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کروگے۔ جو خود مانتا ہے کہ میں اللہ کی مخلوق ہوں اس کا بندہ ہوں اور یہ بھی جانتا ہے کہ مالک نے یہ بات نہیں فرمائی ہے اور پھر کہتا ہے کہ ہاں فرمائی ہے تو صرف بغاوت نہیں بلکہ بغاوت پر مزید جھوٹ اور افترا پردازی کا جرم ہے۔

۷۱ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کچھ اعلان کیا ہے سچا ہے اگر تم میں سچائی کا کچھ پاس ہے تو آؤ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک ہی کا ہو رہا تھا اور مشرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ یعنی خدا تعالیٰ نے حلال وحرام کے متعلق، نیز اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں سچی سچی اور کھری کھری باتیں تم کو سنا دیں جن کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اب چاہیے کہ تم بھی مسلمانوں کی طرح اصلی دین ابراہیم کی پیروی کرو۔ اور اس کے اصول کا اتباع کرو جن میں سب سے بڑی چیز توحید خالص ہے۔ چاہیے کہ تم بھی عزیر ومسیح اور احبار ورہبان کی پرستش چھوڑ کر پکے موحد ومسلم بن جاؤ۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے جو یہ بات بتائی ہے کہ نزول تورات سے پہلے بنی اسرائیل پر کوئی چیز حرام نہ تھی اس میں اللہ سچا ہے اور اب تمہارے خلاف حجت قائم ہو چکی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ کیونکہ اگر اللہ کی وحی میری رہنمائی نہ ہوتی تو میں نہ تمہیں دعوت دیتا اور نہ مجھ پر تمہاری کذب بیانی منکشف ہوتی۔ جب صورت حال یہ ہے تو آؤ اس ملت ابراہیم کی پیروی کرو جس کی میں دعوت دے رہا ہوں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

ملت ابراہیم سے مراد

آیت میں ملت ابراہیم سے مراد اسلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ اتباع کے موقعہ پر بجائے ابراہیم کے ملت ابراہیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی اتباع اس حیثیت سے مطلوب ہے کہ یہ محمد رسول اللہ کی پیروی ہے۔ اس حیثیت سے نہیں کہ یہ حضرت ابراہیم کی پیروی ہے کیونکہ حضور انور کی حیثیت ان انبیاء بنی اسرائیل کی نہیں ہے جو موسیٰ کی شریعت کی تبلیغ کا کام کرنے آئے تھے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ انبیاء دو قسم کے ہیں مؤسسین اور مجددین۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء مؤسسین میں ہیں۔ انبیاء مجددین میں سے نہیں۔

حضرت ابراہیم کی شخصیت سے استدلال

آخر میں فرمایا ہے حنیفاً و ما کان من المشرکین۔ یہ حضرت ابراہیم کا چہرہ ہے۔ حضرت ابراہیم یہودی، عیسائی اور مشرکین کے لیے یکساں قابل احترام تھے۔ اور قرآن کے اولین مخاطب بھی تینوں تھے۔ قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان تینوں کے سامنے پیش کیا ہے کہ اگر تم واقعی حق کے طالب ہو تو آؤ میری دعوت کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ملت ابراہیم کی پیروی کر لو جو کچھ میں بتا رہا ہوں یہ حضرت ابراہیم نے پیش کی تھی۔ یہی راہ نجات ہے حضرت ابراہیم کی راہ کیا تھی؟ قرآن نے دو لفظوں میں اسے سمیٹ دیا ایک یہ کہ وہ حنیف تھے دوسرے یہ کہ وہ مشرک نہ تھے حنیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی نہ تھے۔ کیونکہ قرآن کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حنیف کا مقابل مشرک ہے۔ اسی بنا پر جہاں جہاں قرآن میں حنیف کا لفظ آیا ہے اس کے ساتھ ساتھ شرک کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں بھی مشرک کے مقابلے پر ہے اس لیے اب جیسا کہ آپ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ

ما کان ابراھیم یھودیاً و لا نصرانیاً و لکن کان حنیفاً مسلماً۔

یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کہتے تھے مذہب حق تو یہودیت یا عیسائیت ہے یہ تیسرا مذہب کون سا ہے؟ قرآن نے جواب دیا کہ یہ دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ اصل مذہب وہ ہے جس

کی دعوت حضرت ابراہیم نے دُنیا کو دی۔

وقالوا کونوا هودًا او نصاریٰ تهتدوا قل بل ملة ابراهيم حنيفًا (بقرہ)

انہوں نے کہا کہ یہودی یا عیسائی ہوجاؤ تو راہ راست پاؤ گے، کہو نہیں بلکہ ابراہیم موحد کا مذہب اختیار کرو۔

یعنی ظاہر ہے کہ یہودیت اور عیسائیت حضرت ابراہیم کے بعد کی چیز ہے اس لیے اسلام جس کی میں دعوت دے رہا ہوں ان پچھلی آمیزشوں سے پاک ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِينَ ﴿٩٦﴾ فِيهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهُ
كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ
سَبِيلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ ﴿٩٧﴾

بلاشبہ سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے بنائی گئی وہ مکہ میں ہے[162]۔ یہ سراپا برکت ہے[163] اور تمام انسانوں کے لیے چشمہ ہدایت ہے[164]۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں، اس میں مقام ابراہیم ہے[165]۔ اور جو شخص اس میں داخل ہوا مامون و محفوظ ہو گیا[166]۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے[167]۔ اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے گا تو یاد رکھو کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے[168]۔

دُنیا میں سب سے پہلی عبادت گاہ

بیت اللہ جس کا دوسرا نام کعبہ اور تیسرا نام البیت الحرام ہے، وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاکے خیال میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا مرکز ہے۔ وہ ازل سے اس دُنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا۔ سب سے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اسے قرار دیا۔ لیکن حضرت ابراہیم سے بہت پہلے دُنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدے میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چاردیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جاتے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں بھی البیت العتیق پرانا گھر تھا کوئی نیا گھر نہ تھا۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھر نئے سرے سے ان پر چاردیواری کھڑی کی واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت واسماعیل اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی۔ حضرت ابراہیم واسماعیل نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا۔ یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے۔ یونان کا مشہور مورّخ ڈیوڈرس جو حضرت عیسٰی سے ایک صدی پہلے گزرا ہے وہ عرب کے ذکر میں لکھتا ہے:

ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزّت کرتے ہیں۔ (گبن کی تاریخ، عروج وزوال روم)

اور ثمود کا مقام شام و حجاز کی حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزّت سارے عرب کرتے ہیں، خانہ کعبہ ہے۔

رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ہے۔ پراکوپس مورّخ لکھتا ہے:

۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار ریلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا۔ اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا۔ اس پر سپہ سالار نے کہا۔

تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں [1]

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا موسم ہے اور حج کا تعلق بیت اللہ سے ہے۔ خانہ کعبہ کی قدامت پر سر ولیم میور لکھتا ہے کہ "مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کے لیے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔

بیت المقدس کے متعلق خود بائیبل کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان نے اس کو تعمیر کیا چنانچہ سلاطین ا باب ششم میں ہے :

اور بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد چار سو اسی ویں سال اسرائیل پر سلیمان کی سلطنت کے چوتھے برس زیو کے مہینے میں جو دوسرا مہینہ ہے" ایسا ہوا کہ اس نے خداوند کے لیے گھر بنانا شروع کیا۔ اور جو گھر سلیمان نے خداوند کے لیے بنایا اس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی بیس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔ آیت ۱ - ۲ -

اور حضرت سلیمان ہی کے زمانے میں وہ قبلہ اہلِ توحید قرار دیا گیا۔ چنانچہ سلاطین ا باب ۸ میں ہے:

"تاکہ تیری آنکھیں اس گھر کی طرف یعنی اس جگہ کی طرف جس کی بابت تو نے فرمایا کہ میں اپنا نام وہاں رکھوں گا دن اور رات کھلی رہیں تاکہ تو اس دعا کو سنے جو تیرا بندہ اس مقام کی طرف رُخ کر کے تجھ سے کرے گا اور تو اپنے بندے اور اپنی قوم اسرائیل کی مناجات کو جب وہ اس جگہ کی طرف رُخ کر کے کریں سُن لینا بلکہ تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے سن لینا اور سن کر معاف کر دینا۔

(آیت ۲۹ - ۳۰)

برعکس اس کے تمام عرب کی متواتر اور متفق روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا۔ اور وہ حضرت موسیٰ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے۔ لہٰذا کعبہ کی اولیت ایک ایسی حقیقت ہے جسے ماننے بغیر تاریخ اور علم کی روشنی میں چارہ نہیں ہے۔

---

[1] سیرۃ النبیؐ۔

یہود کا دوسرا اعتراض

۳ : ۹۶۔ بلاشبہ سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے بنائی گئی وہ مکہ میں ہے۔ مسلمانوں کے اس دعوے پر کہ ہم سب سے زیادہ ابراہیم سے اشبہ اور اقرب ہیں۔ یہود کو یہ بھی اعتراض تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وطن اصلی عراق چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کی۔ وہیں رہے وہیں وفات پائی۔ بعدہ ان کی اولاد شام میں رہی، کتنے انبیاء اسی مقدس سرزمین میں مبعوث ہوتے سب کا قبلہ بیت المقدس رہا۔ پھر تم حجاز کے رہنے والے جنہوں نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے اور سرزمین شام سے دور ایک طرف پڑے ہو کس منہ سے دعویٰ کر سکتے ہو کہ ابراہیم و ملت ابراہیم سے تم کو زیادہ قرب و مناسبت حاصل ہے۔ اس آیت میں معترضین کو بتایا گیا ہے کہ بیت المقدس وغیرہ تو مقامات مقدسہ بعد میں تعمیر ہوئے۔ دُنیا میں سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی توجہ الی اللہ کے لیے مقرر کیا گیا اور بطور ایک عبادت گاہ اور نشان ہدایت بنایا گیا وہ یہی کعبہ شریف ہے جو اس مبارک شہر مکہ میں واقع ہے[1]

یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ اگر قرآن اور نبوت محمدیہ کی راہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کی راہ سے مختلف نہیں ہے تو کیوں خانہ کعبہ کو بیت المقدس کی جگہ قبلہ مقرر کیا گیا۔ حالانکہ تمام انبیاء بنی اسرائیل بیت المقدس ہی کو قبلہ مقرر کرتے رہے ہیں۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی پہلی عبادت گاہ جو حضرت ابراہیم نے تعمیر کی وہ بیت المقدس نہیں خانہ کعبہ ہے۔ قرآن نے اس جواب میں یہی انکشاف نہیں فرمایا کہ حضرت ابراہیم نے پہلی عبادت گاہ مکہ میں بنائی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ دُنیا میں پہلی عبادت گاہ یہی ہے۔ تاریخی طور پر جیسے یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا خدا کا گھر ہے ایسے ہی یہ بات بھی از روئے قرآن بے غبار ہے کہ خانہ کعبہ کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی۔ البتہ دیواریں بے نشان تھیں، اللہ سبحانہ نے حضرت ابراہیم کو اس گھر کی جگہ بتادی جسے آپ سورہ حج میں پڑھیں گے۔

واذ بوانا لابراهيم مكان البيت

ہم نے ابراہیم کو اس گھر کی جگہ کا ٹھکانہ بتایا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے یہ معبد موجود تھا۔ کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو۔ اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم، اسماعیل کو قربانی کے لیے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا کہ وہاں جاکر عبادت کرکے واپس آتا ہوں۔ ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو۔ اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیم کی طرف اس گھر کی ایجاد کی نہیں بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے۔ جیسا کہ آپ پہلے پارے میں پڑھ آئے ہیں۔ اس وقت تک اس سرزمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ لفظ تو مجموعہ تورات میں حضرت سلیمان کے زمانے سے ملتا ہے۔ اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا۔ کیونکہ یہ شام کی جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا۔ اور کبھی اس کا نام بیابان تھا۔ آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا۔ اصل میں پہلا نام عربۃ تھا جو تخفیفاً بعد کو عموماً عرب بولا جانے لگا اور اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پاگیا چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے

اسد بن جابل کہتا ہے :

وعربۃ ارض جد فی الشرا ھلھا
کما جد فی شرب النقاح ظماء

اسلام کے بعد بھی یہ نام باقی رہا۔ ابوسفیان کلبی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہتا ہے :

ابونا رسول اللہ وابن خلیلہ
بعربۃ بوانا فنعم المراکب

اب سوال یہ ہے کہ اس ملک کا نام عربہ کیوں قرار پایا۔ اصل یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عربہ صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ عبرانی میں عربامہ بیابان اور میدان کو کہتے ہیں۔ اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں۔ عرابۃ کے معنے بدویت کے ہیں اور اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں لفظ عرب ملک عرب کے لیے کہیں نہیں آیا۔ حضرت اسماعیل کی سکونت کے ذکر میں واد غیر ذی زرع ناقابل کاشت وادی آیا ہے۔ اکثر لوگ اس نام کو عرب کی طبعی حالت کا بیان سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ عرب کا بعینہٖ ترجمہ ہے چونکہ اس عہد میں اس غیر آباد ملک کا کوئی نام نہ تھا اس لیے خود لفظ غیر آباد ملک اس کا نام

پڑ گیا۔ [1]

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اگر یہ سچ ہے تو ماننا پڑے گا کہ عبادت گاہوں میں سب سے قدیم خانہ کعبہ ہے اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ سترہ میں البیت العتیق کے تحت آئے گی۔

مکہ کی لغوی تحقیق

آیت میں جہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ عبادت گاہوں میں سب سے پہلا گھر خانہ کعبہ ہے وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پہلا گھر مکہ میں ہے۔ قرآن میں مکہ کی جگہ بکہ آیا ہے۔ عربی زبان میں میم کو با سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیکن قدیم زمانے کے بعض محققین کی رائے میں لفظ بکہ بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنے گھر کے ہیں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی۔ یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داؤد کی زبور میں آیا ہے جسے یہود نے بگاڑ کر بکہ کی بجائے بکاء بنا دیا اور اس کو مصدر بنا کر اس کا ترجمہ رونا کر دیا۔ اس آیت میں قرآن نے مکہ کو بکہ کہہ کر مکہ کے اس قدیم نام کی یاد دہانی کر دی جو تورات میں موجود تھا۔

نیز قدیم شامی زبان میں بک کے معنے آبادی یا شہر کے ہیں جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل دیوتا کا شہر) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے۔

بکہ کا جغرافیائی مقام

بکہ یا مکہ جس کا تیسرا نام ام القریٰ ہے عرب میں حجاز کا دارالحکومت ہے۔ یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر کی بنا، ایک نوجوان پیغمبر کی ہجرت گاہ اور ایک یتیم پیغمبر کا مولد ہے۔ یہ شہر عرض البلد

---

[1] ارض القرآن

۲۱ درجہ ۳۸ دقیقہ اور طول البلد ۴۰ درجہ ۹ دقیقہ پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۲۳۰ میٹر بلند ہے۔ چاروں طرف پہاڑوں نے قدرتی دیوار یں کھینچ دی ہیں۔ بالفعل شرقاً وغرباً تقریباً ۲۰ کیلو میٹر لمبا اور جنوباً وشمالاً تقریباً ڈیڑھ کیلو میٹر چوڑا ہے۔
حضرت مسیح سے اڑھائی ہزار برس پہلے یہ کاروانِ تجارت کی ایک منزل گاہ تھی دو ہزار سال قبل مسیح حضرت ابراہیم نے اپنے فرزندِ عزیز حضرت اسماعیل کو یہاں آباد کیا۔ باپ بیٹے نے خدا کے نام پر یہاں ایک قربان گاہ بنائی۔ فرزندانِ اسمٰعیل کی اولاد ایک مدت تک یہاں دیگر قبائل پر بالادست رہی۔ اس کے بعد قحطانی قبائل آتے اور انہوں نے استیلا حاصل کیا۔ بنو اسماعیل میں سے آخر قصی نے یہاں کی ریاست حاصل کی۔ قصی قریش کا پدر اعلیٰ تھا۔ آخر زمانے میں یہاں کے مالک قریش تھے۔ [1]

خانہ کعبہ برکتوں کا خزانہ ہے

۱۷۳۔ یہ سراپا برکت ہے۔ حق تعالیٰ نے شروع سے اس گھر کو ظاہری و باطنی، حسی و معنوی برکات سے معمور کیا اور سارے جہان کی ہدایت کا سرچشمہ بنایا۔ روئے زمین پر جس کسی مکان میں برکت وہدایت پائی جاتی ہے اسی برگزیدہ گھر کا ایک پرتو اور عکس سمجھنا چاہیے۔ یہیں سے رسُول الثقلین کو اٹھایا مناسکِ حج ادا کرنے کے لیے سارے جہان کو اسی کی طرف دعوت دی۔ عالمگیر مذہب اسلام کے پیروؤں کو مشرق ومغرب میں اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اس کے طواف کرنے والوں پر عجیب وغریب برکات والوار کا فیضان فرمایا۔ انبیاء سابقین بھی حج ادا کرنے کے لیے نہایت شوق وذوق سے تلبیہ پکارتے ہوئے اسی شمع کے پروانے تھے۔ [2]

بیت اللہ اور البیت المقدس کا تقابلی مطالعہ

برکات کی جو تصویر یہاں شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے وہ عام مفسرین کی ترجمانی ہے لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نے جو خانہ کعبہ اور مسجد اقصیٰ کا تقابلی مطالعہ عارفانہ اور متکلمانہ انداز میں

---

[1] ارض القرآن [2] افاداتِ شیخ الاسلام

پیش فرمایا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ مولانا نے اولاً سمجھایا ہے کہ اللہ سبحانہ کی معبودیت بیک وقت دو شانوں میں جلوہ گر ہے۔ ایک شانِ محبوبیت دوسرے شانِ حاکمیت۔ یہ دو معبد یعنی خانہ کعبہ اور بیت المقدس اللہ سبحانہ کی ان دو شانوں کے مظہر ہیں۔ خانہ کعبہ اللہ کی شانِ محبوبیت کا اور بیت المقدس اللہ کی شانِ حاکمیت کا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شرح اس مدعا کی یہ ہے کہ جب بیت المقدس تجلی گاہ مرتبہ حکومت اور خانہ کعبہ تجلی گاہ مرتبہ محبوبیت ہے تو بیت المقدس کی حیثیت ایک کچہری اور بادشاہ کے دیوان عام کی ہوتی اور خانہ کعبہ بمنزلہ محل سرائے شاہی بلکہ بمنزلہ جلوہ گاہ محبوب ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ کچہری یا دیوان عام صرف مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا قیام و بقا عمائدِ رعیت کی طاعت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر عمائدِ رعیت سرکش ہو جائیں تو پھر دیوان عام بیکار ہو جاتا ہے اور اس دور میں اس کی بربادی تعجب خیز نہیں۔ اس کے برعکس دیوان خاص اور محل سرائے شاہی چونکہ شب و روز رہنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی نگرانی ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کوئی مسمار نہ کر سکا اور بیت المقدس بوجہ سرکشی بنی اسرائیل جو اپنے زمانہ میں بمنزلہ عمائدِ رعیت تھے بیکار ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں وہ باغیوں اور نافرمانوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ اور پھر حاکمیت کا حاصل ہی تغیر و تبدیلی ہے عزل و نصب ملازمین اور مہمات کی انجام دہی کے لیے تعمیر و تخریب ہو۔ بیت المقدس مظہرِ حاکمیت ہونے کی وجہ سے تغیر و تبدیلی کا بھی مظہر ہے اس لیے اگر وہاں آبادی کی جگہ ویرانی اور ویرانی کی جگہ آبادی ہوتی رہی ہے تو خلافِ عقل نہیں کیونکہ جس چیز میں خاصیت تغیر و تبدیلی ہوتی ہے وہاں تغیر و تبدل ہونا ہی ہے اور تاثیر محبوب یہ ہے کہ ہجوم خلائق اور ہنگامہ اجتماع ہو۔ اگر ویرانہ میں بیٹھ جاتے تو ہر خاص و عام پروانہ وار اسی جگہ قربان ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کے اردگرد ایسا ملک رکھا جو وادِ غیر ذی زرع ہے تاکہ ہر شخص سمجھ لے کہ واقعی یہاں کوئی ایسا دلبر اور محبوب جلوہ افروز ہے جس کے جمال عالم فریب کا ایک عالم دیوانہ ہے یہ ہفت اقلیم کے آدمیوں کی آمد جس میں خانہ کعبہ تمام عالم کے مقامات مقدسہ اور مشاہدِ متبرکہ اور زیارت گاہ ہائے معظمہ سے بالبداہت بالاتفاق ممتاز ہے۔ یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہاں جلوۂ محبوب حقیقی ہے۔ علاوہ ازیں حکومت خود منجملہ آثار محبوبیت ہے کیونکہ مرتبہ وجود جو دراصل صادر اول اور مصداق اسم مالک اور حاکم ہے اس تجلی اول کا رہینِ منت ہے جو

بوجہ اجتماع جملہ محاسن اسم جمیل کا مصداق ہے اس لیے مرتبہ حکومت میں جو کچھ ہوگا وہ مرتبہ محبوبیت کا عکس اور پرتو ہوگا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ برکات کا خانہ کعبہ سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے اور بیت المقدس سے اگر برکات جدا ہو جائیں تو قابل تعجب نہیں ہے غالباً اسی لیے یہاں کعبہ کے بارے میں مبارکاً کی تعبیر آئی ہے اور بیت المقدس کے لیے بارکنا حولہٗ فرمایا ہے۔ لفظ مبارک صیغہ صفت ہونے کی وجہ سے برکت کے دوام کو بتلاتا ہے اور بارکنا فعل ہونے کی وجہ سے برکت کے حدوث کو ظاہر کر رہا ہے اس لیے خانہ کعبہ سے برکتوں کا جدا ہونا کبھی ممکن نہیں جب کہ بیت المقدس سے ممکن ہے اور چونکہ خانہ کعبہ سے برکات کا علیحدہ ہونا ممکن نہیں اور بیت المقدس سے ممکن ہے اس لیے بیت المقدس کا بے دینوں سے مسمار ہو جانا اور خانہ کعبہ کا مسمار نہ ہونا بعید از عقل نہیں ہے مگر چونکہ برکات کا یہ ارتباط مرتبہ محبوبیت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے لفظ مبارک لا کر اشارہ کر دیا کہ اس کی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہوگی۔ گویا جیسے بیت المقدس قبلہ ایک وقت کے لیے تھا اور بالآخر اس کی برکت ایک وقت منقطع ہونے والی تھی یہ صورت اس پاک گھر خانہ کعبہ کی نہ ہوگی۔

خانہ کعبہ کی تباہی پورے عالم کی تباہی ہوگی

ہاں جب بھی محبوبانہ تجلی کبھی غضب کی تجلی کا لبادہ پہن لے گی تو پھر بجائے محبت خوف اور بجائے اجتماع انتشار کی حالت ناگزیر ہوگی یعنی جس وقت صفت غضب کی تجلی کا ظہور ہوگا تو وہ وقت پورے عالم کی تباہی کا ہوگا کیونکہ جیسے خانہ کعبہ وقت ظہور آثار محبوبیت و رحمت مظہرِ اوّل تھا ایسے ہی وقت ظہور آثار غضب و جلال بھی یہی مظہرِ اوّل ہوگا اس لیے خانہ کعبہ جیسے بوقتِ ظہور آثار محبوبیت مظہرِ اوّل رہا ایسے ہی بوقت ظہور آثار جلال و غضب بھی یہی مظہر اوّل ہوگا اور خانہ کعبہ کی ویرانی سے ہی کائنات کی ویرانی کا آغاز ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بادشاہی مکانات آبادی اور بربادی میں اوروں کے مکانات کی نسبت اوّل رہتے ہیں۔ یعنی جب دار الخلافہ آباد کیا جاتا ہے تو پہلے محلات شاہی اور گورنمنٹ ہاؤس کے لیے زمین اور میدان مقرر کر کے تعمیر کا آغاز کیا جاتا ہے اور جب دار الحکومت کا انتقال عمل میں آتا ہے تو پھر بھی پہلے شاہی محلات کو اٹھایا جاتا ہے۔ بعد ازیں دوسرے شہریوں کا نمبر آتا ہے، ٹھیک اسی طرح عالم اجسام میں خانہ کعبہ بمنزلہ مکان شاہی ہے کیونکہ یہ تجلی گاہ ربانی اور آئینہ جمال یزدانی

ہے اس لیے بننے میں بھی خانہ کعبہ اوّل رہا اور ویرانی عالم کے وقت بھی اسی کو اوّل رکھیں گے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت ان اوّل بیت وضع للناس اس کی اوّلیت کو بتارہی ہے ایسے ہی قرآن کی دوسری آیت جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس (اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے) یہ بتارہی ہے کہ جب تک یہ گھر یعنی خانہ کعبہ موجود ہے لوگ بھی اس عالم میں قائم ہیں۔ جس روز یہ گھر ویران ہوگا سمجھو کہ پورا عالم ویران ہو جائے گا۔

ہدایت و رحمت کا اجتماع

۱۷۴۔ اور تمام انسانوں کے لیے چشمۂ ہدایت ہے۔ ہدایت کے معنے رہنمائی کرنے، راہ دکھانے اور راہ پر لگا دینے کے ہیں۔ یعنی خانہ کعبہ لوگوں کو قبلہ عبادت کی راہ بتانا ہے گویا یہ خانہ ہدایت ہے اس لیے قبلہ عبادت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ اگر عالمین کے لیے ظہور ہدایت کا ذریعہ ہے تو حضور انور کی ذات گرامی عالمین کے لیے ظہور رحمت کا ذریعہ ہے ہدایت اور رحمت ہی عرفان حق کے وسائل ہیں ایسے لوگوں کے لیے حق شناسی کی کوئی راہ نہیں جو ہدایت و رحمت دونوں سے محروم ہوں۔ قرآن نے ایمان کی زندگی کے لیے ان دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

فقد جاءکم بینۃ من ربکم و ھدی و رحمۃ

تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل اور ہدایت و رحمت آچکی

ایک دوسرے موقعہ پر ہے:

ھذا بصائر من ربکم و ھدی و رحمۃ لقوم یومنون

قرآن تمہارے رب کی جانب سے سرمایہ دلائل اور ان سب کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت و رحمت ہے۔

ایک موقعہ پر قرآن کو ھدیً للناس فرمایا ہے اور ایک جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کہا ہے۔ زندگی کا سیدھا راستہ مل جانا اور اخلاقی و روحانی زندگی میں حسن و جمال اور نورانیت کا ظہور بھی نبوّت کا مقصد ہے۔ خانہ کعبہ چونکہ ھدیً للعالمین ہے اور حضور انور رحمۃ للعالمین ہیں اس لیے ان دونوں میں ایسا ہی معنوی ربط ہے جیسے قرآن اور حضور انور کی ذات گرامی میں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے خانہ کعبہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے

باہمی ربط کو عارفانہ انداز میں جس خوبصورتی کے ساتھ پیش فرمایا ہے وہ گوش گزار فرمالیجئے ۔
دیوان عام اور کچہری تک تو ہر شخص کی رسائی ہو سکتی ہے لیکن دیوان خاص، محل سرائے شاہی اور عشرت کدہ محبوب تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حبیب رب العالمین اور خاتم النبیین ہیں اس لیے بالاصالت خانہ کعبہ کو آپ کا قبلہ بنایا گیا ہے ۔
شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ اس کی توجیہہ عقلی کیا ہے کہ خانہ کعبہ حضور انور کی حاضری کے لیے بنا ہے ۔ آپ سے پہلے جو بھی آیا وہ اپنے شوق سے آیا حسب الطلب نہیں آیا ۔
تو اس کا جواب یہ ہے کہ معبود کو عابد چاہیے لیکن جتنا ادھر کمال ہو گا اسی قدر اس طرف بھی کمال مطلوب ہو گا ۔ عبودیت کے لیے کمال علمی اور کمال عملی کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے پرندے کو اڑنے کے لیے دونوں پروں کی ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عبودیت نام ہے دلی خشوع وخضوع کے ساتھ ظاہر و باطن کی انقیاد کا اس لیے اولاً عابد کے لیے اللہ سبحانہٗ کے جلال و جمال کا علم ضروری ہے ۔ کیونکہ بغیر علم ظاہر و باطن کا انقیاد ممکن ہی نہیں ۔
ثانیاً اسے اخلاق حمیدہ کے حسن سے مالامال ہونا ضروری ہے ۔ کیونکہ اس کے بغیر طاعت و انقیاد ہو ہی نہیں سکتی ۔ لہذا جیسے عبودیت کے لیے علم کی ضرورت ہے ایسے ہی کمال کے لیے اخلاق حمیدہ کی حاجت ہے ۔
علم کا تو اس سے اونچے تصور نہیں ہو سکتا کہ عابد خود خاتم صفات حاکمہ سے براہ راست مستفید ہو یعنی درگاہ علمی خداوندی کا تربیت یافتہ ہو اسی کو ہم خاتم النبیین کہتے ہیں اور خاتم ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ علم خداوندی سے براہ راست استفادہ کرتا ہے اور علم پر صفات حاکمہ ختم ہو جاتی ہیں ۔ الغرض جیسے تجلی گاہ محبوبیت مرتبہ میں تجلی گاہ حکومت سے اوّل ہے ایسے ہی قبلہ اوّل کے استقبال کے لیے بھی اوّل ہی درجہ کا نبی ہونا چاہیے اور ایسا نبی سوائے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ، بلاشبہ جس گھر کو ہدی للعالمین ہونا ہے اس کے استقبال کے لیے بھی رحمۃ للعالمین ہونا چاہیے ۔

نبوت اللہ سبحانہٗ کی سفارت ہے

دراصل قافلہ نبوت ایک قافلہ سفارت ہے اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو رسول کہتے

ہیں۔ اگر نبوت سفارتِ خداوندی کا نام ہے اور انبیاءً کی حیثیت سفارتی قافلہ کی ہے تو ضروری ہے کہ اس قافلہ میں کوئی سالار بھی ہو۔ نیز نبوت اور سفارت خود ایک وصف ہے اور اوصاف دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ کہ جو وصف نبوت وصف کے حق میں خانہ زاد ہو۔ دوسرے وہ جو موصوف کے حق میں عطاءِ غیر ہو۔ ظاہر ہے کہ وصفِ نبوت میں موصوف بالذات صرف وہ ہوگا جو سب کا خاتم ہوا اور جس کی براہِ راست درگاہِ علمی خداوندی نے تربیت کی ہو اور یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے نبی میں نہیں ہے۔ الغرض مرتبہ محبوبیت درگاہ وجوب کا محبوب کہی ہوگا جو عالم امکان میں اسی طرح مرجع و مآب ہو جیسے عالم وجوب میں یعنی تجلیات ربانی اور صفاتِ یزدانی میں وہ تجلی اول تمام تجلیات کی اصل اور مصدر رہے ایسے ہی عالمِ امکان میں کمالات کے لیے اصل اور مصدر ہو۔ ایسی ذات گرامی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مخلوقات میں اور کون ہے۔ علم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اول ہونا اور جملہ انبیاء کے علوم کا مرجع اور مآب ہونا تو خاتم النبیین سے واضح ہے اس لیے عالمِ امکان میں کمالات علمی ہوں یا کمالات عملی دونوں میں حضور انور کی ذاتِ گرامی پوری کائنات میں اصل اور مصدر ہے یعنی دونوں کمال آپ کی ذات میں بدرجہ کمال موجود ہیں اور جب دونوں کمالات کا آپ کی ذات مرکز ہے تو ظاہر ہے کہ کمال علمی میں اللہ کے جلال و جمال سے آپ کی ذات بدرجہ کمال متاثر ہو گی۔ علم جمال کی تاثیر محبت اور علم جلال کی تاثیر خوف ہے اور ظاہر ہے تاثیر علمی اور تاثیر عملی میں کمال ہوگا تو کمال درجہ کی محبت اور درجہ کمال کا خوف بھی ہوگا اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے حضور میں کمال درجہ کا عجز و نیاز اور تذلل ہوگا۔ اسی کا نام کمالِ عبدیت ہے اور اس کے ساتھ کمال علم کی وجہ سے کمالِ انقیاد اور کمال درجہ کی طاعت ہو گی، اسی کا نام کمال عبودیت ہے اِدھر کمالِ عبدیت ہے اُدھر کمال معبودیت ہے۔ وہاں اگر جمال ہے تو یہاں محبت ہے وہاں اگر استغنا ہے تو یہاں خوف ہے۔ الغرض چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ محبوبیت کے محبوب ہیں اس لیے خانہ کعبہ ان کے لیے مخصوص ہے۔ اس طرح ہُدی للعالمین کے لیے رحمۃ للعالمین ہی مہمانِ خصوصی ہیں۔

آیات بینات کی تشریح

۱۷۵۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں۔ اس میں مقامِ ابراہیم ہے۔ یعنی طرح طرح کی ظاہر باہر

نشانیاں قدرت نے بیت اللہ کی برکت سے اس سرزمین میں رکھ دی ہیں۔ اسی لیے ہر زمانہ میں مختلف مذاہب ملل اس کی غیر معمولی تعظیم کرتے رہے اور ہمیشہ وہاں داخل ہونے والوں کو مامون سمجھا گیا اس کے پاس مقام ابراہیم کی موجودگی پتہ دے رہی ہے کہ یہاں ابراہیم کے قدم آئے ہیں۔ اور اس کی تاریخ جو تمام عرب کے نزدیک بلانکیر مسلم چلی آرہی ہے بتلاتی ہے کہ یہ وہ پتھر ہے کہ جس پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا تھا۔ اور اللہ کی قدرت سے اس پتھر میں ابراہیم کے قدم کا نشان پڑ گیا تھا جو آج تک محفوظ ہے۔ گویا علاوہ تاریخی روایات کے اس مقدس پتھر کا وجود اس بات کی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ گھر طوفان نوح کی تباہی کے بعد حضرت ابراہیم کے ہاتھوں سے تعمیر ہوا۔ جن کی مدد کے لیے حضرت اسماعیل شریک ہوتے۔ جیساکہ پارہ اوّل کے آخر میں گزر چکا ہے۔[1]

آیات بینات اور مقام ابراہیم بول کر اسلام کی پوری روحانی تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلے عام نشانیوں کا اجمالاً ذکر کیا پھر مقام ابراہیم کے لفظ سے خاص نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے آدم سے لے کر ابراہیم تک اور ابراہیم سے محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدم نے سکونت اختیار کی اور عرش کے سائے میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حوا نے آکر آن سے ملاقات کی، یہیں نوح کی کشتی نے آکر دم لیا۔ حضرت ہود اور حضرت صالح نے یہاں پناہ لی، حضرت ابراہیم نے یہاں ہجرت کی، حضرت اسماعیل نے یہاں سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ نے یہاں ولادت پائی یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اپنے گدھے چھوڑ کر اترے۔ یہیں وہ دوسری پہاڑی (مروہ) ہے جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی چاہی۔ یہیں وہ چشمہ زمزم ہے جو حضرت ہاجرہ کو پیاس کے موقعہ پر نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہوکر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام اور عرفات ہیں جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ حجر اسود ہے جو ابراہیم و اسماعیل کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ملت ابراہیم کی بنیاد پڑی۔ قرآن نے ان ہی مناظر اور مشاہد کی طرف اس فقرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں اشارہ کیا ہے فیہ آیات بینات یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامتیں پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے۔ اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرمایا ہے۔ لق ودق بیابان میں بنایا گیا۔ اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا۔ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کے سبب سے سارا ملک عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا۔ مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطراف کعبہ ہی کا ایک خطہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا بلکہ اسی کعبہ کی برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک کو اس کی بدولت امن میسر آجاتا تھا۔ پھر اسی نصف صدی سے پہلے ہی سب دیکھ چکے تھے کہ ابرہہ نے جب کعبہ کی تخریب کے لیے مکہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کس طرح قہر الٰہی کا شکار ہوئی۔ اس واقعہ سے اس وقت عرب کا بچہ بچہ واقف تھا اور اس کے چشم دید گواہ ان آیات کے نزول کے وقت موجود تھے[1] یہ بھی صحیح ہے لیکن امام رازی کی رائے میں آیات بینات سے شعائر حج مراد ہیں جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں۔ فی الواقع ان مشاہد اور مشاعر میں جب کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں جھک جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔ اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے۔ اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کے رگ رگ اور ریشے ریشے میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔

خانہ کعبہ میں پہلی آیت بینہ

مقام ابراہیم سے آیات بینات کی تفصیل شروع ہوتی ہے یعنی پہلی نشانی مقام ابراہیم ہے۔ آیت میں خانہ کعبہ میں مقام ابراہیم کے ہونے کو ایک کھلا نشان بتایا ہے۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور مراسم حج کے ساتھ نامعلوم زمانہ سے حضرت ابراہیم کا نام چلا آرہا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

اگر واقعی حضرت ابراہیم یہاں تشریف نہ لاتے ہوتے تو مشرکین عرب کو کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ ایک شخص کا تعلق اس گھر سے قائم کریں جو علی الاعلان مشرکانہ اعمال کا باغی اور بت شکن تھا۔ اور اس میں ایک مقام ابراہیم قائم کرکے اس کے مراسم حج کو ان کی طرف منسوب کریں۔

اصل بات یہ ہے کہ بعض باتیں جن کی شہادت زبانی روایات میں پوری نہیں رہ سکتی ہے ان کی شہادت ایک قومی تعامل میں رہ جاتی ہے اور تعامل کی شہادت یقیناً روایتی شہادت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ ایسی ہی ایک شہادت خانہ کعبہ کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کے تعلق میں موجود ہے۔ یہ آج بھی اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے کافی ہے کہ جس بیت اللہ یا بیت ایل کا ذکر بائیبل میں ہے وہ فی الواقع خانہ کعبہ ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہی ایک گھر ہے جس کا نام بیت اللہ ہے۔

مقام ابراہیم کے بارے میں علماء نے دو رائیں اختیار کی ہیں۔ ایک راہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ دوسری راہ یہ ہے کہ اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ ہمارے نزدیک موقع محل اور تاریخیت کے لحاظ سے پہلی راہ زیادہ صحیح ہے۔ اس میں خاص اہمیت کی بات یہ ہے کہ نظم کلام کے اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرتی ہے جس کے لیے یہ بات کہی گئی ہے۔ یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ خانہ کعبہ بنائے ابراہیم ہے اور یہی گھر تمام لوگوں کے لیے حضرت ابراہیم نے بطور عبادت گاہ بنایا ہے۔ یہودی مدعی تھے کہ اصل ملت ابراہیم پر وہ ہیں۔ قرآن نے جواب میں کہا ہے کہ خدا کی پہلی عبادت گاہ جو حضرت ابراہیم نے تعمیر کی وہ بیت المقدس نہیں بلکہ خانہ کعبہ ہے۔

دوسری آیت بینہ خانہ کعبہ کی حرمت

۱۷۶۔ جو شخص اس میں داخل ہو گیا مامون و محفوظ ہو گیا۔ اس آیت کے ذریعے یہ نشاندہی کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ بنانے کے بعد اس جگہ کے لیے امن کی جو دعا کی تھی وہ اللہ نے قبول فرمائی تھی۔ چنانچہ یہ علاقہ اس دعا کی قبولیت کا مظہر ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس شہر کے لیے دعا کی تھی رب اجعل هذا البلد آمنا" اے میرے پروردگار اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے۔

جس وقت انہوں نے یہ دُعا کی تھی، تمام دُنیا فتنہ و فساد کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، دُنیا کا امن و امان اٹھ گیا تھا، اطمینان و سکون کی نیند آنکھوں سے اُڑ گئی تھی، دُنیا کی عزت و آبرو معرضِ خطر میں تھی۔ جان و مال کا تحفظ ناممکن ہو گیا تھا۔ کمزور اور ضعیف لوگوں کے حقوق پامال کر دیے گئے تھے، عدالت کا گھر ویران تھا، حریتِ انسان مفقود تھی اور سکون کی مظلومیت انتہائی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ کرۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ظلم و کفر کی تاریکی سے ظلمت کدہ نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے آباد دُنیا کے ناپاک حصوں سے کنارہ کش ہو کر ایک " وادی غیر ذی زرع " میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک دارِ امن بنایا اور تمام دُنیا کو صلح و سلام کی دعوتِ عام دی۔

یہ اس دُعا کی برکت ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔

آیت میں بیت سے مراد خانہ کعبہ ہی نہیں بلکہ سارا حرم شریف ہے۔ مقامِ ابراہیم کے نام سے جو پتھر رکھا ہے وہ خانہ کعبہ کے اندر نہیں باہر ہے۔ الجصاص نے درست لکھا ہے کہ بیت سے مراد یہاں حرم ہے کیونکہ جن آیات کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ حرم کے علاقہ میں ہیں حضرت ابراہیم کی دُعا کے صدقے اس شہر کا امن ہونا خود ایک دلیل ہے حضرت ابراہیم کے آباد ہونے کی۔ حضرت ابراہیم کی دُعا کو اللہ نے ایسا شرفِ قبول بخشا کہ حرم کا پورا علاقہ ہمیشہ کے لیے امن گاہ بن گیا۔ جاہلیت کے تاریک دور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دُشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے لیکن ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اسلام نے بھی اس مقام کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ من دخلہ کان اٰمنًا۔

فتح مکہ سے دوسرے روز بنو خزاعہ نے ہذیل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ فرمایا۔ لوگو! اللہ تعالیٰ نے جس روز زمین و آسمان پیدا کیے اسی روز مکہ کو مقامِ حرمت قرار دیا۔ یہ اس وقت سے برابر چلا آ رہا ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا۔ جو بھی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لیے جائز نہیں کہ مکہ میں کسی کا خون بہائے یا یہاں سے کوئی درخت کاٹے۔ مجھ سے پہلے کسی شخص کے لیے مکہ حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد آنے والے کسی شخص کے لیے حلال ہو گا۔ میرے لیے بھی صرف وقتی طور پر اس لیے حلال ہوا ہے کہ اہلِ مکہ پر اظہارِ غضب مقصود تھا۔ سُن لو! اس وقت کے بعد حرمت کل کی طرح لوٹ آئی جو بھی یہاں موجود ہے اور میری بات سُن رہا ہے اسے چاہیے کہ یہ حقیقت ان لوگوں تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

ایک خلش اور اس کا ازالہ

یہاں یہ خلش چنداں وقیع نہیں ہے کہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ تلوار سے فتح کیا اور اس میں خانہ کعبہ کا امن گاہ ہونا برقرار نہ رہ سکا۔ کیونکہ

اسلامی لشکر ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ ۱۱ فروری ۶۳۰ء کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ لشکر منزل مقصود کی طرف کوچ کرے اور روانگی سے پہلے اعلان کردیا، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے اسے امن ہے اور جو مسجد حرام میں چلا جائے اسے امن ہے۔ لشکر جا رہا تھا اور ہر جیش اپنے خاص پرچم کے ساتھ گزر رہا تھا۔ ابوسفیان یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ انصار کا جیش جس کی سالاری کا پرچم سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا آیا۔ سعد بن عبادہ کی نظر ابوسفیان پر پڑی تو دیکھتے ہی پکار کر کہا

الیوم یوم الملحمۃ	آج گھمسان کا دن ہے
الیوم تستحل الکعبۃ	آج کعبہ حلال کردیا جائے گا

یہ محض ایک گونہ تعریض تھی، جس سے ایک پرجوش مجاہد حق قدیم دشمن کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو فرمایا:

> سعد نے غلط کہا یہ ایسا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ کعبہ کی عظمت بڑھائے اور کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا۔[1]

یہ بھی مذکور ہے کہ علم سعد سے لے کر ان کے فرزند قیس کے حوالہ کردیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "کدا" کی طرف سے مکہ میں داخل ہوئے۔ یہ اس ٹیلے کا نام ہے جو شہر کے بالائی حصے میں یعنی شمالی جانب ہے۔ اسی طرف جنت معلی ہے جو کہ مکرمہ کا مشہور قبرستان ہے، وہیں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا۔ زبیر بن العوام کو حکم ہوا کہ وہ اس راستہ سے آگے بڑھیں جو وادی فاطمہ سے آتا ہے اور شہر مکہ کی مغربی جانب واقع ہے۔ اسی راستہ میں جدہ کا راستہ مل گیا ہے پھر جنوبی و مغربی گوشہ سے یہ شہر کے

---

[1] بخاری کتاب المغازی

اندر داخل ہو جاتا ہے، اسعد بن عبادہ والا لشکر اسی راستہ سے کدا کی طرف مڑا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ خالد بن ولید کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ وہ مسفلہ یعنی مکہ مکرمہ کے زیریں حصہ سے جو جنوبی جانب تھا، شہر میں داخل ہوں، مکہ مکرمہ اور حوالی کے نقشہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس طرح شہر میں آنے والے تمام راستوں پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ خونریزی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اور احترام کعبہ ہاتھ سے نہ جائے اس لیے یہ سوچنا غلط ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی حرمت کے خلاف کچھ بھی کیا ہے۔

حرم پاک کا دائرۂ امن

حرم پاک کی یہ حرمت قانونی ہے کیونکہ علماء نے اسے صرف خبر کے درجے میں نہیں بلکہ حکم کے درجے میں رکھ کر یہ "قانون" نکالا ہے کہ خونی اور قاتل بھی اگر خانہ کعبہ کے اندر پناہ گزین ہو جائے تو اسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حالات ایسے پیدا کیے جائیں گے کہ وہ حرم کے علاقہ سے نکلے۔ ہاں اگر کوئی شخص حرم ہی میں ارتکاب جرم کرے تو پھر اسے حرم ہی میں سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ ان کے صاحبین امام زفر، حسن بن زیاد کی رائے ہے اور یہی صحابہ میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبیداللہ بن عمیر اور تابعین میں سعید بن جبیر، عطا اور طاؤس اور امام شعبی کا موقف ہے لیکن امام شافعی اور امام مالک اس موضوع پر ان بزرگوں کے ہمنوا نہیں ہیں۔ الجصاص نے اول الذکر کی اور قرطبی نے آخر الذکر کو تفصیلاً بیان کیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس قانونی حرمت پر سب متفق ہیں کہ نہ وہاں جنگ کی جائے نہ اس کی جھاڑیاں کاٹی جائیں نہ اس کے درخت قطع کیے جائیں نہ وہاں گری ہوئی چیز اٹھائی جائے الا یہ کہ اٹھا کر اصل مالک کو پہنچانا مقصود ہو۔ ان حدود کے اندر جانوروں کا شکار نہیں کیا جا سکتا۔

حج ہمیشہ ہوتا رہے گا

۱۷۷۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے۔ فعلی پیمانہ چھوڑ کر اسمی پیمانہ اختیار کر کے اشارہ کیا ہے کہ بیت اللہ کا حج کوئی وقتی اور ہنگامی حادثہ نہیں بلکہ یہ تا قیام قیامت ہوتا رہے گا کیونکہ جملہ اسمیہ دوام اور ثبوت کے لیے ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ بیت اللہ ہمیشہ قائم رہے گا اور لوگ ہمیشہ

حج کرتے رہیں گے۔ مولانا محمد قاسم نے قبلہ نما میں بیت المقدس اور بیت اللہ کے تقابلی مطالعہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اجمالی اشارات ہم پیش کر چکے ہیں۔ دوسری بات اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

جب اُمتِ مسلمہ کا روحانی خاکہ تیار ہو گیا تو حضور انورؐ نے اپنی دعوت کی طرح اسے بھی منظرِ عام پر نمایاں کرنا چاہا۔ اس غرض سے آپ نے عمرہ کی تیاری کی اور چودہ پندرہ سو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے کہ پہلی بار اپنے آبائی گھر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر چلے آئیں۔ لیکن یہ کاروانِ ہدایت راستہ ہی میں بمقام حدیبیہ روک دیا گیا۔ دوسرے سال حسبِ شرائطِ صلح زیارتِ کعبہ کی اجازت ملی تو آپ مکہ میں قیام کر کے چلے آئے۔ اب اس مصالحت نے راستہ کے تمام نشیب و فراز ہموار کر دیئے تھے۔ صرف خانہ کعبہ میں پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا اسے بھی فتح مکہ نے ہموار کر دیا۔

اب میدان بالکل صاف تھا۔ راستہ میں ایک کنکری بھی سنگِ راہ نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے گھر کو جس حالت میں چھوڑا تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت میں اس پر قبضہ کر لیا۔ تمام عرب نے فتح مکہ کو اسلام و کفر کا معیارِ صداقت بنایا تھا جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ دُنیا کو اس جدید النشأۃ اُمتِ مسلمہ کے قالبِ روحانی کا منظر عام طور پر دکھایا جاتا۔ اس لیے دوبارہ اسی دعوتِ عامہ کا اعادہ کیا گیا جس کے ذریعے سے حضرت ابراہیمؑ نے تمام عالم میں ایک غلغلہ عام ڈال دیا تھا۔ مگر اس قوت کا فعلی ظہور نبی اُمیؐ پر موقوف تھا۔ اس آیت میں اسی فعلی ظہور کا اعلان ہے و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اُمت کی رائے عامہ میں یہ آیت قرآنی حج کی فرضیت بتا رہی ہے۔ ایک سے زیادہ ارشادِ نبوت میں حج کو اسلام کی عبادات میں چوتھا رکن قرار دیا ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ۳ھ غزوہ احد والے سال میں اسی آیت سے ہوئی ہے۔

اسی آیت میں حج کی فرضیت کے شرائط بتائے گئے ہیں۔ یہاں صرف حج کا ذکر ہے جبکہ البقرہ کی آیت واتموا الحج والعمرۃ للہ میں حج اور عمرہ دونوں کا ذکر ہے۔ وہاں چونکہ حج کی فرضیت بتلانا نہیں ہے بلکہ حج اور عمرے کے بارے میں یہ تعلیم پیش نظر ہے کہ اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کر دے تو اس کا اتمام واجب ہے اور یہاں

اس آیت میں حج کی فرضیت بتلانا مقصود ہے اس لیے خاص طور پر حج کا ذکر کیا ہے ۔
ارشاد میں وللہ کو آغاز میں لا کر بتا دیا گیا کہ حج کا تمام تر مقصد اللہ سبحانہ کی رضا ہے ۔ حج کا پورا عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو ۔ بغیر اخلاص کے عبادت جسم بلا روح کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اہل عرب کے لیے حج عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گیا تھا ۔ ان کے لیے حج کی حیثیت تجارتی میلے کی رہ گئی تھی اور وہ تمام مقاصد مرور زمانہ سے ان کی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے تھے جن کے لیے حضرت ابراہیم نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی ۔ (یہاں للہ کے لفظ سے مسلمانوں کو حج کے اس مقصد کی طرف متوجہ کیا ہے کہ یہ عبادت اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہے نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری سرگرمیوں کے لیے)
یہ واقعہ ہے کہ عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک عبادت گاہ کی ہی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے ، وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا ۔ حج کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا اور اس اجتماع کی بدولت عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا ، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے ۔ شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی ہوتی اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں ۔ یہاں اس آیت میں للہ لا کر خاص طور پر متوجہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں ضمنی ہیں حج کا اصل مقصد اللہ کی رضا اور تقویٰ کی تربیت ہے ۔ یہ بنیادی مقصد ہرگز نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے ۔ مطلب یہ ہے کہ حج کی عبادت اللہ کی خاطر کی جاتے ۔ کاروبار کی خاطر ، اجتماع کی خاطر ، تمدنی روابط کی خاطر اور زبان وادب کی خاطر نہ کی جاتے ۔ یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی ۔ جیسے قرآن نے البقرہ میں اس بات کی تردید کی تھی کہ سفر حج میں کسب معاش سے روحانیت پامال ہوتی ہے ۔ ایسے ہی یہاں اس بات کو سمجھا دیا کہ اصل مقصد سے نظر ہٹا کر کسب معاش ہی کو مقصد قرار دینے سے حج کی روحانیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے اسلام ایک راہ اعتدال ہے نہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ معاش سے ترک تعلق کر لو اور نہ اس کی کہ اللہ سے ترک تعلقات کر کے کاروبار کے ہو کر رہ جاؤ ۔

فرضیتِ حج کی شرائط

ارشاد کے اس ٹکڑے میں فرضیتِ حج کی شرطیں بتائی گئی ہیں من استطاع الیہ سبیلا

جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ استطاعت طوع سے نکلا ہے اس کے معنے بس میں ہونا اور بس میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کام کی ادائیگی کے وسائل پر قابو ہو۔ راہ جن جن ذرائع سے طے کی جاسکتی ہے ان پر قابو ہونا ہی استطاعت ہے صحت اور تندرستی ہونا، راستہ کا محفوظ ہونا، اخراجات کے لیے رقم کا مہیا ہونا، سواری ہونا سب استطاعت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ الغرض اس آیت کی رُو سے حج فرض ہی ان لوگوں پر ہوا ہے جو ہر پہلو سے اس کی استطاعت رکھتے ہیں۔

۱۷۸۔ اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے گا تو یاد رکھو کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اس گھر میں جمالِ خداوندی کی کوئی خاص تجلی ہے، جس کی وجہ سے ادائے حج کے لیے ملے مخصوص کیا گیا ہے کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کی ہر ادا اس جمیل مطلق اور محبوب برحق کے عشق و محبت کے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ پھر ضروری ہے کہ جسے اس کی محبت کا دعویٰ ہو اور بدنی ومالی حیثیت سے بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو کم از کم عمر میں ایک بار دیارِ محبوب میں حاضری دے اور دیوانہ وار وہاں کا چکر لگائے۔ جو مدعی محبت اتنی تکلیف اٹھانے سے بھی انکار کرے سمجھ لو کہ جھوٹا عاشق ہے۔ اختیار ہے جہاں چاہے دھکے کھاتا پھرے خود محروم و مہجور رہے گا۔ اس محبوب کو کسی کی کیا پروا پڑی ہے۔ کوئی یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر اس کا کیا بگڑتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات بھی اگر اس کے حکم کا انکار کر دے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خانہ کعبہ خداوند ذوالجلال کے نور اور جمال کی تجلی کا گھر ہے۔ محبین اور عاشقین کا یہ فرض ہے کہ اس نور السماوات والارض جمیل مطلق اور محبوب حقیقی کے گھر پر عمر بھر میں ایک بار ضرور حاضری دیں۔ اور اس کے در و دیوار کا دیوانہ وار چکر لگائیں اور اس کے آستانہ کو بوسہ دیں۔ جو شخص خدا کی محبت کا دعویٰ کرے اور اس کے گھر کی حاضری کو فرض نہ سمجھے تو وہ جھوٹا مدعی ہے اور محبوب حقیقی کو کیا پروا ہے کہ ایسا شخص یہودی ہو کر مرتا ہے یا عیسائی۔ دونوں مدعی ہیں کہ حضرت ابراہیم ہمارے امام و پیشوا ہیں مگر جس گھر کو حضرت ابراہیم نے بحکم خداوندی حج اور زیارت کے لیے تعمیر کیا اور لوگوں کو اس کی زیارت اور حج کے لیے پکارا اس کا حج نہیں کرتے [2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] معارف قرآن م ا

آیت پر جامع نظر

یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ اگر قرآن اور نبوت محمدیہ کی راہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کی راہ ہے تو کیوں خانہ کعبہ کو بیت المقدس کی جگہ مقرر کیا گیا حالانکہ پچھلے تمام انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ بیت المقدس کو حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار سو سال بعد حضرت سلیمان نے تعمیر کیا اور حضرت سلیمان ہی کے زمانہ میں وہ قبلہ بنا جبکہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا اور وہ حضرت موسیٰ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ نیز حضرت ابراہیم کے بنائے ہوتے میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرمالیا ہے۔ مثلاً۔

پہلی خصوصیت

یہ کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا گھر ہے جو اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا حج فرض ہے یہ بھی اس گھر کی شرافت اور بزرگی کی علامت ہے۔ تمام انبیاء حج کی رسوم عبادت یہاں ادا کرتے رہے اور نہایت شوق و ذوق سے اس کی زیارت کو چل چل کر آتے رہے بیت المقدس کا حج کبھی بھی فرض نہیں ہوا۔

دوسری خصوصیّت

خانہ کعبہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مبارک ہے یعنی خیرات و برکات کا سرچشمہ ہے۔ اگرچہ برکات بیت المقدس میں بھی ہیں مگر دونوں میں فرق ہے۔ برکت خانہ کعبہ کی صفت ذاتی ہے جو کبھی اس سے جُدا نہ ہوگی۔ اور بیت المقدس کے لیے برکت ایک صفت عرضی ہے جس کا جُدا ہوجانا ممکن ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں لفظ مبارک خانہ کعبہ کے متعلق اور بیت المقدس کے متعلق سورۂ اسراء میں لفظ بارکنا کا استعمال بتارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس متعدد بار مخالفوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا لیکن خانہ کعبہ پر کبھی مخالفوں کے ہاتھوں یہ نوبت نہیں آئی اس لیے خانہ کعبہ کی برکات ذاتی ہیں۔

تیسری خصوصیت

یہ ہے کہ خانہ کعبہ خانہ ہدایت ہے ۔ اس سے قبلہ عبادت کی معرفت حاصل ہوتی ہے خانہ کعبہ عالمین کے لیے ظہور ہدایت کا ذریعہ ہے ۔ اسی سمت پر سب نماز ادا کرتے ہیں ، گویا یہ بمنزلہ مرکزی نقطہ کے ہے اور روئے زمین پر تمام نمازیوں کی صفیں بمنزلہ دوائر کے ہیں جو اس مرکز کا احاطہ کیے ہوئے ہیں ۔ خانہ کعبہ کے انوار و برکات اور تجلیات مساجد کی وساطت سے تمام نمازیوں تک پہنچیں گی ۔ اور نماز کی صفوں کو بجلی کی رو کی طرح یکدم منور و روشن کریں گی ۔

چوتھی خصوصیت

یہ ہے کہ فیہ اٰیٰت بینٰت یعنی خود اس گھر میں اس کی حرمت اور عظمت کی ظاہر روشن نشانیاں موجود ہیں ۔ گویا اس کے دامن کے ساتھ روحانی تاریخ وابستہ ہے ۔ آدم سے لے کر حضرت ابراہیم تک اور ابراہیم سے لے کر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق اس مقدس سرزمین کے کوہ و صحرا اور در و دیوار سے ہے ۔ یہیں حضرت آدم نے سکونت اختیار کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا ، یہیں حوا نے آکر دم لیا اور ان سے ملاقات کی ، یہیں نوح کی کشتی آکر رکی ، حضرت ہود اور حضرت صالح نے یہاں پناہ لی ، حضرت ابراہیم نے یہاں ہجرت کی ، حضرت اسماعیل نے یہاں سکونت اختیار کی ۔ یہاں وہ نشانیاں اور شعائر ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص توحید کی نمائندگی کرتی ہیں ۔

پانچویں خصوصیت

یہ ہے کہ یہاں مقام ابراہیم ہے ۔ مقام سے مراد عبداللہ بن عباس ، مجاہد اور عطاء بن ابی رباح کے خیال میں حرم کا پورا علاقہ ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم کے قدم مبارک کا بطور اعجاز نشان پڑ گیا تھا ، اور جس کو بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر آپ نے استعمال کیا ۔

چھٹی خصوصیت

اگرچہ پورا علاقہ حرم امن ہے مگر اس علاقہ کا مامون ہونا بھی بیت اللہ کی برکت ہے

قرآن کی دوسری آیت میں پورے شہر کو بلدِ آمن اور البلد الامین کہا ہے اس لیے حرم کا پورا علاقہ امن گاہ ہے۔ اس میں ہر شخص کو بلکہ ہر جاندار کو مامون ہونا چاہیے۔ کسی کی جان سے اس علاقہ میں کھیلنا دُرست نہیں ہے۔ حرم کا یہ تقدس زمانہ ابراہیم سے آج تک قائم ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاتھ میں ملت ابراہیم کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہ لیتے اور عام جنگ کو حرم میں ناجائز سمجھتے تھے۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ
عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٨﴾ قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

اے پیغمبر! ان اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تمہارے کردار کی ہر کروٹ سے اللہ خوب واقف ہے۹۸۔ اے پیغمبر! کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب یہ تمہارا کیا طرزِ عمل ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ سیدھے راستہ سے ہٹ کر ٹیڑھے راستہ پر پڑ جائیں حالانکہ تم کو ان کا صراطِ مستقیم پر ہونا خوب معلوم ہے۔ یاد رکھو اللہ تمہاری حرکتوں سے غافل نہیں ہے۹۹۔

اہلِ کتاب کو زجر و توبیخ

یہودیوں کے دونوں سوالات کا صاف اور واضح جواب دینے کے بعد ان سے دو سوال کیے گئے ایک یہ کہ جانتے بوجھتے تم نے نبوت کے ساتھ کافرانہ طرزِ عمل کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ دوسرے یہ کہ جو لوگ نبوتِ محمدیہ کو مان چکے ہیں ان کے راستہ میں رکاوٹیں کیوں کھڑی کر رہے ہو؟ ان سوالوں کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اہلِ عرب عام طور پر ناخواندہ لوگ تھے۔ اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا تھا۔ اور انفرادی طور پر ان میں سے ایسے ایسے عالم تھے جن کی شہرت عرب سے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس لیے عربوں پر یہودیوں کی علمیت کا بہت زیادہ رُعب و جلال تھا۔ پھر ان کے علماء نے مذہبی رسُوم کی ظاہری شان جما کر دینداری کے کاروبار کو وسیع سے وسیع تر کر رکھا تھا اور پوری دینی زندگی کو دینداری کا پیشہ بنا رکھا تھا۔ اسی پیشہ ورانہ دینداری کی وجہ سے اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے۔ کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے اور ان کی گڑھیاں تھیں۔ رات دن ان سے ملتے اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن، اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا آوازہ حق بلند کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا تو قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ عرب اہلِ کتاب سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں۔ اور ایک کتاب کو مانتے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ حضور انور جو نبوت کا آوازہ بلند کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں اور ان کی تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ لیکن ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو اپنی پیشہ ورانہ دینداری کی وجہ سے مشکل تھا کہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے لیکن وہ صاف صاف یہ بھی نہ کہتے تھے کہ جس چیز کی آپ دعوت دے رہے ہیں وہ غلط ہے یا توحید، انبیاء، ملائکہ اور آخرت کے بارے میں آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ غلط ہے یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ نہ وہ سچائی کی کھلی تردید کرتے تھے اور نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ ہر سائل کے دل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کی دعوت کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈالتے، کوئی الزام چسپاں

کرتے کوئی ایسا مولویانہ شوشہ چھوڑ دیتے جس سے لوگ شکوک وشبہات میں پڑ جاتے۔ ان کا یہی رویہ پہلے ان دو سوالوں سے ظاہر ہو رہا ہے جو کعبہ کو قبلہ بنانے اور اونٹ کے گوشت کی حرمت کے بارے میں انہوں نے اٹھائے تھے۔ ان دونوں آیتوں میں قرآن ان کے اسی طرزِ عمل پر ان کو ملامت کر رہا ہے کہ حق واضح ہو جانے کے باوجود تمہارا طرزِ عمل بہت ہی عجیب ہے کہ خود بھی قبولِ حق سے محروم ہو اور دوسروں کو بھی راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔ جھوٹے اور فرضی شکوک کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ اسلام صراطِ مستقیم نہیں ہے۔ اللہ تمہاری ان سازشوں سے بے خبر نہیں ہے۔

۱۷۹ ۔ اے پیغمبر ان اہلِ کتاب سے کہہ دو کہ تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ اللہ تمہارے ہر کردار کی ہر کروٹ سے خوب واقف ہے۔ پہلے سے خطاب یہود و نصاریٰ کو کیا جا رہا تھا۔ درمیان میں ان کے کچھ شبہات کا جواب دیا گیا۔ یہاں سے پھر ان کو تنبیہہ و توبیخ کی گئی یعنی حق وصداقت کے واضح دلائل اور قرآن کریم کی ایسی سچی اور پکی باتیں سننے کے باوجود بھی تمہیں کیا ہوا کہ باوجود اہلِ کتاب ہونے کے برابر کلام اللہ اور اس کے لانے والے کے انکار پر تلے ہوتے ہو۔ یاد رکھو کہ تمہاری سب کارروائیاں خدا کے سامنے ہیں تمہاری نیتوں اور تدبیروں کو وہ خوب جانتا ہے، جس وقت پکڑے گا پورا حساب لے کر چھوڑے گا۔[1]

آیت میں اگر آیات اللہ سے قرآن حکیم کی آیات مراد ہیں تو مطلب وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز بتا رہے ہیں۔ اور اگر ان سے تورات و انجیل کی آیات مراد ہیں تو مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کے متعلق جو بشارتیں تورات و انجیل کے ورقوں میں موجود ہیں ان کا خارج میں مصداق ماننے سے کیوں انکاری ہو۔ آپ کی نبوت کا انکار تو خود تورات و انجیل کا انکار ہے اور اگر آیات سے مراد معجزات ہیں تو مطلب یہ ہے کہ جب معجزات سے آپ کی نبوت ثابت ہو چکی ہے تو پھر آپ کی نبوت کا کیوں انکار کرتے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیات سے خانہ کعبہ کا قبلہ ابراہیمی ہونا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ملتِ ابراہیمی پر ہونا مراد ہو تو بات صاف ہے کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بالکل برحق ہے اور کعبہ قبلہ ابراہیمی ہے اور اس کا حج فرض ہے تو پھر اس علم و یقین کے باوجود کفر کی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

راہ کیوں اختیار کرتے ہو۔

زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آیات سے آیات قرآنی مراد ہیں۔ آیات قرآنی ہوں یا آیات تورات و انجیل سب اللہ کی آیات ہیں اور اللہ کی آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی روا کردہ تعلیمات سے جو بات اپنے خیالات یا خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ کا ارشاد ہے، پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی تیسرے یہ کہ ارشاد الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

یہاں لم تکفرون کے بعد واللہ شہید علی ما تعملون فرمایا ہے اور اسی سورت کی آیت ۷۰ میں فرمایا و انتم تشھدون یعنی حالانکہ تم گواہی دیتے ہو دونوں میں جوہری فرق ہے۔ وہاں انداز بیان ناصحانہ ہے اور یہاں انداز بیان میں تنبیہہ اور توبیخ ہے۔ اس لیے نصیحت کے موقعہ پر مشفقانہ بات فرمائی کہ میاں تم تو خود جانتے ہو اور تنبیہہ کے موقعہ پر زاجرانہ انداز میں فرمایا کہ اللہ تمہاری حرکتوں سے خوب واقف ہے یہ تہدید و توبیخ ہے۔ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کا حیرت انگیز اثر اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے ہیں۔ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتب آسمانی کے طرز سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کا انکار مشکل تھا اس لیے وہاں ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ تم خود گواہ ہو اور مشاہدہ کر رہے ہو اس کے باوجود اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہو۔ اور یہاں چونکہ اہل کتاب کے علماء یہ جان چکے تھے کہ حضور وہی نبی ہیں جن کی آمد کا انبیاء سابقین نے وعدہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات حق کی طاقت سے مرعوب ہو کر ان کی زبانیں آپ کی صداقت کا اعتراف کر گزرتی تھیں اس لیے یہاں فرمایا کہ اللہ تمہاری تمام حرکات کو دیکھ رہا ہے وہ جانتا ہے کہ تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

راہِ حق سے ہٹانے پر ملامت

۱۸۰۔ اے پیغمبر کہہ دو! کہ اے اہل کتاب یہ تمہارا کیا طرزِ عمل ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ سیدھے راستہ سے ہٹ کر ٹیڑھے راستہ پر پڑ جائیں حالانکہ تم کو ان کا صراطِ مستقیم پر ہونا خوب معلوم ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تمہاری حرکتوں سے

غافل نہیں ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ خود ایمان کی سعادت سے محروم ہوتے ہو، دوسروں کو بھی چاہتے ہو کہ اللہ کے راستے سے روک دو۔ اور جو سعید روحیں مشرف بایمان ہو چکی ہیں ان کو اسلام کے فرضی عیب بتلا کر دینِ اسلام سے واپس لے آؤ۔ پھر یہ حرکتیں محض جہل و بے خبری سے نہیں کر رہے ہو بلکہ سمجھ بوجھ کر سیدھی باتوں کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ تمہارے اس ہیر پھیر سے اللہ بے خبر نہیں۔ مناسب وقت پر اللہ اکٹھی سزا دے گا۔ لہ

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کا کردار یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں ان کا پیش نہاد صرف یہ ہے کہ اسلام اور نبوتِ محمدیہ میں فرضی شبہات پیدا کر کے اسلام کی ایسی تصویر پیش کی جائے جس سے اس کے محاسن کو بد سے بدتر شکل میں پیش کیا جا سکے اور اسلامی حقائق میں تحریف کی جائے تاکہ اہل ایمان میں اسلام بیزاری کے جراثیم پھیل سکیں اور لوگوں کا یہ ذہن بن سکے کہ اسلام میں انسانی زندگی کے استقبال کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ قرآن نے اسی کو تبغونھا عوجاً سے تعبیر کیا ہے اور مزہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف یہ ساری کارگزاری وہ یہ جانتے ہوئے کرتے ہیں کہ اسلام راہِ حق ہے۔ نادانی سے بیوقوفی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر یہ کام کر رہے ہیں۔ جانکاری اور واقفیت کی اسی حالت کو وانتم شھداء فرمایا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا واللہ شھیدٌ علی ما تعملون اور یہاں فرمایا وما اللہ بغافل عما تعملون دونوں میں باریک فرق ہے پہلی آیت میں ان کے کفر کا ذکر تھا جو ظاہر اور کھلا ہے اور سب کو آنکھوں سے نظر آتا ہے اس لیے فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ کے سامنے ہے اور اللہ دیکھ رہا ہے۔ دوسری آیت میں تدبیروں اور حیلوں کے ذریعے مسلمانوں کو راہِ حق سے ہٹانے کا کردار پیش کیا ہے جو مخفی اور پوشیدہ ہے اس لیے فرمایا کہ اللہ غافل نہیں ہے۔ دونوں جگہ چونکہ کردار مختلف تھا اس لیے الفاظ بھی کردار کے مطابق لائے گئے ہیں۔

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ع ۱

اے اہلِ ایمان! اگر اہلِ کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی اطاعت کرو گے[۱۸۱] تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔[۱۸۲] اور تم راہِ کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیتیں پیش کی جا رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے[۱۸۳]، اور یاد رکھو جو بھی اللہ کا دامن مضبوطی سے تھام لے گا وہ ضرور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے گا۔[۱۸۴]

اہلِ کتاب کی طاعت اور اہلِ ایمان

قرآن حکیم محض کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفہ وعظ و ارشاد نہیں ہے بلکہ کتاب آئین اور

دستورِ حیات بھی ہے۔ پہلی دو آیتوں میں اہلِ کتاب کے کفر اور ان کے اغوا کی داستان بیان کی گئی تھی اب ان دو آیتوں میں پہلی آیت پر تفریع کر کے مسلمانوں کے سامنے مسلمان ہونے کی حیثیت میں ایک منفی اصول پیش کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ چونکہ اہلِ کتاب کا پیش نہاد اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تشکیکی مواد فراہم کر کے اہلِ ایمان کو راہِ حق سے ہٹانا ہے اس لیے مسلمانوں کے ایمان کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں اہلِ کتاب کی طاعت سے دامن بچا کر رہیں۔ کیونکہ ان کا کردار یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی متاعِ ایمان کو تباہ کرنے میں دن رات ایک کر رہے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے طریقِ کار یہ اختیار کیا ہے کہ حضور انور کی نبوت، آپ کی دعوت اور قرآن حکیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تشکیکی سرمایہ جمع کریں۔ نزولِ قرآن کے وقت یہودی دُنیا کے علماء کا یہی حال تھا۔ آج بھی دیکھ لو یہی حال ہے کہ انہوں نے مسلمان نوجوانوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان دانشوروں اور مسلمان رہنماؤں میں اپنے فکری فلسفہ کو اپنے سارے اقتصادی، سیاسی، اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز اس کی مادہ پرستانہ قومیت کو نافذ کرنے کا عزمِ مصمم کر لیا ہے وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس اجتماعی علمی اور ثقافتی ڈھانچہ کے ساتھ مستقل طور پر برسرِ پیکار اور ان معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل، نظامِ تعلیم و تربیت کے ذریعہ اہلِ ایمان کی اس قوتِ ایمانی کو برابر ملیامیٹ کرتے جا رہے ہیں۔ جو نہ کارخانوں اور فیکٹریوں میں ملتی ہے اور نہ پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریروں سے پیدا ہوتی ہے۔

اس آیت کے پس منظر میں شارحینِ قرآن نے جو احوال و واقعات لکھے ہیں ان کا تعلق اس دور سے ہے۔ ضروری نہیں کہ آج کے زمانہ میں اہلِ کتاب مسلمانوں کی متاعِ ایمان پر شب خون مارنے کے لیے وہی اطوار اختیار کریں۔ احوالِ ظروف بدل جانے کے ساتھ حملہ کرنے کے طریقے اور اطوار بھی بدل گئے جیسا کہ مولانا عثمانی نے زمانۂ نبوت کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ —— انصارِ مدینہ کے دو خاندان اوس و خزرج کے باہم اسلام سے پہلے سخت عداوت اور دشمنی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی اور خونریزی کا بازار گرم ہو جاتا تھا جو برسوں تک سرد نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ "بعاث" کی مشہور جنگ ایک سو بیس سال تک رہی۔ آخر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت پر ان کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اور اسلام کی تعلیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے دونوں قبیلوں کو جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے

پیاسے رہتے تھے ملا کر شیر و شکر کر دیا اور نہایت مضبوط برادرانہ تعلقات قائم کر دیے۔ یہود مدینہ کو ان دونوں حریف خاندانوں کا اس طرح مل بیٹھنا اور متفقہ طاقت سے اسلام کی خدمت و حمایت کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ایک اندھے یہودی شماس بن قیس نے کسی فتنہ پرداز شخص کو روانہ کیا کہ جس مجلس میں دونوں خاندان جمع ہوں وہاں کسی ترکیب سے " بعاث " کی لڑائی کا تذکرہ چھیڑ دے۔ چنانچہ اس نے مناسب موقعہ پاکر بعاث کی یاد تازہ کرنے والے اشعار سنانے شروع کر دیے۔ اشعار سنتے ہی بجھی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ گئیں۔ زبانی جنگ سے گزر کر ہتھیاروں کی لڑائی شروع ہونے کو تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جماعت مہاجرین کے ہمراہ موقع پر پہنچ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے گروہ مسلمین ! اللہ سے ڈرو میں تم میں موجود ہوں، پھر یہ جاہلیت کی پکار کیسی ؟ اللہ سبحانہ نے تم کو ہدایت دی، اسلام سے مشرف کیا، جاہلیت کی تاریکیوں کو مٹا دیا، کیا ان ہی کفریات کی طرف پھر پلٹنا چاہتے ہو۔ اس پیغمبرانہ آواز کا سننا تھا کہ شیطانی جال کے سب حلقے ایک ایک کر کے سب ٹوٹ گئے، اوس و خزرج نے ہتھیار پھینک دیے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر رونے لگے۔ سب نے سمجھ لیا کہ یہ سب ان دشمنوں کی فتنہ انگیزی تھی۔ اسی واقعہ کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں بل[1]

اگرچہ بہت سے شارحین قرآن نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن محققین کے نزدیک واقعہ روایتی اور تاریخی حیثیت سے کچھ اتنا طاقتور نہیں ہے چنانچہ اسی بنا پر حافظ ابن کثیر نے اس کو پیش نہیں کیا۔ بہرحال واقعہ ہو یا نہ ہو آیت کے الفاظ عام ہیں اور مسلمانوں کو ایک عمومی دستوری ہدایت دی جا رہی ہے کیونکہ العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب اور یہود و نصاریٰ کی اسلام کے خلاف قیامت تک ہونے والی ریشہ دوانیاں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے جو کھلا ہوا پروپیگنڈا اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور جغرافیائی تحریروں کے ذریعے جاری ہے وہ سب اس آیت قرآنی کا مصداق ہیں۔

۱۸۱۔ اے اہل ایمان اگر اہل کتاب میں سے کسی گروہ کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔ پہلے اہل کتاب کو ڈانٹا گیا تھا کہ جان بوجھ کر کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہو۔ یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم ان مفسدین کے پھندے میں نہ آنا۔ اگر ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے اشاروں پر چلو گے تو اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ نورِ ایمان سے نکل کر کفر کے تاریک گڑھے میں دوبارہ نہ جا گرو۔ لے

اس آیت میں شرط اور جزائے پیرائے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانو! تمہیں اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی اطاعت ہرگز نہ کرنی چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں دینِ حق سے ہٹا دیں گے اور تم کفر کے دلدل میں جا گرو گے۔

پہلی بات کی حد تک آیت کا مطلب واضح ہے کہ قرآن مسلمانوں کو بلا قید اہلِ کتاب کے کسی فریق کی اطاعت سے روک رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے اعمال کے کسی گوشہ میں ان کی اطاعت کی تو یہ انجام یقینی ہے کہ تم ایمان کے باوجود کفر کے شکار ہو جاؤ گے چاہے یہ کفر اعتقادی نہیں صرف عملی ہو اور خواہ اس کا عنوان کچھ ہو۔

اسلام میں طاعت کی حدود

اسلام میں مطلق اور غیر مشروط طاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ باقی کسی انسان کی اطاعت غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس کی طاعت اس وقت ہے جب وہ اللہ اور رسول کی طاعت کرتا ہو کسی خلافِ شریعت فیصلہ اور کسی ایسے حکم کی تعمیل میں جس سے دین اور امت کو یقینی طور پر نقصان پہنچتا ہو کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ یہ تو خود مسلمانوں کو مسلمانوں کی اطاعت کے بارے میں ہدایت ہے۔ باقی رہے غیر مسلم تو صرف یہی آیت نہیں بلکہ قرآن کی متعدد آیتوں میں مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ ان کی اطاعت نہ کرو۔ اس آیت میں خاص طور پر اہلِ کتاب میں سے بلا قید کسی فریق کی اطاعت سے جس انداز میں روکا گیا ہے شاید ممانعت کا اس سے زیادہ بلیغ انداز کوئی نہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی بھی اگر اطاعت کرو گے تو اس کے نتیجہ میں تمہیں ایمان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ کیونکہ یہ اسلام کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ جو مسلمان ان کی باتوں میں آجائے گا اس کو کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ خاص طور پر اہلِ کتاب اور اہلِ کتاب میں کوئی فریق کہہ کر طاعت سے روکنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں یہ دعوت

لے افاداتِ شیخ الاسلام

اسلامی کی خطرناک اپوزیشن ہے۔ ایک نیک نیت آدمی کو یہ حسن ظن ہو سکتا ہے کہ بھلا اہل کتاب ہوکر یہ لوگ کوئی گمراہی کی بات کیوں کر سوچ سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اسلامی دعوت کے مقابلے میں پیروئ نفس، انسان کی مکمل بے راہ روی اور غیر ذمہ داری کی دعوت ہے۔ اس دعوت کی قیادت و امامت تقریباً دو سو برس سے یورپ کی قومیں کر رہی ہیں۔ طبعی طور پر زندگی کے ہر شعبہ اور تمدن کے ہر میدان میں اسلامی دعوت اور اہل کتاب کی دعوت میں تصادم ہوا۔ اس مقابلہ میں اسلامی دعوت کے نمائندوں نے محض اپنی کمزوریوں کی بنا پر شکست کھائی۔ اہل کتاب کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اس مکمل شکست، اس مغلوبیت و ذلت کا طبعی اور نفسیاتی اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اہل کتاب کی طرف سے سخت عناد اور جذبۂ انتقام پیدا ہو۔ اور ان کو اپنا مستقل حریف، حقیقی مدمقابل اور عالمگیر دشمن سمجھیں۔ لیکن کس حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ عظیم الشان حقیقت مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور یہ مسئلہ کہ یہ مدمقابل دعوت ہے، اس کی اطاعت ایمان سے محرومی ہے۔ مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا، وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ وہ اور اہل کتاب دو متقابل دعوتوں، دو متضاد نظام حیات اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں۔ اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا بلند ہوگا۔ اس امر واقعی کا اہل کتاب کے ہر فریق کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں ہوا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان زندگی کی ہر شاخ میں ان کے متبع ہوگئے اور ان کی حالت یہ ہے کہ آخرت پر ایمان کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اصول و صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں۔ جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اس وقت سے ہوئی جب پاکستان و ہندوستان اور تمام اسلامی ممالک کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور مغربی معیاروں کو اپنانا شروع کیا اور افادیت و مصلحت کے نام پر ان کی طاعت کو قبول کیا۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

اسلامی معاشرہ میں مغربی افکار

۱۸۲۔ وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔ گویا یہ نتیجہ ہے اہل کتاب کی اطاعت کا۔ مکمل شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد بننے کا۔

وہ کافر کیونکر اور کیسے بناتے ہیں۔ وہ زمانۂ نبوت کی طرح صرف بعاث کی یاد تازہ کرنے کے لیے اشعار نہیں سناتے بلکہ آج ان کے کافر بنانے کا انداز بدلتے ہوتے حالات میں نرالا ہے۔ وہ کہیں علمیت کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں اور پورے خلوص اور پورے زورِ قلم اور انشا پردازی کے ساتھ اسلام کے محقق اور شارح بن کر مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم کا انسانی فکر کا نتیجہ ہونا، دین و سیاست کی تفریق۔ اسلام کے نظام حکومت سے یکسر بے تعلق، اور اس کا محض ایک اعتقادی، اخلاقی اور عبادتی نظام ہونا لادینیت کی دعوت، عربی زبان وادب کے اولین ماخذ کی صحت و ثبوت سے انکار، حدیث کی قیمت، حجیت اور سنت کی صحت کا انکار یا تشکیک، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ مساوات کلی، اور مساوات کلی کی تلقین و تحریک، فقہ اسلامی کو رومن لاکا چربہ قرار دینا، قدیم تہذیبوں کے احیاء کا نعرہ، پاکستان میں دلہر کی، ہندوستان میں اشوک کی اور مصر میں فرعون کی تقدیس، ان کی تہذیب ادب اور کارناموں پر فخر کرنا، مغربی قانون کی بنیاد و اصول پہ قانون سازی اور وطنی قومیت اور مادی سوشلزم کی دعوت، ان سب چیزوں میں مغربی فکر بلکہ مغربی طرز ادا اور تعبیر تک کے گھنے سائے آپ کو ان اسلام کے خیر خواہوں کے دماغوں اور ان کی تحریروں پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے نظر آئیں گے۔

اسلامی معاشرہ میں مغربی افکار کے اس فاتحانہ داخلہ اور بردوکسہ بعد ایمانکہ مکافرین کی شہادت ایک مستشرق عالم نے بھی دی ہے۔ لے ۔ اَر ۔ گب اپنی کتاب ویدر اسلام، میں لکھتا ہے:

> اگر ہمیں مغربی اثر و نفوذ کا صحیح پیمانہ درکار ہے اور ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغربی ثقافت اسلام کے رگ و پے میں کس طرح سرایت کر گئی ہے تو اس کے لیے ہم کو سطحی مظاہر سے نیچے اترنا ہوگا۔ ہم کو ان جدید افکار اور نئی تحریکات پر غور کرنا ہوگا جو محض مغربی طریقوں اور اسالیب سے گہرے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ مشرقی فکر ان کو پورے طور پر ہضم کر کے ان کو نئی قائم ہونے والی اسلامی سلطنتوں کا اس طرح جزو بنا دینا چاہتا ہے جو ان کے حالات کے ساتھ میل کھا سکے۔

اس فکری ارتداد میں ان کی کوششیں صرف علمی تحقیقات تک محدود نہیں۔ اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو شاید ہماری بحث کا موضوع ہی نہ ہوتا۔ مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دُور رس پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول اور غیر معقول طریقہ پر کمزوریوں کی نشاندہی پر صرف کرتے ہیں، وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دُوربین سے دکھاتے ہیں۔ رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں اس سبک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر ملنی مشکل ہے وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اس کو ثابت کرنا ہے۔ پھر اس مقصد کے لیے ہر طرح کے رطب و یابس مذہب، تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری، مستند، غیر مستند ذخیرے سے مواد فراہم کرتے ہیں اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی ہے۔ اس کو بڑے شوق سے پیش کرتے ہیں اور اس متفرق مواد سے ایک نظریے کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لیے بڑی فیاضی سے اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن ان کے انصاف، وسعتِ قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو قبول کر لے۔ وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول کا تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی ردِ عمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور اس کی عظمت و تقدیس اور کسی غیر انسانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر ہو جاتا ہے۔ اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں زہر کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کرے۔ ان کی تحریریں فکری ارتداد میں بے حد موثر ہیں۔ اور ایک درمیانی استعداد اور قابلیت کا آدمی ان کی زد سے بہت مشکل سے بچ سکتا ہے۔ اہلِ ایمان کو جادۂ ایمان سے ہٹانے کے لیے قرآن، سیرۃ نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہاء، مشائخ و صوفیہ، رواۃِ حدیث، فنِ جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوینِ حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق ان کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے اس کا علمی جائزہ لینا ان کی تحریفات فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس

کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لیے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو وہ اپنے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی اصلاح و ترقی کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں جو ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی فاضلانہ کتاب الفکر الاسلامی الحدیث میں پیش کیا ہے اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدرِ مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔ اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی۔ یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت میں تھا۔ اس ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت نے اس کا موقعہ دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی۔ اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا کلچرل سیاسی اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ یہ خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ خلافت اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا اور اب اس کی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لیے اس کا اظہار کر سکے گا اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور یہ نتیجہ ہے روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانہ میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدن جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے اس لیے وہ اس بات کا نمونہ

ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے مفر نہیں مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بقدم چل سکیں اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پا سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں۔ ملت اسلامی کو بھی تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متاثر ہونا ضروری ہے اس لیے کہ فکر و زندگی کے میدان میں اہلِ مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں۔ اہلِ مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹیفک طریقہ استعمال کیا۔ یہ طریقہ اوہام و خرافات اور مخصوص عقائد سے متاثر نہیں ہوتا اس کے پیشِ نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی جدوجہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید غصہ اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی نقطہ نظر سے خطرناک تھا وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے۔ اب ان نتائج کی روشنی میں انہوں نے طے کیا کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاحِ مذہب کی تحریک چلانی چاہیے اور جہاں جہاں تجدد و اصلاحِ مذہب کی تحریک چل رہی ہے اس کی ہمت افزائی و تائید کرنی چاہیے۔ اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریقِ کار کی حسبِ ذیل اقتباس سے بخوبی نشاندہی ہوتی ہے۔

اصلاحی تحریکیں دینی تعلیمات کے موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سرِ نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس لیے وہ (مسیحیت) کے ایک مبلغ کے لیے اولین اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر نئی تحریک جس کو کہ چند خبطی شروع کر دیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھیلتی جا رہی ہیں اور جس میں روحانی قوتیں حقائق سے نبرد آزما ہیں

بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کیلیے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلہ میں بالآخر اہم ثابت ہوتی۔ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح و احیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید و احیاء ہو۔ بہرحال یہ کام کا ایک میدان ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی۔ یہ میدان کھلا ہے۔ یہاں معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس نصف صدی کے اندر عالمِ اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدد و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوتے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقہ کار میں مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کو ان کا مشترک منشور کہا جاسکتا ہے۔ ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اُصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جاتے اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جائے۔ کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک طرف انہوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت اور دقیانوسیت کا مترادف قرار دیا۔ دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انہوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سینکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیتِ قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردانِ رشید کے ذریعہ مصر میں فرعونی، عراق میں آشوری، شمالی افریقہ میں بربری، فلسطین و لبنان کے ساحل پر فنیقی تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے۔ انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شدومد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی　فصحیٰ اس

کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس کی بجائے عام ——— اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہیے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہیے۔ یہ بات انہوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنی بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جاتی۔ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عربوں کا رشتہ کٹ جاتا اور وہ ان کے لیے ایک اجنبی زبان بن جاتی۔ عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دیتی اور عرب اس پورے دینی سرمایہ اور ذخیرہ سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کی نذر ہو جاتے۔ اسی طرح انہوں نے عربی رسم الخط کی بجائے لاطینی رسم الخط کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کیے۔ اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہو جاتی اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بے کار ہو کر رہ جاتا۔ ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات ان کی دور بینی اور ان کی اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں۔ اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث و فقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکیک و ارتیاب پیدا کرتی ہیں۔ اسلام کے حاملین و شارحین (محدثین و فقہاء) کی علمیت و ذہانت کی طرف سے متشکک بناتی ہیں۔ فاحش علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں لیکن ان کی اکثر و بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دُنیا میں مقبول ہیں۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سنجیدہ اہلِ علم کی بھی ایک تعداد شامل ہے) اس کی حسنِ ترتیب، طرزِ استدلال نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹیفک) طریقہ سے مرعوب اور مسحور ہے اور اس کی تشفی خالص علماءِ مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی۔ مغربی علماءِ مشرقیات جس وقعت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انہوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کر لیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی تینوں موقر مجالسِ علمیہ میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے اور ان کے مطالعہ و آراء سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ عالمِ اسلام اور عالمِ عربی کی بے مائیگی و کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر بھی عرصہ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر

وارومدار ہے اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ ادبیات عرب پر نکلسن کی کتاب جس میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک تعداد بھی شامل ہے اسلامی معلومات وحقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے اور مصر و پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے اس صورت حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی وتشکیکی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین و اہل نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں مستند وصحت مند اسلامی معلومات اور نقطہ نظر پیش کریں یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت، مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی اور عمق ماخذ کے استناد وصحت اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق وممتاز ہوں۔ ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں۔ دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے۔ متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ واخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے۔ ان کے ماخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کیے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے اور ان کی دعوت اور تلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں۔ ان کو طشت ازبام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔ اس پہلے مثبت وایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور اس دوسرے سلبی وجرابی جزو (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین وحوصلہ مند طبقہ جو یورپ وامریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے اور مغربی زبانوں ہی میں (جن میں وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے) اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ مستشرقین کے زہر آلودہ خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہوا اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرہ سے دوچار رہیں گے۔ اور ان ممالک میں تجدد و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے جو اسلام کی روح کے منافی ہے اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں جو صرف نسل د قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلامی کے ان فضلاء اور رہنماؤں سے

یہ کہنا صحیح ہوگا ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است[1]

اہلِ کتاب کی طاعت پر قدغن

۱۰۳ ۔ اور تم راہِ کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیتیں پیش کی جا رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔ یعنی بہت بعید ہے کہ وہ قوم ایمان لائے۔ پھر کافر بن جائے یا کافروں جیسے کام کرنے لگے جس کے درمیان خدا کا عظیم الشان پیغمبر جلوہ افروز ہو جو شب و روز ان کو اللہ کا رُوح پرور کلام اور اس کی تازہ بتازہ آیات پڑھ کر سناتا رہتا ہے[2]

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے دینِ حق سے ارتداد کی کب گنجائش ہے جبکہ تم میں قرآن اور سنتِ رسُول موجود اور محفوظ ہے۔ آیت میں کفر سے مراد اعمال کفر کی طرف بازگشت ہے اور کَیفَ اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ یعنی اس آیت میں اللہ سبحانہٗ اظہارِ تعجب فرما رہا ہے کہ یہ عظیم الشان حقیقت اہلِ ایمان کی نگاہوں سے کیسے اوجھل ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ اپنی اس مرکزیت اور عمومیت کے ساتھ ان کے ذہن سے کیونکر صاف ہو جائے گی۔ اپنی اور اپنے مستقل عالمگیر حریف کی یہ صحیح پوزیشن ان کی نظر سے کیسے مخفی ہو جائے گی۔ وہ اس حقیقت کو کیونکر فراموش کر دیں گے کہ وہ اور اہلِ کتاب دو متقابل دعوتوں، دو متضاد نظامِ حیات اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں۔ ایک ایمان کا داعی ہے۔ دوسرا کفر کا مبلغ ہے اور اس طرح دونوں ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا اونچا ہوگا۔ ان میں سے ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود ان کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لیے ایک مستقل مزاحمت، ایک مسلسل خطرہ اور ایک دائمی کشمکش ہے۔ اس امرِ واقعی کا اہلِ کتاب کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا آج احساس نہیں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یہاں پوری صراحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس موقعہ پر ایک مسلمان کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے اور اس کے ایمان اور غیرتِ دینی کا کیا تقاضا ہے اس کے لیے قرآن نے حضرت ابراہیم کا نمونہ پیش کیا ہے۔

---

[1] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ [2] افاداتِ شیخ الاسلام۔

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ

یہ اُسوۂ حسنہ کیا تھا؟ یہ بھی قرآن نے پوری قوت اور صراحت سے بتایا ہے ۔

اذ قالوا لقومھم انا برآء منکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم
وبدا بیننا و بینکم العداوۃ والبغضاء حتی تؤمنوا باللہ وحدہٗ

جب انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم پوجتے ہو بالکل بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بیر ہو گیا تا آنکہ تم یگانہ اللہ پر ایمان لاؤ۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اہل کتاب یہودی اور عیسائیوں کو تو اس فرق و اختلاف کا احساس ہوا اور ان میں اپنے نظام اور دین کے لیے محبت و غیرت زیادہ ہوا اور وہ اپنے مخالفین سے کسی اتحاد و موالات کے لیے تیار نہ ہوں مگر اہلِ ایمان ذرا سی مصلحت سے ان کی طاعت کر لے لیں۔ اس فرق کو بھی قرآن نے بیان کیا ہے۔

ولن ترضی عنک الیھود ولا النصاری حتی تتبع ملتھم

تم سے یہودی اور عیسائی اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کی ملت کے پیرو کار نہ ہو جاؤ۔

اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہ سہی لیکن اجمالی طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اب سے کچھ پہلے تک اہل کتاب کی تہذیب و نظام سے نفرت موجود تھی "کافر فرنگی"، نفرت و حقارت کے لیے ضرب المثل تھا۔ لیکن ہم کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس دور میں باوجود اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت کے علمبردار ہونے کے مغربی تہذیب نے بتدریج اس نفرت کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ نفرت کی جگہ ان کی طاعت کی رغبت پیدا کر دی۔ پاک و ہند اور عرب ممالک میں اس تبدیلی کی پوری تاریخ ہے۔ پہلے اس نے ہمارے فکری ارتداد کے لیے ہمارے اندر احساس کمتری پیدا کیا، یورپ کا بالعموم تفوق ذہن پر قائم کیا۔ اس کا پورا نظام نہایت خوبصورت اور آراستہ کر کے دکھایا۔ پھر اس کی محبت کو قلب و دماغ میں اس طرح اتار دیا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے اس سے انحراف مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ سیاسی طور پر اگر اس کو اس سے اختلاف بھی ہو تو ذہنی اور تہذیبی حیثیت سے اس کا ربط اس سے قائم ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی ذہنیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ اس کو دنیا میں اگر کوئی اپنا حلیف اور سرپرست نظر آتا ہے تو وہ صرف یہودی اور عیسائی۔ اس نے اس حقیقت سے

آنکھیں بند کرلیں جو روزِ روشن کی طرح ہے کہ اس کا اصلی اور عالمگیر حریف جس سے پہلی صدی ہجری سے اس چودھویں صدی ہجری تک مسلسل معرکہ آرائی رہی ہے اور جو دُنیا کی قیادت اور اس کی تعمیرِ نو میں اس کا اصلی رقیب اور مزاحم ہے۔ وہ یورپ کے یہودی اور عیسائی ہیں۔ اس نے اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا کہ جب تک ان کا اقتدار قائم ہے اس وقت تک دین کی دعوت پورے طور پر سرسبز نہیں ہوسکتی۔ اور اس میں وہ طاقت اور جذب کشش پیدا نہیں ہوسکتی جس کی وہ مستحق ہے جب تک اہلِ کتاب دنیا کے لیے تنہا مقتدا و پیشوا ہے اس وقت تک انسانی محاسن و فضائل اور اسلام کے معیارِ اخلاق کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اسلام کی اور بالتبع پوری انسانیت کی عین مصلحت ہے کہ اہلِ کتاب کو منصبِ قیادت سے ہٹایا جاتے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان ان مسائل پر اس نقطۂ نظر سے غور ہی نہیں کرتے۔ وہ یورپ کو پورے طور پر بے نقاب ہونے کے بعد پہچان نہ سکے۔ ان کی نظر اب بھی یردوکم بعد ایمانکم کافرین تک نہیں پہنچی ہے اور وہ قومی مصلحتوں اور محدود جغرافی مسائل میں اُلجھ کر اس عالمگیر ضرورت کو بھول بیٹھے ہیں انا للہ والی اللہ المشتکی۔

آیت میں آیات اللہ سے قرآن حکیم اور رسول سے آپکی زندگی مراد ہے۔ یہ قرآن کا طرزِ ادعائی نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ ہے۔ آج بھی دُنیا کی قوموں اور ادیان میں اہلِ ایمان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے لائے ہوئے علم وعمل کے وارث ہیں اور اس میں دُنیا کی کوئی قوم ان کی شریک و سہیم نہیں ہے۔

۱۸۳۔ اور یاد رکھو جو بھی اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے تھام لے گا وہ ضرور صراطِ مستقیم پر گامزن ہوجائے گا۔ یعنی سچ تو یہ ہے کہ جس نے ہر طرف سے قطع نظر کرکے ایک خدا کو مضبوط پکڑ لیا اور اسی پر دل سے اعتماد و توکل کیا۔ اسے کوئی طاقت کامیابی کے سیدھے راستہ سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹا سکتی[۱] اصل ارشاد میں لفظ اعتصام آیا ہے۔

علماء نے اعتصام کے معنے کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے کے اور تھامنے کے بتائے ہیں۔ اور اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اللہ کے دین اور اس کے احکام پر ہر حال میں مصلحت اور مفاد سے بالا ہوکر قائم رہو۔ گویا بتایا گیا ہے کہ جب نبوت کا لایا ہوا

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

علم وعمل تمہارے پاس موجود ہے تو یہ محرومی اور بدبختی کی انتہا ہوگی کہ دولت مند ہوکر تم کسی دروازے پر بھکاری بن کر جاؤ۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے چمٹ کر رہو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی زندگی میں مخلوقات سے ہٹ کر صرف اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کرو۔ اسی کی طرف حضرت شیخ الاسلام نے اشارا کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے دونوں معنے کی گنجائش بتائی ہے۔ اور علامہ طیبی نے دونوں میں یہ لطیف اور جوہری فرق لکھا ہے کہ پہلی صورت میں آیت کا مفاد یہ ہوگا کہ یوں تو کفر وارتداد ہر حال میں انسان کی بدبختی کا غماز ہیں لیکن جب اللہ کا رسول تمہارے سامنے قرآن کی تلاوت کر رہا ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ ہم دنیا میں خدائی پیغام کے حامل ہیں تو پھر یہ محرومی اور بدبختی کی انتہا ہے۔ گویا پہنچے کو برحق اور مدمقابل کو باطل سمجھنے کے باوجود پھر اہل باطل کی تقلید وپیروی اگر کرتے ہو تو یہ دن کی روشنی میں ٹھوکر ہے اور دوسری صورت میں آیت کا منشا یہ ہوگا کہ اگر تم اہل کتاب کی پیروی وطاعت، ان کی دسیسہ کاریوں، فریب کاریوں کے اندیشہ سے دب کر کرتے ہو تو تمہیں اس اندیشہ سے بالا ہونا چاہیے اور تمہیں یقین کرنا چاہیے کہ جس کے اللہ سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اسے اللہ کی جانب سے راہِ راست پر چلے رہنے کی توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ پہلے مفاد کی صورت میں یہ فقرہ کفر کے خلاف احتجاج ہے اور دوسری صورت میں یہ جملہ اللہ پر اعتماد وتوکل کا شاہکار ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی معنے کو نمایاں کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ پر توکل واعتماد ہی ہدایت میں سب سے بڑا سہارا اور گمراہی سے بچنے میں سب سے اونچا سہارا راست روی کے لیے بہترین ذریعہ اور حصولِ مقصد کے لیے سب سے اعلیٰ وسیلہ ہے۔

وحدتِ ادیان اور قرآن

قرآن کی اس آیت نے یہ بات روزِ روشن کی طرح اہلِ ایمان کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے کہ اس کے تصورِ دین کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اب صرف اس کی پیروی کی جائے۔ دوسرے آسمانی مذاہب بھی حق اور ذریعہ نجات رہے ہیں مگر اب ان میں کوئی بھی ایسا دین نہیں ہے جو باطل کی آمیزشوں سے پاک ہو اور اللہ کے حضور قابل قبول اور ذریعہ نجات ہو۔ اگر کسی درجہ میں کسی آسمانی دین میں کوئی صداقت ہوتی تو قرآن اس قوت کے ساتھ غیر مشروط انداز میں ہرگز نہ روکتا۔ اس کھلے اور صاف صریح اعلان کے باوجود کچھ لوگ اسلام کی اس حیثیت کو

پورے شرح صدر کے ساتھ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ان کے ذہنوں میں دوسرے مذاہب خصوصاً یہودیت اور عیسائیت کے لیے بڑے نرم گوشے ہیں۔ کتنی زبانیں تو صاف کہتی سنائی دیتی ہیں کہ سارے آسمانی مذاہب برحق ہیں کیونکہ بنیادی اصول اور عالمگیر سچائیاں سب میں مشترک ہیں۔ فرق جو کچھ ہے الفاظ اور اصطلاحات کا ہے یا زیادہ سے زیادہ رسوم ومظاہر کا، اور یہ چیزیں ہرگز مدارِ حقیقت نہیں۔ جس طرح اس نظریہ کے ہمارے دُنیادار اور دین دار دونوں ہی قسم کے لوگ شکار ہوتے ہیں اور دونوں میں گرفتاری کے محرکات الگ الگ ہیں۔ لیکن قرآن نے اس آیت میں خاص اہلِ کتاب کے کسی گروہ کی اطاعت پر نبوّت کے لاتے ہوتے علم وعمل کے مقابلہ میں قدغن لگا کر اپنے منا طبوں کے جلد دماغ میں یہ بات اُتار دی ہے کہ بے شک سب ادیان برحق تھے لیکن اب اسلام کے سوا کسی کی اطاعت روا نہیں ہے۔ یہ تنگ نظری نہیں بلکہ سینۂ قرآن سے اُبلی ہوئی صدا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿۱۰۲﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اس کی نافرمانی سے بچ کر رہنے کا حق ہے[۱۸۵] اور (دیکھو) تمہارا مرنا نہ ہو مگر ایسی حالت میں کہ تم سراپا طاعت و فرمانبرداری ہو[۱۸۶]۔

تقویٰ کی اجتماعی فضا پیدا کرو

گزشتہ آیات میں اہل کتاب کی طاعت کا نتیجہ کفر قرار دینے کے بعد اس کفر کی پذیرائی پر تعجب کا اظہار کیا اور بتایا کہ اسلام کے مکمل نظامِ حیات کے علمبردار ہونے کے باوجود اہل ایمان کا عملی زندگی میں اہلِ کتاب کی طاعت کرنا حیرت انگیز ہے۔ اب اس آیت میں اسی فہمائش کا تتمہ بیان کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اہل کتاب اسی طرح تمہاری ایمانی زندگی پر حملہ آور رہیں گے ان کے حملوں سے بچنے کی اس آیت میں دو بنیادی تدبیریں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اسلامی زندگی کی حد تک اپنی اجتماعی زندگی میں جماعتی طور پر تقویٰ اختیار کرو۔ اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ فضا برائی سے بچانے میں مددگار ہوگی۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو۔ اور اس کے گرد و پیش میں دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں تو وہ نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی پا[ئے] گا بلکہ خارجی اثر قبول کرے گا۔ اس کی کیفیتِ ذہنی صرف اس کی ذات تک محدود رہے گی۔ اس کو نشوونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی بلکہ خارجی

اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پوری جماعت اور پورے ماحول پر طاری ہو تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر ایک ہی کیفیت چھائی ہوگی۔ اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی جائے گی۔ دوسری یہ کہ دشمن کے حملوں سے بچنے اور خارجی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایمان میں استحکام اور جماؤ ہو۔

۱۰۵۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اس کی نافرمانی سے بچنے کا حق ہے یعنی ہر مسلمان کے دل میں پورا ڈر خدا کا ہونا چاہیے کہ اپنے مقدور بھر پرہیزگاری و تقویٰ کی راہ سے نہ ہٹے[1] تقاۃ اصل میں وقیۃ ہے جیسے تقویٰ اصل میں وقوی ہے۔ عربی میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں۔ لیکن زبانِ نبوت میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ سبحانہ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ گویا تقویٰ میں قلبی احساس اور اس کے مطابق پیمانۂ عمل ملحوظ ہوتا ہے اسی لیے جن شارحینِ قرآن کی نظر اس مجموعہ میں اول پر پڑی ہے انہوں نے اس کی تشریح ڈر، خوف اور اندیشہ سے کی ہے اور جن کی نظر دوسرے تک پہنچی، انہوں نے نافرمانی سے بچو سے کی ہے۔ صحابہ سے بھی آیت کی تشریح میں یہ تعبیرا اختلاف منقول ہے۔ عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً اور موقوفاً یہ بیان نقل ہو کر آیا ہے۔ اگرچہ حافظ ابن کثیر نے تاریخی طور پر اس کو عبداللہ بن مسعود ہی کا بیان قرار دیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ:

> حق تقاتہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی ایسی طاعت کی جائے کہ اس میں نافرنی کا شائبہ نہ ہو۔ اس کو اس طرح یاد کیا جائے کہ غفلت طاری نہ ہو اور اس کا شکر اس طرح ادا کیا جائے کہ اس میں ناشکری کی آمیزش نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ بندے پر اللہ سبحانہ کا ایسا ڈر خوف غالب ہونا چاہیے۔ عبداللہ ابن عباس

[1] افادات شیخ الاسلام

فرماتے ہیں:

حق تقاتہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں جان کھپائی جائے اور کسی بھی ملامت گر کی ملامت کے اندیشہ سے بے پروا ہو کر یہ کام کیا جاتے اور عدل وانصاف کا دامن نہ چھوڑا جاتے خواہ خود اپنی ذات، اپنے والدین اور اپنی اولاد کے خلاف کرنا پڑے۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اسلام کو اپنا یا جائے۔ قاضی بیضاوی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس فقرہ پر یہ تشریحی نوٹ قلم بند کیا ہے۔

فرائض کی بجا آوری اور محرمات سے بچنے میں اپنی کوششوں کو پورے طور پر لگا دینا حق تقاتہ ہے۔

جبکہ دوسرے مفسرین نے آیت میں تقویٰ کا مدلول قلبی کیفیت کو بتایا ہے۔

کیا یہ آیت منسوخ ہے

علامہ بغوی معالم التنزیل میں رقمطراز ہیں کہ

اہل تفسیر کا کہنا ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ پر اس کا مطالبہ شاق ہوا اور جناب نبوت میں عرض کی کہ اس کی بجا آوری کون کر سکتا ہے؟ اس پر قرآن کی یہ آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی مقاتل کہتے ہیں کہ آل عمران میں صرف یہی آیت منسوخ ہے۔

اور حافظ ابن کثیر نے سعید بن جبیر، ابو العالیہ، ربیع ابن انس، قتادہ، مقاتل اور زید بن اسلم کی رائے بھی یہی بتائی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ لیکن عبداللہ ابن عباس اور طاؤس کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔

دراصل یہ اختلاف زمانہ نزول کا اختلاف نہیں بلکہ معنئے آیت میں فکر کا اختلاف ہے جن کی نظر تقویٰ کے معنے میں قلبی احساس پر ہے۔ انہوں نے اسے دوسری آیت سے معارض سمجھ کر منسوخ قرار دے دیا اور جن کی نظر تقویٰ کے معنے میں پیمانہ عمل اور قلبی احساس کے تقاضے پر ہے ان کو دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نظر نہیں آیا۔ ہمیں علامہ زمخشری کی یہ رائے بے حد پسند آئی ہے کہ

فاتقوا اللہ ما استطعتم کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ اور خدا کی نافرمانی سے

بچنے میں اتنا مبالغہ کرو کہ استطاعت بھر تم سے کچھ رہ نہ جائے۔

یہی اتقوا اللہ حق تقاتہ کا مطلب ہے اس لیے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے قاضی بیضاوی بھی علامہ زمخشری کے ہم زبان ہیں۔ وہ دونوں آیتوں کو مماثل قرار دیتے ہیں۔

دراصل یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے جیسے حضرت عبداللہ ابن عباس نے بہت مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اہل کتاب کے حیا سوز معاشرے، دہشت انگیز ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں ان لوگوں کو جنہوں نے نبوت کی دعوت پر لبیک کہی ہے بتایا جا رہا ہے کہ اہل کتاب کی ظالمانہ چیرہ دستی اور ان کی ایمان سوز سازشوں سے بچنے کی اولین تدبیر یہ ہے کہ پوری قوت سے اپنے اندر اجتماعی تقویٰ پیدا کیا جائے۔ اہل کتاب جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں یہ سب کی سب اندھی قوتیں ہیں، جن میں نہ تو فہم حقیقت ہے اور نہ عقل و دانش کی روشنی ہے اور نہ انسانیت کی منزل مقصود کا کوئی نشان۔ یہ تمام قوتیں وقتی حالات اور ہنگامی تقاضوں کی مخلوق ہیں اور اس وقت تک اہلِ ایمان کے ایمانوں پر شب خون مارتی رہیں گی جب تک ایمان ایک تازہ جاندار طاقت بن کر انہیں تباہ و برباد نہ کر دے۔ اور ایمان کے جاندار رہنے کا دار و مدار صرف زبانی اقرار سے نہیں بلکہ یقین کی شدت اور عمل کی پختگی پر ہے جس طرح درخت کی مضبوطی اور زندگی جڑوں کی طاقت پر منحصر ہوتی ہے اور جڑوں سے درختوں کو اپنی پوری نشو و نما کا سامان ملتا ہے۔ اسی طرح اسلام دنیا میں ایک زندہ اور کارفرما قوت کی حیثیت سے اسی وقت ابھرتا ہے جب اس کے پیروؤں کے دل و دماغ ایمان کی روشنی سے منور اور یقین کی پختگی اور شدت سے مالا مال ہوں۔ آیت میں ایمان کے حوالہ سے خطاب کرنا اور پھر اتقوا اللہ حق تقاتہ کا حکم دینا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ ایمان ہی وہ مرکزی قوت ہے جس سے اسلامی نظام کے مختلف اجزاء ترکیبی اپنی زندگی اور قوت کے لیے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان نظام ہائے باطل کے مقابلے میں اسلامی نظام کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو۔ اور اس راہ میں سب سے پہلی قربانی یہ ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں جہاں جہاں اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے اور جس طرح ہو رہی ہے اس سے یک قلم کنارہ کش ہو جائے ذاتی منفعت، ملکی مصلحت اور قومی مفادات اس راہ میں اگر رکاوٹ ہوں تو ٹھکرا دے۔ حضرت عمر نے ابی ابن کعب سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے کہا اما سلکت طریقا ذا شوک؟ تم کبھی ایسے راستہ میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں فرمایا ہاں۔ کہا،

نما عملت ؟ اس حالت میں تم نے کیا کیا ؟ فرمایا میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں۔ کہا کہ فذالک التقوی بس یہی تقویٰ ہے۔

بہرحال اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی قرآن نے اولین تدبیر یہ بتائی ہے کہ من حیث الجماعۃ اہل ایمان کو برائیوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔

ایمان میں جماؤ پیدا کرو

۱۸۶۔ اور دیکھو تمہارا مزاج ہو مگر ایسی حالت میں کہ تم سراپا طاعت و فرمانبرداری ہو یعنی شیاطین چاہتے ہیں کہ تمہارا قدم اسلام کے راستہ سے ڈگمگا دیں۔ تم کو چاہیے کہ انہیں مایوس کر دو اور مرتے دم تک کوئی حرکت مسلمانی کے خلاف نہ کرو۔ تمہارا جینا اور مرنا خالص اسلام پر ہونا چاہیے [1] مطلب یہ ہے کہ اسلام پر جیے رہو اور موت تک اسلامی زندگی کی حفاظت کرو۔ یعنی تم پر کوئی لمحہ ایسا نہ آئے کہ کامل فرمانبرداری کی حالت نہ ہو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں صحت اور سلامتی کی حالت میں اسلام کی حفاظت کرو تاکہ تمہاری موت اسلام پر ہو۔

عجیب بات ہے کہ کچھ شارحین قرآن نے یہاں اسلام کو اخلاص کے معنی میں لے کر مطلب یہ بتایا ہے کہ تم سرتاسر اللہ کے لیے ہو جاؤ۔ اور کچھ نے اسلام کو ایمان قلبی کے معنے کا لبادہ پہنا دیا ہے حالانکہ قرآن خود اہل ایمان سے مخاطب ہے اور ان کو بتا رہا ہے کہ ایمان کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور پوری زندگی اسلام پر کاربند رہو۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر مرا ذوق یہ کہتا ہے کہ تقویٰ آیت میں محارم اور منہیات سے بچنے کے لیے اور اسلام فضائل اور محاسن سمیٹنے کے لیے بولا گیا ہے اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ ایمان صرف ایک درخت ہے لیکن اس کی افادیت اس وقت تک اقوام دنیا کے مقابلہ میں متصور نہیں ہو سکتی جب تک تمہارا دامن خدا کی نافرمانی کے رذائل سے پاک اور اللہ کی طاعت و فرمانبرداری کے زیور سے آراستہ نہ ہو گا۔

مسلمان کا سب سے بڑا مقصد

اصل یہ ہے کہ اسلام کی امامت بڑی نازک اور وسیع صفات کی طلب گار ہے جو جماعت اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

منصب پر فائز ہو اس کے لیے ذاتی صلاح و تقویٰ اور طاعت کے علاوہ جہاد و اجتہاد کی صلاحیت بھی ناگزیر ہے۔ یہ دو لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی و مطالب سے لبریز۔ جہاد سے مراد ہے عزیز اور اہم ترین مقصد کی خاطر اپنی طاقت اور وسائل کو صرف کر دینا۔ مسلمان کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی فرمانبرداری، اس کی خوشنودی کا حصول اور اس کی بادشاہی اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے۔ اس کی خاطر ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، تہذیب و تمدن، اغراض و خواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں ایک طویل جدوجہد کرنا اور ان تمام داخلی مطاعوں کے خلاف جو اللہ کی فرمانبرداری و طاعت میں حریف و رقیب ہوں اپوزیشن بن جانا مسلمان کا فرض ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے احکام کو اپنی ذات پر نافذ کرے اوامر کی پابجائی کرے، محرمات سے بچ کر رہے۔ پہلے کا نام اسلام اور دوسرے کا نام تقویٰ ہے اور یہ طاعت و تقویٰ ان کی پوری زندگی میں نمایاں ہو۔ دین و اخلاق اور قوت و سیاست اسی کے مطابق ہوں۔ ان کی حکومت، تعلیم و تمدن، ان کے عقیدے، تربیت، دین و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہوں۔ وہ حکام کی حیثیت میں ہوں یا معمولی کارکنوں کی، پولیس کی حیثیت میں ہوں یا فوج کی، مزدور ہوں یا کارخانہ دار، والد ہوں یا اولاد ہمیشہ محتاط و پاک دامن و دیانت دار، امانت دار، خدا ترس اور منکسر مزاج ہوں۔ یہی معنے ہیں اتقوا اللہ حق تقاتہ اور لا تموتن الا و انتم مسلمون کے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۠ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو[۱۸۶] اور اس سے جدا نہ ہو[۱۸۷] اور اللہ کے اس انعام کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اسی نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی۔ بس اسی کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے تھو[۱۸۸]۔ حالانکہ تم اپنے ماضی میں آگ سے بھرے ہوتے ایک گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے، اللہ نے تم کو بچا لیا[۱۸۹]۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے کھول کر پیش کرتا ہے تاکہ تم کامیابی کی راہ پالو[۱۹۰]۔

اجتماع وائتلاف

اہل کتاب کی جانب سے خطرہ کی نشاندہی کرنے کے بعد اس سے بچنے کی تدابیر بتائی ہیں۔ اولین اور بنیادی تدبیر یہ بتائی کہ زندگی اور موت دونوں کی منزلوں میں اللہ کے تابع فرمان رہو، معرمان سے دامن بچا کر رکھو اور اوامر کی حد تک طاعت کی سرشاریوں کا مظاہرہ کرو، یہی تقویٰ اور اسلام ہے۔ اب اسی خطرہ سے بچنے کے لیے دوسری تدبیر اس آیت میں بتائی جا رہی ہے خطرہ چونکہ عظیم ہے اس لیے اس سے بچنے کی تدابیر بھی عظیم اور ٹھوس ہیں۔ خطرہ کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے یعنی یہ کہ اہل کتاب طرح طرح کے مکروفن سے اہل ایمان کو دین حق سے ہٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم پروپیگنڈا اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی، جغرافی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں جاری رہتا ہے وہ اسی کے مظاہر ہیں۔ مقصد ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کا یہی ہے کہ مسلمان اگر یہودیت و مسیحیت کو نہ ہی قبول کریں پھر بھی کم از کم اسلام سے تو ضرور برگشتہ ہو کر رہیں۔ یردوکم بعد ایمانکم کافرین سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۱ میں بھی اسی خطرہ سے آگاہ کیا گیا تھا وہاں جو بات اجمالاً کہی گئی تھی یہاں اسی کی تفصیل ہے۔

قرآن کی اس آیت میں اسی خطرہ سے بچنے کی دوسری تدبیر بتائی جا رہی ہے۔ تدبیر یہ ہے کہ اہل ایمان پوری اجتماعی قوت کے ساتھ مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لیں اور اس سے کبھی جدا نہ ہوں۔ یہی اصل مقصد ہے۔ اس سے ہٹ جانے کے بعد اسلامی زندگی کا شیرازہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی اہل ایمان میں زندگی کی حرارت اور سعی و طلب کا ولولہ پیدا کر سکتا ہے اور یہی اہل ایمان کے تمام اقدار و معیارات کا سرچشمہ اور ماخذ ہے تمدنی اور معاشرتی نظام درحقیقت اسی مقصد کا تابع ہوتا ہے

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ اسلامی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب وہ قوت ہے جو مسلمانوں کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ اسی کے ذریعے مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت اور رائے۔ فرد واحد یا اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ جمع ہوتی ہیں اور تمام مواد، قوی، اعمال اور

افراد پر ایک اجتماعی حالت طاری ہو جاتی ہے تا آنکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہمدگر جڑا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے اور کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ یہی اعتصام بحبل اللہ ہے۔

اعتصام بحبل اللہ

۱۸۷۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور اس سے جدا نہ ہو یعنی سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسی ہے۔ یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے۔ اگر سب مل کر اسے پوری قوت سے مضبوط تھامے رہو گے۔ کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی بھی غیر متزلزل اور ناقابل اختلال ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم تازہ زندگی حاصل کر سکتی ہے لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کو اپنی آراء و اہوا کا تختہ مشق بنالیا جائے بلکہ اس کا مطلب وہی ہوگا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو۔[1]

اللہ کی رسی سے مراد قرآن ہے۔ عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کتاب اللہ ھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض یعنی کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے (ابن کثیر) زید بن ارقم کی روایت میں حبل اللہ ھو القرآن کے الفاظ آئے ہیں۔[2]

یعنی قرآن حکیم اور دین اسلام اور شریعت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔ جس طرح رسی کو مضبوط پکڑ لینا اوپر سے گرنے سے بچاتا ہے اور نیچے سے اوپر تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم اور دین اسلام کو مضبوطی سے تھام لینا بندے کو خدا تک پہنچا دیتا ہے اور آگ میں گرنے سے بچا لیتا ہے اور خدا کی رسی اس قدر مضبوط ہے کہ ٹوٹ تو نہیں سکتی البتہ غفلت کی بنا پر ہاتھ سے چھوٹ سکتی ہے۔[3]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ش [3] معارف م ا

اللہ کی رسی سے مراد اس کا دین ہے۔ اور اس کو رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے اس رسی کو مضبوط پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت دین کی ہو۔ اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں۔ اور اس کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کریں جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں۔ پھر ان میں لازماً وہ ہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں کو ان کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دُنیا و آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے [1]

حبل اللہ کی تعبیری بلاغت

اعتصام تو لغت کی زبان میں عصم سے بنا ہے، عصم کے معنے روک دینا اور اعتصام کے معنے رکنا آتے ہیں۔ اسی سے اعتصام میں کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے معنے پیدا ہو گئے ہیں، حبل اللہ کے معنے اللہ کی رسی ہیں۔ اعتصام بحبل اللہ کے معنے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا اور پکڑ لینا ہیں۔ پہلی آیت میں اللہ کو تھام لینے اور مضبوطی سے پکڑ لینے کا حکم تھا اس میں اجمال تھا۔ اب اس آیت میں اس کی وضاحت ہے کہ اللہ کو تھام لینا یہ ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے۔ کچھ کی رائیں اس موضوع پر آپ پڑھ آئے ہیں۔ ابوحیان الاندلسی نے لکھا ہے کہ حبل اللہ کی مراد متعین کرنے میں ایک سے زیادہ باتیں کہی گئی ہیں مثلاً عہدِ قرآن، دین، طاعت، توبہ، توحید، جماعت اور اسلام، سب شارحینِ قرآن کی تفسیر ان کے اردگرد گھومتی ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، زمخشری، آلوسی، ابوحیان، قرطبی، بیضاوی، بغوی، اور خازن سب کے سب ایک زبان ہیں۔ حبل اللہ سے مراد قرآن ہونے کی ایک حدیث مرفوع سے بھی تائید ہوتی ہے۔ اوروں نے تو نہیں مگر آلوسی نے اسی کو تفسیر میں اولیت دی ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

عبداللہ بن مسعود سے بسند صحیح یہی تفسیر منقول ہے۔ قتادہ بن دعامہ سے بھی یہی تفسیر آئی ہے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے حضرت ابوسعید خدری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے،

قرآن ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین کی طرف دراز کی گئی ہے۔

یہ سب باتیں درست ہیں۔ ان میں باہم کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اگر آیت کے سیاق و سباق پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ حقیقت الم نشرح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اولاً اللہ سبحانہ نے اہل ایمان کو اہل کتاب کی طاعت سے اس اندیشے اور خطرے کے تحت روکا کہ یردوکم بعد ایمانکم کافرین اور بعد ازیں اس پر تعجب ظاہر فرمایا کہ تم نبوت کی راہ سے آتے ہوئے علم و عمل کے علمبردار ہو کر دوسروں کی طاعت کیوں کر کر سکتے ہو۔ تمہارا ایمان ایک عہد و میثاق کے ذریعے وجود میں آیا ہے۔ یہ میثاق اس اقرار سے عبارت ہے کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نبوت کے علم و عمل کو اپنی زندگی اور اپنے افکار و اعمال کے لیے قبول کرتے ہیں۔ یہ اقرار ہے اس بات کا کہ آئندہ سے مسلمان کسی اور علم و عمل پر اپنی فکری اور عملی قوتیں صرف نہ کریں گے۔ اور اسی طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ امور و مسائل میں وہ کسی اور قانون و ضابطہ یا کسی دوسرے آئین و دستور کی رہنمائی نہیں قبول کریں گے بلکہ اس علم اور عمل میں اپنے لیے ہدایت تلاش کریں گے جو انہیں نبوت کے ذریعے ملا ہے۔ اس میثاق کے ہوتے ہوتے کسی اور نظام کی اطاعت حیرت افزا اور تعجب خیز ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ سے ربط اور قرآن و سنت سے وابستگی ہی اعتصام باللہ ہے اور یہ اعتصام ہی اس دنیا میں صراطِ مستقیم کا رہنما ہے۔ اس کے علاوہ ہر اعتصام خواہ یہ یہودیت کا ہو یا عیسائیت کا، اور چاہے یہ وطنیت کا ہو یا قومیت کا، مادیت کا ہو یا معاش کا صراطِ مستقیم کا رہنما نہیں بلکہ سُبل متفرقہ کا رہنما ہے۔ بعد ازیں اہل ایمان کو اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے اور اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی متعدد عملی تدبیریں بتائی ہیں۔ ان میں بنیادی اور اولین تدبیر یہ بتائی ہے کہ اسلامی زندگی کی خاطر تمہارے ایمان میں ثبات اور استحکام ہونا چاہیے۔ استحکام یہ ہے کہ تمہاری ساری زندگی میں طاعت کی سرشاریاں ہوں اور زندگی میں پھیلی ہوئی خدا کی نافرمانیوں سے تمہارا دامن محفوظ ہو۔ اب اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ تمہیں قانونی، اخلاقی، سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں میں اجتماعی طور پر

اللہ کی رسی کو تھام کر رہنا چاہیے اور اس سے زندگی کا کوئی گوشہ جدا نہ ہونا چاہیے۔ تمہاری مختلف کارکن قوتیں اسی مقام، اسی مرکز، اسی سلسلہ، اسی وجود، اسی طاقت میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ یکجا ہونی چاہئیں۔ اور تمام اعمال اور قوتوں پر ایک ایسی اجتماعی کیفیت طاری ہو۔ ہر قوت سمٹی ہوئی، ہر عمل باہم ملا ہوا اور ہر شخص زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو۔ کوئی چیز، کوئی گوشہ، کوئی عمل اس سے علیحدہ نہ ہو۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر قائم رہنے کی ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں اللہ کی جناب میں درخواست کرتا ہے۔ اسی کو قرآن نے انبیاء، شہداء، صدیقین اور صالحین کی راہ بتایا ہے۔ آیات اللہ و رسولہ اللہ کی کتاب اور اللہ کا رسول یعنی نبوت کی راہ سے آیا ہوا علم و عمل۔ یہی وہ حبل اللہ ہے جس کے اعتصام کا قرآن اس آیت میں مطالبہ کر رہا ہے۔ اس میں لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا گیا ہے کہ انعامِ اسلام کی حقیقی کسوٹی اعتصام بکتاب اللہ و رسول اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ مسلمان نظام ہائے باطل کے مقابلہ میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کا بول بالا کرے اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس سے وابستہ ہو کسی حال میں اس سے جدائی گوارا نہ کرے۔

علم وعمل کے لیے حبل کی تعبیر

شارحین قرآن نے تو اس موقعہ پر حبل اللہ لانے کی ایک سے زیادہ وجوہ بتائی ہیں۔ کسی نے اسے تمثیل بنایا اور کسی نے استعارے کی زبان قرار دیا۔ آلوسی بغدادی، ابو حیان اندلسی، زمخشری نے اس پر خوب دادِ تحقیق دی ہے اور کچھ نے تمثیل و تشبیہہ سے الگ ہو کر حبل اللہ کی تعبیر کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ یہ اللہ سے تعلق کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں مگر اپنا ذوق یہ کہتا ہے کہ پہلی آیت میں کتاب اللہ اور رسول اللہ کا ذکر آیا ہے۔ کتاب اللہ سے مراد علمِ نبوت ہے اور رسول اللہ سے نبوت کا عمل مراد ہے۔ لفظ حبل لا کر قرآن نے علم و عمل نبوت کی طرف اشارا کیا ہے کیونکہ جیسے ہم عربی میں حبل اور اردو میں رسی کہتے ہیں۔ وہ ایک اور مفرد چیز کا نام نہیں بلکہ ایک ہی جیسی دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ دونوں صرف مل کر نہیں بلکہ ایک دوسرے پر چڑھ کر حبل اور رسی کہلاتے ہیں۔ یہی حال نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کا ہے۔ فکر کی حد تک یہ دونوں الگ الگ ہیں مگر عمل کی حدود میں دونوں برابر ہیں۔ ان دونوں کی اسی ہم آہنگی کی طرف قرآن نے لفظ حبل بول کر اشارا کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب تک

اُمت کے افکار و اعمال نبوت کے علم و عمل سے وابستہ رہیں گے۔ اُمت اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رہے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں نبوت کے علم و عمل والی ہستیوں کی راہ کو صراطِ مستقیم قرار دینے کے بعد اہل کتاب کے اسی خطرے کی طرف غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ گویا اہل کتاب کا فتنہ قرآن کی نظر میں اتنا عظیم ہے کہ اس سے محفوظ رہنے کی ہر مسلمان نماز میں درخواست کرتا ہے۔

اعتصام بحبل اللہ کا مدلول

یہ تو اس آیتِ قرآنی کا منطوق ہے لیکن اسی کا مدلول یہ بھی ہے کہ اگر مسلمانوں میں اعتصام بحبل اللہ یعنی نبوت کے علم و عمل سے وابستگی رہی تو ان میں یگانگت، اتحاد، اجتماع اور ایتلاف کی فضا قائم رہے گی۔ گویا بتا دیا کہ اُمت میں اتحاد، ایتلاف، امتزاج اور نظم کا ذریعہ صرف اعتصام بحبل اللہ ہے۔ اس سے ہٹ کر اتحاد کا تصور ایک لفظ بے معنے ہے۔ یہ امر واقعہ ہے اور تاریخ کی بے لاگ شہادت موجود ہے کہ مسلمانوں کی اسلامی زندگی کا اصلی دور وہی تھا جب ان کی اجتماعی و انفرادی، مادی و معنوی، اعتقادی و عملی زندگی کے تمام گوشے نبوت کے علم و عمل سے وابستہ تھے۔ اور ان کے تنزل و ادبار کی اصلی بنیاد اسی وقت پڑی جب ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں نبوت کے علم و عمل کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ابتداء میں ہر ذرہ مجتمع تھا، ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی، ہر چیز بندھی ہوئی تھی لیکن بتدریج نبوت کے علم و عمل سے علیحدگی کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ پھیلا، ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر ہو گئی۔ قرآن نے ولا تفرقوا کہہ کر خبردار کیا تھا کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے جُدا نہ ہونا مگر افسوس کہ ہم نے اس پر عمل نہیں کیا اور اس کے نتیجے میں مسلمان ہر موڑ پر تنزل کے شکار ہیں۔ اور نبوت کے علم و عمل سے ہٹ کر ذلیل ہیں۔ چونکہ اعتصام بحبل اللہ کا منطوق، اتحاد و اتفاق سمجھ لیا گیا اس لیے ولا تفرقوا کے معنے کسی نشست بھی صحیح نہ رہے۔ کسی نے اس کے معنے بتائے کہ فرقہ فرقہ نہ ہو۔ کسی نے کہا جُدا جُدا نہ ہو اور کسی نے بتایا کہ متفرق اور پراگندہ نہ ہو۔ حالانکہ اتحاد و اجتماع خود اعتصام بحبل اللہ نہیں بلکہ اس کا مدلول اور لازم ہے۔ محققین کی نگاہ اس پر گئی اور انہوں نے بتایا کہ تفرق کا منطوق نبوت کے علم و عمل سے ہٹنا اور جُدا ہونا ہے۔ ابن جریر رقمطراز ہیں ولا تتفرقوا عن دین اللہ اللہ کے دین سے جُدا نہ ہو

اُلوسی نے پوری قوت سے بتایا کہ لا تتفرقوا عن الحق الذی امرتم بالاعتصام بہ۔ جس حق سے تمہیں چمٹ جانے کا حکم ہے اس سے جُدا نہ ہو۔

مغرب زدگی کے خلاف احتجاج

قرآن کی یہ آیت کہ اعتصام بحبل اللہ کرو۔ یعنی نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے اپنی زندگی کی ہر شاخ میں چمٹ کر رہو اس سے کہیں بھی جُدا نہ ہو۔ مسلمانانِ عالم، ان کے رہنماؤں اور ان کے حکمرانوں میں مغرب زدگی کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے۔ موجودہ عالم اسلام مغرب زدگی کے راستہ پر جس طرح سے گامزن ہے اور اس آیت کے خلاف جس انداز سے پیش قدمی کر رہا ہے، اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان سب رہنماؤں اور لیڈروں نے اہل کتاب کے فکری فلسفہ کو اپنے سارے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز ان کی مادہ پرستانہ قومیت کو اپنانے کا عزم مصمم کر لیا ہے۔ وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس کے علمی، اجتماعی، ثقافتی ڈھانچہ کے ساتھ مستقل طور پر برسرِ پیکار ہیں اور معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل، نظامِ تعلیم وتربیت اور اعلانات کے ذریعے قوم کی اس قوتِ ایمانی اور جذبہ دینی کو غیر شعوری طور پر داؤ پر لگا رہے ہیں، اور اہل کتاب کی طاعت کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ بے شک یہ رہنما وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا بھی اظہار کرتے رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اب بھی اسلام ان کے اور عوام کے درمیان سب سے بڑا اور طاقتور رابطہ ہے اور اس کا نام لیے بغیر وہ لاکھوں عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ لیکن اسلام کا مفہوم ان کے ذہن میں وہ نہیں ہوتا جو واقعی ہے۔ اسلام سے ان کے نزدیک وہ اصلاح شدہ مذہب ہے جو مغربی تمدن اور مغربی افکار کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے اور ان کی قوم پرستی کا ساتھ دے سکے اور عقائد واخلاقیات میں محدود رہ کر ان کی آئین سازی اور ان کے سیاسی مصالح ومسائل میں مزاحم نہ ہو۔ اس طرح ڈاکٹر سالم کی یہ رائے کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے "قومیت" نے کامل اتحاد اسلام سے پیدا کیا ہے۔ لیکن جس اسلام کو قومیت نے اپنایا ہے یہ وہ قدیم بالکل خشک اسلام نہیں ہے بلکہ یہ بالکل

تبدیل شدہ اسلام جدید ہے، محمد رسول اللہ اور قرآن کے نام بے تکلف لیے جاتے ہیں۔ مگر اس لیے کہ ہر اس چیز کے لیے سندِ جواز ہاتھ آئے جسے قوم پرور اختیار کرنا چاہیں عرب قومیت کو عوام میں مقبولیت اسی اسلام سے چپٹے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اعتصام بحبل اللہ کے لوازم

اگر یہ حقیقت ہے کہ اعتصام بحبل اللہ قرآن کا مطالبہ ہے اور اعتصام بحبل اللہ کی حقیقت یہی ہے کہ مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں اس سے وابستہ رہیں اور کسی ایک شاخ میں بھی اس سے جُدا نہ ہوں تو اس کا مطلب صاف اور واضح یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں نبوت کی راہ سے آتے ہوتے علم وعمل کی واقفیت عام ہو اور جس چیز پر وہ ایمان لاتے ہیں وہ ان کے لیے شعوری ہو۔ کیونکہ اگر کسی نظام کی پشت پر اس کے ماننے والوں میں اس کے جاننے والوں کی عددی طاقت نہ ہو تو اس نظام کے زندگی کے ہر گوشہ میں قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ٹھیٹھ عقلی بات ہے کہ نظام خواہ کوئی ہو جب تک اس کے جاننے والوں کی طاقت اس کی پشت پناہی نہ کرے گی۔ اس کے قیام، اس کے اظہار کا اس عالم میں کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔

عہدِ رسالت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں اسلام کا شعور اور اس کا علم عام تھا۔ آج اگر ہزار میں سے ۹۹۹ مسلمان اسلام سے ناآشنا ہیں تو صحابہ میں ایک فیصد بھی مسلمان اسلام سے ناواقف اور بے خبر نہ تھا۔ ان میں اسلام کی لگن اور اس کا عشق تھا۔ اور ان کو اسلام سے ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے نہ سہی ہو۔ اسلام آشنائی کی طلب ان کے دل میں اسی آیت کے مطالبہ اعتصام بحبل اللہ کی وجہ سے اور ذمہ داری کے احساس سے خود بخود پیدا ہوئی تھی۔ چونکہ اسلام کو حق ماننے کے بعد ان کا دل ودماغ سب طریقوں سے باغی اور منکر ہو گیا تھا۔

اس نئے نظام کی بنیاد پر زندگی کی تعمیرِ نو کی خاطر ان کو اسلامی معلومات کی ضرورت تھی اس لیے ہر شخص اسلام کی تعلیمات حاصل کرنے کا خود بخود شائق تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اسلام سے ناواقف ہو۔ زمانہ نبوت میں اطرافِ عرب سے مختلف قبائل کے لوگ حاضرِ خدمت ہوتے اور تعلیم حاصل کر کے واپس جاتے۔ اصحابِ صفہ مستقل طور پر آستانۂ رسالت پر مقیم رہتے اور ہر وقت کی تعلیمات سے باخبر رہتے۔ محدثین نے صحابہ کی ان علمی

سرشاریوں پر مستقل عنوان قائم کیے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب العلم میں دو عنوانوں کے ذریعے صحابہ کی طلب علم کی کیفیت پر بحث کی ہے۔ ایک عنوان ہے الخروج فی طلب العلم یعنی تلاش علم کی خاطر سفر کرنا۔ دوسرا عنوان ہے الرحلۃ فی المسئلۃ النازلۃ پیش پا افتادہ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے گھر سے بے گھر ہونا۔ پہلے عنوان کے تحت امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے حضرت عبداللہ بن انیس سے ایک حدیث سننے کی خاطر ایک ماہ کی مسافت والا سفر کیا۔

امام دارمی نے اپنی سنن میں بروایت عبداللہ بن بریدہ بیان کیا ہے کہ ایک صحابی سفر کرکے حضرت فضالہ ابن عبید کے پاس مصر پہنچے۔ یہ اس وقت اپنی اونٹنی کو چارہ ڈال رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بولے مرحبا۔ صحابی مذکور نے فضالہ سے کہا کہ میں آپ کی ملاقات کے لیے نہیں آیا بلکہ کام آیا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میں نے اور آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ارشاد سنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ کے علم میں ہوگی۔ فضالہ نے دریافت کیا کہ وہ کون سی ہے؟ صحابی مذکور نے کہا کہ فلاں حدیث جس میں یہ ہے۔[1]

اسی طرح کا ایک واقعہ محدث حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں حضرت ابوایوب انصاری کا نقل کیا ہے کہ وہ بھی حضرت عقبہ ابن عامر کی خدمت میں صرف ایک حدیث کی خاطر سفر کرکے مصر تشریف لے گئے۔ چنانچہ جب وہ مسلمہ بن مخلد انصاری کے مکان پر پہنچے جو اس وقت مصر کے گورنر تھے تو ان کو اطلاع دی۔ مسلمہ جلدی سے باہر آتے معانقہ کیا پوچھا کیسے تشریف آوری ہوئی فرمایا میں نے ایک ارشاد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ اب سوائے میرے اور عقبہ کے اور کوئی حضور انور سے اس ارشاد کا سننے والا باقی نہیں اس لیے کسی کو بھیج دو جو مجھے ان کے مکان کا پتہ بتادے مسلمہ نے فوراً آدمی روانہ کردیا۔ حضرت عقبہ کو اطلاع ہوئی تو جلدی سے باہر آکر معانقہ کیا اور پوچھنے لگے اے ابوایوب کیسے آنا ہوا؟ جواب دیا مسلمان کی پردہ پوشی کے بارے میں میں نے ایک ارشاد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ اب تمہارے اور میرے سوا اور کوئی اس کا سننے والا باقی نہیں ہے۔ عقبہ بولے ہاں۔ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

من ستر علی مومن فی الدنیا خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامہ

---

[1] سنن دارمی

جو دُنیا میں کسی رسوائی پر مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سُن کر کہا تم نے سچ کہا یہ کہہ کر سواری کا رُخ کیا اور سوار ہو کر واپس ہو گئے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ علومِ نبوّت کی طلب و تلاش کے لیے صحابہ کی سرشاریاں اور اس بارے میں ان کو اپنی ذمّہ داریوں کا احساس کس قدر تھا؟

اللہ سبحانہٗ کا انعام

۱۰۸۔ اور اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی۔ بس اسی کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہوگئے۔ یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تم کو بھائی بھائی بنا دیا جس سے تمہارا دین اور دُنیا دونوں دُرست ہوگئے اور ایسی ساکھ قائم ہوگئی جسے دیکھ کر تمہارے دُشمن مرعوب ہوتے ہیں۔ یہ برادرانہ اتحاد اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے جو روئے زمین کا خزانہ خرچ کر کے میسر نہ آسکتی تھی۔ [1]

آیت میں نعمت کا لفظ مکرر آیا ہے اور سارا زور اسی پر ہے اس میں یہ پہلو قابلِ غور ہے۔ یعنی نعمت اللہ پر کیوں زور دیا گیا اتنا کہہ دینا کافی تھا اذکروا اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم اخوانا۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ کیوں کہی گئی کہ اللہ کی نعمت کو یاد کرو۔

اس لیے کہ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کا مقام اس کے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان جب بھی کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو ہی وہ اصلی قوت ہے جو اس کے اعمال میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اخوّت اور بھائی چارہ جو تم دیکھ رہے ہو خود بخود وجود میں نہیں آگیا۔ سوچو اور غور کرو کہ حضور انور کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ خون کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک لیا کرتے تھے رسول اللہ اور کتاب اللہ نے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور خاندانی و قبائلی اتحاد سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگت ان میں پیدا کر دی۔ مفسرین قرآن نے اپنے ذوق کے مطابق یہی سمجھا ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں اللہ کی نعمتوں میں سے وہ ہدایت و توفیق ہے جو تمہیں اسلام کی طرف لائی ہے۔ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں نعمت سے مراد اسلام ہے۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ اللہ نے اپنی نعمت یاد دلائی ہے اور سب سے بڑی نعمت اسلام اور حضور انور کی پیروی ہے اسی کے ذریعے عداوت کی جگہ محبت اور انتشار کی جگہ اتحاد وجود میں آیا ہے۔ تعبیر میں اگرچہ اختلاف ہے مگر مقصد سب کا ایک ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ارشاد میں نعمت سے کتاب اللہ اور رسول اللہ مراد ہیں۔ یعنی نبوت کا کمال علم اور کمال عمل اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔ نعمت دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جس میں دل خوشی محسوس کرے۔ مسلمانوں کو اللہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے ایک علم دوسرا عمل، قرآن نے علم و عمل کے اسی مجموعہ کو نعمت قرار دیا ہے اور اس کے حاملین کے راستہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے صراط الذین انعمت علیھم یہاں نبوت کے کمال علم اور کمال عمل کے لیے کتاب اللہ اور رسول اللہ کی تعبیر آئی ہے۔ اسی بنا پر حبل اللہ کی تفسیر میں لوگوں نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق مختلف باتیں کہی ہیں۔ کچھ علماء صحابہ نے قرآن، کچھ نے اللہ کا دین اور کچھ بزرگوں نے اللہ کا عہد بتایا ہے۔ مقصد سب کا ایک ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے اُمت کی وابستگی میں اُمت کی وحدت کا راز پوشیدہ ہے۔

سب سے بڑا اخلاقی وصف

سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ اس ارشاد کے ذریعے قرآن نے صحابہ کرام کی اخوتِ ایمانی کا چہرہ پیش فرمایا ہے۔ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے۔ تو ان کو انصار نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انصاریوں کے سوا باقی زمین مہاجرین

کوٹے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ قرآن میں ذکر کیا۔

والذین تبوؤا الدار والایمان من قبلھم

آگ سے بھرا ہوا گڑھا

۱۸۹۔ حالانکہ تم اپنے ماضی میں آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ یعنی کفر و عصیان کی بدولت دوزخ کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے کہ موت آئی اور اس میں گرے۔ خدا تعالیٰ نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر بچا لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ایمان و اتفاق کی روشنی سینوں میں ڈالی۔ حق تعالیٰ کے ان عظیم الشان دینی و دنیوی احسانات کو یاد رکھو گے تو کبھی گمراہی کی طرف واپس نہ جاؤ گے[1]

یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کی کشت و خون جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی نے انہیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئیں اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اوس و خزرج کے وہ قبیلے جو سالہا سال ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے اور یہ دونوں قبیلے مکے سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبت کا برتاؤ کر رہے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے[2]

ارشاد میں نار سے نارِ جہنم مراد ہے یا نارِ حرب، صاحب تفہیم کی رائے میں آگ سے جنگ و جدال کی آگ مراد ہے۔ مفتی محمد عبدہ مصری کی ان کو ہمنوائی حاصل ہے جب کہ جمہور شارحین قرآن کے خیال میں نار سے نارِ جہنم مراد ہے جیسا کہ شیخ الاسلام کی تعبیر بتا رہی ہے۔ علامہ آلوسی نے آیت میں جنگ کی آگ کو ظاہر کے خلاف قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ حملھا علی نار الحرب بعید۔ ہم بھی جمہور کے ساتھ ہیں۔ بے شک اتحاد و اتفاق بھی نعمت ہے لیکن اصل نعمت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

وہ چیز ہے جس کے ذریعے اتفاق ہو ورنہ اتفاق واخوت کے تو اور بھی مظاہر ہیں۔

دُنیائے عرب کا عمومی جائزہ

قرآن اس ارشادِ گرامی کے ذریعے عرب کے عمومی جائزے کی طرف اشارا کر رہا ہے۔ انبیاء اور ان کی تعلیمات سے بعد، ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کی وجہ سے وہ دینی اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے چھٹی صدی میں وہ تنزل وانحطاط کے آخری نقطہ پر تھے۔ کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس میں دُنیا کے امام تھے۔ اخلاقی واجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔

غیر اللہ کی پرستش

جہالت وجاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول وعام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور رکمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بتوں اور مورتیوں کی صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ سے ان کا کلاً وقلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال انہیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور پورے ملک میں کھلی بت پرستی خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا دور دورہ تھا۔ شامی فاضل محمد عزت اللہ دروزہ نے اپنی کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم من القرآن میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اخلاقی واجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں گھر کر گئی تھیں۔ شراب عام طور پر پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کا تذکرہ، ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوتے ہے۔ عربی زبان میں جس کے نام اس کثرت سے ہیں اور ان ناموں سے جن باریک فرقوں کا لحاظ رکھا گیا اس سے اس کی مقبولیت اور عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن سیدہ نے المخصص میں ان ناموں سے الخمر کے تحت بحث کی ہے۔ شراب کی دکانیں بر سرِ راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر جھنڈا لہراتا تھا۔ جاہلیت کے مشہور شعراء مثلاً طرفہ اور لبید بن ربیعہ جو عرب کا

مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ انتہا یہ کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا مرادف بن گیا تھا۔

شراب نوشی کے ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا۔ عرب کے مال و دولت کا تمام سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لیے جوا بھی ان کے ذریعے کھیلا جاتا تھا۔ جوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی علامت تھی۔ اور ایسے شخص کو برم کا خطاب ملتا تھا۔ تفسیر کبیر میں امام رازی نے تفصیل پیش کی ہے۔ جو لوگ برم کا خطاب کر لیتے تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار فعال کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی محمد بن خالد اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

واذا هلکت فلا تزیدی عاجزا

عنساً ولا برماً ولا مغرا لا

اگر میں مرجاؤں تو میرے بعد تو عاجز، کمزور اور جوئے میں شریک نہ ہونے والے اور سفر میں لوگوں سے علیحدگی پسند سے شادی نہ کرنا۔

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلے میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے کرتے۔ زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا۔ اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے۔ اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے۔ زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔

خاندانی عصبیت

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا۔ وہ اپنے بھائی اور حلیف کی مدد کرنا ہر حال میں ضروری سمجھتے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیات کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے خاندان سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا۔ بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم میں شرکت پسند نہیں کرتے۔ ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا۔ ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا تھا جس سے بیگار لی جاتی اور کچھ عوام اور بازاری تھے۔

جنگ جوئی

ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرپیکار رہتا۔ ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس فرض کو انجام دیتا۔ اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا۔ ان ہی لڑائیوں کو اہل ادب اور مؤرخین ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد لکھا ہے۔

یہ فن شمار کا استقصار نہیں کر سکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔ (جلد ۳ ص ۳۷۱)

لوٹ مار اور غارت گری

عرب میں لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنہوں نے راہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو لصوص کہتے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے پیش گوئی کی کہ وہ دن آئے گا جب بصرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کرے گی تو وہ چونکہ قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ پھر طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے۔

چوری

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا۔ مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے۔

عام بدوعربوں میں یہ برائی جتنی عام ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے دوسری باتوں کے ساتھ اس بات کا بھی معاہدہ لیتے تھے کہ وہ آئندہ چوری نہ کریں گے بلکہ خود اللہ سبحانہ نے قرآن میں آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ایک ٹیڑھا لوہا (محجن) لگا رکھا تھا۔ حج کے زمانے میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ جس طرح عرب میں بطے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے۔ چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبائل تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب چوری کرتے تھے۔

سفاکی و بے رحمی

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے۔ زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی غذا تھی۔ زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے۔ مقتولوں کی ناک کاٹ ڈالتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتی تھیں۔ منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سزا دینے کا یہ ایک طریقہ تھا کہ مجرم کو درخت کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضا ان میں باندھ دیتے پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے۔ مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے سرپٹ دوڑا دیتے ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے۔ اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور روساء دیتے۔

قرآن کی اس آیت میں کنتم علی شفا حفرۃ من النار کی بلیغ تعبیر کے ذریعے ان ہی حالات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبوت کا علم و عمل آیا اس کے ذریعے اللہ نے تمہیں جہنم سے بچا لیا ورنہ تم تو اپنے ان اعمال و افکار کی وجہ سے دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے۔ یعنی جہنم میں جانے کے لیے صرف مرنے کی دیر تھی۔ اگر تم اس حالت میں مر جاتے تو تمہارا دوزخ کے سوا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایسے وقت میں اللہ نے تمہاری مدد کی کہ تمہیں کتاب اللہ اور رسول اللہ کی نعمت سے نوازا اور اس طرح جہنم سے بچا لیا۔

فلاح کا سیدھا راستہ

۱۰۹۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے کھول کر پیش کرتا ہے تاکہ تم راہ پالو۔
یعنی یہ باتیں اس قدر کھول کھول کر بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ ٹھیک راستہ پر چلتے رہو ایسی مہلک و خطرناک غلطی کا پھر اعادہ نہ کرو اور کسی شیطان کے اغوا سے استقامت کی راہ نہ چھوڑو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ تمہاری دین و دُنیا میں کامیابی نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستگی میں ہے۔ اس سے ہٹ کر اہلِ کتاب سے رشتہ جوڑنے میں تمہارے لیے فلاح نہیں ہے۔ نبوّت کے علم و عمل سے اگر زندگی کے تمام گوشوں میں ربط قائم رہتا ہے تو پھر سمجھ لو کہ یہ اعتصام باللہ ہے اور تمہارے قدم اس صراطِ مستقیم پر ہیں جو انبیاء و صدّیقین، شہداء اور صالحین کی شاہراہ ہے۔ اگر اس سے ہٹ کر زندگی کے مختلف احوال میں یہود و نصاریٰ سے تم نے رشتہ قائم کیا ہے تو پھر سمجھ لو کہ یہ المغضوب علیہم والضالین کی وہ راہ ہے جس سے قرآن تمہیں ہٹانا چاہتا ہے۔ اگر نبوّت کے علم و عمل سے وابستہ رہ کر اعتصام باللہ کے علمبردار رہے تو کامیاب ہو گے۔ اللہ کی ذات جامع الکمالات ہے اور اس کا رسُول مجمع الکمالات ہے: جامع الکمالات کی جانب سے مجمع الکمالات جو علم و عمل لے کر تشریف لاتے وہ دُنیا کا جامع ترین اور کامل ترین نظام ہے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرامین اور احکام کھول کر اس لیے بیان ہو رہے ہیں کہ تم آئندہ زندگی کے مختلف گوشوں اور نئے نئے حالات کے مختلف موڑوں میں اس نظام کے ذریعے ہدایت پاؤ اور ہدایت پاتے پاتے اس مقام پر پہنچ جاؤ کہ تمہارا چہرہ یہ ہو جائے اولٰئک علی ھدی من ربھم اور اس طرح تم پر زندگی میں فلاح و سعادت کی وہ تمام راہیں کھل جائیں گی جو رضائے الٰہی کا سامان ہیں چونکہ روحانی ترقیوں کی انتہا کوئی نہیں ہے اس لیے نبوّت کے لاتے ہوئے علم و عمل کی روشنی میں زندگی کے مختلف مراحل میں جب اُمت اجتماعی طور پر حرکت کرے گی تو ہدایت کے نئے نئے دروازے کھلتے جائیں گے اور اس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نوعِ انسانی کی پوری کامیابی

اس آیت کا یہ انکشاف بہتوں کے لیے حیران کن ہوگا کہ نبوت کے علم و عمل سے وابستگی میں نوعِ انسانی کی پوری کامیابی و سعادت حاصل ہوگی اور نبوت کی قیادت میں جو قدم بھی اٹھے گا وہ صحیح ہوگا اور صحیح منزل کی طرف اٹھے گا۔ دُنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہوگی۔ نبوت کا علم و عمل ہی اسلامی مملکت کی ابتدا اور اس کی نشوونما کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسلامی مملکت دراصل ایک عہدِ میثاق کے بعد وجود میں آئی ہے۔ جو ذاتِ الٰہی اور مسلمانوں کے مابین منعقد ہوا تھا۔ یہ میثاق اس اقرار سے عبارت تھا کہ مسلمان انفرادی و اجتماعی حیثیت سے نبوت کے علم و عمل کو اپنی زندگی اور اپنے افکار و اعمال کے لیے قبول کرتے ہیں۔ یہ اقرار تھا اس بات کا کہ آئندہ مسلمان کسی دوسرے علم و عمل پر اپنی فکری اور عملی قوتیں صرف نہیں کریں گے اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے جملہ مسائل میں وہ کسی اور قانون و ضابطہ یا کسی دوسرے آئین و دستور کی اطاعت قبول نہیں کریں گے بلکہ صرف نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل میں اپنے لیے ہدایت تلاش کریں گے۔ نبوت کے اس علم و عمل نے جس کی اطاعت کا عہد مسلمانوں نے ایمان کے ذریعہ کیا تھا۔ ان کی زندگی کے مقاصد ان کے اصولِ کار نیز ان کی معیشت و سیاست اور حیاتِ عائلی کا پورا خاکہ تیار کر دیا۔ لہٰذا اب ان کے تمام قانونی، سیاسی، عائلی اور دیگر تمام مسائل میں جو نبوت کے علم و عمل کی حدود میں آتے ہیں۔ اہلِ ایمان کی ایک ہی راہ ہو سکتی ہے جو بالکل متحد اور شائبۂ اختلاف سے پاک ہے۔ مقاصد کی یک جہتی اور اصولوں کی ہم آہنگی نے اسلامی معاشرہ میں وہ حالت پیدا کر دی جو آج کی سیاسی زبان میں ادارۂ عامہ کے وجود کی شرط ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور دیکھو! ضروری ہے کہ تم میں[۱۹۱] ایسی ایک جماعت ضرور ہو جو
بھلائی کی دعوت دے[۱۹۲] اور نیکی کا حکم دے برائی سے روکے[۱۹۳] اور
بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں[۱۹۴]۔

عالم کی نجات کی فکر کرو

شخصی نجات کو اجتماعی نجات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انفرادی زندگی میں کوئی شخص راست کرداری اور نیک عملی کی راہ میں استوار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا اجتماعی ماحول ان صفات کی نشوونما کے لیے سازگار نہ ہو۔ بڑے انسانوں اور مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر عام انسانوں کی ذہنیت اور سیرت بالکلیہ ان معاشرتی معیارات اور اخلاقی اقدار سے مبنی ہے جو ان کے خاندان اور سوسائٹی میں رائج اور حکمران ہوتے ہیں۔ جس معاشرے میں غلط معیارات، باطل اقدار اور پست اخلاقی تصورات کی فرماں روائی ہو وہاں کوئی شخص محض اپنے شخصی اعمال کی بنا پر مشکل ہی سے نجات کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے معاشرے میں فرد کی نجات کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کو بدلنے اور اپنی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات اور معاشرتی معیارات کو درست کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ جہاں کہیں برائی دیکھیں اسے مٹانے کے لیے جدوجہد کریں کیونکہ جو شخص کسی برائی پر صبر کرتا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش نہیں

کرنا وہ درحقیقت اپنی شخصی نجات کے امکانات کو کم کر رہا ہے مختصر یہ کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دُنیا بھر کی نجات کی فکر کرو۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو صرف اعمال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر انہیں تمام انسانوں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ زیرِ تشریح آیتِ قرآنی میں اللہ سبحانہ نے اسی اہم موضوع کی طرف اہلِ ایمان کو متوجہ کیا ہے اسی کو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔

امام رازی کی یہ تقابلی نکتہ آفرینی قابلِ قدر ہے کہ اللہ سبحانہ نے ابتدائی آیات یعنی ۹۸ اور ۹۹ میں اہلِ کتاب کی دو اجتماعی کمزوریوں کی نشاندہی فرمائی۔ ایک یہ کہ وہ ذاتی طور پر کفر کی آماجگاہ ہیں دوسرے یہ کہ وہ اجتماعی طور پر دوسروں کو کافر بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس کے مقابلے میں پہلے اہلِ ایمان کو نبوت کا لایا ہوا علم و عمل اپنانے کی دعوت دی اور پھر اسی علم و عمل کو سوغات بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اور آلوسی فرماتے ہیں کہ پہلی آیات میں اہلِ ایمان کی اپنی صلاح و درستگی کے بارے میں ہدایت کی تھی اب اس آیت میں دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے تاکہ اس طرح اہلِ ایمان ہادی اور مہدی بن سکیں۔ گویا پہلے کمال کا نسخہ بتایا اب دوسروں کی تکمیل کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔

کچھ کی ذمہ داری یا سب کی

۱۹۱۔ اور دیکھو ضروری ہے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہو۔ اصل ارشاد میں و لتکن منکم امۃ آیا ہے۔ اس میں شارحینِ قرآن کا اختلاف ہے کہ ارشاد میں لفظ من کچھ کے معنے میں ہے یا توضیح کے لیے آیا ہے۔ امام رازی کو اس پر اصرار ہے کہ اس آیت میں کچھ کی نہیں سب کی ذمہ داری بتائی جا رہی ہے۔ کیونکہ اولاً آنے والی آیت کنتم خیر امۃ میں اسی عمل کو اُمت کی خیریت کا مرکزی نقطہ بتایا جا رہا ہے۔ ثانیاً اسلام نے مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ جہاں بھی کہیں بُرائی دیکھیں اسے مٹانے کی ہر ممکن جدوجُہد کریں۔ ارشاد ہے کہ

جو شخص تم میں سے بُرائی دیکھے اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل سے اسے ضرور بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

اس لحاظ سے آیت میں لفظ من کچھ کے معنے میں نہیں بلکہ توضیح و بیان کے معنے دے رہا ہے

اور فقرہ کے معنے یہ ہیں کہ ضروری ہے کہ تم کو ایسی اُمت ہونا چاہیے۔ پوری اُمت کو اس کا مکلف بنانے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار سمجھے گا وہ لازماً اپنی اصلاح کی بھی کوشش کرے گا ورنہ سوسائٹی خود اسے ملامت کرے گی کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اسے اپنے اعمال دُرست کرنے چاہئیں۔ نیز اس فرض کی انجام دہی میں اس کا ضمیر بھی اس سے احتساب کرتا رہے گا۔

یہ کیسی اچھی منطقی ترتیب ہے کہ اولین طور پر باطل نظامات کے پیدا کیے ہوئے نظریات و افکار کو توڑنے کی ہدایت کی یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین پھر اسلامی معیار خیر و شر کو قائم کرنے کی یہ کہہ کر تلقین فرمائی یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ اور لا تموتن الا وانتم مسلمون اور بعدازیں معیارِ خیر و شر کے لیے محسوس و مرئی قانون بتایا کہ واعتصموا بحبل اللہ اور اب جب کہ خیر و شر کا تصور اور حق و باطل کا معیار عملاً قائم ہو گیا تو اسے باقی رکھنے کا ٹھوس منصوبہ بتایا۔ یہی بات شیخ الاسلام نے کیسے اچھوتے انداز میں فرمائی ہے "تقویٰ اعتصام بحبل اللہ اتحاد و اتفاق، قومی زندگی، اسلامی مواخات یہ سب چیزیں اس وقت باقی رہ سکتی ہیں جبکہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص دعوت و ارشاد کے لیے قائم رہے۔ اس کا وظیفہ یہ ہی ہو کہ اپنے قول و عمل سے دنیا کو قرآن و سنت کی طرف بلائے اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا بُرائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور بُرائی سے روکنے میں اپنی مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے"[1]

یاد رہے کہ یہ کام اگرچہ سب کی ذمہ داری ہے لیکن کچھ کے کرنے سے سب کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ فرض تو سب کا ہے لیکن عمل سب سے مطلوب نہیں ہے بالفاظِ دیگر اس آیت میں جو ذمہ داریاں اُمت پر ڈالی گئی ہیں وہ اُمت پر فرض ہیں۔ یعنی اگرچہ افراد کے لیے ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی ہے لیکن پورے اجتماع کے لیے وہ فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو افراد ان ہدایات کی تکمیل کے لیے ضروری وسائل رکھتے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کو بجا لائیں تاکہ متعلقہ اجتماعی مصلحت کا تحفظ ہو سکے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ حکم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرض کفایہ کہلاتے ہیں۔

انفرادی اور اجتماعی مقاصد

فرض کفایہ کے تحت عموماً ایسے احکام آتے ہیں جن کا تعلق پورے اجتماع کے مفاد و مصالح سے ہے۔ ان مفادات و مصالح کا تحفظ ضروری ہے۔ لہٰذا ان احکام کی تعمیل اور متعلقہ امور کا انجام پانا لازمی ہے۔

فرض کفایہ کی تعریف شیخ ابن الہمام نے التقریر والتحبیر میں ابن امیر الحاج کے حوالہ سے ان الفاظ میں کی ہے :

فرض کا مسئلہ یہ وہ کام ہے جس کا پورا ہونا شارع کو قطعی طور پر مقصود ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ اسے کون انجام دیتا ہے اس میں نماز جنازہ جیسے امور بھی شامل ہیں اور ضروری صنعتوں جیسے دنیوی امور بھی۔

علامہ شاطبی نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

علماء اصول کا کہنا ہے کہ کفائی حکم کا مخاطب اجتماع ہوتا ہے لیکن جب بعض افراد اسے بجا لاتے ہیں تو باقی افراد سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ کہنا اس حکم کی مجموعی حیثیت کے اعتبار سے درست ہے مگر جہاں تک اس کے جزئیات کا تعلق ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

عام حالات میں معاشرے کے کسی فرد کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت ایک ایسی اخلاقی ذمہ داری کی ہے جسے پورا کرنا بہتر ہے لیکن اس کے نہ کرنے پر اسے قابلِ ملامت یا مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ فرماتے ہیں :

فرائض کفایہ افراد کے لیے اخلاقی ہدایات کی حیثیت رکھتے ہیں۔[1]

امام شاطبی نے شریعت کے مقاصد اصلیہ کو ضروری انفرادی مقاصد اور ضروری اجتماعی مقاصد پر تقسیم کر کے فرض کفایہ کی تشریح اس طرح کی ہے۔

ان کے کفائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے حاصل کرنے کی ذمہ داری کسی مخصوص فرد پر نہیں بلکہ علی العموم سارے مکلفین پر ہے تاکہ وہ عام احوال درست

---

[1] الموافقات

رہیں جن کے بغیر انفرادی حالات درست نہیں رہ سکتے۔ مقاصد کی یہ قسم پہلی قسم یعنی ضروری انفرادی مقاصد کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کی طرح ضروری ہے کیونکہ عینی یعنی انفرادی مقاصد بغیر کفائی مقاصد کی تکمیل کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ کفائی مقاصد کا تعلق تمام بندگان خدا کے مشترکہ مصالح کے تحفظ سے ہے۔ اس اعتبار سے کفائی احکام کا مخاطب ایک ایسے امر کا مخاطب ہے جو مخصوص طور پر اسی پر نہیں عائد ہوتا۔ کیونکہ ان کاموں کا حکم اسے اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا تعلق صرف اس کی ذات سے ہے۔ ایسا ہوتا تو یہ حکم بھی عینی ہو جاتا۔ ان کا مکلف بنانے کا منشا یہ ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے۔ فرد کی اصل حیثیت بندگان خدا کے درمیان اپنی قدرت و استعداد کے مطابق خدا کے خلیفہ کی ہے مگر ایک فرد اتنی استعداد نہیں رکھتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی حالات درست رکھ سکے اور اپنے سارے اہل و عیال کی مصالح کی نگرانی کرتا ہے، کجا یہ کہ پورے قبیلہ یا ساری انسانیت کے مصالح کا تحفظ عمل میں لاسکے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشترکہ انسانی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری تمام لوگوں پر ڈالی ہے اور اسی بنا پر ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے۔[1]

شاطبی کی اس تشریح سے فرض کفایہ کی وہ نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جس پر ہم یہاں زور دینا چاہتے ہیں۔ ان فرائض کا تعلق ان اہم اجتماعی مصالح سے ہوتا ہے جن کا تحفظ ضروری ہے لہٰذا ان فرائض کی تعمیل ضروری ہے۔ یہ ایسے مصالح ہیں جن کے تحفظ پر بڑی حد تک انفرادی مصالح کا تحفظ بھی منحصر ہے۔ علمائے اصول فقہ کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرے میں جو لوگ جن کفائی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی دوسرے افراد کی بہ نسبت زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو پورا کریں۔ باقی لوگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں کہ ایسے صاحب استعداد و صلاحیت افراد ان ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوں۔ جیسا کہ شاطبی کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ کفائی امور کی انجام دہی کی نگران ریاست ہے اور انہی امور کا تحفظ بڑی حد تک ریاست کو وجود میں لانے کا سبب بھی ہے۔ افراد اگر اپنا اخلاقی فرض پہچانتے ہوں اور ان کے رضاکارانہ عمل سے یہ امور کما حقہ انجام پا جائیں تو ریاست کو قانونی ذرائع اختیار کرنے

---

[1] الموافقات

کی ضرورت نہ پیش آئے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے مناسب اقدامات کے ذریعے اس کا اہتمام کرنا ہوگا کہ یہ کام انجام پائیں۔ وہ معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے ان امور کی بجاآوری کا اہتمام براہ راست خود بھی کر سکتی ہے۔ پہلی صورت میں اسے اس بات کا حق ہوگا کہ وہ اصحاب استطاعت سے ان کاموں کے لیے مطلوبہ ذرائع و وسائل کی فراہمی کا مطالبہ کرے اور دوسری صورت میں وہ صاحب استعداد افراد کو ان امور کی انجام دہی پر مجبور کرنے کے لیے مناسب قوانین وضع کرے۔

یہ بحث دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے اس اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ اس نوعیت کے کام ہیں کہ ان کی بجا آوری ہر کردم کا کام نہیں ہے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ :

> ظاہر ہے کہ یہ کام وہی حضرات کر سکتے ہیں جو معروف و منکر کا علم رکھنے اور قرآن و سنت سے باخبر ہونے کے ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہوں۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی معروف کو منکر یا منکر کو معروف خیال کر کے بجائے اصلاح کے سارا نظام ہی مختل کر ڈالے یا ایک منکر کی اصلاح کا ایسا طریقہ اختیار کرے جو اس سے بھی زیادہ منکرات کے حدوث کا سبب ہو جائے یا نرمی کی جگہ سختی اور سختی کے موقع پر نرمی برتنے لگے شاید اسی لیے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا جو ہر طرح دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو۔ حدیث میں ہے کہ جب لوگ منکرات میں پھنس جائیں اور کوئی روکنے والا نہ ہو تو عام عذاب آنے کا اندیشہ ہے باقی یہ کہ کن حالات میں اور کن اوقات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک میں آدمی معذور سمجھا جا سکتا ہے اور کن مواقع میں واجب یا مستحب ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ابو بکر رازی نے احکام القرآن میں اس پر نہایت مبسوط کلام کیا ہے [1]

دعوت الی الخیر

۱۹۲ - جو بھلائی کی دعوت دے ۔ عربی میں خیر کے معنے میں بڑی وسعت ہے ایسے تمام

[1] افادات شیخ الاسلام

اعمال خیر کہلاتے ہیں جو فضائل کے درجے کے ہوں۔ اس کی جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے افکار و اعمال، اخلاق، معاملاتی اقدار، معاشرتی آداب سب اس کے دامن میں سمٹے ہوئے ہیں۔ اسلام صرف ایک کا تناتی نظریہ نہیں بلکہ وہ انسان کی جہات انفرادی و اجتماعی کی تعمیر و تاسیس کا ایک عملی پروگرام ہے۔ یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک مخصوص اخلاقی سانچے میں ڈھالتا ہے اور افراد انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن اسلام اس بارے میں دیگر ادیان و مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے کردار و عمل کی اس تبدیلی کو جس کا مطالبہ ہر مذہب میں موجود ہے انسان کی خانگی عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا۔ نیز اس نے اخلاق اور خیر کے اصولوں اور دینی اقدار کو انسان کی جہاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں سے صرف اللہ کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ انہیں عالمِ انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئت اجتماعی میں وہ بنیادی تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں صادق ہیں جس حد تک انسان اپنی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی میں یہ تبدیلیاں پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے اسی حد تک اس کا ایمان ناقص رہتا ہے۔ غرض کہ اسلام صرف ایک طرزِ فکر نہیں ہے جو انسانی زندگی کی اجتماعی فلاح و بہبود اور اس کے نظامِ اجتماعی کے صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک جیتا جاگتا دستور العمل ہے جس کو سوغات بنا کر پیش کرنا ایک مسلمان کا فرض ہے۔ قرآن اسی کو دعوت الی الخیر کہتا ہے چونکہ اس میں برائی اور شر کا کوئی پہلو نہیں سرتا سر خیر ہے اور سب کے لیے خیر ہے اس لیے آیتِ قرآنی میں اسے خیر کہا گیا ہے اسی بنا پر ابن جریر نے خیر کی تشریح اسلام سے کی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر خیر سے مراد اسلام ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ خود حضور انور کا ارشاد ہے کہ الخیر اتباع القرآن و سنتی اگر یہ روایت تاریخی طور پر صحیح ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نبوت کے علم و عمل ہی کا نام اسلام ہے۔ قرآن کا اسلام کو خیر کہہ کر پکارنا بتا رہا ہے کہ اسلام پوری انسانیت کے لیے سرتا سر خیر کا پیغام ہے۔

اسلام کی سوغات لے کر نکلو

قرآن کی ہدایت بتا رہی ہے کہ اسلام کو تحفہ، سوغات بنا کر دُنیا کے انسانوں کے سامنے لے جانا مسلمانوں کا مشن ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔ دعوت کے لفظی معنے بلانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنے ہیں کہ جس چیز کو نبوت کے علم و عمل نے اچھا سمجھا ہے اور اچھا سمجھ کر جسے ہم نے اپنایا ہے اس کی اچھائی اور خوبی کی طرف دوسرے لوگوں، دوسری قوموں اور ملکوں کو دعوت دیں۔

دعوت کی اہمیت

قرآن نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں حقدار قرار دیا اس لیے اپنی دعوت کے لیے قریش وغیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں کی بلکہ دُنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں اس فرض کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ حضرت علی سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دُنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔[1]

دراصل اسلام سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنے قریب کی زمین کو پھر آگے پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے یہ انتظام کیا ہے کہ مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا کہ ان میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو دعوت الی الخیر کا کام کرے اور لگاتار کرتی رہے انداز بیان بھی بتا رہا ہے کہ یہ کام انفرادی تلقین و ہدایت سے نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ہونا چاہیے اور اجتماع کی نیابت اسلامی حکومت کرتی ہے اسے اپنے اختیار و قوت سے یہ کام انجام دینا چاہیے مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ اگر حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں۔

---

[1] صحیح مسلم

دعوت اور اس کے لوازم

دعوت کے کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لیے چند باتیں ضروری ہیں۔ اوّلاً یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کی جائیں جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید و رسالت اور آخرت پر جس زور سے اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں اس کا اتباع دعوتِ اسلام کی بڑی اور بنیادی ضرورت ہے۔ اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام نے جو احکام دیے ہیں انہیں بھی تفصیل سے پیش کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔ اور اس کی پیروی کس طرح دنیوی زندگی کی بھی خوشگواریوں کی ضامن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داعی اسلام سے بھرپور آشنائی رکھتا ہو۔

ثانیاً غیر اسلام پر سنجیدہ تنقید کی جائے اس تنقید کے لیے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر اسلامی دنیا پیروی کر رہی ہے اور جو اس وقت کے مذہبوں، تہذیبوں، فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اچھی طرح معلوم کیا جائے کہ وہ کیا دلیلیں ہیں جن پر یہ نظریات قائم ہیں۔ اس کے بعد ان نظریات کی پوری قوت سے تردید کی جائے۔ اور اس طرح کی جائے کہ ان کا غیر عقلی، غیر منطقی اور غیر فطری ہونا بالکل کھل جائے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ اُن نظریات کے پیدا کیے ہوتے ان عملی نتائج کو بھی انگلی رکھ کر بتایا جائے جنہیں کسی طرح بھی انسانیت کے لیے خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید دعوتِ اسلام کی راہ کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے اور اس کے بغیر یہ فریضہ صحیح طور سے ادا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اسلام کی دعوت ایک نئی تعمیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

ثالثاً اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دلنشیں اور جدید ترین انداز کا ہو۔ اس زبان میں جس سے وقت کا انسان مانوس ہے، اس طرز سے ہو جو آج کے ذہنوں کو اپیل کر سکتا ہو۔ اس طریقے کا جسے سائنس کا یہ دورِ بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیونکہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں بلکہ اسلام کی دعوت کی توضیح کے لیے ہے۔ وہ توضیح توضیح نہیں جس کے بعد بھی مخاطب بات کو نہ پا سکے اور وہ دعوت دعوت نہیں کہی جا سکتی جو اپنے پیغام کو دلوں اور دماغوں تک نہ پہنچا سکے۔ اس

لیے ضروری ہے کہ اپنی بات کہتے وقت مخاطب کا ذہن اور اس کا ذوق بھی لازماً سامنے رہے۔ اور بحث و استدلال کا انداز وہ ہو جسے وہ بحث و استدلال کا انداز سمجھتا ہو۔ قرآن حکیم نے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان، اندازِ بیان اور طرزِ استدلال وہی اختیار کیا جس سے اہلِ عرب مانوس تھے۔

رابعاً اس دعوت کے پیچھے کوئی قومی غرور کوئی حریفانہ جذبہ اور کوئی مناظرانہ ذوق ہرگز نہ کام کر رہا ہو بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و للہیت کے ساتھ نکلے۔ محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر نکلے۔ اس حال میں نکلے کہ بندگانِ خدا کی گمراہیوں پر اندر سے دل کڑھ رہا ہو اور انہیں ایسا محسوس ہو رہا ہو کہ یہ اسلام کا داعی ہم سے کچھ لے نہیں رہا ہے بلکہ ہمیں کچھ دے رہا ہے اور ایک بڑی نعمت دے رہا ہے۔

خامساً اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں موجود ہو اسی لیے دعوت کی ہدایت سے پہلے اہلِ ایمان کو یہ تلقین کی ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے اس طرح بچو جیسے کہ حق ہے اور اوامر الٰہیہ کے سامنے سر جھکا دو اور اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لو۔ کیونکہ اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہیں، برف میں ٹھنڈک نہ ہو تو وہ برف نہیں اور آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ نے تمام اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے پورے زور کے ساتھ فرمایا کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہئیں۔ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملاً ترجمان ہوں، انہیں توحید، آخرت اور رسالت وغیرہ عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ ان کے معاملات ان ہی خطوط پر انجام پائیں جو کتاب و سنت نے مقرر کر دیے۔ ان کی معاشرت ان کی معیشت اور ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کی ایک ایک شاخ اسی نقشہ کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ اور رسولؐ نے بنا کر دیا ہے۔ تاکہ دُنیا اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے کہ اسلام کسے کہتے ہیں وہ کس قسم کے افراد کس قسم کا معاشرہ اور کس قسم کا اسٹیٹ وجود میں لانا چاہتا ہے۔

عملی دعوت کا مرتبہ علمی دعوت سے مقدم تر بھی ہے اور اہم تر بھی۔ ایک تو اس لیے کہ جب تک

کوئی شخص یاگروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کررہا ہو۔ اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے نہ صرف یہ کہ ایسی دعوت دینا اسے زیب نہیں دیتا بلکہ نتیجہ کے اعتبار سے بھی یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کا شاید کسی پر کوئی اثر پڑسکے۔ دوسرے اس لیے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت اصلاً عملی دلائل ہی کی زبان سمجھتی ہے۔ عقلی دلائل تک اس کی رسائی بہت کم ہوتی ہے۔

یہ ہے یدعون الی الخیر کا پورا مفہوم اور معیاری طریقہ۔ اُمتِ مسلمہ کی عملی کوششیں اس معیار کے جس حدتک قریب پہنچیں گی اسی حدتک وہ اپنے فرض میں کامیاب اور اپنے مقصد میں بامراد ثابت ہوں گی اور جس حدتک یہ کوششیں اس معیار سے دُور ہوں گی اسی حدتک وہ ناکام و نامراد رہے گی۔

ہم اس موقعہ پر وہ تمام تصریحات قصداً چھوڑ رہے ہیں جن کا ذخیرہ شرح شرعۃ الاسلام، احیاء العلوم اور اتحاف السادۃ المتقین میں موجود ہے کہ داعی کے لیے عادل ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ ہماری رائے میں یہ تفصیل امر بالمعروف نہی عن المنکر اور احتساب سے متعلق ہے اور اس کا قانونی درجہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے اور قرآن حکیم نے دعوت کی جو حقیقت ہمیں بتائی ہے وہ تمام تر یہی ہے۔ دعوت کا حق سب سے اوّل اس شخص کو حاصل ہے جو خود ایمان و عمل صالح کا پیکر ہو۔ قرآن نے خالص دعوت کے موضوع پر داعی کے کردار کے لیے دوسری قید لگائی من احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین۔ اس شخص سے زیادہ اچھی بات والا کون ہوگا جو اللہ کی طرف دعوت دے اور عمل صالح کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ بہرحال یہ مقام زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔

امر بالمعروف

معروف کے معنی پہچانا، یعنی ایسا کام جس کی اچھائی جانی پہچانی ہو۔ عرف یعرف سے مفعول کا صیغہ ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

عرف عارفہ معروف ہر اس امر کو کہتے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کا کرنا ضروری اور اس کا ہونا اس کے نہ ہونے سے بہتر ہے۔

قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ہر وہ اچھی عادت جس کو عقل پسند کرے اور جی اس پر مطمئن ہو معروف کا لفظ قرآن وحدیث میں بہت جگہ آیا ہے اس کے معنے ہر نیک کام جس میں اللہ کی

اطاعت ہو یا لوگوں سے اچھا سلوک ہو یا جس کام کی قانون نے ترغیب دی ہو۔ معروف حسن صحبت اور معاشرہ کو بھی کہتے ہیں۔ مروت اور احسان کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں حسن گفتار، حسن اخلاق، حسن کردار، حسن معاملہ، حسن معاشرہ، حسن سلوک، حسن ادا اور انسانی اقدار سے متعلق ہر نیکی کو معروف کہا گیا، حدیث میں ہے کل معروف صدقۃ ہر نیکی صدقہ ہے۔ ایک اور ارشاد ہے معروف یعنی حسن سلوک والے قیامت کے روز معروف کی وجہ سے بخشے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں غریبوں پر رحم کر کے ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ گویا قرآن وسنۃ کی زبان میں لفظ معروف تمام اخلاقی، مالیاتی، انتظامی، معاشی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی فضائل اور خوبیوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔ خالص فوجداری ضابطہ کو بیان کرتے ہوئے جب یہ بتایا کہ قتل صرف فوجداری جرم نہیں بلکہ فرد پر شخصی حیثیت میں دیوانی بھی ہے جان کا بدلہ جان یا پھر جان کا بدلہ مال ہو۔ اگر کوئی کچھ مال نہیں لیتا اور معاف کر دیتا ہے تو مقتول کے وارثوں کو چاہیے کہ مطالبہ میں معروف کو اپنائیں یعنی رقم کا مطالبہ معقولیت اور آدمیت سے کرو فاتباع بالمعروف۔ خالص دیوانی معاملہ میں ارشاد ہے الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف یعنی پسندیدہ طریقہ پر، عقل کی رعایت سے حاجت کا لحاظ کر کے حسن معاملت اور حسن معاشرہ دونوں قسم کے احکام کے موقعہ پر قرآن میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔ معاشرۂ انسانی میں ساری اخلاقی قدروں اور سارے حقوق کو اگر کوئی لفظ اپنے دامن میں سمیٹتا ہے تو وہ یہی لفظ معروف ہے۔ اخلاق میں زبان کی سچائی، دل کی سچائی، عمل کی سچائی، عفت و پاکبازی، دیانتداری اور امانت، شرم و حیاء، رحم، سخاوت، عدل و انصاف، عہد کی پابندی، احسان، عفو و درگزر، حلم و بردباری، رفق و لطف، تواضع و خاکساری، خوش کلامی، ایثار، اعتدال اور میانہ روی اور حقوق میں والدین کا حق، اولاد کا حق، تعلیم و تربیت، حقوق زوجین، اہل قرابت کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق، بیوہ کے ساتھ حسن سلوک، یتیموں کے حقوق، حاجت مندوں کے، بیمار کے حقوق، غلاموں کے حقوق، مہمان کے حقوق، مسلمانوں کے باہمی حقوق، انسانی برادری کے حقوق، جانوروں کے حقوق یہ سب معروف ہیں۔

ارشاد ہے صنائع المعروف تدفع میتۃ السوء وتقی مصارع الھوال معروف کا کردار خواہ کچھ ہو یہ بُری موت کے لیے دافع ہے اور ذلت و رسوائی سے بچاتا ہے۔

ایک اور ارشاد ہے معروف سے زیادہ بزرگی والی چیز سوائے معروف کے ثواب کے کچھ نہیں ہے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں امر بالمعروف کے ارکان و شرائط پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

آزادیٔ اظہارِ رائے

جسے آج کی سیاسی زبان میں آزادیٔ اظہار کہتے ہیں قرآن اسے امر بالمعروف کہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نیکی کا حکم کرنا نہ صرف مسلمان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لیے لوگوں سے کہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔

پہلے فقرے میں دعوتی جہاد کو بتایا تھا اب اس فقرے کے ذریعے داخلی جہاد کی ترغیب دی جارہی ہے۔ داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکیوں، خوبیوں، اور اچھائیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کو پروان چڑھنے کے وسائل کو بروئے کار لایا جائے۔ اسی کا نام امر بالمعروف ہے۔ امر کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر کرنے کا ہے اور اس انداز پر کرنے کا ہے کہ یہ کام کرنے والا ایک آمر کی حیثیت میں معاشرے کے سامنے آئے۔

نہی عن المنکر

۱۹۳۔ برائی سے روکے۔ انسانی زندگی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اجتماعیت پسند ہے۔ افراد کے جملہ مادی اور روحانی مفادات اجتماعی اہتمام کے طالب ہیں۔ یہ اجتماعیت صرف مفادات کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ افراد کے جملہ مفاسد کو دور کرنے کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ مادی حالات کی بہتری ہو یا معاشرتی فضا کی وابستگی، سیاسی نظم و استحکام ہو یا روحانی تربیت و تزکیہ بغیر اجتماعی کوششوں کے ان مفاسد کو پوری طرح دور کرنا ممکن نہیں ہے۔ زندگی کی صحیح تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ افراد میں اس کی لگن پائی جائے اور اجتماع ان تعمیری کوششوں کی ذمہ داری لے۔ کیونکہ اگر سماج غلط رخ پر جارہا ہو تو اس کے انجام سے ہر فرد کو دوچار ہونا پڑے گا خواہ اس کا ذاتی رجحان کچھ بھی ہو۔ زندگی کی اس اجتماعی نوعیت کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل کے ذریعے سمجھایا ہے۔

> اللہ سبحانہٗ کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنے والوں اور ان سے تجاوز کرنے والوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر نیچے کے حصوں میں

پر سے ڈالیں۔ ایک گروہ کو اوپر کا حصہ ملے اور دوسرے گروہ کو نیچے کا حصہ۔ نیچے والوں کو جب پانی کی ضرورت پیش آتی ہو تو اوپر جانا پڑتا ہو۔ یہ دیکھ کر وہ یہ اسکیم بنائیں کہ اگر ہم اپنے حصہ میں کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ کر لیں تو اوپر والوں کو زحمت دینے سے بچ جائیں گے۔ نیچے والوں کی اسکیم پر اگر اوپر والے خاموش رہ جائیں اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں ان کو کر گزرنے دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سب ایک ہی ساتھ ہلاک ہوں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کو روک دیں گے تو خود بھی محفوظ رہیں گے اور سب کو تباہی سے بچا لیں گے۔[1]

گویا زندگی کی یہ کشتی چند افراد کی حماقت سے ڈوب سکتی ہے اور جب کشتی ڈوبے تو پوری اُمت ڈوبے گی۔ لہٰذا اجتماع کا فرض ہے کہ اپنے افراد پر نگاہ رکھے۔ ایسا کرنے میں خود اس کی بھلائی مضمر ہے اور ان غلط کار افراد کی بھی۔ کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہے کہ آزمائش کی انفرادی نوعیت کا مطلب یہ ہے کہ افراد کو سماج دشمن سرگرمیوں کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ قرآن اس سادہ لوحی سے بری ہے اس کا اصول یہ ہے کہ اجتماعی مفاد کی خاطر غلط کار کو ایسی حرکتوں سے باز رکھا جاتے خواہ اس کے لیے سیاسی طاقت اور جبر سے کام لینا پڑے اگر اجتماع اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے گا تو اس کا وبال پورے اجتماع کو بھگتنا پڑے گا۔

کمالِ ایمان کے دو درجے

پہلا کمال تو آپ سُن چکے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا، اوامرِ الٰہیہ کے سامنے سرنگوں ہونا، اللہ کی رسی مضبوط تھامنا۔ یہ کمال تو ذاتِ مومن کے ساتھ صفتِ ایمان کے قیام کے لیے ناگزیر ہے۔ لہٰذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی درجہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو پھر وہ مومن ہی نہیں ہے۔ دوسرا کمال جس کا ہونا مومن کے لیے نہیں بلکہ اس کے کامل و مکمل اور بلند مرتبہ اور عالی شان مومن ہونے کے لیے ضروری ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ کمالِ ایمان کے یہ درجے جن کا قرآن نے یہاں ذکر کیا ہے صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔ جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہوگا اس کے لیے یہ کب ممکن ہے کہ بُرائی دیکھے اور اُسے

---

[1] بخاری کتاب الشرکہ

مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

مجھ سے پہلے کسی اُمت میں اللہ سبحانہ نے کسی نبی کو روانہ نہیں کیا مگر اس کی اُمت میں ایسے لوگ ضرور گزرے ہیں جو اس کے معین، مددگار، اس کے طریق کار کے متبع اور اس کے ہر حکم کے پیرو کار ہوتے تھے۔ پھر ان کے بعد ان کے جانشین کچھ ایسے بداطوار ہوئے جن کے قول و عمل میں بڑا فرق تھا جو بات اپنی زبان سے کہتے اس پر عمل نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا ان کو حکم نہ تھا۔ جس شخص نے ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے زبان سے ان کی تردید کی وہ مومن ہے اور جس نے صرف قلبی ناگواری پر کفایت کی وہ بھی مومن ہے اس کے بعد ایمان کا ایک رائی کے برابر بھی جز نہیں ہے۔[1]

امام مسلم نے اس حدیث کو طارق ابن شہاب کے واسطہ سے بھی روایت کیا ہے اس میں ان مراتب ثلاثہ کو قوتِ استطاعت و قدرت کے ساتھ مقید کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

تم میں جو شخص کوئی بات شریعت کے خلاف دیکھے اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اصلاح کر دے اگر اتنی قدرت نہ ہو تو زبان سے اس کی مخالفت کرے اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اس سے کیا کم کہ اپنے دل میں اس کی ناگواری برابر محسوس کرتا ہے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔[2]

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد دراصل اُمت مسلمہ کو یہ بتانا ہے کہ آئندہ چل کر اسے یہ حالات درپیش آئیں گے اور جب یہ حالات پیش آئیں تو اسے کیا کچھ کرنا ہو گا۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ اول یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو برائی بھی رونما ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے۔ دوم یہ کہ اس جہاد کی عملی صورتیں کیا کیا ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے ؟

سب سے افضل صورت یہ ہے کہ اس برائی یا ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں طاقت استعمال کی جائے اور اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دیا جائے لیکن اگر اتنی جرأت

---

[1] مشکوٰۃ [2] صحیح مسلم

نہ ہو کہ کسی معنے اور کسی شکل میں بھی ہاتھ کی قوت استعمال کی جاسکے تو پھر زبان کی قوت سے کام لیا جائے، برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے، نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے، آخرت یاد دلائی جائے اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و تنبیہ بھی کی جائے۔ اور اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو تو ایسا لازماً کیا جائے کہ اس برائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے۔ آنکھوں میں وہ کانٹا بن کر چبھتی رہے، آرزو کی جائے کہ یہ برائی جلد سے جلد مٹ جائے دعائیں کی جائیں۔

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں ہر شکل جہاد ہے۔ کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے اور اسلام کی دعوت کی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ اور حق کی خاطر کوشش کا نام ہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ایمان کے تین درجے

اس ارشاد نبوت میں ایمان کے تین درجے بتائے گئے ہیں۔ اعلیٰ، درمیانہ اور ادنیٰ۔ ان میں سے ہر ایک درجہ کا تقاضا جدا اور ہر ایک کی علامت علیحدہ علیحدہ ہے۔ سب سے ادنیٰ درجہ کی علامت یہ ہے کہ منکرات سے دل میں ہر وقت نفرت و کراہت ہو یعنی جب کہیں کوئی منکر نظر آئے تو فوراً دل میں اس کے خلاف ناگواری محسوس ہو۔ قرآن میں بھی اس کی طرف اشارا موجود ہے۔

وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان

اور اللہ نے تمہارے دلوں میں کفر بدکاری اور اپنی نافرمانی کے خلاف کراہت ڈال دی ہے۔

اس کراہت کے بھی مرتبے ہیں سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ خدا کی زمین سے کفر و فسق کو اپنی قوت بازو سے مٹا ڈالے اور اس سے کم یہ کہ دل میں اس کے خلاف ناگواری محسوس کرے۔ اگر اتنا احساس بھی نہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اس میں ایمان کی کوئی نشانی بھی نہیں ہے۔ اگر ایسا شخص تمہیں نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں ازالہ منکر کے لیے ایمان کے مطابق دل کی ناگواری بھی موجود نہیں ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اثر پیدا نہیں کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان

ہیں بتلایا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں بلکہ تصدیق و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی مجموعہ پر اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس تمام میں جن باتوں پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے ان میں نہی عن المنکر کے سلسلے میں صرف یہی تین باتیں ہیں۔ برائی کو ہاتھ سے مٹانا ان میں سب سے اونچا ہے اور انکارِ قلبی سب سے کمتر ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ ازالہ منکر کے لیے حرکت نہیں کرتا۔ اس کی زبان روکنے کے لیے نہیں ہلتی اور اس کا قلب اندرونی طور پر انکار کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو اب اس کے بعد اعمالِ ایمانی میں ایسا کوئی عمل نہیں ہے جس کی ادائیگی پر اس کو کسی ادنیٰ ثواب کا بھی استحقاق ہو۔ محدثین کے یہاں چونکہ اعمال ایمان کے اجزا شمار ہوتے ہیں اس لیے اس حدیث میں اجزاء ایمان کی نفی سے اعمال کی نفی مراد ہے۔ اور اس کے بعد ایمان کا رائی برابر بھی درجہ باقی نہیں ہے کا ٹھیک مطلب یہی ہے یعنی انکارِ قلبی کے بعد اب رائی برابر بھی ایمان کا کوئی جزو نہیں ہے جس پر اجر مرتب ہو سکے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے بعد وہ شخص مومن ہی نہیں رہتا۔

اسلام میں محکمہ احتساب

امام غزالی نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنوان قائم کر کے اسی کے تحت احتساب کو بیان کیا ہے۔ دراصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک جامع فریضہ ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اسلامی حکومتیں خصوصی اہتمام کرتی ہیں اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ابتدائی دور میں ہی اسلامی حکومتوں نے ایک علیحدہ شعبہ قائم کر دیا تھا جس کا نام حسبہ رکھا تھا۔ اس شعبہ کا کام یہ تھا کہ اگر کسی معروف کو عملاً ترک کیا جا رہا ہو یا کسی منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اور یہ خرابیاں علانیہ نمودار ہو جائیں تو ان کو دُور کیا جائے اور ان کا سدِ باب کیا جائے۔ ماوردی اور ابو یعلیٰ نے الاحکام السلطانیہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس موضوع پر جو تصانیف ہمارے پیشِ نظر ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مثال کے طور پر ہم علامہ محمد بن محمد بن احمد القرشی المعروف بابن الاخوۃ کی کتاب معالم القربۃ فی احکام الحسبہ کا مختصر تعارف کرائیں گے۔ مصنف نے اپنے زمانہ کی مختلف صنعتوں، پیشوں اور کاروباری سرگرمیوں کا جائزہ لے کر اصلاحِ اُمور کی نشاندہی کی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اتحاف السادۃ المتقین میں مساجد، بازار، شاہراہوں، حماموں، ہوٹلوں اور عام شہری زندگی کے منکرات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مباحث کے علاوہ ابن الاخوہ نے احتساب کی اہمیت

اس کے آداب اور اس کے دوسرے متعلقات پر گفتگو کی ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف رقمطراز ہے۔
ان منکرات کے قبیل کی بہت سی اور چیزیں ہیں جن پر اسی طرح بحث کی جاسکتی ہے اور جو انہی کی طرح حرام ہیں۔ آپ ان کے بارے میں اپنی قوت فیصلہ استعمال کیجئے اور جن امور کی نسبت صاف اور واضح نہ ہو ان کے بارے میں اپنے علم کی رہنمائی میں فیصلہ کیجئے بدعت پر خاموشی اختیار کر لینا اس پر راضی ہو جانے کے مترادف ہے۔ منکرات کی یہ بحث طویل ہے کیونکہ منکرات بے شمار ہیں اور ان کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

یہ بحث بے حد طویل الذیل ہے۔ ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ تفصیل انشاء اللہ پارہ ششم میں ملے گی۔

کامیاب و کامران جماعت

۱۰۴ - بلاشبہ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ فلاح عربی زبان میں بڑے وسیع معنے رکھتا ہے۔ دُنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لیے المفلحون کا پورا ترجمہ کامیاب و کامران اور بامراد وغیرہ کسی اُردو لفظ سے ہونا دشوار ہے۔ امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ زبان وادب کے ماہروں کا فیصلہ ہے کہ عربی زبان میں جامعیت خیر کے لیے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔
یہ انداز عربی زبان میں حصر وخصوصیت کے معنے بتانے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کامل بس ان میں محصور ہے اور بقول مولانا محمد اور بس جو ایسا نہیں کرتے وہ سراسر نقصان اور خسارے میں ہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ ؛
یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر فلاح کا مدار ہے۔
اور علامہ زبیدی رقمطراز ہیں کہ :
فلاح ان میں ہی ہے ان کے علاوہ نہیں ہے۔ فلاح دو قسم کی ہے دنیوی اور اُخروی۔ دُنیوی یہ کہ موجودہ زندگی خوش حال اور سعادت سے ہمدوش ہو جائے اور اُخروی یہ کہ چار چیزیں حاصل ہو جائیں۔ اوّل ایسی زندگی جس کو موت نہ ہو، دوم ایسی عزت جس میں ذلت کا نام ونشان نہ ہو، سوم ایسا غنا کہ جس میں فقر نہ ہو، چہارم ایسا علم کہ جس میں نادانی نہ ہو[1]

[1] اتحاف السادۃ المتقین۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ
وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ
وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

اوران لوگوں کی طرح نہ ہونا جو جُدا جُدا ہو گئے اور کھلی واضح آیات آنے کے باوجود باہم اختلاف میں پڑ گئے[۱۹۵]۔ اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے[۱۹۶]۔ جس روز کچھ چہرے تو چمکیں گے اور کچھ سیاہ ہوں گے[۱۹۷]۔ جن کے چہرے کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا تم نے ایمان کے بعد راہِ کفر کیوں اختیار کی تھی اب اس کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو[۱۹۸]۔ اور جن لوگوں کے چہروں پر چمک ہو گی وہ اللہ کی رحمت میں

ہوں گے وہ ہمیشہ رحمتِ الٰہی میں رہیں گے۔[199]

نبوت کے علم وعمل سے جدائی اور اختلاف

جس طرح نسل و توارث کے رشتوں نے خاندان کی بنیاد ڈالی ہے اسی طرح کتاب اللہ اور رسول اللہ سے ایمان وطاعت کے رشتوں نے اجتماعیت کی بنیاد استوار کی ہے۔ اسی کو قرآن نے حبل اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو ہم نبوت کا علم وعمل اور زبانِ شریعت میں کتاب وسنت کہتے ہیں۔ اجتماعیت افراد کے فطری رجحانات و دواعی سے ابھرتی ہے۔ اجتماعِ افراد کے جذبۂ اخوت و تعاون کا عملی مظہر ہے افراد اس کے ذریعے اپنے مشترکہ مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ اجتماع فرد کے لیے رحمت ہے کہ یہ ہر فرد کے تمام مادی اور روحانی مفادات کا نگران و محافظ ہے اور ان کی ترقی و تزکیہ کا ذریعہ ہے۔ اسی کے بطن سے ریاست اور دوسرے اجتماعی ادارے جنم لیتے ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تعمیر و تزکیہ کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن نبوت کے علم وعمل کے ذریعے اپنے ماننے والوں کے تمام افراد میں ایسی اجتماعیت چاہتا ہے وہ کہتا ہے کہ تمام افرادِ امت دراصل ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد ہیں۔ نبوت کے علم وعمل سے رشتہ ان کا نسب ہے۔ بلاشبہ ان میں سے ہر فرد کا فرض ہے کہ اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے اس رشتہ کو قائم رکھے۔ اس کا یہ حق نہیں ہے کہ اپنی نیکی کو اپنے ہی لیے سمجھ لے اور اپنے بھائیوں کی اس کے ذریعے خدمت نہ کرے۔

ایمان کا دامن امر بالمعروف کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تم ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں نبوت کے علم وعمل سے وابستہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ اگر تم نبوت کے علم وعمل سے وابستہ نہیں ہو تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اس لیے کسی حال میں نبوت کے علم وعمل سے جدا نہ ہو۔ اس سے جدائی تمہارے رشتہ وحدت کو پامال کر دے گی۔ یہی دنیا میں تمہارے قیام و بقا کی اصلی بنیاد ہیں۔ اس سے ہٹ کر تم اختلاف کا شکار ہو جاؤ گے اور جس نے نبوت کے علم وعمل سے وابستہ زندگی کی جگہ اس سے علیحدگی اور اختلاف کی بے نتیجہ زندگی اختیار کی تو اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔

اُمتوں میں تفرق اور اختلاف

۱۹۵ - اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو جُدا جُدا ہو گئے ۔ اور کھلی واضح آیات کے باوجود باہم اختلاف میں پڑ گئے ۔ یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو جو خدا تعالیٰ کے صاف احکام پہنچنے کے بعد محض اوہام و اہوا کی پیروی کر کے اُصول میں متفرق اور فروع میں مختلف ہو گئے ۔ آخر فرقہ بندیوں نے ان کے مذہب و قومیت کو تباہ کر ڈالا ۔ اور سب کے سب عذاب الٰہی کے نیچے آ گئے ۔ [1]

یہ اشارہ ان اُمتوں کی طرف ہے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں سے دین حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدت گزر جانے کے بعد اساس دین کو چھوڑ دیا ۔ اور غیر متعلق ضمنی و فروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کیے ۔ پھر فضول لایعنی باتوں پر جھگڑے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انہیں اس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے سپرد کیا تھا اور نہ عقیدہ و اخلاق کے ان بنیادی اصولوں سے کوئی دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح و سعادت کا دارومدار ہے ۔ [2]

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات پر غور کیجئے تو یہ حقائق سامنے آئیں گے کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہو گئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنے ہے اور پھر یہ کہ جن لوگوں کو اللہ سبحانہٗ یہ سرفرازی بخشتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں نبوت کے علم و عمل کی رسی پکڑاتا ہے ۔ اگر وہ اپنی شامتِ اعمال سے اس رسی کو چھوڑ کر دوسری اور کوئی رسی پکڑ لیتے ہیں تو ان کو ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اس دُنیا کی زندگی میں نبوت کے علم و عمل سے ہٹ کر دوسروں کے علم و عمل کے ہو کر رہ گئے اور نبوت کی صاف اور واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے نبوت کے علم و عمل میں اختلاف کے شکار ہو گئے ۔

مفتی محمد شفیع مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ درحقیقت آیت واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا کا تتمہ ہے اسی آیت میں مرکزِ وحدت اعتصام بحبل اللہ کی طرف دعوت دی گئی اور اشارۃً بتلایا گیا کہ اجتماع اور اتحاد تمام اُمت اور قوم کو ایک شخص واحد میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ پھر دعوت الی الخیر، امر بالمعروف

---

[1] افادات شیخ الاسلام ۔ [2] تفہیم القرآن

اور نہی عن المنکر سے اسی وحدت واجتماع کو غذا فراہم کی پھر ولا تفرقوا اور لا تکونوا کالذین تفرقوا سے یہ ہدایت کی ہے کہ تفرق واختلاف نے پچھلی اُمتوں کو تباہ کر دیا۔ ان سے عبرت حاصل کرو اور اپنے میں یہ مرض پیدا نہ ہونے دو۔[1]

نئی اُمت اور نئی زندگی

اس اعتصام بحبل اللہ یعنی نبوت کے علم وعمل کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جانِ بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیا کی شکل میں پڑے تھے جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی جن کو جہالت کفر اور کم ہمتی نے برباد کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اس میں خدا کی مدد سے ایمان وعقیدہ پیدا فرما دیا زندگی کی نئی رُوح پھونک دی۔ دبی ہوئی صلاحیتیں ابھار دیں اور اندرونی استعدادیں اجاگر کر دیں۔ پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی۔ گویا کہ اسی کے لیے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی۔ وہ بے جان پتھر تھا اب نبوت کے علم وعمل کے ذریعے ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ وہ بے حس وحرکت مردہ تھا، اب وہ زندہ ہو کر دُنیا پر حکومت کرنے لگا۔ پہلے نابینا تھا جس کو خود راستہ کا پتہ نہ تھا اب ساری دُنیا کا رہبر ورہنما بن گیا۔ پہلے وہ منتشر تنکے تھے اب وہ ایک جاندار وحدت کے حامل بن گئے۔ نبوت کے علم وعمل سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ دُنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو اعجوبہ روزگار اور دُنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ تھوڑے عرصہ ہی میں متمدن دُنیا نے دیکھ لیا کہ وہ خام اشیا جو بکھری پڑی تھیں جن کی معاصر قوموں نے ذرا قدر نہ کی تھی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اُڑایا تھا اعتصام بحبل اللہ کے ذریعے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوا کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن ومکمل مجموعہ کمالات نہیں دیکھا۔ ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دین ودُنیا کی ہر ضرورت کے لیے اس کے پاس سامان موجود ہے۔ قرآن ان ہی سے کہہ رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ نبوت کا علم وعمل اور اعتصام بحبل اللہ اصل طاقت ہے۔ اس سے جُدائی جب ہوگی تنزل وادبار کا اسی وقت آغاز ہو جائے گا۔ اجتماع وائتلاف کی جگہ اشتات وانتشار کی نحوست چھا جائے گی۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ نبوت کے

---

[1] معارف (مستفاد)

علم و عمل سے جدا ہو کر سب کچھ رکھنے کے باوجود سب کچھ کھو بیٹھے۔ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عزت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت ان پر چھا گئی ہے۔

حدیث افتراقِ اُمت

قرطبی، آلوسی، ابن کثیر اور دوسرے شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حدیثِ افتراق کو نمایاں جگہ دی ہے۔

امام ترمذی نے حدیثِ افتراق روایت کرنے والوں میں چار صحابہ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمرو کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے۔ حضرت سعد اور عوف بن مالک کا صرف حوالہ دیا ہے۔ ابوہریرہ کی روایت کو صحیح اور عبداللہ کی روایت کو غریب کہا ہے۔

ابوہریرہ کی روایت یہ ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہود ۷۱ اور ۷۲ فرقے بنے اور نصاریٰ بھی اسی طرح۔ اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ترمذی)

حافظ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کرنا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر خاموشی اختیار فرمائی ہے۔ شارح سفر السعادہ نے امام ترمذی کے پیش کردہ ناموں پر گیارہ صحابہ کا اور اضافہ فرمایا ہے۔ انس بن مالک، جابر، ابن مسعود، علی مرتضیٰ، عمرو بن عوف، عویمر، ابو الدرداء، ابو معاویہ، ابن عمر، واثلہ، اس طرح اس حدیث کے راویوں کی تعداد پندرہ تک پہنچ جاتی ہے۔

ان روایات میں کمی و بیشی ہے۔ ابوہریرہ کی روایت میں صرف ۷۳ فرقے ہونے کی خبر ہے لیکن کچھ میں ایک کے نجات یافتہ ہونے اور باقی کے ہالک ہونے کی اور کچھ میں ایک کے سوا سب کے نجات یافتہ ہونے کی خبر ہے جیسے اہل علم کے مابین ان روایات کے ثبوت اور عدم میں کلاً و جزءً اختلاف ہے ایسے ہی ۷۳ کے عدد میں بھی اختلاف ہے اور پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اُمت سے اُمت دعوت مراد ہے یا اُمت رجابت۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے بڑی جرأت سے سفر السعادہ کے خاتمہ میں اپنا یہ فیصلہ لکھ دیا ہے۔

اس موضوع پر کوئی روایت قطعاً ثابت نہیں ہوئی۔
اور حافظ ابن حزم نے بھی اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث کے بارے میں اپنا فیصلہ لکھا ہے۔
یہ دونوں حدیثیں روایتی نقطہ نظر سے بالکل صحیح نہیں ہیں۔
حافظ نورالدین ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس روایت کے تمام طرق پر تفصیلی بحث کی ہے
چنانچہ حضرت انس کی روایت کو بطریق مسند ابی یعلیٰ نقل فرماکر لکھتے ہیں۔
اس میں ایک راوی یزید الرقاشی ہے جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے اور معمولی سی اس کی توثیق بھی کی گئی ہے۔ بقیہ تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔
ایک دوسرے مقام پر ساتویں جلد میں اسی حدیث کا دوسرا طریقہ پیش کرکے لکھا ہے
اس کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور اس میں ابو معشر راوی ہے اس میں ضعف ہے۔
حضرت ابو امامہ کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں ؛
اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔
لیکن ساتویں جلد میں تصریح کی ہے کہ
اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور معجم کبیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ ہیں۔ اس میں ایک راوی ابوغالب ہے یحییٰ ابن معین نے اسے ثقہ کہا ہے۔ بقیہ معجم اوسط کے سب راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر کی ایک اسناد کا حال ہے۔
حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت مسند بزار سے نقل کرکے لکھتے ہیں ؛
مسند بزار میں اس کو روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی موسیٰ ابن عبیدہ ضعیف ہے۔
پھر حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں۔
اس کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہے جو مدلس ہے بقیہ راوی ثقہ ہیں۔
حضرت ابوالدرداء، ابوامامہ، واثلہ اور انس کی روایات کے متعلق بتایا ہے :

اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی کثیر بن مروان ہے اور یہ بہت ضعیف ہے۔

اس کے بعد عمرو بن عوف کی روایت بحوالہ طبرانی کر کے اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

اس میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے۔ ترمذی نے اس کی ایک حدیث کی تحسین بھی کی ہے۔ بقیہ تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہیں۔

باب افتراق امت کے خاتمہ پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث پر تحریر فرماتے ہیں:

اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے دو سندوں سے ایک سند کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی ہیں سوائے بکیر بن معروف کے کہ وہ صحیح کا راوی نہیں ہے مگر امام احمد نے اس کی توثیق کی ہے۔

عوف بن مالک کی روایت مستدرک حاکم میں ہے اس کے بارے میں خود حاکم کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ علامہ شاطبی نے حضرت علی کی روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس کی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا ہوں اور ابو ہریرہ کی حدیث نقل کر کے حاکم فرماتے ہیں کہ یہ اسانید ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔ اتنی بات کو امام ذہبی نے بھی تسلیم کیا ہے۔

بہر حال پندرہ صحابہ میں سے تیرہ صحابہ کی احادیث پر علماء کے یہ خیالات ہیں۔ ان میں ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمرو، انس، ابو امامہ، عمرو بن عوف، معاویہ، ابن عمر، عوف بن مالک کی روایات صحیح یا حسن کے درجہ پر آ سکتی ہیں۔ بقیہ روایات کی اسانید اگرچہ ضعیف ہیں مگر تعدد طرق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھی بالکل نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہیں۔

ان تمام روایات میں صرف ابو ہریرہ کی روایت جسے ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ایسی ہے جس کے بارے میں کوئی قابل ذکر قدح نہیں کی گئی ہے لیکن اس میں ایک فرقہ کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونے کی زیادتی نہیں۔ ابو داؤد کی زیادتی والی روایت کو محمد بن عمرو اللیثی کی وجہ سے قابل پذیرائی نہیں سمجھا گیا ہے۔ حاکم نے اس حدیث کو بھی علی شرط مسلم کہا ہے لیکن حافظ ذہبی نے یہ کہہ کر حاکم کی رائے کو بے وزن بنا دیا ہے کہ محمد بن عمرو لیثی منفرد ہو کر ناقابل احتجاج ہے۔ ابن ماجہ، بیہقی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ حدیث ضرور آئی ہے لیکن کسی میں روایت عبدالرحمٰن ابن زیاد بن انعم ہے، کسی میں کثیر بن عبداللہ، کسی میں

عباد بن یوسف، راشد بن سعد کہیں ولید بن مسلم اور دوسری روایات میں مجاہیل کی بھیڑ ہے تفصیل دیکھنی ہو تو احادیث کشاف پر حافظ زیلعی کی تخریج دیکھیو۔ خواہ کچھ ہو اتنی بات صاف ہے کہ جو حدیث اتنے صحابہ سے صحیح اور حسن طریقوں سے روایت ہو کر آتی ہو بے اصل نہیں ہے۔ حافظ ابن القیم کے ابوداؤد کے حاشیہ پر انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسے بے اصل قرار نہیں دیتے۔ حافظ ابن حزم چونکہ تعدد طرق سے جبر نقصان کے قائل نہیں ہیں اس لیے وہ اسے صحیح نہیں مانتے، مگر بقول مولانا بدر عالم میرٹھی کہ اگر ایک طرف حافظ ابن الجوزی کا تشدد اُمت میں ضرب المثل ہے تو اس کے ساتھ ہی حافظ ابن حزم کی زبان کا سیف حجاج ہونا بھی مشہور ہے۔

اختلاف سے مراد

تفرق کا مطلب تو آپ سن آئے کہ نبوت کے علم وعمل سے جُدا ہونا اور ہٹ جانا مراد ہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کی اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری یہ بتائی ہے کہ تم کچھ کتاب الٰہی کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے۔ یعنی نبوت کے لاتے ہوئے علم کا جو حصہ ان کے مفادات کا ساتھ دیتا ہے اسے مانتے ہیں اور جو ان کے اجتماعی مفادات اور قومی تقاضوں سے متصادم ہوتے ہیں ان کو نہیں مانتے۔ یہی نبوت کے لاتے ہوئے علم سے جُدا ہونا ہے۔ اور جب نبوت کے علم سے جُدائی ہو گئی تو لازماً کتاب الٰہی ان کی فکری آوارگی کا نشانہ بن گئی۔ واضح ہدایات کے باوجود خود کتاب اللہ میں اختلاف کر بیٹھے۔ کتاب اللہ علم وحقیقت ہے۔ اور اختلاف جہل وظن سے پیدا ہوتا ہے۔ جب علم وحقیقت آجائے تو اختلاف باقی نہ رہنا چاہیے پھر جو لوگ کتاب اللہ کے نزول کے بعد بھی اختلاف میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ شقاق بعید میں پڑ جاتے ہیں۔ اہل کتاب کی سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ دین حق کے علم اور کتاب اللہ کے حصول کے بعد بھی باہمی اختلافات میں پڑ گئے اور وحدت ضائع کر کے الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ اور ایک دین پر جمع ہونے کی جگہ فرقوں میں بٹ جاؤ۔

اختلاف سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کا جواب شارحین قرآن نے مفصل دیا ہے۔ شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

اس آیت سے ان اختلافات اور فرقہ بندیوں کا مذموم ہونا معلوم ہوا جو شریعت کے صاف

احکام پر مطلع ہونے کے بعد پیدا کیے جائیں۔ افسوس ہے کہ آج مسلمان کہلانے والوں میں سینکڑوں فرقے شریعتِ اسلامیہ کے صاف و صریح اور مسلم و محکم اصول سے الگ ہو کر اور ان میں اختلاف ڈال کر اس عذاب کے نیچے آئے ہوئے ہیں۔ تاہم اسی طوفان بے تمیزی میں اللہ اور رسول کے وعدے کے موافق ایک عظیم الشان جماعت بحمد اللہ خدا کی رسی کو مضبوط تھامے ہوئے ما انا علیہ واصحابی کے مسلک پر قائم ہے اور تا قیامِ قیامت قائم رہے گی۔ باقی فروعی اختلافات جو زمانہ صحابہ اور ائمہ مجتہدین میں ہوتے ان کو آیت حاضرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ فروعی اختلاف کے اسباب پر حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی تصانیف میں کافی و شافی بحث کی ہے[ل]

حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اختلاف کے موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے احکام الایتلاف فی احکام الاختلاف کے نام سے ایک رسالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ آپ نے اختلاف کو دس قسموں میں تقسیم فرما کر ہر ایک کا حکم شرح و بسط سے بتایا ہے اور مثالوں سے توضیح کی ہے۔ ان دس قسموں میں چھ قسمیں اختلاف حقیقی کی اور چار اختلاف غیر حقیقی کی ہیں۔ ہم یہاں مولانا موصوف کے بیان کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :

اختلاف کی قسم اول یہ ہے کہ اختلاف کسی دنیوی معاملہ میں ہو اور اس کا منشا صحیح ہو۔ جیسے ڈاکٹروں کا طریق علاج میں اختلاف کوئی ایلوپیتھک، کوئی ہومیوپیتھک، کوئی ویدک اور کوئی یونانی طب کو اپنا کر علاج کرتا ہے۔ یا دو ڈاکٹروں کا تشخیص میں اختلاف اور اس کے نتیجے میں تدبیر میں اختلاف۔ یا دو وکیلوں کا مقدمہ کی پیروی میں اختلاف، ایسے ہی روزمرہ کی زندگی میں ارباب تجربہ اور اصحاب رائے کا اختلاف۔ یہ اختلاف جب تک حدود میں رہے مذموم نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف دراصل اسی مشورے کا ایک حصہ ہے جس کی ترغیب و تاکید خود قرآن و سنت میں موجود ہے۔

اختلاف کی دوسری قسم یہ ہے کہ اختلاف دنیوی معاملہ میں ہو مگر اس کا منشا محض نفسانیت ہو یہ بلاشبہ مذموم ہے۔ قرآن و سنت میں اس اختلاف کی مذمت کی گئی ہے۔

اختلاف کی تیسری قسم یہ ہے کہ اختلاف کسی دینی معاملہ میں ہو اور اس کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ فروع سے ہو اور منشا دلیل ہو خواہ یہ دلیل منصوص ہو یا مجتہد فیہ۔ یہ اختلاف امت میں زمانۂ نبوت سے چلا آرہا ہے۔ اس اختلاف کے اسباب سے حافظ ابن تیمیہ نے رفع الملام

ل افاداتِ شیخ الاسلام

میں اور شاہ ولی اللہ نے الانصاف میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس اختلاف کے محمود و مقبول ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اختلاف کی چوتھی قسم یہ ہے کہ اختلاف ایسے امور دینی میں ہو جن کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ فروع سے ہے اور بلا دلیل محض رائے سے ہو۔ اس اختلاف کا حکم یہ ہے کہ یہ سخت معصیت اور مذموم ہے

اختلاف کی پانچویں قسم یہ ہے کہ اختلاف ایسے دینی معاملہ میں ہو جس کا تعلق فروع سے نہیں بلکہ اصول سے ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اختلاف کفر و ایمان ہے۔ کفر و ایمان کی کش مکش کا قرآن میں ذکر ہے۔

اختلاف کی چھٹی قسم یہ ہے کہ اختلاف ایسے دینی معاملہ میں ہو جس کا تعلق اصول سے ہے اور سنت و بدعت کے درجہ میں ہے۔ اس اختلاف کا حکم بھی یہی ہے کہ علمبرداران سنت کو اہل بدعت سے بچ کر رہنا چاہیے بدعت سے مراد وہ بدعت ہے جو باتفاق اہل حق بدعت ہو اور جس میں اہل حق کو اجتہاد کی گنجائش ہو وہ بمنزلہ مسائل اختلافی ہے۔

اختلاف کی ساتویں قسم یہ ہے کہ اختلاف غیر حقیقی ہو اور بندے کے کردار سے متعلق ہو جیسے اسباب معیشت کا اختلاف۔ یہ اختلاف محمود ہے۔

اختلاف کی آٹھویں قسم یہ کہ اختلاف غیر حقیقی ہو اور تکوین سے متعلق ہو۔ جیسے اختلاف طبائع، اختلاف صور، اختلاف الوان اور اختلاف امزجہ، یہ اختلاف حکمت الٰہی پر مبنی ہے اس کے مذموم ہونے کا وسوسہ بھی لانا حکمت تکوین پر قدغن لگانا ہے۔

اختلاف کی نویں قسم یہ ہے کہ اختلاف غیر حقیقی ہو اور خود قانون شریعت میں ہو۔ مثلاً قراتوں کا اختلاف۔ یہ اختلاف بھی مذموم نہیں ہے۔

اختلاف کی دسویں قسم یہ ہے کہ مختلف شریعتوں میں اور مختلف زمانوں میں ہے، یہ اختلاف بھی حکمت الٰہی پر مبنی ہے۔

اختلاف کی ان تمام قسموں میں سے اختلاف مذموم صرف چار ہیں یعنی قسم دوم، چہارم، پنجم اور ششم اور وہ بھی جانبین سے نہیں بلکہ اہل باطل کی جانب سے اور صاحب حق کی جانب سے یہ اقسام بھی محمود ہیں اور بقیہ چھ قسمیں علی الاطلاق محمود ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام غلط فہمی یہ ہوگئی ہے کہ آیت قرآنی واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا میں لوگ

جمیعًا اور لاتفرقوا کو دیکھتے ہیں اور واعتصموا بحبل اللہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں حالانکہ یہ حکم کی جان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب اعتصام بحبل اللہ اختیار کرو اور اس سے تفرق مت کرو کہ کوئی اعتصام کرے اور کوئی نہ کرے۔ لہٰذا اصل جوہر اور مقصد اعتصام بحبل اللہ ہے نہ کہ اجتماع اور بالذات منع ترک اعتصام ہے نہ کہ تفرق۔ لہٰذا اگر اعتصام میں تفرق ہوتا ہو بایں طور کہ کچھ اعتصام کریں اور کچھ نہ کریں تو اس تفرق سے بچنے کے لیے اعتصام کو نہ چھوڑیں گے بلکہ اعتصام کی خاطر تفرق کو گوارا کر لیں گے۔ اور اگر ترک اعتصام سے اجتماع حاصل ہوتا ہو بایں طور کہ سب نے اعتصام ترک کر دیا ہو اور سب بے دینی پر جمع ہو گئے ہوں تو اس اجتماع کے لیے اعتصام ترک نہ کریں گے بلکہ اعتصام کے لیے اجتماع کو چھوڑ دیں گے۔[1]

یہاں حافظ ابوبکر الجصاص نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے وہ بھی بڑی قیمتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> اسلامی شریعت میں احکام مختلف قسم کے ہیں کچھ تو ایسے ہیں جن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر حال میں ان میں اختلاف ممنوع ہے لیکن کچھ احکام ایسے بھی ہیں جو کبھی واجب ہوتے ہیں اور کبھی ناجائز، ان میں اختلاف کی گنجائش ہے جیسے نماز روزے میں پاک و ناپاک عورت کے حکم کا اختلاف، مقیم و مسافر کا نماز کے قصر اور اتمام میں اختلاف، یہ اختلاف ممنوع نہیں ہے۔ اگر ہر نوع کا اختلاف مذموم ہو تو پھر شریعت کے احکام میں بھی اختلاف نہ ہو۔ اور پھر نصوص میں جب اختلاف کی گنجائش ہے اجتہاد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ دو مجتہد زوجین کے نان ونفقہ وغیرہ میں مختلف ہو سکتے ہیں اگر اجتہادی اختلاف مذموم ہوتا تو صحابہ کرام میں اس کا مظاہرہ نہ ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود صحابہ میں یہ اختلاف موجود ہے اور اس موضوع پر ان سے کوئی نکیر منقول نہیں ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اُن کا اس پر اتفاق ہے۔[2]

یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جب کہ تفرقوا کا مطلب فرقہ ہونا اور اختلاف کا مقصد دین میں اختلاف ڈالنا ہو۔ جیسا کہ بہت سے شارحین قرآن نے ایسا ہی سمجھا ہے لیکن اگر تفرق سے مراد نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے جدا ہونا اور اختلاف سے کتاب الٰہی میں اختلاف

---

[1] بوادر النوادر [2] احکام القرآن

مراد ہو یا تفرق سے جماعت کا تفرقہ اور اختلاف سے دین کا اختلاف مراد ہو جیسا کہ قرآن کی آیت
وقالت الیہود لیست النصاریٰ علیٰ شیئٍ وقالت النصاریٰ لیست الیہود علیٰ شیئٍ
سے معلوم ہوتا ہے تو پھر اس سے وہ اختلاف خود بخود خارج ہو جائے گا جو وضوح بینات
سے پہلے کا ہے جس کو اجتہادی اختلاف کہتے ہیں کیونکہ یہ اختلاف فروعی ہوتا ہے اور فروعی
اختلاف باعث تیسیر ہے۔ اصولی اختلاف ایسا خطرناک مہلکہ ہے جس سے حضرات انبیاؑ نے
نے سخت خوف محسوس کیا ہے اس کی براہ راست زد معاشرہ اسلامی کی رُوح اجتماعیت پر
پڑتی ہے۔ اسی لیے اس رُوح کو پامال کرنے والوں کو زبان نبوتؐ نے کافر کہہ کر پکارا ہے۔
لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ باہم
ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ ایک اور ارشاد میں اسی اختلاف کا اندیشہ محسوس کرتے
ہوتے فرمایا:

> بخدا مجھے تمہارے بارے میں فقر کا اندیشہ نہیں ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ
> دُنیا تم پر کشادہ ہو جاتے جس طرح تم سے پہلے دوسری قوموں کے لیے کشادہ ہوئی
> اور تم اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہو اور اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے
> جس طرح تم سے پہلے دوسری قومیں ہلاک ہو گئیں۔ تم حسد کرو گے پھر باہم بغض و بیر
> کرو گے پھر باہم اُلجھ جاؤ گے۔

جو شخص دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ اور دوسرے اسلامی شہروں کی تاریخ تمدن سے واقف
ہے اور اس اخلاقی اجتماعی انحطاط پر نظر رکھتا ہے۔ جو مسلمانوں میں ان کی تہذیب کے عروج کے
کے زمانے میں ظاہر ہوا وہ حرف بحرف ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرے گا جو نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کا معجزہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مستقبل کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں اور سب
کچھ مشاہدے کے بعد فرماتے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ زیر تفسیر آیت قرآنی کی پکار اور نبوت کی
حکمت دُوراست ہے۔

بہرحال اس اجتماعیت کو قرآن نے جس کی اساس اعتصام بحبل اللہ ہے اصل بنیاد قرار دیا
ہے اور اس سلسلۂ اجتماع سے نکل جانے کو اسلام سے خروج بتایا ہے

اعتصام بحبل اللہ سے روگردانی کا نتیجہ

۱۰۶۔ اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے یعنی جو لوگ دُنیا کی اس زندگی میں

اپنا رشتہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے توڑ کر رکھیں گے اور واضح احکام کے باوجود ان کے علم و عمل میں اختلاف ہوگا تو ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ جن کی طرح ہونے سے قرآن نے یہاں اہل ایمان کو روکا ہے البقرہ کی آیت ۸۵ میں ان کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے۔

> تم کتاب الٰہی کا کچھ حصہ مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔ یاد رکھو تم میں جو شخص ایسا کرے گا اس کو اس کی پاداش میں دنیا کی ذلت و رسوائی ملے گی اور روز قیامت ان کو سخت سے سخت عذاب ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جب نبوت کے علم و عمل سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی سطح پر آ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف منافع اور اغراض رہ جاتے ہیں اور عذاب الٰہی ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں کی اندرونی حالت میں انقلاب آیا وہ اعتصام بحبل اللہ کو بھول گئے۔ لوگوں پر نبوت کے علم و عمل کی جگہ اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرنے لگے۔ قید و بند سے آزاد ایک قسم کی اباحی زندگی گزارنے لگے گویا نہ وہ نبی کی امت ہیں اور نہ ان کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل پر ایمان ہے۔ نہ حساب کا ڈر ہے اور نہ آخرت کا خوف۔ وہ ان جاہلی قوموں سے پوری طرح مشابہ ہو گئے جن سے وہ کل تک جنگ کرتے رہے اب وہ تمدن، اجتماع، سیاست، اخلاق، معاشرت اور بہت سی چیزوں میں ان مغضوبین و ضالین کے مشابہ ہو گئے جن سے اللہ ناراض ہوا تھا اور جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ مسلمانوں کے پیش نظر کوئی صحیح اور اعلیٰ مقصد نہ رہا۔ ان کی تگ و دو اور جد و جہد کھانے پینے اور عیش و عشرت تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اپنے ہم جنسوں کی طرح وہ بھی دنیا میں انسانوں کا ایک گلہ ہو کر رہ گئے بلکہ ان کے بعض بادشاہ اور سلاطین تو دوسری قوموں کے جبابرہ اور فراعنہ سے بازی لے گئے۔ ان کے دولت مندوں میں تکبر پیدا ہو گیا۔ ان کے سردار اور اکابر قوم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے یہاں تک کہ جب اس امت کے فساق و فجار بغض و حسد، جاہ طلبی، دنیا پرستی، عیش پسندی، آخرت سے غفلت، خون ریزی، بے حیائی، حق تلفی، بدعہدی، بے وفائی، حدود اللہ سے تجاوز، ظلم و بے انصافی، اسراف و تبذیر اور فواحش و منکرات وغیرہ

مختلف جرائم میں دوسری قوموں سے سبقت لے گئے تو ان پر بھی غضب الٰہی نازل ہوا۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے نام اسلامی تھے اللہ کی نظروں میں حقیر ہوگئے اور باوجود اپنی وسیع سلطنت، لاتعداد افواج، بے شمار خزانوں اور اپنی شاندار تہذیب کے وہ لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعت ہوگئے۔ لوگوں کے دلوں سے ان کی عظمت و ہیبت جاتی رہی اور وہ ان پر جری ہوگئے۔

چہروں کی سپیدی و سیاہی

۱۹۷۔ جس روز کچھ چہرے تو چمکیں گے اور کچھ سیاہ ہوں گے۔ یعنی بعضوں کے چہروں پر ایمان و تقویٰ کا نور چمکتا ہوگا اور عزت و وقار کے ساتھ شاداں و فرحاں نظر آئیں گے۔ ان کے برخلاف بعضوں کے منہ کفر و ایمان یا فسق و فجور کی سیاہی سے کالے ہوں گے۔ صورت سے ذلت و رسوائی ٹپک رہی ہوگی گویا ہر ایک کا ظاہر باطن کا آئینہ بن جائے گا۔[1]

چہرے کی سیاہی اور سپیدی سے متعلق قرآن میں متعدد الفاظ آئے ہیں۔ بیاض، سواد، غبرہ، قترہ، اور نضرہ۔ جمہور مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نور ایمان کی سفیدی ہے یعنی مومنین کے چہرے نور ایمان سے روشن اور غایت مسرت سے خنداں اور فرحاں ہوں گے اور سیاہی سے مراد کفر کی سیاہی ہے یعنی کافروں کے چہروں پر کفر کی کدورت چھائی ہوگی اور اوپر سے فسق و فجور کی ظلمت اور زیادہ تیرہ و تاریک کر دے گی۔[2]

مطلب یہ ہے کہ آخرت میں روحوں کو جو اجسام ملیں گے وہ حقیقتہً ان کے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا۔ مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ یعنی ہمارے آخرت میں جسمانی قالب ہمارے دنیوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

ایمان کے بعد کفر کی راہ

۱۹۸۔ جن کے چہرے کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا تم نے ایمان کے بعد راہ کفر

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] معارف قرآن م سش

کیوں اختیار کی تھی۔ اب اس کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ الفاظ مرتدین، منافقین، اہلِ کتاب، عام کفار یا مبتدعین و فساق و فجار سب کو کہے جا سکتے ہیں۔ مرتد تو اسی کو کہتے ہیں جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے۔ منافق زبان سے اقرار کے بعد دل میں کافر رہتا ہے۔ اہلِ کتاب اپنے نبیوں اور کتابوں پر ایمان کے مدعی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سب بشارتوں کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دی گئی تھیں تسلیم کریں اور ان کی ہدایات کے موافق حضور پر ایمان لائیں مگر وہ انکار میں سب سے آگے رہتے ہیں گویا اپنے نبی اور کتاب پر ایمان لانے کے بعد کافر بن رہے ہیں۔ مبتدعین کا زبان سے تو دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن و سنت کے متبع ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں مگر اس کے بعد بہت سی بے اصل اور باطل چیزیں دین میں شامل کر کے یا بعض ضروریاتِ دین کا انکار کر کے اصلی دین سے نکل جاتے ہیں۔ اس طرح وہ بھی ایک درجہ میں اکفرتم بعد ایمانکم کے مخاطب ہو گئے، رہے فساق جن کا عقیدہ صحیح ہو اگر ان سے یہ خطاب ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد کافروں جیسے عمل کیوں کیے گویا کفر سے کفرِ عملی مراد ہوگا۔ اور اگر عام کفار کے حق میں یہ خطاب مانا جائے تو یہ حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو دینِ فطرت پر پیدا کیا۔ اس فطرتِ ایمانی کو ضائع کر کے کیوں کافر بنے۔ باقی سباقِ آیات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کفر سے کفرِ عملی یعنی اختلاف و تفریق مذموم مراد ہو واللہ اعلم[1]

اس آیتِ قرآنی میں دُنیا کی زندگی میں نبوت کے علم و عمل سے جُدا رہنے اور زندگی کو اختلاف کا گہوارہ بنانے کو کفر کہا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے البقرہ میں یہودیوں کو ان کی بدعملی پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ اگرچہ کچھ علماء نے آیت میں کفر کی زد سے اُمتِ مسلمہ کو بچانے کے لیے دور از کار بحثیں چھیڑ دی ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ کسی نے بتایا کافروں کے بارے میں ہے اور کسی نے اہلِ کتاب پر بات رکھ دی لیکن ان میں سے کوئی بات بھی قرآن کے سباق کے موافق نہیں۔ مخاطب تو یاایھا الذین آمنوا ہیں صاحبِ روح المعانی علامہ آلوسی نے حضرت علی، عبداللہ بن عباس، ابوامامہ اور ابوسعید خدری کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف کیا ہے انہم من اھل البدع

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

والاھواء من ھذہ الامۃ ابن کثیرنے بھی عبداللہ بن عباس کے حوالے سے یہی بات پیش فرمائی ہے۔ سیاقِ قرآنی کا تقاضا یہی ہے کہ آیت میں کفر سے کفرِ عملی مراد ہو۔ جب گناہ شدید ہوتا ہے تو محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیشِ نظر اس پر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کفر کا اطلاق کچھ لغت کے قریب قریب ہے۔ کفر لغت میں حق ناشناسی کو کہتے ہیں۔ اس لیے جہاں جہاں حق شناسی کی زیادہ ضرورت ہے اگر وہاں اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے تو قرآن ایسی حق ناشناسی کو کفر کہتا ہے۔ نبوت کے علم وعمل کو حبل اللہ کی صورت میں نعمت لے کر پھر اس سے جدا ہو جانا اور عملی زندگی کو اختلاف کی آماجگاہ بنا لینا کفر نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر ان آیات میں خالص اجتماعی قانون کے تحت پوری امت مخاطب ہے اور اس کو اجتماعی ہدایات دی جا رہی ہیں کہ۔

۱۔ اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جیسے نافرمانی سے بچ کر رہنے کا حق ہے
۲۔ تمہاری موت خالص مطیع و فرمانبردار کی موت ہو۔
۳۔ تمہیں اپنی اجتماعی زندگی کو اعتصام بحبل اللہ کی اساس پر قائم کرنا چاہیے۔
۴۔ تمہاری اجتماعی زندگی میں حبل اللہ سے کبھی جدائی نہ ہو۔
۵۔ حبل اللہ اللہ کی نعمت ہے۔
۶۔ اعتصام بحبل اللہ کو قائم رکھنے کے لیے تمہیں دعوت الی الخیر کا نظام قائم کرنا چاہیے۔
۷۔ امر بالمعروف کے لیے تمہارے اندر ایک جماعت ہونی چاہیے۔
۸۔ نہی عن المنکر کی خاطر تمہیں اجتماعی طور پر کام کرنا چاہیے۔
۹۔ تمہیں اپنی زندگی میں متفرقین کی کاپی نہ کرنی چاہیے۔
۱۰۔ تمہیں مختلفین کی تقلید کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

اگر معاملہ اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہوتا تو بات کچھ اور ہوتی لیکن یہ معاملہ خالص اجتماعی ہے۔ جماعت کو من حیث الجماعۃ ایماندار اس وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ زبان سے اقرار کرے اور من حیث الجماعۃ اس اقرار پر عمل پیرا ہو۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی مفقود ہو تو اس کا شمار اہلِ اخلاص میں نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ایک فرد کی حالت میں اور ایک جماعت کی حالت میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ فقہا نے بھی ترکِ صلاۃ میں اسے ملحوظ

رکھا ہے۔ اگر ایک فرد قیامِ صلاۃ میں کوتاہی کرتا ہے تو گنہ گار ہے لیکن اگر ایک جماعت بحیثیتِ جماعت ترکِ صلاۃ کرتی ہے تو وہ ہرگز اپنے اپنے دعوئ ایمان میں مخلص نہیں ہے۔ کفر جیسے ایمان یعنے تصدیق کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے ٹھیک ایسے ہی ایمان یعنے اخلاص کے مقابلہ پر بھی آتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام دراصل صرف شہادتین کا نام ہے مگر اس کے کچھ مخصوص افعال بھی ہیں جو اس کی اس شہادت باطنی کے گواہ کہلاتے ہیں۔ ان افعال کو شہادتین کے ساتھ اتنا گہرا ربط ہے کہ گویا یہ افعال ان کا ایک قالب ہیں اس لیے ان کا اختیار کر لینا اسلام اور ان کا ترک کرنا کفر سے موسوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کفر بھی اسلامی عقائد کے برخلاف عقائد کا نام ہے لیکن کافرانہ زندگی کے بھی کچھ لوازم ہیں جو بعض اوقات خود تو کفر نہیں ہوتے مگر انسان کے کافر ہونے کا بیّن ثبوت ہوتے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس قسم کے افعال کو بھی کفر کے افعال کہا گیا ہے اور ایمان کے لیے یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اس کی زندگی میں یہ افعال کفر نظر آئیں۔ اسلام کے بعد اس قسم کے افعال سے کافر تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس کفر نما اسلام کو اسلام کہنا بھی مشکل ہے مسلمان کو چاہیے کہ جس طرح وہ کفر و شرک سے بچتا ہے اسی طرح ایسے افعال سے بھی بچتا رہے جن کو کفر کی زندگی کے افعال سے بہت قریبی علاقہ ہو۔

اہل ایمان کے لیے مقام رحمت

۱۹۹۔ اور جن لوگوں کے چہروں پر چمک ہو گی وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور ہمیشہ رحمتِ الٰہی میں رہیں گے۔ یعنی جنت میں کیونکہ جنت محض عمل سے نہیں ملتی۔ عمل کے بعد خدا کی رحمت سے ملتی ہے۔ اور وہ ہی جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی رحمت کے سامان کیے ہیں۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد[1]

اللہ کی رحمت کب نہیں اور کہاں نہیں ؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے مطابق اس دنیا میں ایسے واقعات اور حوادث بھی پیش آتے ہیں جن کو ہم رحمت کے بجائے زحمت سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعبیر کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت اللہ سبحانہٗ کے قہر وغضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر وغضب کا نام ونشان نہ ہوگا وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض کرم کی بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا
لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ
تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ع ۱۱ ۲

اے پیغمبر یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہارے سامنے فی الواقع پیش کر رہے ہیں اور یہ بات نہیں کہ اللہ سب جہانوں پر ظلم کرنا چاہے[۲۰۰]۔ اور یاد رکھو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے اور ساری باتیں بالآخر اللہ کی طرف لوٹنے والی ہیں[۲۰۱]۔

نبوت کا علم و عمل پوری کائنات کے لیے رحمت ہے

پہلی دو آیتوں میں عذاب و رحمت کا تقابلی مطالعہ پیش کر کے بتایا تھا کہ اصل رحمت ہے۔ اگر رحمت نہ ہوتی تو یہ کائنات عدم سے وجود میں نہ آتی اور وجود میں آنے کے بعد ربوبیت کا یہ کارخانہ بھی نہ ہوتا۔ صفت قہر و غضب پوری تمامیت کے باوجود مستحقین پر اترنے کے لیے بھی مشیت کا انتظار کرتی ہے مگر یہ صفت رحمت ہے کہ ہر چیز کو بلا تفریق محیط ہے اور عالم کا کوئی گوشہ نہیں جسے صفت رحمت سے حصہ نہ ملا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے پیدا نہیں فرمایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے عذاب دے

بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کی رحمت کا ظہور ہو اسی لیے سورۂ فاتحہ میں صفتِ ربوبیت کے بعد رحمٰن و رحیم کی صفت لائی گئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت رحمت ہے یعنی رحمت اس کی ذاتی صفت ہے۔ اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے اپنے آپ کو رحمتِ الٰہی سے دُور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے۔

اس آیت میں قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو رحمت پوری کائنات میں کارفرما ہے کیونکر ممکن ہے کہ انسان کی معنوی ہدایت اور انفرادی و اجتماعی صلاح و سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہو۔ اگر تم سب جگہ اس کی رحمت کو مانتے ہو تو یہاں کیوں نہیں مانتے۔ نبوت کے علم و عمل کا فیضان بھی اسی کی رحمت کا ظہور ہے۔ قرآن نے حضور انور کے رسُول اللہ ہونے کو جیسے عالمین کے لیے رحمت کہا ہے ایسے ہی نزولِ قرآن یعنی کتاب اللہ کو بھی رحمت اللہ بتایا ہے۔ اس آیت میں بنیادی طور پر اسی حقیقت کو تلک آیات اللہ نتلوھا علیک بالحق کے ذریعے بے نقاب کیا گیا ہے۔

اللہ کی رحمت کی وسعت

۲۰۰ ۔ اے پیغمبر یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہارے سامنے فی الواقع پیش کر رہے ہیں اور یہ بات نہیں کہ اللہ سب جہان والوں پر ظلم کرنا چاہے۔ یعنی حقیقی معنے میں ظلم تو وہاں ممکن ہی نہیں ہے لیکن ظاہری طور پر جسے تم ظلم کہہ سکتے ہو اس کا صدور بھی اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا مثلاً ایسے سخت احکام بندوں کو بھیجے جن سے غرض محض ستانا ہو یا مستحقِ رحمت کو عذاب کرنے لگے یا تھوڑی سزا کی جگہ زائد سزا جاری کر دے یا کسی کی ادنیٰ ترین نیکی کی جزا نہ دے وغیرذالک۔ خوب سمجھ لو اس کا جو حکم ہے خالص بندوں کی تربیت کے لیے اور جو معاملہ کسی کے ساتھ ہے عین حکمت و مصلحت کے موافق ہے۔[ل]

مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اس لیے عذاب اور رحمت جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس دُنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا

ل افاداتِ شیخ الاسلام

موت، شہد کا شیرینی غرض ہر اچھے اور برے عمل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے جدا ہونے اور زندگی کے تمام گوشوں کو اس سے الگ کرنے کا لازمی نتیجہ عذاب عظیم ہے جو دنیا میں ہمیں ملتا رہتا ہے اسی طرح اپنے اس کردار کا نتیجہ آخرت میں بھی ملنے والا ہے اگر ہم نبوت کے علم و عمل سے چمٹ کر رہیں تو اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اگر اس سے جدا ہو کر رہیں گے تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔ جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی۔ اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہمیں نبوت کے علم و عمل سے روگرداں ہونے کے بعد عذاب عظیم کیوں ہوا؟۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایتِ رحمت سے ہم کو نبوت کے ذریعے اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو بالکل حقیقت پر مبنی ہیں اور اپنے پیغمبر کے ذریعے سنا رہے ہیں۔ "تلاوت سے کتاب اللہ اور علیک سے رسول اللہ مراد ہے۔ ان دونوں کا ظہور ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے اور ان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں پر رحمت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر ہم باز نہ آئیں اور نبوت کے علم و عمل سے روگرداں رہیں تو اب ہمیں ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رحمت کے لیے بنایا ہے عذاب کے لیے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا سزاوار ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عباس نے آیت ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذالک خلقھم لوگ مختلف ہی رہیں مگر ہاں جس پر تیرے پروردگار نے رحم فرمایا اور اسی لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ کی تفسیر میں فرمایا ہے:

للرحمۃ خلقھم ولم یخلقھم للعذاب

اللہ نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا ہے عذاب کے لیے نہیں

ہم نے نبوت کے علم و عمل سے جدا ہونے والوں اور اختلاف کرنے والوں کے لیے جو عذاب تیار کیا ہے وہ ظلم نہیں بلکہ ان کے اعمال کی سزا ہے۔ ہم تو ان پر رحمت ہی کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہماری رحمت میں داخل ہونا ہی نہیں چاہتے۔

اسلامی نظریہ مملکت

۲۰۱ - اور یاد رکھو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور ساری باتیں بالآخر اللہ کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ یعنی جب اللہ کی مملوک و مخلوق ہے اور ہر کام کا انجام اس کے ہاتھ میں ہے تو ظلم کیونکر اور کس لیے کیا جائے۔ ؎

یہ گویا پہلی آیت میں بیان کی ہوئی بات کی علت بتائی جارہی ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ نبوت کے علم و عمل سے روگردانی کرنے والوں کے لیے جو عذاب عظیم کا قانون بنایا گیا ہے۔ اس تشریع میں اللہ سبحانہٗ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ یہ اس کی جانب سے اپنے بندوں کے لیے رحمت کا دروازہ کھولنا ہے اور وہ عالمین پر ظلم کیسے کر سکتا ہے اور کیونکر کر سکتا ہے جب کہ پوری کائنات اس کی مخلوق اور مملوک ہے۔ خالق و مالک اپنے ملک میں ہر قسم کے تصرف کا مجاز ہے۔ ظلم تو ملک غیر میں تصرف کرنے کا نام ہے اور عالمین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی مخلوق اور مملوک نہ ہو۔ پھر اللہ سبحانہٗ ظلم کا ارادہ کیسے کر سکتا ہے۔ ہاں تمام کائنات کا اس کی ملک ہونا اس کو مقتضی ہے کہ وہ اپنے ملک میں جو چاہے تصرف کرے وہ ظلم نہیں عین عدل ہے اس لیے یہاں جس ظلم کی تردید کی جارہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل کے ذریعے اللہ سبحانہٗ جو انسانوں کے لیے ہدایت و سعادت کے لیے قانون پیش کر رہا ہے۔ یہ بندوں کے مفاد کی خاطر ہے ظلم نہیں سرتاسر رحمت ہے۔

قرآن کا یہ حکم کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا یعنی نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو اپناؤ اس سے جدا نہ ہو اس پر گواہ ہے کہ قرآن زندگی کے ایسے تصور کو قبول نہیں کرتا جس میں اجتماعیت نہ ہو کیونکہ اس کا عطا کیا ہوا ضابطہ حیات اجتماعیت کی عدم موجودگی میں پوری طرح نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ نبوت کا لایا ہوا نظام ایک قانونی نظام ہے اور کوئی قانونی نظام موثر نہیں ہو سکتا جب تک اجتماعیت کی طاقت اس کے پس پشت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی کوئی حکومت موجود نہ ہو وہاں بھی ان کو حکم ہے کہ وہ جماعتی زندگی بسر کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ اجتماعیت کی ماہیت اور اس کی بنیاد و اساس کیا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ ساری کائنات میں ملکیت اور اس میں اقتدار اللہ کا ہے۔ انسان کی

؎ افادات شیخ الاسلام

حیثیت مالک کی نہیں مملوک کی ہے۔ اللہ نے نبوت کے ذریعے ایک مکمل علم وعمل انسان کو دیا ہے اور اس لیے دیا ہے کہ وہ اس علم وعمل کو خود اپنی زندگی اور اس کے معاملات کے لیے چراغِ راہ بناتے اور دوسروں کو بھی اس کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے لیے اسے کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور اسی مقصد کے حصول کے لیے کائنات خارجی اور اس کی لاتعداد قوتوں کو انسان کا خادم بنایا گیا ہے۔ انسان اس لیے نہیں ہے کہ وہ خارج کا غلام بن کر رہے۔ اس کا شرف وامتیاز یہ ہے کہ وہ خارج اور اس کی قوتوں پر اپنے ارادے کو موثر کرے اور جس کی مخلوق و مملوک ہے۔ اس کی ذات وصفات سے قرب پیدا کرے تاکہ اس کی ذات ذاتِ الٰہی کا پرتو بن جاتے اور پھر چونکہ خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت میں انسان کا کمال مطلوب یہ ہے کہ وہ ذات باری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرب پیدا کرے اس لیے اسے بھی دوگونہ قرب کا حامل ہونا چاہیے۔ ایک طرف تو اسے اپنے ماحول اور گرد وپیش میں ان سب چیزوں کو اللہ کا زیرِ فرمان بنانا چاہیے جن پر اسے اختیار ہے اور دوسری طرف اسے ارادے کو اپنے نفس وخواہشات پر حکمران بنانا چاہیے تاکہ وہ بے قیدی اور بے عنانی سے آلودہ نہ ہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١١٠﴾

وہ بہترین اُمت تم ہی ہو جسے انسانوں کی قیادت اور رہنمائی کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔[۲۰۲] تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو۔[۲۰۳] اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔[۲۰۴] یہ اہلِ کتاب اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ ایمان والے ہیں مگر ان میں بیشتر نافرمان ہیں۔[۲۰۵]

اسلام کی مخصوص حیثیت کا مخصوص تقاضا

یہ بات بتا دینے کے بعد کہ اسلام نام ہے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہو جانے اور چمٹ جانے کا۔ اور اس سے جُدائی عذاب عظیم کو دعوت دینا ہے۔ اس علم و عمل کا ظہور خالق کائنات کی جانب سے بندوں کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ اور اس کائنات کے سارے مالکانہ حقوق اللہ کو حاصل ہیں اور اس میں ہونے والے معاملات کا مرجع اللہ کی ذات ہے ایک ایسا مسئلہ سامنے آگیا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے کہ اگر حقیقت یہی ہے تو ضروری ہے کہ لے دُنیا کے گوشے گوشے تک

پہنچنا چاہیے اور برابر پہنچتے رہنا چاہیے۔ قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیے اور یہ بہم ہوتی رہنی چاہیے۔ فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیے ورنہ دُنیا اس کو پہچان نہ سکے گی۔ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے۔ اگلی کا جواب شیخ الاسلام کی زبانی سنیئے :

گزشتہ رکوع میں فرمایا تھا یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ، درمیان میں اسی کے مناسب کچھ اوامر و نواہی اور وعدہ وعید آ گئے۔ یہاں سے پھر اسی اول مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تم کو تمام اُمتوں میں بہترین اُمت قرار دیا ہے۔ اس کے علم ازل میں پہلے یہی مقدر ہو چکا تھا جس کی خبر بعض انبیاء سابقین کو بھی دی گئی تھی کہ جس طرح نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں سے افضل ہوں گے۔ آپ کی اُمت بھی جملہ اُمم و اقوام پر گوئے سبقت لے جائے گی، کیونکہ اس کو سب سے اشرف و افضل پیغمبر نصیب ہو گا، اقدم و اکمل شریعت ملے گی۔ علوم و معارف کے دروازے اس پر کھول دیے جائیں گے۔ ایمان، عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں اس کی محنت اور قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گے۔ وہ کسی خاص قوم و نسب یا مخصوص ملک و قوم میں محصور نہ ہو گی، بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم کو اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ گویا اس کا وجود ہی اس لیے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں جنت کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دے۔ اخرجت للناس میں اسی طرف اشارا ہے، یوں سمجھ لو اس سُورت کے نویں رکوع میں واذ اخذ اللہ میثاق النبیین سے نبی کریم کی امامت و جامعیت کبریٰ کا بیان ہوا تھا۔ دسویں رکوع میں ان اول بیت وضع للناس سے اس اُمت کے قبلہ کی برتری دکھلائی گئی تھی۔ گیارھویں میں واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا سے اس اُمت کی کتاب و شریعت کی مضبوطی کا اظہار فرمایا اب یہاں بارھویں رکوع کے آغاز سے دوسری اُمتوں کے مقابلے میں خود اُمت مرحومہ کی فضیلت و عظمت بیان ہو رہی ہے[1]

جماعتی نصب العین

۲۰۲ ۔ وہ بہترین اُمت تم ہی تو ہو جسے انسانوں کی قیادت کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ تمام اُمتوں میں بہتر اُمت کہہ کر اس اصل عظیم کی طرف اشارا کر دیا کہ مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت اور برتری میں جماعتی گھمنڈ اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قومی حرص و آز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کے منافی تھی۔
بس صرف خیر اور بہتر ہونے پر زور دیا گیا جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے جس جماعت کا یہ نصب العین ہوگا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو وہ کسی مادی طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ [1]

یہ تعبیر صاف بتا رہی ہے کہ یہ امت صرف اسی طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں بلکہ ایسی امت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبانی بنا کر روانہ کی گئی ہے اخرجت للناس کے ساتھ لفظ خیر بتا رہا ہے کہ ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں اور محاسن کے ساتھ نمود تھی۔ اخلاقی اور اعلیٰ روحانی تربیت عجیب و غریب اعتدال اور غیر معمولی جامعیت جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے ان میں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اور پھر مکمل مادی تیاری اور وسیع عقل کی بنا پر ان کے لیے ممکن تھا کہ وہ انسانی گروہ کو اس کے اعلیٰ روحانی و اخلاقی اور مادی مقصد و کمال تک پہنچا سکیں۔ ان میں ہر پہلو خیر کا حامل تھا۔ زبان نبوت نے جس دور کو خیر القرون کہا ہے اس کی خیریت کا تمام تر تعلق دور والوں سے ہے۔ مکان اور زماں کی خیریت کا رشتہ اہل زماں اور اہل مکان سے وابستہ ہے۔ ہمیں تاریخ میں ایسے دور کا علم نہیں جو تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب خیریت کا دور ہو۔ خلافت راشدہ کا دور ہی ایسا دور ہے جس میں انسانیت کے لیے خیر ہی خیر تھی۔ اس دور میں روحانی و اخلاقی، دینی و علمی وسائل سے تہذیب خیر اور تمدن خیر کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے، اس دور میں حکومت میں خیر تھی اور حکومت اپنی تمام سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی۔ اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے، اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظام حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھیں۔ تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے عروج پر تھی۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی۔ یہ نتیجہ تھا ان کے خیر امت ہونے کا اور ان کے عقیدے اور تربیت کا۔ اس لیے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین و اخلاق میں خیر کا نمونہ اعلیٰ تھے، وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا معمولی کارکنوں کی پولیس کی حیثیت میں یا فوج کی ہمیشہ محتاط پاک دامن، دیانتدار،

---

[1] ترجمان القرآن

امانت شعار، خدا ترس اور سراپا خیر ہوتے ۔

دُنیا کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

وہ اس عالم کو اللہ کی مملکت سمجھتے تھے جس میں اللہ نے بحیثیت مسلمان کے اہل زمین کا نگران اور اتالیق مقرر کیا تھا۔ ان کو حکم تھا کہ خیر بن کر رہیں اور پوری انسانیت کے مفاد کو سوچیں۔ خیر کے لفظ سے ان کو سمجھایا گیا تھا کہ ان کا فرض ہے کہ وہ پورے عالم کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں، جو راہِ راست سے منحرف ہو جائے اس کو صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں۔ کجی کو دُور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں۔ کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں۔ مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں نبوت کا لایا ہوا علم و عمل قائم کریں، وہ روٹی کے نام پر نہیں، وطن کے نام پر نہیں، پیسہ کے نام پر نہیں، رنگ اور نسل کے نام پر نہیں اور زبان کے نام پر نہیں بلکہ صرف اور صرف اعتصام بحبل اللہ کے نام پر انسانیت کو بلائیں۔

اُمت کی خاص ذمہ داری

۲۰۴۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بُرائی سے روکتے ہو۔ "منکر"، بُرے کاموں میں کفر، شرک، بدعات، رسوم قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں۔ ان سے روکنا بھی کئی طرح کا ہے، کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہے۔ یہ صفت جس قدر عموم اور اہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی۔ پہلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے[1]

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی اُمتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کریں تو اُمتِ مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک خاص ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ پوری دُنیا کے سامنے نیکی کا حکم کرے اور بُرائی سے منع کرے اور یہ کام اسی طرح کرے جس طرح کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسول اس کے سامنے رکھ گیا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دراصل اس موضوع پر صورتِ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دُنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے کہ آپ اپنا قائم مقام ایک ایسا گروہ تیار کریں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلم ہو کہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اس طرح حقیقت واقعی برقرار باقی ہے کہ آپ کی بعثت اہلِ عرب کی طرف تو براہِ راست تھی مگر باقی دُنیا کی طرف اس اُمت کے توسط سے تھی جسے آپ تیار کر گئے تھے اور جو نسلاً بعد نسلٍ تیار ہوتی رہے گی۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب قیامت تک یہ کام اس اُمت کا ہے کہ دُنیا کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتی رہے مختصر یہ کہ یہ اُمت اپنے مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اور بحیثیتِ اُمت اس کی زندگی کا مشن وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔

اُمتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ یہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ یہ ارشاد کہ تمہارا کام نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا ہے۔ اس اُمت کی حیثیت صاف طور پر بھی مقرر کرتا ہے یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس مقصد سے بے تعلق ہو جانے کے بعد وہ اپنی ساری اہمیت کھو دیتی ہے۔ اس لیے اُمتِ مسلمہ کی اصل قدر و قیمت یعنی اس کا خیرِ اُمت ہونا امر بالمعروف، نہی عن المنکر پر موقوف ہے۔ وہ خیرِ اُمت فی الواقع اس وقت تک ہے جب دُنیا کے سامنے اپنا یہ فرض ادا کرتی رہتی ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی اس اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کی علت ہے۔ امام رازی نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔

یہ ایک نئی بات ہے اور اس کا مقصد اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کی علت بتانا ہے۔ پہلے آپ بولتے ہیں رشید نیک ہے وہ لوگوں کو کھانا کھلاتا اور کپڑے پہناتا ہے یعنی کھانا کھلانا اور کپڑے پہنانا رشید کے نیک ہونے کی علت ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ علم الاصول میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ اگر حکم کسی صفت کے ساتھ مل کر آتا ہے تو وہ صفت اس حکم کی علت ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ پاک نے اس اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کا اعلان کیا ہے اور اعلان کے ساتھ یہ حکم بھی بتایا ہے کہ اس کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ

اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کی علت امر بالمعروف نہی عن المنکر اور ایمان ہے[1]

اس کا واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ اس وقت خیرِ اُمت کہلانے کی مستحق ہے جب وہ بحالتِ ایمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دے۔ اور اگر وہ اس فریضہ کو انجام نہ دے گی تو خیرِ اُمت کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی بلکہ حد یہ ہے کہ وہ اپنے اصل نام مسلم تک کی مستحق نہ ہو گی۔ کیونکہ اس کا یہ نام محض ایک نام نہیں بلکہ صفاتی نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لیے ملا ہے کہ اس کی مسلمانہ ذمہ داریاں دوسری اُمتوں کے مقابلے میں دوہری ہیں۔ سورۂ حج میں ان الفاظ کو غور سے پڑھیے۔

هو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج
ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمّٰکم المسلمین من
قبل و فی ھذا لیکون الرسول شھیدا علیکم
و تکونوا شھداء علی الناس ط

اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام مسلم رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے دینِ حق کا گواہ ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے گواہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں اُمتِ مسلمہ کی مخصوص حیثیت اور اس کی مخصوص ذمہ داری دونوں چیزوں کو اجاگر کر دیا ہے۔ سب سے پہلے اجتباکم کو غور سے دیکھئے۔ یہ لفظ عام طور سے قرآنِ حکیم میں انبیاء کے لیے بولا گیا ہے ایک ایسا لفظ جو عموماً منصبِ نبوت کے لیے بولا گیا ہو اسے اگر ایک اُمت کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تو یہ اُمت کے کارِ نبوت کے حامل ہونے کی کھلی نشانی ہے۔ اس کے بعد ھو سمّٰکم المسلمین من قبل پر غور فرمائیے کہ خاص طور پر اسی اُمت کا نام مسلم رکھا ہے اور آج نہیں بلکہ مدتوں پہلے اسے یہ خطاب عطا ہو چکا تھا یہ اس اُمت کے ممتاز اور غیر معمولی حیثیت کے مالک ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی آمد سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی

[1] مفاتیح الغیب

اور دُنیا میں بشارت کے ظاہر ہونے کے لیے ایک مدت سے انتظار میں تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ آپ کی اُمّت کا بھی تھا۔ ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں لاکھوں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا پہلے ہی اعلان کر دیا گیا تھا۔

ایمان کا ناگزیر تقاضا

۲۰۴ - اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی توحید پر، اس کے رسولوں پر اور کتابوں پر ایمان لانا بھی اس میں داخل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ توحید خالص وکامل کا اتنا شیوع و اہتمام کبھی کسی اُمت میں نہیں رہا جو بحمد للہ اس اُمت میں رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص تم میں سے چاہتا ہے کہ اس اُمت خیر الامم میں شامل ہو اسے چاہیے کہ اللہ کی شرط پوری کرے یعنی امر بالمعروف نہی المنکر اور ایمان باللہ جس کا حاصل ہے خود دُرست ہو کر دوسروں کو دُرست کرنا، یہ شان حضرات صحابہ کی تھی[1]

مطلب یہ ہے کہ اس اُمت کی خیریت جن اُمور کے ساتھ وابستہ کی گئی ہے ان سب میں ایمان باللہ کی صفت ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا ناگزیر تقاضا اور لوازم ہیں۔ اسلام میں ایمان کی علامت صرف پیشانی پر نماز کا نشان، ہونٹوں پر روزوں کی خشکی اور بروقت زکوٰۃ کی ادائیگی قرار نہیں دی گئی بلکہ اس کی ایک بڑی علامت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور امر بالمعروف میں بڑا گہرا ربط ہے۔ ایمان صرف ان اعمال کے ادا کرنے سے پایہ کمال کو نہیں پہنچتا جن سے ایک انسان کی صرف ذاتی تکمیل ہوتی ہے بلکہ اس کا معیار وہ اعمال ہیں جن سے پورے عالم کے نفوس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس اُمت کی تخلیق کا منشا صرف اپنے کمالات علمیہ وعملیہ کی تکمیل نہیں بلکہ عالم کی تمام مخلوقات کی تکمیل کی ذمہ داری بھی اسی کے سر ہے اور یہی اس کا طغرائے امتیاز ہے اور اسی بنا پر اسے تمام اُمتوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ یہی چیز اسلام کو رہبانیت سے ممتاز کرتی ہے۔ رہبانیت صرف ذات کی تکمیل چاہتی ہے جب کہ اسلام صرف ذات کی نہیں بلکہ عالم کی تکمیل کا علمبردار ہے۔

ایک یورپین نومسلم عالم نے اسلام کے اس امتیاز کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اس کا اقتباس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نامناسب نہ ہوگا

"اسلام عیسائیت کی طرح دُنیا کے متعلق بُری رائے نہیں رکھتا۔ اس کی تعلیم ہے کہ ہم دنیوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دُنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے ۔ موجودہ یورپ عیسائی رُوح کے خلاف زندگی پر ایسا گرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر وہ اس کو نگلتا تو ہے مگر اس کی عزت کرنا نہیں جانتا۔ اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا ہے بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک ضروری منزل سمجھتا ہے جس سے گزر جاتا ہے۔ اس بنا پر انسان کو اس کی تحقیر اور اپنی اس دنیوی زندگی کی بے وقعتی نہ کرنی چاہیے۔ زندگی کے سفر میں ہمارا اس دُنیا سے گزرنا ضروری اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے۔ پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے لیکن ہم کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ وہ محض ایک واسطہ اور آلہ ہے اور اس کی قیمت اس سے زیادہ نہیں جو ایک واسطہ اور آلہ کی ہوتی ہے۔ اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا نعرہ ہے کہ میری سلطنت بھی دُنیا ہے اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دُنیا میری سلطنت نہیں، اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے

مادی ترقی و خوشحالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ناپسندیدہ۔ ہماری ساری کوششوں اور جدوجہد کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے اور اگر موجود ہے تو ہم اس کو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو۔ اس اصول کے مطابق اسلام مسلمانوں میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقعہ پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو۔ اس لیے کہ اسلام ہماری زندگی کی ضروریات کو اخلاق و اعمال کی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کرلے یا باطل کو۔ اس کے نزدیک درمیانی چیز کوئی نہیں ہے وہ عمل پر اس لیے زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جُز ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے ہر فرد مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اس کے گرد و پیش کے واقعات کا شخصی طور پر جواب دہ سمجھنا چاہیے۔ اور اپنے تئیں دینی جد و جہد کے لیے مامور اور ہر وقت ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصور کرنا چاہیے قرآن میں ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

وتؤمنون باللہ [1]

ایمان کی قید اور اس کی تاخیر کی وجہ

یہ بات بہت زیادہ قابلِ غور ہے کہ جب ایک انسان کے ذاتی کمال کے لیے قوتِ ایمانی کی ضرورت ہے تو اس اُمت کے لیے جس کو یہ دعوت دی گئی ہو کہ وہ تمام دُنیا کی طاقتوں کو چیلنج دے کر ان کی نفسیاتی اور اخلاقی تکمیل کرے، کتنے عزم اور کتنی قوت کی ضرورت ہو گی۔ ایمان باللہ کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا۔ یہ صفت جتنی کامل ہو گی مسلمان اتنا ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بے تاب ہو گا۔ اگر بدنصیبی سے وہ اس بے قراری سے خالی ہو چکا ہے تو جب تک اس میں نورِ ایمانی کا ذرہ موجود ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دل احساسِ ناگواری سے خالی نہ ہو۔ اگر اس میں یہ احساسِ ناگواری بھی نہیں تو پھر سمجھنا چاہیے کہ اس میں غیرتِ ایمانی کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ صحیح مسلم کی اس حدیث کا مطلب یہی ہے جس میں فرمایا ہے کہ اس کے بعد ایمان کا ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی حصہ نہیں ہے۔

امام رازی نے اس سوال کا جواب اچھا لکھا ہے کہ اگر ایمان ساری طاقتوں کے لیے بنیاد و اساس ہے تو پھر اس کو آخر میں کیوں لایا گیا؟ جواب یہ دیا ہے کہ ایمان باللہ تمام اُمتوں میں ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور سب ایمان باللہ کے مدعی ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی خیریت کا اعلان کیا اور اس کی علت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دی۔ صرف ایمان کو اس کی علت نہیں بتایا، بعد میں ایمان لانے کی وجہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خیریت کی علت ہونے اور اُمت کی خیریت میں اس کے موثر ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ اگر ایمان نہ ہو گا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالذات یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اُمت کی خیریت کی علت بن سکیں۔ اور مفتی محمد عبدہ مصری نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ایمان کی تاخیر یہ بتانے کے لیے کی گئی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ایمان کے محافظ اور پاسبان ہیں۔ ارشادِ نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قلب کی ناگواری کے درجے میں بھی نہ ہے تو پھر سمجھ لو کہ ایمان کا رائی برابر بھی حصہ نہیں ہے۔ اور علامہ رشید رضا فرماتے

---

[1] انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

ہیں کہ اس میں اہلِ کتاب پر لطیف طنز ہے کیونکہ وہ مدعیٔ ایمان ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام نہ دیتے تھے۔ ایمان کا تو ان کا بھی دعویٰ تھا۔ امر بالمعروف کو پہلے لاکر بتا دیا کہ تمہارا ایمان صحیح نہیں کیونکہ نتائج ایمان ناپید ہیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک گروہ ہمیں امنا باللہ والیوم الاخر کہتا ہوا نظر آتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا ہے۔

اہلِ کتاب سے خیرِ اُمت میں شامل ہونے کا مطالبہ

۲۰۵۔ یہ اہلِ کتاب اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ یعنی اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو وہ بھی اس خیر الامم میں شامل ہو جاتے جس سے دُنیا میں عزت بڑھتی اور آخرت میں دوہرا اجر ملتا۔ مگر افسوس ہے ان میں سے چند افراد کے سوا مثلاً عبداللہ بن سلام یا نجاشی وغیرہ کسی نے حق قبول نہیں کیا باوجود وضوحِ حق کے نافرمانی ہی پر اڑے رہے۔[1]

گویا اس حقیقت کی طرف اشارا ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ سے ایمان و ہدایت کی رُوح مفقود نہ ہو گئی ہوتی تو وہ آج اس نعمتِ خیر و برکت کے مستحق ہوتے لیکن ان کی بڑی تعداد استعدادِ ایمانی سے محروم ہو گئی۔[2]

یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن اہلِ کتاب کے یہودی اور عیسائی ہونے ہوئے ان میں کچھ کے ایماندار ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ شارحینِ قرآن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ المومنون سے وہ اہلِ کتاب مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور لَوْ اٰمَنَ سے جس ایمان کی توقع باندھی جارہی ہے وہ وہی ایمان ہے جس کا قرآن نے فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ میں مطالبہ کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیماتِ نبوت کی طرف دعوت اسی ہدایت کے پالینے کے لیے جو اسلام یعنی انبیا کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ اس کے بغیر ان کو ہدایت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوتِ محمدی کی دعوت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔ [2] ترجمان القرآن

جہاں دی گئی ہے ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے چنانچہ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہو۔

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا۔

اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دو کہ کیا تم اسلام لے آتے ہو اگر وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے سیدھی راہ پالی۔

اس لیے آیت میں المومنون سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جن میں استعداد ایمانی موجود تھی اور جنہوں نے محمد رسول اللہ کی نبوت کی دعوت پر لبیک کہی نہ کہ ان یہودیوں اور عیسائیوں کی جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور انہوں نے دعوت نبوت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو قرآن کا یہ مطالبہ آمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے۔

شارحین قرآن نے یہاں المومنون سے عبداللہ بن سلام اور وہ تمام یہودی مراد لیے ہیں جو اسلام کی نعمت سے مالا مال ہو گئے تھے۔ قرآن وسنت میں یہ بات واشگاف الفاظ میں واضح کر دی گئی ہے کہ دین محمدی کا قبول کرنا تمام انسانوں پر اس لیے ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف وتصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو نبوت محمدی لے کر آئی ہے۔ اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحف الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ
مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے زیادہ سے زیادہ کچھ اذیت پہنچا سکتے ہیں اور اگر یہ تم سے لڑیں گے تو میدانِ مقابلہ میں پیٹھ ہی دکھلائیں گے پھر ان کو کہیں سے مدد نہ[206] ملے گی۔ یہ جہاں بھی تھے ان پر ذلت کی مار پڑی اِلّا یہ کہ کہیں اللہ کے عہد یا انسانوں کے عہد سے پناہ[207] مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں آ گئے۔ محتاجی اور بدحالی میں مبتلا[208] ہو گئے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور انبیاءؑ کے ناحق قتل میں دلیر[209] تھے۔ یہ

ان کی نافرمانیوں اور سرکشیوں کا انجام ہے۔ [210]

خیر اُمت ہونے کے نتائج

یہ آیت قرآنی اپنے موقعہ کے لحاظ سے بہت گہری معنویت کی حامل ہے۔ اگرچہ بظاہر پیوند کرتی نہیں مگر انتہائی مربوط ہے۔ یوں سمجھو کہ پہلے رکوع میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ اگر شرط ہے تو یہ اس کی جزا ہے وہ اگر مقدمات ہیں تو یہ اس کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلی آیت میں اہل اسلام کو دوسری اُمتوں کے مقابلے میں "خیر اُمۃ" کا لقب دیا گیا ہے اور اس لقب کی اساس امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان کو قرار دیا۔ ایمان کے تو سب مدعی ہیں مگر ایمان کے لوازم سے تہی دامن ہیں۔ بتایا کہ اہل اسلام کے خیر اُمۃ ہونے کی وجہ ان میں ایمان کے ساتھ ایمان کے لوازم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علی وجہ الکمال ظہور ہے۔ اس سے پہلے رکوع میں ایمان کے لوازم ایک ایک کرکے شمار کیے۔

بات کا آغاز یہاں سے ہوا کہ تمہیں اہل کتاب میں سے کسی فریق کی ہرگز طاعت نہ کرنی چاہیے اگر ایسا کروگے تو عظیم خطرہ کا شکار ہو جاؤ گے۔ خطرہ یہ ہے کہ یہ وہ کسد بعد ایمانکم کافرین تمہیں ایمان کے باوجود کافر بنالیں گے۔ پھر اس خطرہ سے بچنے کی مفصل تدبیر بتائی ہے کہ اجتماعی طور پر

اولاً زندگی کے تمام گوشوں میں رذائل سے بچ کر رہو
ثانیاً تمہارے دامن میں زیادہ سے زیادہ فضائل کا ذخیرہ ہو
ثالثاً اجتماعی طور پر تم انسانیت کے سامنے نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل کے علمبردار بن کر رہو
رابعاً تمہاری اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں نبوت کے علم و عمل سے بیگانگی اور جدائی نہ ہو۔
خامساً اجتماعی زندگی کا سارا شیرازہ اعتصام بحبل اللہ کی اساس پر قائم ہو۔
سادساً جماعتی حیثیت سے تم دعوت الی الخیر کے علمبردار ہو
سابعاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا جماعتی نشان ہو۔
ثامناً نبوت کے علم و عمل سے جدا ہونے والوں کی تمہاری زندگی میں قطعاً کاپی نہ ہو۔

ان سب باتوں کے ساتھ اگر تم دنیا میں اچھائی کے پھیلانے اور برائی کو مٹانے کا کام ایمان کی اساس پر کروگے تو تم خیر اُمت ہو۔ اگر تم خیر اُمت بن کر رہے یعنی اگر تم زندگی کے تمام گوشوں میں

اجتماعی طور پر خدا سے ڈرتے رہے، اس کی نافرمانیوں سے بچ کر رہے اور تمہاری اجتماعی زندگی ایک مطیع و فرمانبردار کی رہی، زندگی کے تمام گوشوں میں نبوت کے علم و عمل سے وابستہ رہے اور اس سے بیگانے نہ ہوتے اور اجتماعی زندگی کا قوام تم نے اعتصام بحبل اللہ پر استوار کیا، اور اجتماعی طور پر اچھائی کے پھیلانے اور برائی کے مٹانے کو تم نے اپنا نصب العین قرار دیا ۔۔ تو پھر یاد رکھو کہ لن یضروکم الا اذی یہ اہل کتاب جو اپنی سازشوں سے تمہیں کافر بنانے کی فکر میں ہیں وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے سوائے اس کے کہ دل کے پھپھولے زبان کے کچوکوں سے نکال لیں اور بس۔ اگر تمہارا ان اوصاف کے زیور سے آراستہ ہو کر ان اہل کتاب سے مقابلہ ہوا تو میدان تمہارے ہاتھ میں ہوگا وہ ہزیمت سے دوچار ہوں گے۔ ان کی اب تک کی تاریخ یہ ہے کہ اپنی بدعملیوں اور سرکشیوں سے مغضوب الٰہی بن رہے ہیں اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ جہاں کہیں بھی پناہ ملی ذلت و نامرادی کی پناہ تھی۔ یعنی یا تو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے لوگوں نے چھوڑ دیا ہے یا پھر حکمران قوموں نے محکومیت کے قول و قرار پر زندگی کی مہلت دی ہے۔ چنانچہ پہلی عرب میں تھی دوسری روم و ایران میں، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم ان کی مخالفانہ سرگرمیوں سے اندیشناک ہو وہ ہزار سازشیں کریں ناکام ہوں گے بشرطیکہ تم خیرِ اُمت بنے رہے۔

یہودیوں کی ہزیمت کی پیشین گوئی

۲۰۶۔ تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے زیادہ سے زیادہ کچھ اذیت پہنچا سکتے ہیں۔ اور اگر تم سے لڑیں گے تو میدان مقابلہ میں تمہیں پیٹھ ہی دکھلائیں، پھر ان کو کہیں سے مدد نہیں ملے گی۔ یعنی اکثر ان میں نافرمان ہیں تو ہونے دو۔ تم کو ان کی اکثریت یا مادی ساز و سامان سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اے خیر الامم خدا کا وعدہ ہے کہ یہ شیطانی لشکر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا بشرطیکہ تم اپنے کو خیر الامم ثابت کرو۔ بس یہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ زبان سے گالی دیں اور نامردوں کی طرح تم کو برا بھلا کہتے پھریں یا کوئی چھوٹی موٹی عارضی تکلیف پہنچائیں باقی تم پر غالب و مسلط ہو جائیں یا کوئی بڑا قومی نقصان پہنچا سکیں یہ کبھی نہ ہوگا۔ اگر لڑائی میں تمہارے مقابلہ میں آئے تو پیٹھ دکھا جائیں گے اور کسی طرف سے ان کو مدد نہ پہنچ سکے گی جو ان کی ہزیمت کو روک دے۔ یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہودیوں

کا یہی حشر ہوا۔ اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر بال بیکا نہ کر سکے جہاں مقابلہ ہوا حمرٌ مستنفرہ کی طرح بھاگے ہر موقع پر اللہ کی نصرت و امداد خیرالامم کے شامل حال رہی۔ دشمن بدحواسی اور بے کسی کی حالت میں مقہور و مخذول ہو کر بھاگے یا قید ہوئے یا رعیت بن کر رہے یا جہنم میں پہنچ گئے ۔ لہ

دراصل اذیٰ کے معنے دکھ اور تکلیف کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کی جڑ کٹ چکی ہے ان کے اندر اب اتنا دم خم باقی نہیں ہے کہ تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں بس زیادہ سے زیادہ جو یہ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کچھ طعن و تشنیع، کچھ زبان درازی اور کچھ افترا پردازی و تہمت تراشی کر لیں اس سے زیادہ کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے اور اگر یہ تم سے لڑنے کے لیے نکلے تو پیٹھ دکھائیں گے اور پھر ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ بعد کے واقعات نے قرآن کی اس پیش گوئی کی حرف بحرف تصدیق کر دی۔ یہود سے پورے سات سال تک مقابلہ درپیش رہا۔ یہود عرب میں بڑی طاقت رکھتے تھے۔ تمام مالی کاروبار ان کے قبضہ میں تھا۔ ان کے پاس بکثرت دولت تھی۔ عربوں سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں علانیہ فائق تھے۔ ہر طرح کے سامان جنگ رکھتے تھے اور فن جنگ سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ مدینہ سے لے کر حدود شام تک ان کے تجارتی قلعوں کی مسلسل قطاریں تھیں اور ادھر مسلمانوں کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ بایں حالات قرآن نے اعلان کیا کہ مسلمانو! اگر تم نے خیرالامۃ ہونے کی ذمہ داریاں پوری کیں تو ضرور ہی ہے کہ

اولاً یہ تمہیں اپنے بڑے بڑے مضبوط قلعوں کے باوجود، بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود ہرگز کوئی قابل ذکر نقصان نہ پہنچا سکیں گے ۔

ثانیاً اگر تم سے مقابلہ اور مقاتلہ کی نوبت آئی تو ہرگز غلبہ نہ پا سکیں گے بلکہ الٹی شکست کھا کر بھاگیں گے ۔

ثالثاً، یہ کہ عرب کے جن قبائل کی حمایت کا ان کو غرہ ہے ان میں سے کوئی ان کی مدد کو نہ آئے گا اور نہ مدینہ کے منافقین ہی ان کے کام آئیں گے ۔

تاریخ گواہ ہے کہ تینوں پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئی ہیں۔ یہ ایک طرف نبوت کی

لہ افادات شیخ الاسلام

صداقت کی دلیل ہے تو دوسری طرف اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ پوری جماعت صحابہ نے خیر الامۃ ہونے کی ان تمام ذمہ داریوں کو انجام دیا جو یہاں قرآن نے قوانین کی صورت میں پیش کی ہیں۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ کی رہنمائی میں ان کی تربیت ہوئی۔ کتاب اللہ برابر ان کے دلوں کو طاقت اور گرمی بخشتی رہی۔ رسول اللہ کی مجلسوں سے ان کو استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی وہ لوگ چستی و سستی میں رسول اللہ کی اطاعت کرتے، جس حال میں ہوتے خدا کی راہ میں کھڑے ہو جاتے۔ ان کے لیے دنیا سے بے تعلقی آسان ہو گئی تھی۔ اہل و عیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے۔ قرآن کی آیات وہ بے شمار احکام لائیں جن کے وہ مانوس نہ تھے۔ وہ لوگ مع اپنے قلوب کے مع اپنے ہاتھ پاؤں کے مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن میں آگئے۔ رسول اللہ کے کسی فیصلہ پر ان کو کبھی قلبی یا ذہنی کش مکش پیش نہ آئی۔ جس بات کا آپ فیصلہ فرما دیتے ذرا اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو ان کے افکار و اعمال، اخلاق اور احوال کی بنا پر قرآن نے خیر الامۃ کا لقب دے کر جہان کی قیادت ان کے سپرد کی۔ گویا جب شیطان کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب ان کے نفوس کے اثرات خود ان سے دور ہو گئے، نفسانیت کا خاتمہ ہو گیا۔ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے لگے نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے، فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتا، دولت سرکشی پیدا نہ کرتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے، اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا۔ بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہوتا۔ لوگوں کے لیے وہ میزان عدل تھے۔ وہ انصاف کے علمبردار تھے۔ اللہ سبحانہٗ کے گواہ تھے۔ اللہ نے اپنی زمین کو ان کے قدموں میں ڈال دیا اور دنیا کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ وہ عالم کے محافظ اور اللہ کے داعی بن گئے اور قرآن نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ لن یضروکم الا اذیٰ

یہودیوں کی ذلت و رسوائی

۲۰۷۔ یہ جہاں بھی تھے ان پر ذلت کی مار پڑی الا یہ کہ کہیں اللہ کے عہد اور کہیں انسانوں کے عہد سے ان کو کچھ پناہ مل گئی ہے۔ یہ تنبیہ اہل کتاب میں سے خاص کر یہود کے بارے میں نازل

ہوتی ہیں جیسا کہ سیاق کلام اور قرآن کی دوسری آیات سے ظاہر ہے یعنی یہود پر ہمیشہ کے لیے ذلت کی مہر ثبت کر دی گئی ہے۔ یہ بدبخت جہاں کہیں بھی پائے جائیں ذلت کا نقش ان سے محو نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے کروڑ پتی یہودی بھی آزادی اور خود مختاری سے اپنے جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی آزاد حکومت کسی جگہ نہیں الا یہ کہ اللہ کے عہد یعنی بعض بچی کچی رسمیں تورات کی عمل میں لاتے ہیں اس کے طفیل سے پڑے ہیں اور کہیں انسانوں کے عہد سے یعنی کسی کی رعیت ہیں اس کی پناہ میں پڑے ہیں کذا فی الموضح۔ بعض مفسرین نے حبل من اللہ وحبل من الناس سے اللہ کا ذمہ اور مسلمانوں کا عہد مراد لیا ہے۔ یعنی بجز اس کے کہ مسلمانوں سے عہد کر کے خدا کے ذمہ میں آجائیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بحبل من اللہ سے اسلام مراد ہے یعنی اسلام لا کر اس ذلت سے نکل سکتے ہیں یا معاہد بن کر کیونکہ معاہدہ بھی جان و مال کی طرف سے مامون کر دیتا ہے واللہ اعلم[1]

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب ہوا ہے تو وہ ان کو اپنے بل بوتے پر قائم کیا ہوا امن وچین نہیں ہے بلکہ دوسروں کی حمایت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی ہے اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے انہیں اپنی حمایت میں لے لیا۔ اسی طرح بسا اوقات انہیں دنیا میں کہیں زور پکڑنے کا موقع مل گیا ہے لیکن وہ بھی اپنے زور بازو سے نہیں بلکہ محض بہاتے مردی ہمسایہ[2]

گویا سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ اگر کہیں یہ قائم ہیں تو اپنی سطوت و عزت کے اعتماد پر نہیں بلکہ یا تو اللہ والوں کے کسی معاہدے نے ان کو امان دے رکھی ہے یا اپنے پاس پڑوس کے قبائل سے انہوں نے کوئی اسی قسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے۔ یہ سہارے وقتی اور عارضی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداً ان کے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تھے ان کی عہد شکنیوں اور شرارتوں کی وجہ سے بعد میں وہ ختم کر دیے گئے اور یہ یا تو اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کر دیے گئے یا جلاوطن کر دیے گئے۔ دوسرے قبائل سے انہوں نے جو معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آگئے تو وہ معاہدے بھی عملاً بے اثر ہو گئے۔ جس درخت کی اپنی جڑیں کھوکھلی ہوں۔ وہ ٹھونیوں کے سہارے آخر کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہود کی نام نہاد سلطنت بھی اسی حکم میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] تفہیم القرآن

بلکہ حبل من الناس امریکہ اور انگلستان کے سہارے پر کھڑی ہے اور جو چیز دوسرے کے سہارے کھڑی ہو اس کا کھڑا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں [1]

اصل ارشاد حبل من الناس ہے۔ یہ مومن و کافر دونوں کو شامل ہے اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے معاہدہ کرلیں اور بے فکر ہوجائیں اور یہ بھی محتمل ہے کہ دوسری غیر مسلم طاقتوں سے معاہدہ صلح کرکے محفوظ ہوجائیں جیسا کہ حکومت اسرائیل کی موجودہ صورت ہے کہ کسی صاحب بصیرت پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اسرائیل کی حکومت درحقیقت اہل یورپ کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی جو کچھ قوت نظر آتی ہے وہ سب غیروں کے بل بوتے پر ہے۔ اگر امریکہ و برطانیہ، روس وغیرہ آج اس پر سے اپنا ہاتھ اٹھالیں تو وہ ایک دن اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا [2]

یہودیوں پر غضب الٰہی

۲۰۸ - یہ اللہ کے غضب میں آگئے۔ محتاجی اور بدحالی میں مبتلا ہوگئے۔ باؤا کے معنے اور بھی کیے گئے ہیں لیکن اکثر کی رائے میں اس کے معنے استحقاق کے ہیں۔ یہودیوں پر اس قدرتی غضب کا ظہور برابر انسانوں کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔ اولین طور پر بابل کے حملے نے بنی اسرائیل کی نسل اور قومیت کو ہلاک و منتشر کردیا تھا لیکن ایک سو سال کے بعد حالات نے پھر کروٹ لی اور یہودی جمعیت کا جسم مردہ پھر زندہ ہوگیا۔ دوسری بار رومیوں نے حملہ کیا۔ یہ یہودیوں کی آخری ہلاکت تھی اس کے بعد پھر سنبھل نہ سکے۔ اس آخری زمانہ میں ہٹلر جیسے چنگیزی فرمانروا کی یہود دشمنی اور یہود بیزاری تاریخ داں طبقہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہودیوں کی اسی مغضوبیت کی تلافی امریکہ و برطانیہ اور روس کی ملی جلی سازش سے اسرائیل کے ذریعے کی گئی ہے۔ غضب کے ساتھ دوسری بات یہودیوں کے بارے میں یہ بتائی ہے کہ وہ محتاجی اور بدحالی میں مبتلا ہوگئے اصل ارشاد میں لفظ مسکنت آیا ہے۔ عام شارحین قرآن نے اس کے معنے محتاجی اور مفلسی کے کیے ہیں لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے معنے جزیہ کے کیے ہیں اور جزیہ سے مراد یہ ہے کہ یہود پر دوسروں کا محکوم بن کر رہنا تھوپ دیا گیا ہے۔ ذلت تھوپنے کے ذکر میں

---

[1] تدبر قرآن۔ [2] معارف قرآن م شفیع

۱۷۱ بحبل من اللہ وحبل من الناس کا استثناء ہے مگر مسکنت کے لیے کوئی استثنا نہیں ہے

کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء

۲۰۹ - یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کے ناحق قتل میں دلیر تھے۔ کفر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی روانہ فرمودہ تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات اور خواہشات کے خلاف پائی اس کے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جن افعال کا قالب اتنا خطرناک ہو کہ ان میں صریح کفر کی اتنی قریب استعداد موجود ہو کہ ذرا غفلت کرنے سے وہ کھلا کفر بن جاتے۔ قرآن و سنت ان میں منطقی تحلیل پسند نہیں کرتے بلکہ ان کو بھی کفر ہی کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ اس اختلافِ نظر اور اختلافِ اسلوب کی وجہ سے مزاج فقاہت اس قسم کی بہت سی آیات میں تاویل کر دیتا ہے۔ یہ اختلاف نہیں صرف اختلافِ نظر اور طریقہ تعبیر کا اختلاف ہے۔

ناحق اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے تھے یعنی دوسری بیہودگیاں اور شرارتیں تو تھیں حد یہ ہے کہ قتل تک سے بھی نہ چوکے اور یہ بھی اگر کانوا یکفرون پر ہی عطف ہے جیسا کہ عبارت کا تقاضا ہے تو مطلب یہ ہے کہ قتل نبی کا ایک واقعہ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی نبیوں کے قتل جیسے سنگین جرم سے آلودہ تھی اور قومی حیثیت سے وہ اس کے مجرم عادی تھے۔

آیت میں قتلِ انبیاء کا جرم بیان کرتے ہوئے بغیر حق کی قید لگائی ہے۔ نبی کا قتل تو ہمیشہ ہی ناحق ہوتا ہے نبی کے قتل کے جائز ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ قرآن کا مقصد اس اضافہ سے یہ بتانا ہے کہ خود ان کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق اور ناجائز ہے یعنی خلاف عدل تو تھا ہی قانون وقت اور ضابطہ بھی اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔

قتلِ انبیاء کے جرم کی تاریخ خود ان کی زبانی

بنی اسرائیل نے اپنے اس جرم کو تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بائبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ ۲۔ تواریخ، باب ۱۶، آیت ۷-۱۰۔

۲۔ حضرت الیاس نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سر نو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کا لیوا ہو گیا۔ حتیٰ کہ انہیں جزیرہ نما سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقعہ پر جو دعا حضرت الیاس نے مانگی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا ...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔ (۱۔ سلاطین باب ۱۹ آیت ۱-۱۰)

۳۔ ایک اور نبی حضرت میکایا کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (سلاطین)

۴۔ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہودا یوآس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان کے درمیان سنگسار کر دیا۔　　　(۲۔ تواریخ باب ۲۴ آیت ۲۱)

۵۔ اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم ہوئی اور یروشلم کی یہودی ریاست پر تباہی کا طوفان کھڑا رہتا تو یرمیاہ نبی اپنی قوم کے زوال کا ماتم کرنے اٹھے اور کوچے کوچے انہوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہو گا مگر قوم کی جانب سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار ہوئی پیٹے گئے اور قید ہوئے۔ رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں مر جائیں اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدار ہیں۔ بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ باب ۱۵، ۱۸، ۲۰، ۳۶، ۴۰)

۶۔ ایک نبی حضرت عاموس کے بارے میں لکھا ہے کہ جب انہوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انہیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو (عاموس باب ۷ آیت ۱۰-۱۳)۔

۷۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں تو پہلے وہ قید کیے گئے پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کرکے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔

(مرقس باب ۶ آیت ۱۷-۲۹)

۸۔ آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا۔ ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا۔ رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ لیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز تمہاری خاطر یسوع اور برابا ڈاکو دونوں میں سے کس کو رہا کروں تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابا کو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔

(متی باب ۲۷ آیت ۲۰ تا ۲۶)

یہ ہے اس قوم کی داستان جرائم کا ایک نہایت شرمناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصر اشارا کیا گیا ہے۔ [1]

سرکشی اور نافرمانی

۲۱۰ ۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور سرکشیوں کا انجام ہے۔ یعنی نافرمانیاں کرتے کرتے حد سے نکل گئے۔ جس کا انتہائی اثر یہ تھا کہ اللہ کی صریح آیتوں کے انکار اور معصوم پیغمبروں کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ [2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی بغاوت اور سرکشی کے عادی مجرم تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ارشاد میں بتایا ہے کہ کفر اور قتل انبیاء جیسے جرائم ان میں اس لیے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ عصیان اور عدوان یعنی خلوت و جلوت میں خدا کی نافرمانی میں بے باک ہو چکے تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ عصیان و عدوان نے ان کو کفر اور قتل انبیاء تک پہنچا دیا۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ فقرہ دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس طرح صحت بدن کی ایک نشانی یہ ہے کہ زبان کا

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

ذائقہ درست ہو اور اس میں میٹھی چیز میٹھی اور کڑوی چیز کڑوی معلوم ہو اسی طرح صحت ایمان کی علامت یہ ہے کہ ایمان کا ذائقہ درست ہو۔ اس میں طاعت و عصیان کا صحیح صحیح امتیاز باقی ہو۔ اگر یہ امتیاز باقی نہ ہے تو سمجھ لو کہ بیماری لپیٹی ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اب اس میں طاعت و عصیان کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس کی پامالی سنگین گناہوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ — مومن اپنے گناہوں سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور ڈر رہا ہو کہ اب گرا۔ اور فاجر آدمی ان کو اس طرح حقیر سمجھتا ہے جیسے مکھی اس کی ناک کے پاس سے گزر گئی اور اس نے اپنے ہاتھ کی حرکت سے اڑا دی۔

لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ
اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ
يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۖ
وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن
يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝

یہ سارے ایک جیسے نہیں ہیں[۲۱۱]۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ ہدایت پر قائم ہیں[۲۱۲]۔ راتوں کو اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں اور جناب الٰہی میں سجدہ ریز ہوتے ہیں[۲۱۳]۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ بھلائی کے سارے کاموں میں دوڑ دھوپ مچاتے ہیں یہ نیکوکار لوگ ہیں[۲۱۴]۔ اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ضرور قدر کی جائے گی[۲۱۵] اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔

سارے اہل کتاب کا حال یکساں نہیں

قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ پچھلی کتابوں کا مصدق ہے اور اہل کتاب سے مطالبہ کرتا ہے کہ آمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہے یعنی جب میری تعلیم تمہارے مقدس نوشتوں کے خلاف کوئی نیا دین نہیں پیش کرتی بلکہ سرتاسر مصدق اور موید ہے تو پھر تم میری دعوت کیوں قبول نہیں کرتے اور میرے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کرتے ہو۔ اس بات کا ثبوت کہ نبوت محمدیہ کی پیروی کے بغیر ہدایت اور نجات نہیں ہے۔ خود قرآن میں موجود ہے اور ایسا ثبوت موجود ہے جس کے آگے جھکنے سے صرف ناانصافی اور خود پرستی ہی روک سکتی ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ ایک یہودی، یہودی رہتے ہوتے اور ایک عیسائی، عیسائی رہتے ہوئے ہدایت پر گامزن ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ قرآن اہل کتاب کو ایمان و اسلام کی ہرگز دعوت نہ دیتا کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اگر دعوت دیتا بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار نہ کرتا۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہے قرآن نے اہل کتاب کو بھی اسلام کی اسی طرح دعوت دی ہے جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا۔

یا ایہا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا او نلعنھم۔

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ہے ایمان لاؤ تم اس کتاب پر جو ہم نے اتاری جب کہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں یا انہیں پیٹھوں کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں۔

نہ صرف یہ کہ آپ نے اہل کتاب کو ایمان لانے کی دعوت دی بلکہ دعوت بھی اس شرط کے ساتھ دی کہ ایمان بھی اسی طرح لاؤ جیسے ابوبکر و عمر ایمان لائے ہیں۔ اگر ایسا ایمان لائیں گے تو پھر ان کو ہدایت ہوگی ورنہ نہیں۔

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا

اگر اہل کتاب ویسا ہی ایمان لے آئیں جیسا کہ تم لائے ہو تو پھر وہ ہدایت پا جائیں گے اور نہ صرف یہ کہ قرآن نے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول

نہیں کیا ان کو صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی قرار دیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر قرآن کے اس انکار کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں صرف کافر نہیں بلکہ پکا کافر کہا گیا۔

اولٰئك هم الكافرون حقا

اس آیت میں اہل کتاب کو ان کے جس کردار کی بنا پر پکا کافر کہا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کا رسول مانتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

غرض قرآن حکیم نے اہل کتاب کے انکار اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دی ہے جو مشرکوں کے انکار کو دی تھی۔ اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتاتے ہیں۔ اس نے اہل کتاب کے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اللہ کے یہاں ہدایت یافتہ اور نجات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ جیساکہ مصر و ہند کے شارحین قرآن کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے چنانچہ زیر تشریح آیت پر ایک مایہ ناز مفسر قرآن رقمطراز ہیں:

> یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی رُوح ضائع نہیں کی تھی۔

ایسا سمجھنا قرآن کو بازیچہ اطفال بنا لینے کے مترادف ہے۔ اس آیت میں قرآن صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ حق ناشناسی اور اسلام سے متعلق اپنے طرز عمل کے لحاظ سے اہل کتاب سارے یکساں نہیں۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا یہ اہل کتاب کی اکثریت کا حال ہے۔ باقی ان میں سے بعض حق شناس، انصاف دوست بھی تھے اور وہ بالآخر مشرف بہ اسلام ہو کر رہے۔ ان کا چہرہ اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

اہل کتاب مومن و کافر یکساں نہیں

۱۱۳۔ یہ سارے ایک جیسے نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سب اہل کتاب اسی طرح کے نہیں ہیں جن کا اوپر چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں سے ان یہودیوں کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے جو حق شناسی کا ذوق رکھتے تھے اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن ان یہودیوں کے مناقب بیان کر رہا ہے جو قرآن کی تکذیب اور

کفر کر رہے ہیں۔ قرآن نے خود یہودیوں کے انکار قرآن کا تذکرہ اور پھر اس پر اپنا تبصرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

واذا قیل لھم آمنوا بما انزل اللہ قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی اور اس طرح وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں۔

کیا اس جواب کے باوجود قرآن ان یہودیوں کا تعارف کرا سکتا ہے جو خود قرآن کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ آخر پھر کسی چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں؟ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فلسفہ کو اللہ سبحانہ' نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اسے صاف طور پر کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عموم رسالت اور ختم نبوت کا لازمی تقاضا ہے کہ آخرت کی نجات اس اسلام پر موقوف ہے جس کی دعوت آپ لے کر آئے ہیں اور اس اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سب نبیوں کی تصدیق کرتے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے۔ واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جن شریعتوں کو منسوخ کر چکا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اس امت میں سے جس کسی بھی شخص تک یہودی ہو یا عیسائی میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہوگا۔

غرض جہاں تک نبوت محمدیہ کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے قرآن وسنت میں دو ٹوک انداز میں موجود ہے یعنی یہ کہ نبوت محمدیہ کی پیروی سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے اس کا پیغام پہنچا ہی نہ ہو جیسا کہ لا یسمع بی کی قید لگا کر آپ نے واضح فرما دیا ہے آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے جن پیغمبروں کا دور پیغمبری ختم کر دیا۔ انہی کی اطاعت

اور پیروی پر اصرار کرنے والوں کو وہ اپنا وفادار قرار دے اور اپنے اس پیغمبر کی اطاعت اور پیروی سے انکار کے باوجود انہیں بغاوت کی سزا نہ دے جسے وہ اس دور کے لیے اپنا جہانی اور ابدی پیغمبر اور اپنی عالمگیر شریعت قرار دے چکا ہے۔ بہرحال اللہ سبحانہ بتارہا ہے کہ سارے اہل کتاب اوصاف سے تہی دامن نہیں کچھ انصاف طبیعت ایسے بھی ہیں جنہوں نے نبوت کے لاتے ہوتے حق کو قبول کر لیا ہے جیسے عبداللہ بن سلام، ثعلبہ ابن سعید، اسید بن سعید اور اسید بن عبید۔

عبداللہ بن سلام کا اسلام

عبداللہ بن سلام جن کا اصل نام حصین تھا۔ مدینہ منورہ کے ایک ذی علم اور دولت مند یہودی تھے سعید الفطرت ہونے کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنتے ہی اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ قبا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو پہنچے تو اہل وعیال کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام یہودی اسلام کے حلقہ میں آجائیں۔ چنانچہ عرض کیا یا رسول اللہ آپ بالفعل میرا اسلام ظاہر نہ فرمائیں۔ میں چھپ جاتا ہوں۔ آپ یہودیوں سے میرے بارے میں پوچھیں۔ اگر وہ میرے متعلق اچھی رائے دیں تو فرمائیں کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو کیا تم سب قبول کر لو گے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمائد یہود کو بلا کر اسلام کی تلقین کی۔ ساتھ ہی عبداللہ بن سلام کے بارے میں دریافت کیا۔ یہودی بولے وہ ہمارا سردار ہے۔ سردار کا بیٹا ہے۔ اس کے علم وفضل کی بھی تعریف کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو آپ لوگ بھی اس کی پیروی کریں گے۔ انہوں نے کہا نعوذ باللہ ایسا ہو سکتا ہے کہ عبداللہ اسلام قبول کرلے۔ اس پر عبداللہ باہر آگئے اور یہودیوں کو سمجھایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے انکار کی طرف قدم نہ اٹھاؤ۔ یہودی یہ سن کر مبہوت ہو گئے۔ پھر بولے اس کی بات کو ہم نہیں مانتے یہ جھوٹا ہے۔ بہرحال عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا۔

اہل ایمان جادۂ حق پر قائم ہیں

۲۱۲۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ ہدایت پر قائم ہیں۔ اصل ارشاد اُمّۃ قائمۃ آیا ہے زمخشری نے اس کی تشریح مستقیمہ او عادلہ سے کی ہے۔ لکڑی کے سیدھا کرنے کے لیے اقمتہ بولا جاتا ہے۔ جب سیدھی ہو جائے تو قائمہ اور مستقیمہ بولتے ہیں۔ یعنی ایسی جماعت جو ٹھیک ٹھاک

ہے جس میں فکر کی کوئی کجی اور عمل کا کوئی زیغ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہودیت اور عیسائیت اگر افراط و تفریط ہیں تو ان دونوں کے درمیان نقطہ اعتدال اسلام ہے۔ جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں یہ بات پوری قوت سے بتائی گئی ہے۔ اسلام سے مشرف ہونے کے بعد اہل کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ یہ اُمّۃ قائمۃ ہے یعنی جس راہ کو انہوں نے اپنا لیا ہے وہ بالکل ٹھیک اور سیدھی ہے اس میں اعتدال ہے افراط و تفریط نہیں، زندگی کے تمام گوشوں میں کام آنے والی ہے۔ فرد اور جماعت کے حق میں صلاح و فلاح کی ضمانت دیتی ہے۔ اس میں کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے زندگی کے ہر موقعہ اور ہر گوشہ کے لیے رہنما ہے۔ منزل تک پہنچانے والی ہے کشادہ ہے۔

سید رشید رضا کو اس پر حیرت ہے کہ قرآن اہل کتاب کو اُمّۃ قائمۃ کیسے کہہ رہا ہے جبکہ خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ اہل کتاب خود اپنی کتابوں کے بیشتر حصوں سے محروم ہو چکے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس موجود ہے وہ قطعاً محرف اور مبدل ہے۔ اس حیرت کی وجہ یہ ہے کہ سید صاحب مرحوم نے آیت اُمّۃ قائمۃ کا مصداق یہودیوں کو بحالت یہودیت قرار دیا ہے۔ اور سید صاحب ہی کی پیروی میں مولانا آزاد کا بھی میلان یہی ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا مطالعہ قرآنی ہمیں ان کی ہمنوائی کی اجازت نہیں دیتا جیسا کہ معالم القرآن کے ناظرین کو ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

رات کو تلاوت اور سجدہ

۲۱۳۔ راتوں کو اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور جناب الٰہی میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ فقرہ بھی قائمۃ کی طرح اُمّۃ کی صفت ہے گویا دین حق اور اسلام پر قائم ہو جانا پہلی صفت ہے اور تلاوت قرآن ان کی دوسری صفت ہے۔ یعنی یہ وہ گروہ ہے جو اسلام پر قائم ہے اور رات کے وقتوں میں کتاب الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، رات کی نماز اور تلاوت کا پیوند قرینہ ہے اس بات کا کہ یہ ان کی شبانہ نماز یعنی تہجد کا تذکرہ ہو رہا ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ تہجد گزار ہیں۔ رات کے اوقات میں نماز میں تلاوت قرآن روحانی تزکیہ اور صفائے باطن کے لیے بہترین تریاق ہے۔ سجدہ کا لفظ بول کر نماز کی طرف اشارہ قرآن کا انداز ہے گویا بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کو نئی اور پاک زندگی نصیب ہوئی ہے۔ یہ ان کے دل سے مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ عقائد دُرست ہوں۔ ظاہر و باطن سے اسلام قبول کر لیا جائے اور ہر عمل کے وقت یہ تصوّر قائم رہے کہ

قادر مطلق کی نظر اسے دیکھ رہی ہے وہ اس سے دُور نہیں بہت قریب ہے اور اتنا قریب ہے کہ رگ جان بھی اتنی قریب نہیں جو نقل و حرکت وہ کرتا ہے اس کو خوب جانتا ہے۔ رات میں ان کی تلاوت قرآن اور اللہ کی جناب میں سجدے ان کے ان اوصاف کو نمایاں کر رہے ہیں۔

ایمان اور اس کے لوازم

۲۱۴۔ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں بھلائی کے سارے کاموں میں دوڑ دھوپ مچاتے ہیں، یہ نیکوکار لوگ ہیں۔ یعنی سب اہل کتاب کا حال یکساں نہیں۔ اتنے بُروں میں کچھ اچھے بھی ہیں۔ ان ہی مسروخ اشقیا کے درمیان چند سعید روحیں ہیں جن کو حق تعالیٰ نے قبول حق کی توفیق دی اور اسلام کی آغوش میں آگئے اور جادۂ حق پر ایسے مستقیم ہو گئے کہ کوئی طاقت ہلا نہیں سکتی۔ وہ رات کی تاریکی میں میٹھی نیند اور نرم بستر سے چھوڑ کر خدا کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنے مالک کے سامنے خضوع و تذلل اختیار کرتے ہیں، جبین نیاز زمین پر رکھتے ہیں، نماز میں اس کا کلام پڑھتے ہیں۔ اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔ خالص توحید کے قائل ہیں، قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں۔ اور جب کسی نیک کام کی طرف پکارا جائے لپک کر ایک دوسرے سے آگے نکلنا چاہتے ہیں۔ پھر نہ صرف یہ کہ خود راہِ راست پر ہیں دوسروں کو بھی سیدھے راستہ پر لانا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ ان یہود میں سے یہ لوگ ہیں جن کو خدا نے نیک بختی اور صلاح و رُشد کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے[1]

اسی سُورت کے آخر میں اہل ایمان کے ساتھ ان ہی اہل کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جنہوں نے دعوتِ نبوت کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ پوری سچائی کے ساتھ دعوتِ نبوت کو قبول کیا۔ فرمایا کہ ان کے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے وہ اپنی راست بازی اور نیک عملی کا ضرور اجر پائیں گے۔ ارشاد ہے:

وان من اهل الكتاب لمن يؤمن بالله وما انزل اليكم وما انزل اليهم خاشعين لله لا يشترون بآيات الله ثمناً قليلاً، اولئك لهم اجرهم عند ربهم

اور یقیناً اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس پر اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کے دل اللہ کے آگے جھکے ہوتے ہیں وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہیں کرتے بلاشبہ ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔

یہاں بھی ان کا ذکر ہے اور یہ تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ مجموعی حیثیت سے پوری سورت میں اہل کتاب کی شدید مذمت ہوتی ہے اس لیے بتا دیا کہ ان میں سارے خراب نہیں ہیں کچھ راست باز بھی ہیں۔ ان کے ایمان وعمل کی اللہ کے یہاں قدر ہے۔ یہ اپنی کتب سابقہ پر بھی قائم رہے اور دولتِ اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔

اہلِ کتاب کو ایمان وعمل کا اجر ملے گا

۱۱۵ - اور جو نیکی بھی کریں گے اس کی ضرور قدر کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ ان کو دگنا اجر ملے گا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے اولٰئک یؤتون اجرھم مرتین بما صبروا اور حدیث صحیح میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمادی [1] شیخ الاسلام نے جس حدیث صحیح کی طرف اشارا کیا ہے وہ صحیح بخاری میں بحوالہ ابو موسیٰ اشعری اس طرح آئی ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخصوں کو دوہرا اجر ملے گا، ایک وہ اہلِ کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

دراصل ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لیے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا شاق گزرتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیانِ حقہ میں کوئی چشمک اور رقابت نہیں ہے، پارٹیاں نہیں ہیں اس لیے ان مذاہب کے ماننے والوں کو بھی یہی جذبات رکھنے چاہئیں کہ یہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے۔ اب اگر کوئی اہلِ کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں چلا گیا بلکہ اگر وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر ایمان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی نہ ملے گا۔ کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر ہے۔ اس آیت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنا ایمان قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لائیں جب کہ سب نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت ہے۔ لہٰذا آپ پر ایمان لانا سب نبیوں پر ایمان لانا ہے۔ اور آپ کا انکار کرنا سب کا انکار ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ
اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾
مَثَلُ مَا يُنفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ
أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ
وَلَٰكِنْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٧﴾

بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے تو ان کو نہ ان کا مال اور دولت اللہ کے عذاب سے بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد، وہ دوزخی ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔[۲۱۶] دُنیا کی اس زندگی میں یہ لوگ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس ہوا کا چلنا جس میں پالا ہو اور ان لوگوں کی کھیتی پر آن پڑی ہو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہو اور اسے برباد کرے[۲۱۷] اور یاد رکھو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا یہ خود اپنے ہاتھوں

اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔"[218]

کفر کی زندگی میں کیے گئے اعمال

اس سے پہلی آیات میں ان اہلِ کتاب کا چہرہ پیش کیا جنہوں نے نبوتِ محمدیہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اب ان آیات میں ان کا تعارف ہے جنہوں نے اہلِ کتاب ہونے کے غرہ میں نبوتِ محمدیہ کو نہیں مانا اور کفر پر اڑے رہے۔ جو صداقت حضرت آدم کے زمانے سے شروع ہوئی اس کی حقیقت کبھی نہیں بدلی لیکن دورِ ارتقائی کی طبعی رفتار کے پیشِ نظر کچھ تغیر و تبدیل ہوتی رہی یہاں تک کہ سچائی کی حقیقی راہ دکھائی گئی جس میں نزولِ عمل کی سختی اور نہ ہی عقل کے لیے بوجھ ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ اور اب یہ پیغامِ محمد کا مخصوص لقب ہے۔ ارتقاء کی ان ہی منزلوں کی طرف آیتِ اکمال و اتمام میں اشارہ ہے لفظ کمال میں دین کی اسی ارتقائی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن حکیم کی سب سے بڑی خصوصیت مصدق لما معکم کا حاصل بھی یہی ہے اور لا نفرق بين احد من رسله کی دستوری دفعہ بھی اسی لیے ہے۔ یعنی یہ سب ایک ہی صداقت کی کڑیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ ان کی صورتیں بے شک مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی تھی اس لیے یہاں تسلیم و انکار کی تفریق برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ایک کا ماننے والا اس کا مکلف ہے کہ دوسرے کو بھی مانے اسی طرح ایک کا انکار کرنے والا اس جرم کا بھی مرتکب ہے کہ اس نے سب کا انکار کر دیا ہے۔ ان انبیاء میں افضل و مفضول ہونے کے باوجود تجزیہ کے تحت اس لیے ناموزوں ہے کہ وہ سب ایک ہی پیغام اور ایک ہی صداقت کے حامل تھے۔ سورت کے آغاز میں یہی آیت عیسائی دنیا کو یہ بتانے کے لیے لائے تھے کہ نبوتِ محمدیہ کا انکار اگر ان کی زندگی میں ہوگا تو آخرت کی زندگی میں ان کو کوئی چیز عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکے گی۔ یہاں یہی آیت یہودیوں کو سمجھانے کے لیے آئی ہے کہ اگر تمہارے دامن میں نبوت کا کفر ہوگا تو تمہیں تمہارا سرمایہ اور تمہاری اولاد دوزخ سے نہ بچا سکیں گے اور بتایا کہ اس دنیا کی زندگی میں اپنی رسمی اور رواجی دینداری کے لیے جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کی حیثیت اس کھیتی سے زیادہ کچھ نہیں جس پر پالا پڑا ہو اور اس کے نتیجے میں کھیتی برباد ہو گئی ہو۔

ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں

۲۱۶ ۔ بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے تو ان کو نہ ان کا مال و دولت کام آئے گا اور نہ ان کی اولاد، وہ دوزخی ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ صالحین و متقین کے بالمقابل یہاں کافروں کا حال و انجام ذکر فرماتے ہیں۔ پہلے فرمایا تھا وما یفعلوا من خیرٍ فلن یکفروہ یعنی مومنین کی ادنیٰ ترین نیکی بھی کام آئے گی۔ ان کے کسی بھلے کام کی بے قدری نہیں کی جائے گی اس کے برخلاف کافر جو کچھ مال و دولت دُنیا میں خرچ کرے خواہ اپنے نزدیک بڑا ثواب اور خیرات کا کام سمجھتا ہو۔ آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت اور پرسش نہیں کیونکہ ایمان و معرفت کی روح نہ ہونے سے اس کا ہر ایک عمل بے جان اور مُردہ ہے۔ اس کی جزا بھی ایسی ہی فانی و زائل اس دارِ فانی میں مل جائے گی عمل کی ابدی حفاظت کرنے والی چیز ایمان و ایقان ہے[1]

آج کل علمِ نفسیات نے یہ مسئلہ بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اصلاح مقدم ہے۔ اور انسان کے دل اور ارادے پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا ایمان ہے۔ صحیح اور صالح عمل کے لیے یہ ضروری ہے کہ چند صحیح اُصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت ہم تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوع اور اصول متعارفہ کے ماننے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح اور دُرست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوع ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں۔ وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس لیے پابر زنجیر عقل کے ذریعے ہم اپنے خیالات ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط ذہنی تصورات کے ذریعے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا ہے۔ اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قابلِ قبول نہیں سمجھا ہے۔ غرض ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اجر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے۔ وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک ہے۔

کافرانہ زندگی میں عمل کی مثال

۱۱۷۔ دنیا کی اس زندگی میں کافر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس ہوا کا چلنا جس میں پالا ہو اور ان لوگوں کی کھیتی پر آن پڑی ہو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اسے برباد کر دے۔ یعنی ایمان کے بغیر عمل کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی شریر ظالم نے کھیتی یا باغ لگایا اور اس کو پالے سے بچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ چند روز اس کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر خوش ہوتا رہا اور بہت کچھ امیدیں باندھتا رہا۔ یکایک اس کی شرارت و بدبختی سے سرد ہوا چلی۔ برف پالا اس قدر گرا کہ یکبارگی ساری لہلہاتی کھیتی تباہ ہو کر رہ گئی۔ آخر اس بربادی پر کفِ افسوس ملتا رہ گیا نہ امیدیں پوری ہوئیں نہ احتیاج کے وقت اس کی پیداوار سے منتفع ہوا۔ اور چونکہ یہ تباہی ظلم و شرارت کی سزا تھی اس لیے اس مصیبت پر کوئی اجرِ اُخروی بھی نہ ملا جیسے کہ مومنین کو ملتا ہے یعنی یہ مثال ان کفار کی ہے جو کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے اپنے خیال میں بہت خیرات کرتے ہیں بالخصوص وہ بدبخت جن کا زور قوت اور پیسہ حق اور اہلِ حق کی دشمنی پر خرچ ہوتا ہے تو ان کا پوچھنا ہی کیا ہے وہ نہ صرف بے کار خرچ کرتے ہیں بلکہ روپیہ پیسہ خرچ کر کے اپنے لیے اور زیادہ وبال خریدتے ہیں۔ ان سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ مال ہو یا اولاد کوئی چیز عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکے گی اور نہ حق کے مقابلہ میں وہ اپنی توقعات میں کامیاب ہوں گے[1]

دراصل اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے۔ ہوا سے مراد وہ اوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

میں دولت صرف کرتے ہیں ۔ اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطہ خداوندی کی پیروی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہوا کھیتوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے ۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کی مزرعہ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے مگر جب اس کے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مہلک بن جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے اور اس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرف کر رہا ہے ۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا، یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرف کرتے ہوئے اس کے قانون وضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا تو اس کے یہ تمام تصرفات ازسرتاپا جرم بن جاتے ہیں ۔ اجر ملنا کیسا وہ تو اس کا مستحق ہے کہ ان تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے ۔ اس کی خیرات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نوکر اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اس کا خزانہ کھولے اور جہاں جہاں اپنی دانست میں مناسب سمجھے خرچ کر ڈالے[1]

ان کا ظالمانہ کردار اور اس کے نتائج

۲۱۸ ۔ اور یاد رکھو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے ہیں ۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ کافر کی کوئی نیکی قبول نہیں کی جاتی تو اس پر معاذاللہ خدا کی جانب سے کوئی ظلم ہوا ہے ۔ نہیں یہ ظلم تو انہوں نے اپنی جانوں پر خود کیا ہے نہ کفر اختیار کرتے اور نہ یہ روز بد دیکھنا پڑتا[2] یعنی کفرو شرک کے پالے سے اپنی آخرت کی کھیتی خراب کی اور ضرورت کے وقت کفِ افسوس ملتے رہ گئے[3] یہ جو کچھ ہوا ان کے باغیانہ کردار کی وجہ سے ہوا ۔

اس فقرے میں اگر ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ دین کے سارے مطالبات اور اللہ سبحانہٗ کے سارے اوامر و نواہی کا رشتہ بندوں کی منفعتوں اور مضرتوں سے وابستہ ہے ۔ اللہ سبحانہٗ اگر کسی کام کے کرنے کو کہتا ہے تو اس میں خود بندوں کا فائدہ ہوتا ہے ۔ اللہ کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر وہ کسی کام سے روکتا ہے تو اس میں بندوں کا اپنا نقصان ہے اللہ کا کوئی نقصان نہیں ۔

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام [3] معارف م ا

تو دوسری طرف وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ میں یہ اشارہ بھی کر دیا کہ اللہ سبحانہٗ کی گوناں گوں نعمتوں کا اور بار بار کی درگزر کا بنی اسرائیل کی مادہ پرست فطرت پر کوئی اثر نہ تھا۔ نعمتوں کی فراوانی کے باوجود یہ نافرمانیاں کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گناہوں کی مشق و تمرین نے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ کیونکہ جب بھی گناہوں سے گناہ کا احساس رخصت ہو جاتا ہے وہ لوگوں کی فطرت سلیم کو مسخ کر ڈالتا ہے اس سے سوسائٹی کی ساری خوبیاں اور اس کے افراد کے سارے فضائل ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں ظلم کا لفظ اگرچہ قرآن میں کئی معنے میں آیا ہے مگر یہاں کفر و شرک اور عصیان کے معنے میں ہے اللہ کا ظلم نہ کرنا یہ ہے کہ وہ بغیر جرم کے سزا نہیں دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ
خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۖ
وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ ۖ إِن كُنتُمْ
تَعْقِلُونَ ۝ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ
بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ
الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ
الصُّدُورِ ۝ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ
سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ
ع ۱۲ / ۳ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

۲۱۹

اے ایمان والو! اپنی جماعت کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہارے خلاف میں کمی کرنے والے نہیں تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہ ہی ان کو پسند ہے تمہاری دشمنی ان کے

منہوں سے ظاہر ہے اور تمہارے خلاف جو کچھ ان کے اندر ہے وہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ ہم نے تمہارے سامنے اپنی آیات کھول کر رکھ دی ہیں اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو[۲۲۰]۔ یہ تم ہی تو ہو کہ تم ان سے محبت کرتے ہو مگر وہ تو تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو[۲۲۱]۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں[۲۲۲] ان سے کہہ دو کہ اپنے غصہ میں جل مرو اللہ دلوں کے چھپے ہوئے رازوں کو خوب جانتا ہے[۲۲۳]۔ اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی کی بات ہوتی ہے تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی افتاد آجاتے تو وہ خوشیاں مناتے ہیں[۲۲۴]۔ اور دیکھو اگر تم صبر سے کام لوگے اور تقویٰ کا دامن تھامے رکھوگے تو ان کی کوئی تدبیر تمہارے

خلاف کارگر نہ ہوگی۔ اللہ ان کی ساری کرتوتوں کا گھیرا ڈالے ہوئے ہے۔[۲۲۵]

یہودیوں سے تعلقات ختم کرو

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع کے کھیت یا باغ نہ تھے یا تو وہ تجارت کرتے تھے یا زرگری۔ ان کی آبادی بھی بنو نضیر یا بنو قریظہ کی طرح الگ نہ تھی، عربوں ہی کی آبادی میں وہ رہتے تھے۔ ممکن ہے مختلف مقامات پر ان کے کئی خاندان اکٹھے بستے ہوں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ مدینے میں اسلامی آبادی کے اندر رہتے تھے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قینقاع کی بستی تو آج کل محض میدان ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں ساڑھے تیرہ سو سال پہلے بنو قینقاع کے مکانات تھے وہاں پھر مکان نہ بنے اور وہ حصہ میدان کی شکل میں باقی رہ گیا۔ باقی دونوں یہودی قبیلوں کے باغات بھی تھے اور کھیت بھی۔ بنو نضیر کی بستی جنوبی سرے پر تھی اور وادی مذینیب کے دونوں کنارے اس آبادی سے مزین تھے اور اس بستی کے پاس ہی جنوب کی جانب ایک ٹیلے پر کعب ابن اشرف کا قلعہ تھا جس کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔

عام یہودیوں کی طرح مدینہ منورہ کے یہودی بھی خاصے مالدار تھے۔ یہودیوں کی بستیاں شمالی جانب دور دور تک تمام تجارتی شاہراہوں پر موجود تھیں۔ ان میں باہم تجارتی روابط قائم تھے۔ اور ہر مقام کے یہودی ان روابط سے کم و بیش مالی فائدہ اٹھاتے تھے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں عرب و شام کی بین الملی اور بین الملکی تجارت پر عملاً یہودیوں ہی کا قبضہ تھا۔ ہجرت تک مدینہ کے اوس و خزرج عرب یہودیوں سے دبے ہوئے تھے کیونکہ اول وہ یہودیوں کے مقروض رہتے تھے۔ اور قرض کے سلسلے میں عورتوں اور بچوں تک کو رہن رکھتے تھے۔ یہودی اہل کتاب تھے اور دوسروں کے مقابلے میں اصحاب علم و ہنر مانے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ اوس و خزرج کے لوگوں کے قدیم زمانہ سے تعلقات تھے۔ انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ

تعلقات رکھتے تھے۔ اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اوس و خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پرانے تعلقات نباہتے رہے۔ اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہو گیا ہو۔ انہوں نے اوس و خزرج کے ساتھ ظاہر میں تو وہ ہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آرہے تھے مگر دل میں اب وہ ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ و فساد برپا کر دیں۔ اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اسی منافقانہ روش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔

۲۱۹ اے ایمان والو اپنی جماعت کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ بعض کہتے ہیں یہ آیات یہود کے متعلق نازل ہوئیں کیونکہ بعض مسلمان جوار و ہمسائگی کے حلیف دوستانہ معاہدہ وغیرہ کی بنا پر جو تعلقات قبل از اسلام ان سے رکھتے چلے آرہے تھے بعد از اسلام بھی بدستور ان پر قائم رہے اور دوستی پر اعتماد کر کے ان سے مسلمانوں کے بعض رازدارانہ مشوروں کے اخفا کا بھی اہتمام نہ کیا اور بعض کے نزدیک یہ آیتیں منافقین کے حق میں نازل ہوئیں۔ کیونکہ عام طور پر لوگ ظاہر میں انکو مسلمان سمجھ کر ان سے پوری احتیاط نہ کرتے تھے جس سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ حق تعالیٰ نے یہاں صاف صاف آگاہ کر دیا کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور رازدار نہ بنائیں[1]

چونکہ اہل کتاب بھی قریش کی طرح تمہاری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تم بھی ان سے چوکنے ہو جاؤ اور انہیں ہمراز اور معتمد نہ بناؤ۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہے لیکن دلوں میں جو کچھ چھپا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے[2]

بطانہ کے معنے

بطانہ بطن سے بنا ہے اس کا استعمال ظہر کے خلاف ہوتا ہے بالائی جانب کو ظہر اور اندرونی جانب کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] ترجمان قرآن

بطن کہتے ہیں۔ اور کپڑے کے بالائی حصہ ابرے کو ظہارہ اور زیریں حصہ استر کو بطانہ کہتے ہیں۔ پھر یہیں سے بطور استعارہ دلی دوست رازدار اور معتمد کے معنے میں بولا جاتا ہے۔ عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں بطانہ کے معنے یہ بتاتے ہیں بطانۃ الرجل صاحب سرّہ وداخلۃ امرہ الذی یشاورہ فی احوالہ یعنی بطانہ کسی شخص کے دلی رازدار دوست اور اس کے معاملات میں دراندازِ صاحبِ مشورہ کو کہا جاتا ہے۔ اقرب الموارد میں بطانہ سے مراد آدمی کے اہل و عیال اور اس کے خواص اور محرمانِ راز بتائی ہے۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بھی یہی معنے لکھے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ بطانہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو رازدار، دلی اور دوست سمجھا جاتے اور اس کو اپنے معاملات میں معتمد اور مشیر بنایا جاتے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ملت کے سوا کسی کو اس طرح کا معتمد اور مشیر نہ بناؤ کہ اس سے اپنے اور اپنی ملت و حکومت کے راز کھول دو۔[1]

دراصل پہلے بتایا گیا تھا کہ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اگر تم نے اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مومن ہونے کے باوجود تمہیں کافر بنالیں۔ بعد ازیں اس خطرے سے بچنے کی عملی تدابیر بتائی ہیں۔ عملی تدابیر بتانے کے بعد فرمایا تھا کہ اگر تم نے ان کی پاسبانی کی تو یہ اہلِ کتاب تمہارا بال بھی بینکا نہ کرسکیں گے۔ اب بتایا جارہا ہے کہ یہی اہلِ کتاب یعنی یہودی جو مدینہ میں آباد ہیں اور جن سے تمہارے عہد و پیمان اور جوار کے تعلقات ہیں ان کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ آیت میں محطِ نظر من دونکم کی قید ہے۔ یعنی ان یہودیوں کے ساتھ صرف اس قسم کی بطانہ ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق اور مفادات پر مقدم ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے کسی اجتماعی ادارے کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کے ساتھ بطانہ کا تعلق قائم کرے۔

یہود دشمنی کی تصویر

۲۲۰ ۔ وہ تمہارے خلاف میں کمی کرنے والے نہیں، تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہ ہی

---

[1] معارف ص ۳۳

ان کو پسند ہے۔ تمہاری دشمنی ان کے مونہوں سے ظاہر ہے اور تمہارے خلاف جو کچھ ان کے اندر ہے وہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ ہم نے تمہارے سامنے اپنی آیات کھول کر رکھدی ہیں۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔ یعنی یہ لوگ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ تمہیں پاگل بنا کر نقصان پہنچائیں۔ اور دینا و دنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں۔ ان کی خواہش اسی میں ہے کہ تم تکلیف میں رہو اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچ جائے جو دشمنی اور بغض ان کے دلوں میں ہے تو وہ بہت ہی زیادہ ہے۔ لیکن بسا اوقات عداوت و غیظ کے جذبات سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں۔ مارے دشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی۔ پس عقلمند آدمی کا کام نہیں ہے کہ ایسے خبیث باطن دشمنوں کو اپنا رازدار بناتے۔ خدا تعالیٰ نے دوست دشمن کے پتے اور موالات وغیرہ کے احکام کھول کر بتلا دیے جس میں عقل ہوگی ان سے کام لے گا۔ موالات کفار کے متعلق کچھ تفصیل پہلے اس سورت میں گزر چکی ہے اور کچھ مائدہ وغیرہ میں آئے گی۔[1]

بطانتہ سے کیا مراد ہے

عام شارحین قرآن نے بطانتہ کے مفہوم اور مراد متعین کرنے میں بات کو بہت پھیلا دیا ہے قرطبی رقمطراز ہیں:

اس آیت کے ذریعہ اللہ سبحانہ نے اہل ایمان کو کافروں، یہودیوں اور اہل اہوا کو مسلمانوں کے معاملات میں دخیل بنانے سے روکا ہے۔

اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ قانون اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم کو یا اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت کے لیے ضرر کے اندیشے اور خطرے کھلے ہوتے ہیں۔[2]

فقہاء کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مسلمان حاکم کے لیے جائز نہیں کہ اہل ذمہ میں سے کسی کافر کو اپنا منشی اور پیش کار بنائے۔[3]

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان بزرگوں کی نظر میں ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] [3] ماجدی۔

ملازمتوں کے سارے دروازے بند ہیں۔ بلکہ کچھ کے خیال میں یہ معاملہ صرف ریاست کا نہیں بلکہ ہر فرد مسلم کا ہے یعنی ان کے خیال مبارک میں نجی طور پر کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم کو ملازم رکھنا ناجائز ہے[1]

اسی کے نتیجہ میں ــــ مسلمانوں کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کرنا پڑا بلکہ موزوں الفاظ میں ان کو اپنے ماضی کا مرثیہ لکھنا پڑا۔ چنانچہ علامہ قرطبی حسرت قلق اور درد کے لہجے میں لکھتے ہیں:

اس زمانے میں حالات میں ایسا انقلاب آگیا کہ یہود و نصاریٰ کو رازدار و امین بنالیا گیا اور اس طرح وہ نادان حاکموں اور سربراہوں پر مسلط ہو گئے ۔

لیکن کیا یہ قرآن کا منطوق، مدلول اور مفہوم ہے؟ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ جہاں قرآن نے علی الاطلاق غیر مسلموں کو معتمد بنانے سے منع نہیں کیا ہے بلکہ ان کا واضح اور صاف چہرہ بھی پیش کیا ہے جن کو معتمد بنانا منع ہے۔ اس چہرہ نمائی کے لیے قرآن نے ان کے چار اوصاف بتائے ہیں ۔

اوّل یہ کہ جن غیر مسلموں کو معتمد و مشیر بنانا منع ہے۔ وہ مسلمانوں کے فساد کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے ہیں۔ یعنی فتنہ انگیزی اور تمہاری تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے لا یالونکم خبالا کا مفہوم یہی ہے خبال کے معنے بگاڑ اور فساد کے ہیں ۔

دوم یہ کہ وہ تمہارے لیے اس کے متمنی ہیں کہ تمہیں اس راہ میں ٹھوکریں لگیں اور تم زحمتوں میں پھنسو۔ عنت کے معنے مشقت اور تکلیف کے ہیں ۔

سوم یہ کہ ان کے مونہوں سے تمہاری دشمنی عیاں ہے یعنی ان کی باتوں سے بغض و عداوت ٹپک رہی ہے یعنی بغض و عداوت اس قدر ہے کہ اس کو ضبط نہیں کر سکتے اور نہ وہ ان کے چھپانے سے چھپ سکتا ہے اندر سے اچھل کر اور اُبل کر منہ پر آتا ہے ۔

چہارم یہ کہ تمہاری دشمنی و عداوت ان کے دلوں میں جو چھپی ہوئی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ظاہر ہو چکی ہے ۔

بلاشبہ جن غیر مسلموں میں یہ اوصاف پائے جائیں ان کے لیے اسلامی مملکت میں اجتماعی اداروں کے سارے دروازے بند ہیں اور قرطبی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ صرف اہل کفر کے لیے

---

[1] جیسا کہ دریا بادی فرماتے ہیں کہ یہ اجازت کسی مسلم کو یا اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کو ضرر اندیشہ اور خطرے کھلے ہوئے ہیں ۔

نہیں اہل اہوا کے لیے بھی اجازت نہیں ہے لیکن جن غیر مسلموں کے بارے میں تجربے سے معلوم ہو جائے کہ ان میں اہل ایمان کے لیے کوئی فتنہ انگیزی نہیں وہ اہل ایمان کے لیے مصائب اور تکالیف کو پسند نہیں کرتے۔ ان میں بغض وعداوت نہیں ہے اور ان کے دل مسلمانوں کی دشمنی سے پاک ہیں تو قرآن چند محفوظ مناصب کے علاوہ ان کو تمام ملازمتوں میں داخل ہونے کا حق دیتا ہے اور اس معاملہ میں ان سے کوئی تعصب روا نہیں رکھتا مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے لیے اہلیت کا معیار ایک ہی ہوگا اور اہل آدمیوں کا بلا امتیاز انتخاب کیا جائے گا۔

محفوظ مناصب سے مراد

محفوظ مناصب سے مراد ایسے مناصب ہیں جو اسلام کے اصولی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں ان مناصب کی فہرست کافی غور وخوض اور قرآن وسنت کے مطالعہ کے بعد ماہرین کی ایک جماعت بنا سکتی ہے۔ بطور ایک قاعدہ کلیہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل اور محکموں کی رہنمائی سے ہو وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں۔ اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں سے لی جاسکتی ہیں جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں خواہ یہ عہدہ رئیس مملکت کے منشی اور پی اے کا ہو کہ یہ رازداری کا مقام ہے کہ

فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب سے کہا گیا کہ یہاں ایک غیر مسلم لڑکا ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے اگر اس کو آپ اپنا میر منشی بنالیں تو بہتر ہو اس پر فاروق اعظم نے فرمایا، اگر میں ایسا کروں تو مسلمانوں کو چھوڑ کر غیروں کو رازدار بنالوں گا۔

یا جیسا کہ قرطبی ہی نے نقل کیا ہے کہ

حضرت عمر نے فرمایا کہ اہل کتاب سے سرکاری محکموں میں کام نہ لو کیونکہ یہ رشوت کو حلال سمجھتے ہیں۔

ان خدمات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی تمام نظم ونسق میں بڑے سے بڑے عہدوں پر بھی غیر مسلم شہریوں کو انکی اہلیت کے لحاظ سے مقرر کیا جاسکتا ہے۔

قرآن نے یہی پالیسی غیر مسلموں سے ولایت اور موالات کے بارے میں بھی اختیار کی ہے۔ اس نے کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ،

خدا تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور

انصاف کے ساتھ پیش آؤ جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی۔ اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں کی رفاقت سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا ہے نیز تمہیں جلاوطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔

اسی پالیسی کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں غیر مسلم شہریوں کو ان کی صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے معاشرہ میں معزز جگہ دی۔ مسلمان حکمرانوں نے ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا ان کے اصحابِ علم و کمال کی قدر کی اور ان کا اعزاز و اکرام کیا مگر اس سلسلے میں چند باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اسلام میں مذہب اور سیاست جُدا جُدا نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد اسلامی نظام کا قیام اور اس کے احکام کا نفاذ ہے اس لیے حکومت کے بہت سے شعبوں میں اسلامی احکام سے واقفیت ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مثلاً ریاست کی صدارت، مجلس شوریٰ یا عدالت یا قضاۃ کا محکمہ یا وہ انتظامی اور فوجی شعبے جن میں حکام کو اسلامی فرائض ادا کرتے ہوتے ہیں۔ ان شعبوں میں غیر مسلم کام نہیں دے سکتے لیکن جن شعبوں میں مذہبی احکام سے واقفیت ضروری نہیں تھی مثلاً دفاتر شعبۂ مال، طب و حفظانِ صحت، علوم و فنون کی تعلیم اور اسی قبیل کے دوسرے شعبے ان میں ابتداء ہی سے غیر مسلم تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو ملک فتح ہوئے ان کی زبانیں مختلف تھیں، عراق و ایران کی فارسی، مصر کی قبطی، شام کی رومی تھی۔ اور یہاں کی سابق حکومتوں کے دفاتر بھی ان ہی زبانوں میں تھے اس لیے حضرت عمرؓ نے بھی اس کو باقی اور اس کے پرانے عملہ کو برقرار رکھا۔ عبدالملک کے زمانے تک یہی صورتِ حال رہی۔ سب سے پہلے اس نے عربی کو حکومت کی زبان قرار دیا۔ اس وقت غیر مسلموں کا تعلیم یافتہ طبقہ عربی سے واقف ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں اسی پر عمل رہا۔ بنو امیہ کی عربی عصبیت مشہور ہے لیکن اُموی دور میں جب شام کے عیسائیوں اور رومیوں سے ربط و ضبط بڑھا تو حضرت معاویہؓ نے ابن اثال عیسائی کو حمص کا کلکٹر مقرر کیا اور سرجون اور منصور رومی کو مالیات کے ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا[1]

---

[1] یعقوبی۔ خطط الشام کرد علی۔

عباسیوں کے زمانے میں غیر مسلموں کے لیے بڑے بڑے عہدوں کے دروازے بالکل کھل گئے اور دینی شعبوں کو چھوڑ کر کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں عیسائی، یہودی، صابی اور مجوسی عہدے دار نہ رہے ہوں حتیٰ کہ وزارت تک پہنچے، وزارت کے بعد سب سے بڑا عہدہ کاتب یعنی چیف سیکرٹری کا ہوتا تھا جو شاہی احکام و فرامین لکھتا تھا۔ اس کے لیے صاحب وجاہت اور ادیب و انشا پرداز ہونا ضروری تھا مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہ تھی۔ چنانچہ عباسیوں کے دور میں متعدد صابی اور مجوسی اس عہدے پر مامور ہوئے۔ ان میں ابو ہلال عسکری تاریخ اسلام کا نامور ادیب گزرا ہے اس کو عباسی خلفاء اور دیلمی حکمرانوں کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اور اس دور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا[1]۔ تمام خلافت میں اکثر سفیر عیسائی ہوتے تھے۔

دراصل قرآنی آیات میں قیود کی وجہ سے معاملہ اجتہادی تھا۔ جوں جوں اعتماد کی فضا بحال ہوتی تعلقات میں خوشگواری آتی گئی۔ حالات تبدیل ہوتے گئے۔ ممانعت میں اسی قدر ڈھیل پیدا ہو گئی۔ حافظ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں یہی پہلو اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان غیر مسلموں کی خدمات حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔
جن کا اسلام اور اہل ایمان سے غداری اور فریب کاری نمایاں ہو کر سامنے آ گئی ہو چاہے یہ
ظاہری اور واضح دلائل سے ثابت ہوئی ہو اور خواہ ان کے کردار سے معلوم ہوتی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تمام غیر مسلموں کا حکم نہیں بلکہ صرف ان کے بارے میں ہے جن کی عداوت نبوت اور اہل ایمان کے لیے کھل کر سامنے آ گئی۔ ظاہر ہے کہ معاندین اور مخالفین کے لیے یہ حکم قرین انصاف ہے۔

یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ تاریخ میں مخالفین کے بارے میں اہل ایمان کی رواداری جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی اور ان کو اپنی اس اجتہادی غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اگر وہ اعتدال پر رہتے اور محفوظ مناصب کے لیے غیر مسلم شہریوں کے لیے دروازے نہ کھولتے تو یہ روز بد نہ دیکھتے۔

بہر حال بطانت کا معاملہ سارے کا سارا ولایت اور موالات جیسا ہے جو ولایت اور موالات کی حدود ہیں وہی بطانت کی حدود ہیں۔

---

[1] معجم الادباء

اہلِ ایمان کی رواداری

۲۲۱ - یہ تم ہی تو ہو کہ تم ان سے محبت کرتے ہو مگر وہ تو تم سے محبت نہیں کرتے ہیں حالانکہ تم ساری کتابوں کو مانتے ہو۔ یعنی یہ کیسی بے موقعہ بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دم بھرتے ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں بلکہ جڑ کاٹنے والے دشمن ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہو خواہ وہ کسی قوم کی ہوں اور کسی زمانے میں کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں۔ جن کے خدا نے نام بتلا دیے ان پر علی التعیین اور جن کے نام نہیں بتلائے ان پر بالاجمال ایمان رکھتے ہو۔ اس کے برخلاف یہ لوگ تمہاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے بلکہ خود اپنی کتابوں پر بھی ان کا ایمان صحیح نہیں۔ اس لحاظ سے چاہیے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفور و بیزار رہتے مگر یہاں معاملہ برعکس ہو رہا ہے[۱]

اس آیت میں قرآن نے کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ مسلمان اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے یہود سے محبت رکھتے ہیں اور یہود بھی کون؟ جو اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے اور جنہوں نے شرارتوں، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ مثلاً اوس و خزرج کے درمیان تفرقہ ڈال کر خانہ جنگی کی وہی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جو چند سال پیشتر تک دونوں گروہوں کی بربادی کا باعث بن چکی تھی اور وہ یہودیوں کے دست نگر بن کر رہ گئے تھے اس کے باوجود مسلمان یہود سے محبت رکھتے تھے۔ بلاشبہ یہ رحم و کرم اور محبت اسلام نے ان میں پیدا کی تھی۔ مسلمان اس کے اس حد تک خوگر ہو چکے تھے کہ قرآن کو ان کی اس سادگی پر ٹوکنا پڑا۔

اہلِ ایمان کی سادگی و شرافت

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے جنت اور دوزخ کے ایک طویل مکالمہ کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے کہ جنت کہے گی۔

مجھ میں کیا کمی ہے کہ میرے اندر صرف وہی لوگ آئیں گے جو سب سے کمزور گرے پڑے

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

اور بھولے بھالے ہوں گے۔

اس حدیث میں غرارۃ (سادگی) کی اسی صفت کی طرف اشارا ہے۔ صاحب مجمع البحار نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ،

مومن طبعاً اس کو ناپسند کرتا ہے کہ لوگوں کی عیب جوئی میں لگا رہے یہ نہیں کہ وہ بیوقوف اور جاہل ہوتا ہے۔ اس کا بھولا پن اور سادگی اس کی طبیعت کی شرافت کا تقاضا ہوتی ہے وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ لوگوں کے عیوب نکال کر ان کے منہ پر مارتا رہے۔

اسی کے قریب ایک اور حدیث ہے جو ان الفاظ مروی ہے اکثر اھل الجنۃ بلہ۔ اکثر اہل جنت بھولے اور سادے ہوتے ہیں۔ حافظ سخاوی نے المقاصد الحسنہ میں اس کے جملہ طرق نقل کر کے سب کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اگرچہ حدیث مذکور ان الفاظ میں ضعیف ہے لیکن بڑے بڑے علماء و محدثین نے اس کی جو تشریح کی اس سے اس کی معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ سخاوی تشریح نقل کرتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل ذکر اللہ میں فنا ہو کر ماسوا سے غافل ہو چکے ہوں، ابوعثمان فرماتے ہیں ابلہ وہ شخص ہے جو دُنیا کے معاملہ میں ناسمجھ اور آخرت کے معاملہ میں سمجھدار ہو۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں ابلہ وہ شخص ہے جو بُری باتوں کے لیے نابینا اور بھلی باتوں کے لیے بینا ہو۔ امام ابن قتیبہ لکھتے ہیں ابلہ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جن کے سینے لوگوں کی طرف سے صاف ہوں اور مخلوق کی عیب جوئی کی عادت سے وہ اتنے دُور ہوں گویا غافل ہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابلہ وہ شخص ہے جس کے قلب میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محارم کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو۔ علامہ طاہر فتنی صاحبِ مجمع البحار فرماتے ہیں ابلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا سینہ صاف ہوتا ہے اور لوگوں کی طرف ہمیشہ نیک گمان رکھتے ہیں۔ توجہ الی اللہ کی وجہ سے وہ دُنیا کے خداع و فریب سے بے خبر ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر حضرت ابوہریرہ کے مذکورہ بالا بیان کی شرح کرنے کے لیے کافی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم یہودیوں کو اپنا ہم راز بنانے میں غلطی کرو گے۔ تم ان پر لٹو ہو ان کو تو تم ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے ہو۔ یہ تمہارے نیک اور سادہ ہونے کی وجہ سے ہے حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

اس فقرے کے ذریعے اللہ سبحانہ نے اہل ایمان اور اہلِ کتاب دونوں کا چہرہ

پیش فرمایا ہے۔ فرمایا کہ اہلِ ایمان تو اپنے مخالفین کے ساتھ رحمت و رافت کا معاملہ کرتے ہیں جب کہ اہلِ کتاب کا اہلِ ایمان کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں بخدا مومن تو منافق سے بھی رحمت اور محبت کا معاملہ کرتا ہے۔

گویا قرآن کے نقطہ نظر سے اہلِ ایمان منافق اور اہلِ کتاب کے لیے محبت و رحمت ہوتے ہیں۔ شاید قرآن کی اسی رُوح کو علماء نے سمجھا اور اہلِ السنۃ والجماعت کی یہ نشانی بتائی کہ وہ اپنے مخالفوں کے لیے رحمت ہوتے ہیں چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں:

ان من علامۃ اھل السنۃ ان یرحموا المخالف ولا یقطعوا اخوتہ فی الدین۔

اہلِ السنۃ والجماعت کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کے لیے سراپا رحمت ہوتے ہیں اور دینی اخوت کے قاطع نہیں ہوتے۔

آخر میں فرمایا وتؤمنون بالکتاب کلہ اس کا مطلب عام شارحین قرآن نے یہی بتایا ہے کہ تم ساری کتابوں کو مانتے ہو۔ یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اس کے کہ تمہیں ان سے ہوتی ان کو تم سے ہے تم تو قرآن کے ساتھ تورات کو بھی مانتے ہو اس لیے ان کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے البتہ شکایت اگر ہو سکتی تھی تو تمہیں ان سے ہو سکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے[1]

مطلب یہ ہے کہ تم تو ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو وہ پھر بھی تم سے محبت نہیں کرتے اور وہ تو تمہاری کتاب کو مانتے نہیں تم پھر بھی ان سے محبت کرتے ہو۔ گویا اشاروں اشاروں میں سمجھا دیا کہ وہ اپنے باطل میں تم سے زیادہ سخت جان ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ کتاب کو اسم جنس قرار دے کر کلہ کو اس کی تاکید بنایا جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کی یہی رائے ہے۔ لیکن کتاب کو اسم جنس نہیں بلکہ اپنے حال پر رکھا جاتے اور کلہ کو اسی کی تاکید قرار دیا جائے تو یہ اہلِ کتاب پر ان کے کردار پر ایک تعریض ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہیں تو یہ اہلِ کتاب مگر یہ ساری کتاب کو نہیں مانتے، کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں وہ تو چونکہ کتابِ الٰہی کے ان تمام حصوں کو نہیں مانتے جو ان کے مفادات سے ٹکراتے ہوں۔ وقت آنے پر وہ اپنوں کی گردن ناپتے ہیں۔ مفادات کی

[1] تفہیم القرآن

حدود میں وہ بیگانوں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں اور تم تو ساری کتاب کو مانتے ہو اور اس لیے زندگی کے ہر مرحلہ پر تمہارے سامنے اللہ کی کتاب ہوتی ہے۔ برخلاف ان کے کہ یہ محض اپنے مفادات کی حد تک کتاب اللہ کو مانتے ہیں۔

دوغلہ پن اور ابن الوقتی

۲۲۲ ۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوش غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ منافقین تو کہتے ہی تھے، عام یہود و نصاریٰ بھی بحث و گفتگو میں آمَنَّا ہم مسلمان ہیں کہہ کر یہ مطلب لیتے تھے کہ ہم اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت دیکھ کر یہ لوگ جلے مرتے ہیں اور چونکہ اس کے خلاف کچھ بس نہیں چلتا اس لیے فرطِ غیظ و غضب سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ ان کے ایمان باللہ کے دعویٰ سے یہود کا منصود محض اپنے کو قرآن کی گرفت سے بچانا تھا ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اوپر قرآن میں جو آئے لے دے ہو رہی ہے یہ بالکل غلط ہے ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں دینداری اور خدا پرستی تنہا مسلمانوں ہی کا حق نہیں ہے۔ اس دھونس سے وہ اپنے خلاف مسلمانوں کی زبانیں بند کرنا چاہتے تھے حالانکہ یہ حقیقت ان سے مخفی نہیں تھی کہ قرآن ان سے جس ایمان و اسلام کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے یہ مدعی ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ان سے جس ایمان و اسلام کے لیے تھا وہ صرف اس شکل میں پورا ہو سکتا تھا جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خود قرآن پر اس طرح ایمان لاتے جس طرح مسلمان ایمان لائے تھے۔ چونکہ یہ لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بات نباہنے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی کوشش کا پردہ کہہ کر بھرم چوراہے میں پھوڑ دیا۔ لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوش غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ عضوا علیکم الانامل من الغیظ کاٹ کاٹ کھانا عربی محاورے میں کنایہ شدید جھنجلاہٹ سے ہے جیسے اردو محاورے میں اپنی بوٹیاں نوچنا، دانت پیسنا وغیرہ ہے گویا یہ کہہ کر قرآن نے ان کا یہ راز کھول دیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں کے پاس آتے ہیں تو ان پر اثر جمانے کی کوشش

لہ افادات شیخ الاسلام

کرتے ہیں کہ گویا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی تفاوت ہی نہیں ہے لیکن جب یہ اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں تو خود بھی اندرا ندر غصے سے جل جل کر مسلمانوں کے خلاف دانت پیستے ہیں اور اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت دیکھ کر جلتے ہیں ۔

یہودیوں کا حسد اور اس کا سبب

۲۲۳ - ان سے کہہ دو کہ اپنے غصہ میں جل مرو اللہ دلوں کے چھپے ہوئے رازوں کو خوب جانتا ہے ۔ یعنی خدا تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو اور زیادہ ترقیات و فتوحات عنایت فرمائے گا تم غیظ کھا کھا کر مرتے رہو۔ اگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے تب بھی تمہاری آرزوئیں پوری نہ ہوں گی خدا اسلام کو غالب اور سربلند کر کے رہے گا۔ اسی لیے مسلمانوں کو ان شریروں کے باطنی حالات پر مطلع کیا اور سزا بھی ان کو ایسی دے گا جو اندرونی شرارتوں اور خفیہ عداوتوں کے مناسب ہوگی [1] غیظ و غضب کی بے اعتدالی بہت بڑی برائی ہے ۔ بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب میں کر بیٹھتا ہے ۔ اور بعد کو اکثر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے اسی سے بغض و عداوت نشوونما پاتی ہے اور اسی سے حسد رونما ہوتا ہے ۔ مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا اس لیے وہ اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے ۔

۲۲۴ - اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی کی بات ہوتی ہے تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی افتاد آجاتے تو وہ خوشیاں مناتے ہیں ۔ یعنی اگر تمہاری ذرا سی بھلائی دیکھتے ہیں مثلاً مسلمانوں کا اتحاد و یک جہتی یا دشمنوں پر غلبہ تو حسد کی آگ میں بھننے لگتے ہیں اور جہاں تم پر کوئی مصیبت نظر آئی ہے خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے ۔ بھلا ایسی کینہ توز قوم سے ہمدردی اور خیر خواہی کی کیا توقع ہوسکتی ہے جو دوستی کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جائے [2] یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک برائی اور بھلائی یکساں ہوں ۔ اس لیے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے ۔ اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے ۔ اس آیت میں یہی بات

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

ظاہر کی گئی ہے کہ بغض وعداوت کی وجہ سے یہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ خوبیوں کے لیے آیت میں مَس جس کے معنے چھونے کے ہیں اور بُرائی کے لیے اصابہ جس کے معنے لگنے کے ہیں بولا گیا ہے اس میں گویا اشارا ہے کہ ان کے لیے مسلمانوں کی تھوڑی سی خوشحالی غمگینی کا باعث ہو جاتی ہے لیکن بدحالی جب اُلٹا لوپ ہو جاتی ہے تو یہ لوگ شاداں ہوتے ہیں۔

صبر وتقویٰ کی تلقین

۲۲۵- اور دیکھو اگر تم صبر سے کام لو گے اور تقویٰ کا دامن تھامے رکھو گے تو ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہ ہو گی اللہ ان کی ساری کرتوتوں کا گھیرا ڈالے ہوتے ہے۔ ممکن تھا کسی کو یہ خیال آتا کہ جب ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھیں گے تو وہ زیادہ غیظ وغضب میں آ کر ہمارے خلاف تدبیریں کریں گے اور بیش از بیش نقصان پہنچانا چاہیں گے اس کا جواب دیا کہ تم صبر واستقلال اور تقویٰ وطہارت پر ٹھیک ٹھیک قائم رہو گے تو ان کا کوئی داؤ فریب تم پر کارگر نہ ہو گا۔ جو کارروائیاں سب خدا کے علم میں ہیں۔ اور اس کو ہر وقت قدرت حاصل ہے کہ ان کا تار پود بکھیر دے تم اپنا معاملہ خدا سے صاف رکھو پھر تمہارے راستہ سے سب کانٹے صاف کر دیئے جائیں گے [1]

یہود کے کید اور مکر اور مخالفین کے عناد ومخالفت سے بچنے کا اس فقرہ میں سہل الحصول اور آسان نسخہ بتایا ہے کہ تم صابر اور متقی بن کر رہو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ صبر وتقویٰ ان دو لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس سے پہلے پورے رکوع میں کہا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ یہودی خطرے سے بچنے کی تدابیر کی پورے رکوع میں تفصیل بہ بتائی تھی کہ اگر تمہارے دامن میں تقویٰ ہو تم زندگی کے تمام گوشوں میں نبوت کے علم وعمل سے وابستہ رہے۔ تم دعوت الی الخیر امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کام کرو گے تو یہودی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اب اس ساری تفصیل کو صبر وتقویٰ کے دو مختصر لفظوں میں سمیٹ دیا ہے۔ صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے۔ اس کے معنے بے چارگی اور مجبوری کے نہیں ہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔ اسی لیے اس کا اولین مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے مقصد میں جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آغاز میں لوگوں کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہوگیا۔ ہر طرف عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں تو اس وقت بشریت کے تقاضے سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی۔ اس وقت تسلی کا یہ پیغام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ اللہ کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا واصبر لحکم ربك فانك باعيننا اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی و بیچارگی اور بے بسی سامنے ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی جذبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے بالکل یہی صورت حال مدینے میں مسلمانوں کو پیش آ رہی تھی کہ جب مدینہ میں یہودیوں کی اطاعت سے بھی روک دیا گیا۔ یہودیوں کے اعمال کی کامیابی پر قدغن قائم کر دی گئی اور بالآخر ان کو ہمراز اور معتمد بنانے پر پابندی لگا دی گئی تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ ان کی جانب سے اہل اسلام کی مخالفت کا طوفان اٹھے گا اور وہ بیش از بیش نقصان پہنچائیں گے اس اندیشہ کے جواب میں فرمادیا کہ اگر تم نے صبر سے کام لیا اور تمہارے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی اور ساتھ ہی جن کاموں کے کرنے سے تمہیں روکا گیا ہے ان میں خدا کی نافرمانی سے بچے رہے یعنی یہودیوں کو اپنا محرم راز بنانے سے بچے رہے تو پھر ان کا مکر و فریب تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔ ان کے کردار کی ایک ایک کروٹ پر اللہ کی نگاہ ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ
وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ
نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اے پیغمبر! اس وقت کو یاد کرو جب تم سویرے اپنے گھر سے نکلے اور اُحد کے میدان میں لڑائی کے لیے مسلمانوں کو جا بجا مورچوں پر بٹھا رہے تھے[۲۲۶]، اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور واپس لوٹ جائیں حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا جو ایمان رکھنے والے ہیں انہیں ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے[۲۲۷]۔ اور یاد رکھو یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں مدد دی تھی حالانکہ تم گری ہوئی حالت میں تھے بس اللہ سے ڈرو اور اس

کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم شکر گزار ہو سکو۔ ۲۲۸

جنگ بدر اور اُحد سے استشہاد

جنگ بدر اور اُحد کے تجربوں سے استشہاد جن کے نتائج نے ثابت کر دیا تھا کہ صبر و تقویٰ کے بغیر کبھی نصرت و کامرانی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جنگ بدر کے موقع پر دونوں قوتیں موجود تھیں اس لیے تمہاری مٹھی بھر تعداد نے دشمن کی بہت بڑی تعداد کو شکست دے دی۔ لیکن اُحد کے میدان میں تم نے کمزوری دکھلائی، صبر و تقویٰ کی آزمائش میں پورے نہ اترے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نقصان ہوا۔ اس غزوہ میں بعض مسلمان منافقین کی مفسدانہ حرکات سے کچھ اثر پذیر ہو گئے تھے اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے دو قبیلے صبر و تقویٰ کا دامن چھوڑ بیٹھیں جس سے منافقین کو خوش ہونے کا موقع ہاتھ آجائے مگر اللہ نے دستگیری فرمائی اور ان کو بچا لیا۔

قریش مکہ کا انتقام

غزوۂ اُحد کی بنیاد تو اسی وقت پڑ گئی تھی جب قریش بدر میں شکست فاش کھا کر مکہ واپس ہوئے ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور اس کی تسکین کی خاطر وہ ہر ممکن اقدام کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔

ابن ہشام اور طبقات ابن سعد کا بیان ہے کہ قریش بدر سے مکہ لوٹے تو جس تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے وہ نکلے تھے اور ابو جہل کی فتنہ انگیزی کے باعث غزوہ بدر پیش آیا تھا اس کے افراد دارالندوہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چنانچہ چند اکابر نے ابو سفیان سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے اچھے آدمیوں کا قلع قمع کر دیا ہے اس لیے روپے سے ہماری مدد کرو تاکہ ہم اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں۔ ابو سفیان نے اپنی طرف سے اور خاندان عبد المناف کی طرف سے اسے منظور کر لیا۔ قافلے میں ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا مال۔ اصل سرمایہ مالکوں کو لوٹا دیا گیا۔ منافع رکھ لیا گیا جس کی مجموعی مقدار پچاس ہزار روپیہ تھی۔

جنگ کی تیاری

صفوان بن اُمیہ جنگ کے لیے تیاری میں پیش پیش تھا۔ ابو عزہ شاعر جنگ بدر کے قیدیوں میں شامل تھا۔ اس کے پاس فدیہ کے لیے کچھ نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتجی ہوا کہ میں کثیر العیال اور ضرورت مند ہوں۔ اس وقت مجھ پر احسان فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے احسان رکھ کر رہا کر دیا۔ وہ قریش کی نئی تیاریوں میں شرکت کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن صفوان بن اُمیہ نے لالچ دے کر ساتھ ملا لیا۔ اس نے اور مسافع بن عبد المناف نے بنو کنانہ کو قریش کی معیت پر آمادہ کرنے کے لیے انتہائی سرگرمی سے کام لیا۔

قریش کی فوج

قریش کی تیاریوں کے متعلق تمام خبریں عباس کے ذریعے سے رسول اللہؐ کو مل گئیں جو اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر رسول اللہؐ کی خیر خواہی میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے جو ان کے امکان میں تھا۔ بہرحال قریش مکہ کی فوج تین ہزار جنگ جوؤں پر مشتمل تھی جس میں اہل تہامہ اور بنو کنانہ بھی شامل تھے۔ ان میں سات سو زرہ پوش تھے دو سو گھوڑے تین ہزار اونٹ اور پندرہ عورتیں ساتھ تھیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں۔ لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوش جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں جس لڑائی میں خاتونیں ہوتیں عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوئی تو عورت بے حرمت ہو گی اگرچہ جنگ حنین میں عورتوں، بچوں بلکہ مال کا ساتھ ہونا مخالفوں کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکا اور دُرید بن صمہ کی رائے دُرست ثابت ہوئی تھی کہ جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی میدانِ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔

مشورہ اور فیصلہ

پھر صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا گیا۔ مہاجرین و انصار میں سے اکابر کی رائے یہ تھی کہ عورتوں اور بچوں کو گڑھیوں (آطام) میں بھیج دیا جائے جن کی تعداد مدینے میں خاصی تھی اور خود شہر میں مورچے بنا کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ رسول اللہ کی رائے مبارک بھی یہی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی کی رائے بھی یہی تھی جسے طبری کے بیان کے مطابق پہلی مرتبہ مشورے میں شریک کیا گیا تھا، لیکن

وجوانوں کی بڑی تعداد نے شہر سے باہر نکل کر مقابلے پر زور دیا ان کے جوش اور گرمی خون کا تقاضا یہی تھا۔ آخر اندازہ ہوا کہ کثرت اسی رائے کے حق میں ہے۔ جمعہ کا دن تھا حضور انور نے نماز جمعہ پڑھائی جہاد پر وعظ فرمایا ارشاد ہوا کہ جب تک صبر کرو گے مدد ہو گی۔ پھر آپ مکان میں تشریف لے گئے۔ زرہ پہنی جنگ کا دوسرا سامان لیا لوگ صفیں باندھے آپ کے منتظر تھے۔ اس اثنا میں سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر نے نوجوانوں سے کہا کہ باہر نکل کر مقابلے پر اصرار مناسب نہ تھا بہتر ہے کہ اب بھی معاملہ حضور انور کے سپرد کر دو۔ خود نوجوانوں کو بھی اپنے اصرار پر پشیمانی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلح ہو کر برآمد ہوتے تو باہر نکل کر مقابلے پر اصرار کرنے والے تمام لوگوں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے سے دستبردار ہوتے ہیں آپ کو جو مناسب معلوم ہو وہی کریں۔ حضور انور نے فرمایا پیغمبر کے لیے زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے جب تک اللہ اس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ کر دے جب تک معاملہ مشورے کی منزل میں تھا رائے بدلی جا سکتی تھی جب فیصلہ ہو چکا تو اب رائے بدلنا اور معاملے کو از سر نو معرض گفتگو میں ڈالنا مناسب نہ تھا یہ طریقہ عزیمت و ہمت کے لیے ضعف و نااستواری کا باعث ہو سکتا تھا۔

مدینہ منورہ کی آبادی

مدینہ منورہ کے مشرق مغرب اور جنوب میں کھجور کے گھنے باغ تھے ان میں سے گزرتے ہوئے کسی بستی یا محلہ پر حملہ آسان نہ تھا کیونکہ باغوں میں سے دشمن کا صرف ایک ایک آدمی بمشکل آگے بڑھ سکتا تھا اس صورت میں حملہ آور بآسانی مارے جاتے صرف شمالی جانب سے حملہ ہو سکتا تھا اس لیے قریش نے شمالی و مغربی جانب پر پڑاؤ ڈالا تھا پھر پوری آبادی ایک مقام پر نہ تھی بلکہ پہاڑوں کے درمیان وسیع میدان میں بکھری ہوئی بستیاں یا محلے آباد تھے۔ بعض قبیلوں نے اپنی زمینوں اور باغوں کے پاس آبادی کا انتظام کر لیا تھا اور کئی دو منزلہ گڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ وہ ہر خطرے کے وقت بچوں اور عورتوں کو گڑھیوں کی بالائی منزلوں پر پہنچا دیتے اور خود فارغ البال ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے۔

اسلامی لشکر

مدینہ منورہ سے رسول اللہ عصر کے وقت نکلے آپ نے تین نیزے طلب فرماتے اور تین جھنڈے

بنائے۔ ایک حباب بن منذر کو عطا ہوا دوسرا اُسید بن حضیر اور تیسرا علی بن ابی طالب کو حضور انور گھوڑے پر سوار ہوئے کمان کندھے پر ڈالی نیزہ ہاتھ میں لیا۔ مسلمانوں کی کل تعداد اس وقت ایک ہزار تھی جن میں عبداللہ بن ابی کے تین سو آدمی بھی شامل تھے۔ لشکر میں صرف ایک سو آدمی زرہ پوش تھے۔ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ مرکب مبارک کے آگے آگے دوڑ رہے تھے باقی لشکری دائیں بائیں اور پیچھے تھے۔ حضور انور نے مشرقی جانب کے حرے یعنی حرہ واقم کے دامن کا راستہ اختیار فرمایا جدھر بنی عبدالاشہل کی بستی تھی۔ جب آپ مقام شوط میں پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ میری رائے کے مطابق مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ نہیں کیا گیا گویا اسلامی لشکر کے افراد صرف سات سو رہ گئے ساتھ دو گھوڑے تھے طبقات ابن سعد میں ہے رسول اللہ شیخین میں شب باش ہوتے محمد بن مسلمہ کو پچاس آدمیوں کے ساتھ پہرہ داری پر مامور فرمایا گیا یہ اصحاب رات بھر لشکر کے گرد گشت کرتے رہے۔ رات کے پچھلے حصے میں ابوخیثمہ حارثی کو رہبر بنایا اور اُحد کی جانب روانہ ہوئے۔ القنطرہ پہنچے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ وہیں آپ نے بلال کو اذان کا حکم دیا اور نماز پڑھائی۔ پھر جبلِ اُحد کے پاس اس مقام پر پہنچ گئے جسے بظاہر پہلے سے فوج کی ترتیب کے لیے تجویز فرما رکھا تھا۔

جبلِ اُحد

جبلِ اُحد مدینے کے شمال میں قریباً تین میل پر شرقاً غرباً بخطِ مستقیم پھیلا ہوا ہے۔ اس کی جنوبی جانب وسط میں نعل نما خلا ہے جو خاصا وسیع ہے یعنی یہاں سے پہاڑ پیچھے کی طرف ہٹ گیا ہے۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ نزل الشعب من احد فی عدوۃ الوادی الی جبل یعنی آپ ایک گھاٹی میں اترے۔ یہ مقام وادی قنات سے پہاڑ کی جانب اونچائی میں واقع ہے جہاں سے یہ خلا یا جھکاؤ شروع ہوتا ہے وہاں سے جبلِ اُحد کے ساتھ ساتھ وادی قنات گزرتی ہے جس میں بارش کے ساتھ خاصا پانی بہنے لگتا ہے بارش نہ ہو تو یہ عموماً خشک ہوتی ہے۔ قنات کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ خلا کی زمین قنات سے اونچی ہے اس کے عین سامنے وادی کے جنوبی کنارے پر ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے جسے جبل عینین کہتے ہیں یعنی دو چشموں والا ٹیلا۔ کیونکہ اس سے دو چشمے نکلتے ہیں۔ جنگ اُحد کے بعد اسے جبل الرماۃ بھی کہنے لگے یعنی وہ ٹیلا جس پر تیر انداز(۱)، کا مورچہ تھا رسول اللہ نے اُحد کے اسی جھکاؤ کو صف بندی

کے لیے منتخب فرمایا۔ پشت پر پہاڑ تھا۔ عینین پر پچاس تیر انداز مقرر فرما دیے جن کی سالاری عبداللہ بن جبیر کو سونپی اور تاکید فرما دی کہ ہمیں فتح ہو یا شکست مگر تیر اندازوں کو کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑنی چاہیے وہ ٹیلے پر بدستور جمے رہیں اور مقرر مورچے سے اِدھر اُدھر نہ ہوں۔

تیر اندازوں کے مورچے کی اہمیت

قریش مغربی جانب سے صف بند ہو کر لڑائی کے لیے آ سکتے تھے کیونکہ ان کی لشکرگاہ مغرب ہی کی جانب تھی مسلمانوں کے لیے نعل نما خلا میں صف بند ہو کر دشمن کے مقابلے کے لیے مغربی جانب کا رُخ کر لینا ناگزیر تھا۔

صرف ایک خطرہ تھا کہ جب گھمسان کا رن پڑے تو مبادا کوئی فوج مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دے اس طرح وہ دو لشکروں کے درمیان گھر جائیں۔ جبل عینین کے تیر اندازوں کا اولین وظیفہ یہی قرار دیا گیا کہ وہ عقب سے حملہ کرنے والی ہر فوج کو روکیں اور اس کا رُخ پلٹ دیں۔ مسلمان مغربی جانب دُشمن کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کتنی ہی دُور نکل جاتے اگر ان کا عقب محفوظ رہتا تو کوئی خطرہ ان کے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ قریش کثرتِ تعداد کی بنا پر مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے جبل عینین کی طرف لے آتے تو جبل عینین کے تیر انداز اپنی قادر اندازی سے قریش کے لشکر میں بھی افراتفری ڈال سکتے تھے اور اپنے بھائیوں سے دُشمن کا دباؤ بھی دُور کر سکتے تھے۔ غرض تیر اندازوں کے دو وظیفے تھے اور دونوں کو جنگ میں انتہائی اہمیت حاصل تھی۔ ۱۔ مسلمانوں کے عقب کو ہر حملہ آور سے محفوظ رکھنا، ۲۔ قریش کا دباؤ بڑھے تو ان کی قوت کو درہم برہم کرنے کے لیے امداد دینا۔ یہ دونوں وظیفے اصل مورچے پر قائم و استوار رہنے ہی سے پورے ہو سکتے تھے اس لیے رسول اللہ نے تاکید فرما دی تھی کہ لڑائی کا انجام خواہ کچھ ہو مگر تیر انداز کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑیں۔ طبقات کے بیان کے مطابق ان سے کہہ دیا گیا تھا اگر تم دیکھو کہ ہمیں مالِ غنیمت مل رہا ہے تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا اور اگر تم دیکھو کہ ہم قتل ہو رہے ہیں تو ہماری مدد نہ کرنا۔

قریش کی صف آرائی

قریش کی صف آرائی کے متعلق جو تفصیلات روایات میں ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسالہ دو سو گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ ایک سو گھوڑے لشکر کے میمنہ پر تھے اور ایک سو میسرہ پر۔ میمنہ پر خالد بن

ولید مامور ہوتے جو اس وقت تک اسلام نہیں لاتے تھے۔ میسرہ عکرمہ بن ابی جہل کے حوالے کر دیا گیا ایک سو تیر اندازوں کی کمان عبدابن ربیعہ کو سونپی گئی۔ قلب کی فوج آگے بڑھی تو اس کے پیچھے عورتیں ذہین سجا سجا کر اور اشعار گا گا کر مردوں کو جوش دلا رہی تھیں۔ قریش نے علم طلحہ بن ابی طلحہ کو دیا جو عبدالدار کے خاندان سے تھا۔ رسول اللہ نے یہ سنا تو اسلامی علم مصعب بن عمیر کے حوالے کر دیا وہ بھی عبدالدار کے خاندان سے تھے۔

آغازِ جنگ

جنگ کی ابتداء ابوعامر فاسق سے ہوئی وہ قبیلہ اوس میں سے تھا خدا جانے اسے کیوں یہ خیال ہو گیا تھا کہ میرے ہم قوم مجھے دیکھتے ہی رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس کے ساتھ متفرق آدمیوں کا ایک گروہ تھا۔

انصار نے اسے دیکھتے ہی کہا او فاسق خدا تجھے بینائی سے محروم کرے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پتھر بھی پھینکے پھر یہ کہتا ہوا لوٹ گیا کہ میرے دُور ہو جانے کے باعث میری قوم کے خیالات بگڑ گئے ہیں۔ ابوسفیان نے طلحہ بن ابی طلحہ سے کہا کہ بدر میں بھی ہمارا جھنڈا عبدالدار ہی کے پاس تھا وہاں ہم پر جو مصیبت آئی اس کا ذکر غیر ضروری ہے لوگ جھنڈا ہی دیکھ کر میدان جنگ میں ثابت قدم رہتے ہیں جھنڈا جگہ سے ہٹ جائے تو سب کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں لہٰذا بنو عبدالدار یا تو اطمینان دلاؤ کہ جھنڈے کو بہرحال بلند رکھو گے یا اسے چھوڑ دو تاکہ ہم خود سنبھال لیں۔ بنو عبدالدار نے جھنڈے کی حفاظت کے متعلق پورا اطمینان دلایا اور اس فرض کی بجا آوری میں خاندان کے بیشتر افراد کٹوا دیے۔

بنو عبدالدار کی تباہی

مسلمان تیر اندازوں نے قبیلہ ہوازن کا رُخ پھیر دیا تو طلحہ بن ابی طلحہ (علمدارِ قریش) نے جوش کے عالم میں کہا کوئی ہے جو مجھ سے جنگ کرے۔ علی بن ابی طالب آگے بڑھے اور ایسی ضرب لگائی کہ طلحہ کی کھوپڑی پھٹ گئی اور وہ گر گیا۔ اس کے بعد جھنڈے کی حفاظت میں بنو عبدالدار کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ طلحہ کے بھائی عثمان بن ابی طلحہ کو حمزہ نے اور ابوسعید بن ابی طلحہ کو سعد بن ابی وقاص نے قتل کیا۔ طلحہ کے تین بیٹے، مسافع، کلاب اور جلاس یکے بعد دیگرے مارے گئے

پھر خاندان عبدالدار میں سے ارطاۃ بن شرحبیل اور قاسط بن شریح نیز خاندان کا ایک غلام صواب موت کے گھاٹ اترے گویا اس خاندان نے جھنڈے کی حفاظت میں باری باری نو جانیں دیں۔ قریش ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور انہیں میدان جنگ سے نکال دیا ساتھ ہی مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔

تیراندازوں کی غلطی

تیراندازوں کے سرعسکر عبداللہ بن جبیر اپنے ساتھیوں کو بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد دلاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں حضور انور کے حکم سے تجاوز نہ کروں گا باقی سب کو بھی اس فرمان کا پورا پاس تھا لیکن وہ کہتے تھے کہ اس فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ دشمن میدانِ جنگ بھی چھوڑ دے تو بدستور مورچے پر جمے رہو۔ چنانچہ چالیس تیرانداز جبل عینین سے اتر کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے اور صرف دس اپنے سرعسکر کے ساتھ مورچے پر قائم و استوار رہے۔ اسی غلطی نے دشمن کو ایک ایسی تدبیر پر عمل پیرائی کا موقعہ دیا جس سے مسلمانوں کی بدیہی فتح شدید جانی نقصان میں بدل گئی۔

خالد بن ولید کا حملہ

خالد بن ولید کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی جنگی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں۔ انہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ اپنی شکست کی تلافی کا بہترین ذریعہ کیا ہے چنانچہ فوراً اپنا رسالہ لے کر جبل احد کی شمالی جانب سے ہوتے ہوئے مشرقی سمت آ گئے۔ جبل عینین اور احد کے درمیان سے ان مسلمانوں پر حملہ کر دیا جن کا رخ بھاگنے والے قریش کے تعاقب میں مغربی جانب تھا۔ نیز وہ مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے۔ عکرمہ بن ابی جہل بھی خالد کے ساتھ ہو گیا۔ ایسے ہی حملے کی روک تھام کے لیے تیرانداز جبل عینین پر بٹھائے گئے تھے لیکن انہوں نے رسول اللہ کے تاکیدی حکم کی تعبیر ظاہری حالات کے پیشِ نظر ایسے انداز میں کر لی جس سے ان کی نیت پر زد نہیں پڑتی تاہم اس نقصان کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو اس تعبیر سے اسلامی لشکر ملتِ اسلامیہ اور خود مقاصدِ تبلیغ کو پہنچا پھر یہی تعبیر قریش مکہ کی مزاحمت کو ختم کرنے میں موجبِ تاخیر ہوئی جو اسلام اور عربوں کے درمیان ایک دیوار کی حیثیت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ خالد کا حملہ اس درجہ ناگہانی تھا گویا یکایک ایک بجلی مسلمانوں کے خرمن تنظیم و ترتیب پر آ گری اور ان کی شاندار فتح شدید نقصان میں بدل گئی۔ جن چالیس تیراندازوں نے

مورچہ چھوڑنے کی غلطی کی تھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا انجام کیا ہوا لیکن جن دس نیک بختوں نے عبداللہ بن جبیر کی سرگردگی میں مورچہ نہیں چھوڑا تھا وہ بھی شہادت پاگئے۔

نزولِ آفات

جب تک جبلِ عینین کا مورچہ قائم تھا مسلمان جس طرف بڑھتے تھے گرد و پیش مرت بکھرتے جاتے تھے۔ خالد کے حملے نے صورتِ حالات بالکل منقلب کر ڈالی۔ حمزہ بن عبدالمطلب، ارطاۃ بن شرجیل کو قتل کر کے سباع بن عبدالعزیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عین اس وقت وحشی نے حملے سے پیدا شدہ افراتفری دیکھ کر جبلِ عینین کے پاس سے حربہ حمزہ کی طرف پھینکا جو ناف سے اوپر ان کے پیٹ میں گھسا اور ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل گیا وہ لڑکھڑائے، گرے اور جاں بحق ہو گئے۔ مصعب بن عمیر اسلامی فوج کے علمدار تھے۔ ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ بھی قلم ہو گیا تو علم کو سینے سے لگالیا۔ اسی حالت میں انہیں عمرو بن قمیہ نے شہید کر دیا۔ مصعب شکل اور وضع قطع میں رسول اللہ سے مشابہ تھے۔ اسی بنا پر ابن قمیہ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ محمد کو قتل کر آیا ہے۔ ابوعامر فاسق کفر و شرک کی حمایت میں مصروف تگ و دو تھا لیکن اس کے فرزندِ ارجمند حنظلہ جان ہتھیلی پر رکھے راہِ حق میں سرگرم جہاد تھے۔ اتفاقاً حنظلہ کی مڈبھیڑ ابوسفیان سے ہو گئی قریب تھا ابوسفیان کا خاتمہ حنظلہ کے مقدس ہاتھوں سے ہو جاتا کہ مشرکین میں سے شداد بن الاسود نے حنظلہ کو شہید کر دیا۔

مسلمانوں کے تین گروہ

خالد کے اس حملے نے مسلمانوں میں جو ابتری پیدا کی اس کی وجہ سے وہ تین گروہ ہو گئے۔ ان میں ایک چھوٹا سا گروہ میدان سے بھاگ گیا۔ ان میں سے کچھ مدینہ پہنچ گئے۔ اور کچھ اس سے بھی آگے مشرقی جانب نکل گئے۔ روایتوں میں دو مقاموں کا ذکر آیا ہے اول منقی دوم جلعب۔ یہ دونوں اعوص نام مقام کے قریب بتائے گئے ہیں اور اعوص مدینہ منورہ کے مشرق میں کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے گروہ نے میدان تو نہ چھوڑا لیکن حضور انور کی شہادت ان پر بجلی کی طرح گری اور تعطل کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یکایک کیا صورت پیش آگئی اور اس عالم میں کیا کرنا چاہیے؟ تیسرا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اسی طرح جاں نثاری اور فداکاری میں سرگرم عمل رہا جس طرح پروانے شمع پر جان قربان کرتے وقت گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔

اس گروہ میں ابوبکر، علی، سعد بن ابی وقاص اور مہاجرین وانصار میں سے اور لوگ شامل تھے۔

رسول اللہ کو چشم زخم

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات بھی چشم زخم سے محفوظ نہ رہی۔ سعد بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے جو مسلمان نہیں ہوا تھا حضور انور کا نیچے کا داہنا دانت شہید کر دیا اور اسی کی ضرب سے لب مبارک پر بھی زخم آیا۔ عبداللہ بن شہاب نے پیشانی مبارک کو زخمی کیا۔ عمرو بن قمیئہ نے ایک پتھر اس زور سے مارا کہ دو کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں ایسے ہی حالات میں زبان حق ترجمان پر یہ الفاظ آئے وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کرتی ہے۔ پھر آپ کی شفقت و رحمت بے پایاں ہی فرماتی رہی۔ اے خدا میری قوم کو راہ ہدایت دکھادے یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں یا انہیں معاف کر دے۔ ابو عامر فاسق نے جو گڑھے خفیہ خفیہ کھدوائے تھے اور مسلمانوں کو ان کا پتہ نہیں لگ سکا تھا ان میں سے ایک میں رسول اللہ بھی گر گئے۔ علی بن ابی طالب نے آپ کا دست مبارک پکڑا۔ طلحہ بن عبیداللہ نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ابو عبیدہ بن الجراح نے دانتوں کی کڑیاں یکے بعد دیگرے کھینچ کر نکالیں اور اس عمل میں ان کے آگے کے دو دانت گر گئے۔ ابو سعید الخدری کے والد مالک بن سنان نے چہرہ مبارک سے خون چوس کر نکالا۔

انسانی فداکاری کے معجزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھوڑے سے صحابہ رہ گئے تھے۔ اسلامی لشکر میں خالد کے حملے سے افراتفری پیدا ہوئی تو قریش از سر نو منظم ہو کر حملوں پر آمادہ ہو گئے۔ حضور انور نے فرمایا۔ کون اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کرتا ہے۔ ایک انصاری جن کا نام ایک روایت میں زیاد بن السکن اور دوسری روایت میں عمارہ بن زیاد بن السکن آیا ہے پانچ یا سات انصار کو لے کر کھڑے ہو گئے ایک ایک نے لڑتے لڑتے جان دے دی۔ سب سے آخر میں زیاد بن السکن یا عمارہ بن زیاد بن السکن زخموں سے چور ہو کر گر گئے حضور انور نے فرمایا اسے میرے قریب لے آؤ پھر اس پاکباز مجاہد نے اپنا رخسار پائے مبارک پر رکھ لیا اسی حالت میں وہ جان بحق ہو گئے۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ان کا لاشہ قریب لاؤ لوگ اٹھا کر لائے کچھ کچھ جان باقی تھی قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔

بکہ نازرفتہ باشد زجہاں نیاز مندے　　　　کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

ام عمارہ (نسیبہ بنت کعب المازینہ) نے بھی بڑی دلیری سے رسول اللہ کی حفاظت کا حق ادا کیا۔ تلوار سے عمرو بن قمیہ کے کئی ضربیں لگائیں لیکن اس نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں اس لیے محفوظ رہا خود ابن قمیہ نے ام عمارہ کے کندھے پر شدید زخم لگایا جس کا نشان مدت العمر باقی رہا یہی ام عمارہ ہیں جن کے فرزند حبیب بن زید بن عاصم نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا تھا۔ ابو دجانہ نے اپنے جسم کو حضور انور کے لیے ڈھال بنا رکھا تھا۔ تیر پر تیر کھاتے گئے حتیٰ کہ جسم چھلنی ہو گیا مگر ذرا بھی جنبش نہ کی تاکہ کوئی تیر حضور انور تک نہ پہنچنے پائے۔ طلحہ نے بھی یہ فرض بوجہ احسن انجام دیا۔ سعد بن وقاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیر دیتے جاتے تھے۔ ساتھ ہی فرماتے تھے ارم فداک ابی وامی (میرے ماں باپ قربان چلاتے جاؤ۔) سعد مدت العمر اس محبت بھرے ارشادِ مقدس پر فخر کرتے رہے۔ ابن قمیہ نے حضور انور پر ایک سخت وار کیا۔ اس وار کو طلحہ نے اپنے برہنہ ہاتھ پر روکا جس سے ہاتھ کٹ گیا اور ابن قمیہ کے وار کا زور کم ہو گیا۔ نیز رسول اللہ نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں اس لیے آپ بفضل اللہ گزند سے محفوظ رہے۔

انس اور ابن عوف

انس بن مالک کے چچا انس بن نضیر بعض صحابہ کے پاس پہنچے جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ ان میں عمر اور طلحہ بن عبید اللہ بھی تھے۔ پوچھا آپ لوگ کس لیے بیٹھے ہیں جواب ملا کہ رسول اللہ شہید ہو گئے۔ انس نے کہا پھر آپ کے بعد زندگی کس کام کی۔ اٹھو اور اس مقصد کے لیے مر مٹو جس کے لیے رسول اللہ مر مٹے۔ یہ کہتے ہی انس کفار سے جنگ میں مشغول ہو گئے اور جب تک شہادت نہ پا گئے قتال سے نہ رکے بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم پر کم و بیش ستر زخم تھے نعش پہچانی نہیں جاتی تھی۔ انس کی ہمشیرہ نے انگلیاں دیکھ کر پہچانا۔ عبد الرحمٰن بن عوف کے منہ پر ایک پتھر لگا جس سے ان کا اگلا دانت ٹوٹ گیا اور بیس یا اس سے بھی زیادہ زخم لگے۔ بعض زخم پاؤں پر لگے تھے جن کی وجہ سے وہ لنگڑے ہو گئے۔

مسلمانوں کو بشارت

جس صحابی نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، وہ کعب بن مالک تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا مسلمانو بشارت ہو یہ رسول اللہ ہیں۔ جو صحابہ مایوس اور دل شکستہ بیٹھے تھے یہ بشارت سنتے ہی ان کے جسموں میں گویا از سر نو جان پڑ گئی وہ سب حضور انور کی طرف دوڑے۔ حضور انور گھاٹی کی

طرف چلے۔ ابوبکر، عمر، علی، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، حارث بن صمہ اور بعض دوسرے مسلمان آپ کے ساتھ تھے آپ چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے۔ طلحہ بن عبید اللہ نیچے بیٹھ گئے اور ان کی مدد سے حضور انور چٹان پر چڑھے قریش کا ایک گروہ پہاڑ پر چڑھ آیا تھا۔ عمر بن خطاب اور بعض دوسرے اصحاب نے زبردست مقابلہ کر کے اس گروہ کو پہاڑ سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ علی بن ابی طالب اپنی سپر میں احد کے چشمے سے جس کا نام مہراس تھا پانی لاتے اور رسول اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ کو اس میں سے بدبو آئی لہٰذا پانی پیا نہیں البتہ اس سے چہرہ مبارک کا خون دھویا۔

حسیل اور ثابت

حذیفہ کے والد ماجد حسیل بن جابر (الیمان) اور ثابت بن وقش بہت سن رسیدہ تھے انہیں عورتوں اور بچوں کے ساتھ گڑھی میں بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے باہم بات چیت کر کے طے کیا کہ ہماری عمریں تو اب پوری ہو چکی ہیں کیوں نہ تلواریں لے کر نکلیں اور مسلمانوں سے جا ملیں شاید اللہ تعالیٰ شہادت کا شرف بخشے چنانچہ دونوں بزرگ تلواریں لے کر نکل پڑے۔ ثابت بن وقش تو مشرکوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے لیکن حسیل بن جابر کو غلط فہمی سے مسلمانوں ہی نے شہید کر دیا انہیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ حسیل جنگ کے لیے آگئے ہیں یہی سمجھتے رہے کہ قریش مکہ میں سے کوئی شخص ہے رسول اللہ نے خون بہا دلانا چاہا لیکن حذیفہ نے معاف کر دیا۔

اُصیرم

بنی عبدالاشہل میں سے عمرو بن ثابت بن وقش اصیرم کر کے مشہور تھے۔ وہ قبول اسلام پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ رسول اللہ جنگ کے لیے نکلے تو اصیرم نے خود ہی اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں میں شامل ہو کر لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ عبدالاشہل کے آدمی میدان جنگ میں اپنے مقتولین ڈھونڈ رہے تھے۔ اصیرم کو سخت زخمی دیکھا تو حیران ہوئے کہ انہیں کیا چیز یہاں لائی خود اصیرم سے پوچھا تو انہوں نے کہا میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا پھر تلوار لے کر لڑتا رہا اور اب جو میری حالت ہے وہ آپ لوگوں کے سامنے ہے یہ کہہ کر وفات پا گئے۔ رسول اللہ نے حالات سنے تو فرمایا:

انہ من اھل الجنۃ وہ جنتیوں میں سے ہے۔

عمرو بن الجموح

عمرو بن جموح لنگڑے تھے آپ کے چار بہادر فرزند غزوۂ احد میں شریک تھے اور والد کو روکتے تھے۔ عمرو حضور انور کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ میرے بیٹے روک رہے ہیں لیکن خدا کی قسم میری تمنا ہے کہ لنگڑے پن ہی کی حالت میں جنت کی سرزمین روندتا پھروں۔ حضور انور نے فرمایا تمہیں اللہ نے معذور قرار دیا ہے تم پر جہاد فرض نہیں۔ بیٹوں سے فرمایا کہ تم والد کو منع نہ کریں۔ چنانچہ عمرو بن جموح جنگ میں شریک ہوئے اور شہادت پائی آپ کے ساتھ ایک فرزند خلاد و دو غلاموں سلیم اور ابوایمن نیز عبداللہ بن عمرو بن حرام (برادر اہلیہ عمرو بن جموح) بھی شہید ہوئے عمرو کی اہلیہ ہند بنت عمرو بن حرام، شوہر بیٹے اور بھائی کی نعشیں میدان احد سے اونٹ پر لاد کر مدینے لارہی تھی راستے میں اونٹ بیٹھ گیا اور نہ چلا۔ آخر تمام نعشیں پھر میدان احد میں پہنچائی گئیں جہاں عمرو بن جموح اور عبداللہ عمرو بن حرام کو ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

سعد بن الربیع

سعد بن الربیع مدینے کے رؤسا میں سے تھے انہیں عبدالرحمٰن بن عوف کا بھائی بنایا گیا تھا۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کی خبر لاؤ ایک انصاری میدان میں گئے۔ ہر طرف آوازیں دیں کوئی جواب نہ ملا۔ پھر خیال آیا کہ رسول اللہ کا نام لے کر پکارنا چاہیے۔ یہ آواز سعد کے کان میں پڑے تو شاید جواب دیں چنانچہ انصاری بھائی نے پکار کر کہا سعد بن ربیع کہاں ہیں مجھے رسول اللہ نے ان کے پاس بھیجا ہے یہ سنتے ہی سعد کے تن نیم مردہ میں بجلی کی لہر دوڑ گئی دھیمی آواز میں جواب دیا میں یہاں ہوں۔ انصاری بھائی نے سعد کو مقتولین میں پایا۔ ان پر نزع کی حالت طاری تھی ان سے کہا گیا کہ رسول اللہ نے آپ کی حالت دریافت کی ہے۔ سعد بولے رسول اللہ کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا کہ خدا کے رسولوں کو ان کے پیروؤں کی قربانی اور اخلاص کی وجہ سے جو ثواب ملا کرتا ہے آپ کو وہ ثواب تمام نبیوں سے بڑھ چڑھ کر ملے قوم سے کہنا کہ تم میں زندگی کا سانس ہوتے ہوئے رسول اللہ کو خدانخواستہ کوئی تکلیف پہنچ گئی تو خدا کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوگے۔ کیونکہ تم نے لیلۃ العقبہ میں رسول اللہ پر فدا ہونے کی بیعت کی تھی یہ کہتے ہی عالم بقا کو سدھارے جسم پر صرف نیزے کے بارہ زخم تھے۔

اُبی بن خلف

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹان پر چڑھ گئے تو اُبی بن خلف آپ کا پتہ لگا کر یہ کہتا ہوا آپہنچا۔ اگر محمد بچ گئے تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ انہیں اُبی سے لڑنے کی اجازت ہو حضور نے فرمایا اسے آنے دو وہ قریب آیا تو آپ نے نیزے سے اس کی گردن پر مارا وہ گھوڑے سے لڑکھڑا کر گرا اگرچہ بظاہر زخم معمولی معلوم ہوتا تھا لیکن اُبی پکار پکار کر کہہ رہا تھا قتلنی واللہ محمد خدا کی قسم مجھے محمد نے قتل کر دیا۔ چنانچہ واپسی پر مقام سرف میں مر گیا۔

رسُول اللہ کی تلوار

اس غزوہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنی تلوار اسے دوں گا جو اس کا حق ادا کرے۔ دوسرے اصحاب کے علاوہ زبیر بن العوام کو اس تلوار کی خواہش خصوصیت سے تھی لیکن وہ ابو دجانہ کو دے دی گئی۔ ابو دجانہ کے پاس ایک سُرخ پٹی تھی وہ جب اسے نکال کر سر پر باندھ لیتے تھے تو ان میں ایک خاص جوش پیدا ہو جاتا تھا اور کوئی ان کے مقابلے پر سلامت نہ رہ سکتا تھا تلوار لے کر انہوں نے سُرخ پٹی سر پر باندھ لی اور حمد کے ترانے گاتے ہوئے۔ میدان جنگ میں نکل پڑے جدھر رُخ کرتے تھے افراتفری پڑ جاتی تھی زبیر کو بطور خاص خیال تھا کہ دیکھیں ابو دجانہؓ کون سے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ابو دجانہ صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھے تو ابو سفیان کی اہلیہ ہندہ سامنے آگئی جو مردوں کو جوش دلا رہی تھی۔ ابو دجانہ نے ہند پر تلوار اٹھائی تو اس نے چیخ ماری اور مردوں کو امداد کے لیے بلایا مگر کوئی نہ آیا اس اثنا میں ابو دجانہ نے خود تلوار نیچی کر لی۔ بعد میں زبیر نے ابو دجانہ سے پوچھا۔ پہلے تلوار اٹھائی پھر نیچی کیوں کر لی جواب ملا میرا دل اس پر راضی نہ ہوا کہ رسُول اللہ کی تلوار عورت پر چلاؤں اور عورت بھی وہ جس کا محافظ کوئی مرد نہ ہو۔ زبیر کہتے ہیں اس وقت میں سمجھا کہ ابو دجانہ نے رسول اللہ کی تلوار کا حق جس طرح ادا کیا شاید میں نہ کر سکتا۔

اللہ اعلیٰ واجل

ابوسفیان اور اس کے ساتھی میدان میں پھر پھر کر رسُول اللہ، ابوبکر، اور عمر کی نعشیں تلاش کرتے رہے پھر ابوسفیان پہاڑ پر چڑھ کر اس مقام کے قریب پہنچا جہاں مسلمانوں تک اس کی آواز جا سکتی

تھی۔ اس نے پہلے پوچھا مسلمانو! تم میں محمد ہیں، حضور انور نے فرمایا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ پھر باری باری ابوبکر، عمر کے متعلق پوچھا کچھ جواب نہ ملا تو ابوسفیان نے کہا سب مارے گئے زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ عمر چپ نہ رہ سکے اور بولے دشمنِ خدا تو جھوٹ کہتا ہے ہم سب زندہ ہیں۔ یہ سن کر کہا پھر ابن قمیہ جھوٹ کہتا ہے کیونکہ میں تمہیں اس سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔ پھر ابوسفیان نے اپنے خاص بت ھبل کا نام لے کر کہا تیرے لیے سربلندی ہو۔ حضور انور کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں نے نعرہ لگایا اللہ اعلیٰ و اجل۔ ابوسفیان نے کہا لنا عزیٰ ولا عزیٰ لکم ہمارے لیے عزیٰ ہے تمہارے لیے کوئی عزیٰ نہیں۔ حضور انور نے فرمایا

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا مددگار کوئی نہیں۔

پھر وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان آئندہ انہی دنوں میں بمقام بدر جنگ کا وعدہ رہا۔

شہداء کی تدفین

لڑائی عموماً ختم ہو گئی لیکن قریش مکہ شقاوت و بے دردی سے باز نہ رہے۔ انہوں نے متعدد اسلامی شخصیتوں کو بگاڑا جن میں سے حمزہ، عبداللہ بن جحش اور مصعب بن عمیر بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں سب سے پیش پیش ابوسفیان کی اہلیہ ہندہ تھی۔ حمزہ کی ہمشیرہ حضرت صفیہ کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو وہ نعش دیکھنے کے لیے آئیں۔ رسول اللہ نے نعش کی حالت کے پیش نظر انہیں روکا وہ بولیں میں ماجرا سن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں چنانچہ بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر دعائے مغفرت کرتی ہوئی لوٹ گئیں۔ رسول اللہ نے تمام شہداء کو احد کے دامن میں دفن کرا دیا۔ بعض قبروں میں دو دو شہیدوں کو رکھا گیا انہیں غسل بھی دیا گیا اور اس وقت نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھی گئی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں آٹھ برس کے بعد جب آپ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپ پر رقت طاری ہوئی اس طرح آپ نے پُر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہے۔ مصعب بن عمیر کا سر ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا آخر پاؤں کو اذخر کی گھاس ڈال کر چھپایا گیا۔ بعد میں ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن عوف کے سامنے افطاری کے لیے کھانا آیا تو شاید ذرا پُرتکلف تھا۔ یہ دیکھتے ہی انہیں احد کا زمانہ یاد آ گیا جب بدنوں کو چھپانے کے لیے گھاس کاٹ کاٹ کر ڈالتے تھے۔ عبدالرحمٰن بے تاب ہو کر رونے

لگے اور کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔

شہداء کی تعداد

شہداءِ اُحد کی تعداد عموماً ستر بتائی جاتی ہے۔ المشاہد میں جو تعداد بیان کی گئی ہے اس کی مختصر کیفیت یہ ہے:

مہاجرین	۵
انصار (خزرج)	۵۴
انصار (اوس)	۳۶
متفرق اصحاب	۱۳
	۱۰۸

یہ کل ایک سو آٹھ بنتے ہیں۔ متفق علیہ تعداد جو ستر بتائی جاتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض صحابہ کے نام اس میں نہیں آئے۔

مسئلہ تاریخ

غزوۂ اُحد کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔ ابن ہشام جوامع السیرہ وغیرہ کے مطابق یہ غزوہ ۵ شوال سنہ ۳ھ (۳۱ مارچ ۶۲۵ء) کو پیش آیا دن ہفتے کا تھا۔ طبقات ابن سعد میں اس کی تاریخ ۷ شوال سنہ ۳ھ ۲۳ مارچ ۶۲۵ھ مرقوم ہے اس روز بھی ہفتہ ہی تھا۔

عام کیفیت

مسلمانوں کے لیے غزوۂ اُحد کا نتیجہ بہت بڑے صدمے کا باعث تھا خصوصاً انصار میں سے بہت سے جلیل القدر اصحاب نے شہادت پائی تھی۔ بایں ہمہ اسلام اور رسول اللہ کی ذات بابرکات سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اسے الفاظ کا لباس پہنانا ممکن نہیں۔ ایک انصاری خاتون کا ذکر آپ نے کئی مرتبہ پڑھا ہو گا کہ صحابہ کرام میدان اُحد سے لوٹے تو وہ خاتون حالات معلوم کرنے کے لیے اُحد کی طرف آ رہی تھی جب اسے بتایا گیا کہ تیرا باپ بھائی اور شوہر شہید ہو گئے تو اس نے بے تابانہ پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ بتایا گیا کہ آپ بفضل اللہ خیریت سے ہیں تو وہ بے اختیار

بولیں کل مصیبة بعدک جلل آپ زندہ ہیں تو سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا — اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

حضرت سعد بن معاذ رئیس اوس کے بھائی عمرو بن معاذ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ رسول اللہ سعد و عمرو کی سن رسیدہ والدہ سے ان کے بیٹے کی تعزیت کرنا چاہتے تھے۔ سعد بن معاذ خود والدہ کو آپ کے پاس لے آئے تاکہ آپ ان کے پاس جانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ آپ نے بیٹے کی شہادت پر اظہار ہمدردی فرمایا تو والدہ سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ جب آپ سلامت ہیں تو ہمیں کوئی غم نہیں ہے پھر شہدائے اُحد کی قدر و منزلت کے باب میں کیا کہا جائے۔

سعد بن ربیع کی صاحبزادی اُم سعد ایک مرتبہ حضرت ابو بکر سے ملاقات کے لیے آئی تو خلیفہ وقت نے اُم سعد کے لیے کپڑا بچھایا اور اس پر بٹھایا۔ عمر آئے اور پوچھا کون ہیں۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ اس کی صاحبزادی ہیں جو رسول اللہ کے نزدیک تم سے اور مجھ سے بہتر تھے۔ خلیفہ رسول اللہ وہ کیوں کر؟ فرمایا اس نے رسول اللہ کے زمانے میں جنت کا راستہ لیا اور ہم تم یہیں باقی ہیں۔

شکست یا فتح

زیادہ تر لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُحد میں شکست ہوئی میرے نزدیک یہ تاثر صحیح نہیں۔ بلاشبہ اس جنگ میں تیر اندازوں کے جیش کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا جانی نقصان بہت ہوا لیکن شکست وہ ہوتی ہے جس میں شکست خوردہ میدان چھوڑ دیتا ہے اُحد میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا قریش مکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر رخصت ہو گئے۔ اگلے روز مسلمانوں نے حمراء الاسد تک قریش کا تعاقب کیا اور تین روز وہاں ٹھہرے رہے اس لیے اُحد کو شکست قرار دینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اُحد میں جنگ کے مورچے

۲۲۶۔ اے پیغمبر اس وقت کو یاد کرو جب تم سویرے اپنے گھر سے نکلے اور اُحد کے میدان میں لڑائی کے لیے مسلمانوں کو جابجا مورچوں پر بٹھا رہے تھے۔

اصل ارشاد میں غدوت آیا ہے جو غدو سے بنا ہے جس کے معنے صبح کو نکلنے کے آتے ہیں یہ زوال آفتاب تک کے وقت پر بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہفتہ کے روز ۷ شوال المکرم

۳ھ کو صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ یہاں حافظ ابن کثیرؒ نے حافظ ابن جریر کے حوالہ سے اس سوال کو بے حد اہمیت دی ہے کہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ اُحد کے میدان کی طرف تشریف لے گئے لیکن قرآن کہتا ہے کہ صبح کو روانہ ہوئے۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے روانگی تو جمعہ ہی کے روز ہوئی تھی اور بعد نماز ہی ہوئی لیکن جنگ کی خاطر آپ مورچہ بندی کے لیے ہفتہ کے دن صبح کو میدانِ اُحد میں تشریف لائے۔

اس موقع پر صاحب معارف قرآن کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ آیت میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ سفر کی ابتداء کہاں سے ہوئی من اهلك کے لفظ سے اشارہ ہے کہ سفر کا آغاز اس جگہ سے جگہ ہوا جہاں آپ کے اہل وعیال موجود تھے ان کو مدینہ ہی میں چھوڑ کر آپ نکل کھڑے ہوئے حالانکہ مدینہ ہی پر حملہ ہونے والا تھا۔ اس میں اشارا ہے کہ جب اللہ کا حکم آجائے تو حکم کی تعمیل میں اہل وعیال کی محبت سنگ راہ نہ ہونی چاہیے۔

مسلمانوں کو مورچوں میں بٹھانے کے لیے قرآن نے تبوئ المومنین مقاعد للقتال کی خوبصورت اور دلآویز تعبیر اختیار کی ہے۔ عربی میں بوا یبوء کے معنے ٹھہرانا، ٹھکانا دینا، مقیم کرنا، مامور کرنا، مقاعد مقعد کی جمع ہے جس کے معنے بیٹھنے کی جگہ کے ہیں۔ لیکن وسیع استعمال میں اس کے معنے گھات لگانے کی جگہ کے بھی ہیں اور قرینہ موجود ہو تو اس سے جنگ کا مورچہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مورچہ بندی کیسے کی ؟

کفار نے اپنے لشکر کی صف بندی اس طرح کی کہ سواروں کے ایک حصہ پر خالد بن ولید کو افسر مقرر کیا اور عکرمہ ابن ابی جہل کو باقی رسالے کا افسر بنایا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عمرو بن عوف کے سردار عبداللہ بن جبیر کو قادر تیر اندازوں کا افسر بنا کر جبل عینین کے قریب تعینات کیا۔ مصعب بن عُمیر کو علم دیا گیا۔ سواروں کا جو مختصر رسالہ تھا وہ زبیر کے ماتحت کیا گیا اور اس کی حفاظت کے لیے کچھ تیر انداز مقرر کیے۔ تیر اندازوں کو تاکیدی حکم دیا گیا کہ جنگ کے حالات خواہ کچھ ہوں اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ ایک اور مختصر سا دستہ حضور انور نے جبلِ اُحد کے عقب میں متعین فرمایا تاکہ کفار درہ سے نکل کر لشکر اسلام پر حملہ آور نہ ہو سکیں اور اگر کوئی آدمی میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے تو اسے پکڑ لے۔ یہ ہے تبوئ المومنین مقاعد للقتال کی واقعاتی تصویر۔

اللہ پر اعتماد ہی کامیابی کی کلید ہے

۲۲۷۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے جبکہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں اور واپس لوٹ جائیں حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا جو ایمان رکھنے والے ہیں انہیں ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ حافظ ابن جریر کی یہ رائے قیمتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہاری باتوں کو اس وقت سن رہا تھا جب تمہارے دو گروہ بزدلی دکھانے کو سوچ رہے تھے۔

جب آپ بنفس نفیس فوجی قاعدے کے مطابق صفیں ترتیب دے رہے تھے اسی اثنا میں عبداللہ ابن ابی کی علیحدگی سے دو قبیلے بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے دلوں میں کچھ کمزوری پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی قلیل جمعیت پر نظر کر کے دل چھوڑنے لگے اور خیال آیا کہ میدان سے سرک جائیں مگر حق تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور دستگیری فرمائی۔ دلوں کو مضبوط کر دیا اور سمجھا دیا کہ مسلمانوں کا بھروسہ تنہا اللہ کی اعانت و نصرت پر ہونا چاہیے۔ تعداد و سامان وغیرہ کچھ نہیں۔ جب وہ منظور و منصور کرنا چاہے تو سب سامان رکھے رہ جاتے ہیں اور غیبی تائید سے فتح مبین حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے معرکہ بدر میں، لہٰذا مسلمانوں کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے تاکہ اس کی طرف سے مزید انعام و احسان ہو[1]

یہ درست ہے کہ عرب جنگ کے خوگر تھے۔ ان کا جنگی نظام بہتر تھا، ان کی سپاہ میں تعاون اور ایک دوسرے پر فدا ہونے کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنے امیر اور قائد کے پوری طرح مطیع تھے ان کو اللہ کی راہ میں جان دینے کا شوق تھا۔ لیکن ہر صاحب عقل آدمی سمجھ سکتا ہے کہ نظام کوئی مصنوعی اور میکانکی شے نہیں جو محض عسکری تنظیم، فنون جنگ یا ریاضی کے قواعد سے حاصل ہو جاتے، پتھروں کی آپ کیسی ہی صف قائم کر دیں، ان کو کتنی ہی عمدہ ترتیب سے جنہیں ستونوں اور دیوار دل کو آپ ریاضی کے کتنے ہی مکمل قاعدے سے کھڑا کریں اس کی تنظیم اور صف بندی سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ غرض کہ نظام جنگ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم وہ جذبہ ہے جو لڑنے والوں کے دماغوں پر مسلط ہوتا ہے وہ روح اور مقصد ہے جس کے لیے فوج لڑتی ہے۔ اپنے مقصد سے عقیدت اور وابستگی ایسی طاقت ہے جس سے انسانوں میں غیر معمولی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے ایسے محیر العقول کارنامے صادر ہوتے ہیں کہ فلاسفہ اور مورخین ان کی توجیہ سے عاجز رہتے ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ اہل حق کی کامیابی کا راز اللہ کی ولایت اور اس پر بھرپور اعتماد میں ہے جب یہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ ان کی مدد کا ضامن ہے۔ اس نے ان سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا ہے تو قلت و کثرت کا سوال ان کے لیے ہیچ ہو جاتا ہے۔ خطرات کا خوف ان کے دلوں سے جاتا رہتا ہے اسی لیے یہاں ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ و علی اللہ فلیتوکل المومنون ۔ اس فقرے نے یہ بات کھول دی کہ کثرت عدد اور ساز و سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہ کرنا چاہیے بلکہ بقدر استطاعت مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ بنو حارثہ اور بنو سلمہ میں کمزوری اور کم ہمتی کا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ ملاشے کی کمی کی وجہ سے ہوا تھا اس لیے ان کے وسوسہ کا علاج توکل سے کیا گیا۔

توکل انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ہے محققین صوفیا نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے یہاں صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ توکل کے یہ معنے نہیں ہیں کہ تمام اسباب ظاہری سے بیگانہ ہو کر اللہ پر اعتماد کیا جائے۔ بلکہ توکل یہ ہے کہ تمام ظاہری اسباب کی فراہمی کے بعد نتائج کے ظہور کے لیے اللہ پر اعتماد کرے۔ ان اسباب پر نہ اعتماد کرے اور نہ فخر و ناز کرے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ اسی جنگ اُحد میں مسلمانوں کی فوج کو جنگ کے لیے منظم کرنا اپنی قدرت کے موافق اسلحہ اور دیگر سامان فراہم کرنا، محاذ جنگ پر پہنچ کر مناسب حال و مقام نقشہ جنگ تیار کرنا، مختلف مورچے بنا کر صحابہ کرام کو ان پر بٹھانا۔ یہ مادی وسائل اور اسباب حضور انور نے خود اختیار فرما کر بتلا دیا کہ ترک اسباب کا نام توکل نہیں۔ ہاں مومن اور غیر مومن میں فرق یہ ہے کہ مومن سارے سامان اور سب مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھروسہ اعتماد صرف اللہ پر کرتا ہے جبکہ غیر مومن صرف مادی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے اور بس [1]

بدر میں کامیابی کا راز

۲۲۸ ۔ اور یاد رکھو کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں مدد دی ہے حالانکہ تم گری ہوئی حالت میں تھے بس اللہ سے ڈرو اور اس کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو سکو۔ غزوہ بدر پر تفصیلی تبصرہ ان شاء اللہ سورہ انفال میں آئے گا۔ یہاں موقعہ کی مناسبت سے اتنی بات گوش گزار فرمالیجیے

[1] معارف م ۔ش

کہ بدر مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل مغرب مائل بجنوب اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانہ قدیم سے شام اور مکہ مکرمہ کے درمیان تجارتی قافلوں کی جولانگاہ رہی ہے۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جانے کے اور راستے بھی ہیں جن میں سے بعض کا فاصلہ نسبتہً کم ہے مگر لوگ بدر سے ہو کر بھی آتے جاتے تھے اور حال میں جو پختہ سڑک موٹروں کے لیے حرمین شریفین کے درمیان بنائی گئی ہے وہ بدر سے ہوتی ہوئی گئی ہے۔ بحیرہ احمر کے ساحل سے اس مقام کا فاصلہ دس بارہ میل ہوگا۔ بدر بیضوی شکل کے میدان میں واقع ہے جسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس میدان کا طول ساڑھے سات میل اور عرض چار میل ہے۔ اردگرد پہاڑوں کے نام الگ الگ ہیں۔ آبادی خاصی بڑی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں کہ کئی سو مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں جنہیں مقامی اصطلاح میں قصر کہتے ہیں۔ میدان سنگلاخ ہے۔ یعنی سنگریزے یا چھوٹے گول پتھر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں البتہ جنوبی و مغربی حصے کی زمین نرم ہے۔ یہاں ریگ رواں اکٹھی ہو جاتی ہے۔ بدر میں کنوئیں بھی ہیں اور چشمے بھی۔ بڑا چشمہ جس کی حیثیت آغاز میں زمین دوز نہر کی ہے۔ اسی سے نخلستانوں، باغوں اور کھیتوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ اسلام اور کفر کے درمیان اسی مقام پر سب سے پہلا تصادم ہوا۔ اس غزوہ نے گویا اسلام کی اور اس طرح بالواسطہ ساری دنیا کی تاریخ ہی کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ فرنگی مورخین بھی اس کی اہمیت کے پوری طرح قائل ہیں۔

قرآن نے یہاں مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ تم اس سے پہلے بدر کے دن بے سروسامانی کی حالت میں تھے مگر اللہ نے ساری ناسازگاریوں کے باوجود تمہاری مدد کی تھی۔ تمہاری تعداد بھی دشمن کے مقابلہ میں کم تھی۔ اب بھی صبر و تقویٰ پیدا کرو تو اللہ کی مدد تمہارے استقبال کے لیے تیار ہے۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلٰثَةِ آلٰفٍ
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلٰٓى إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم
مِّن فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُسَوِّمِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم
بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ لِيَقْطَعَ طَرَفًا
مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَآئِبِينَ ۝

اے پیغمبر وہ وقت بھی یاد کرو جب تم اہلِ ایمان سے کہہ رہے تھے کہ
کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ تمہاری تین
ہزار نازل کردہ فرشتوں سے[229] مدد کرے ؟ ہاں بلاشبہ اگر تم
صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کا تم پر فوری حملہ
ہو جائے تو تمہارا پروردگار صرف تین ہزار سے نہیں بلکہ پانچ
ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے[230] گا

اور دیکھو یہ بات اس لیے ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دلوں
میں اس کے ذریعے اطمینان آجائے ورنہ یاد رکھو فتح و نصرت کا
مرکز تو اللہ کی ذات ہے جو سب پر غالب اور بڑی حکمت والا[۲۳۱]
ہے اور نیز اس لیے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک حصہ
کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ نامراد ہو کر وہ پسپا
ہو جائیں۔[۲۳۲]

ملائکہ کا نزول اور اس کا پس منظر

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت کریمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جس ارشاد کی اللہ سبحانہ نے خبر دی ہے وہ آپ نے اہل ایمان سے کب فرمائی؟ بدر کے روز یا اُحد کے دن، ابن کثیر نے بڑے بڑے تابعین کے حوالہ سے دونوں باتیں لکھی ہیں۔ حسن بصری، عامر الشعبی، ربیع ابن انس کہتے ہیں کہ یہ حضور نے مسلمانوں سے بدر والے دن فرمایا تھا۔ امام مجاہد، عکرمہ، ضحاک اور زہری فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ بات اُحد کے دن فرمائی۔ اسی اختلاف کے نتیجہ میں قرآن کی عبارت میں اذ تقول کی پیوندکاری میں اختلاف ہو گیا جنہوں نے بدر کے دن کی بات پر زور دیا انہوں نے اذ تقول کو نصرکم سے جوڑ دیا یعنی اللہ نے بدر کے روز اس وقت تمہاری مدد کی تھی جب اے پیغمبر تم اہل ایمان سے یہ کہہ رہے تھے اور جنہوں نے اسے اُحد کی بات قرار دی انہوں نے اذ تقول کا پیوند غدوت سے قائم کر دیا یعنی جب اُحد والے دن آپ صبح کے وقت گھر سے نکل کر صحابہ کی مورچہ بندی فرما رہے تھے یعنی جس وقت آپ صحابہ سے کہہ رہے تھے۔ بہرحال کچھ ہو بات بدر کی یا اُحد کی اس پر سب متفق

ہیں کہ ملائکہ کا نزول ہوا۔ بدر میں یہ بات آپ نے اس وقت فرمائی جب مسلمانوں کو اس خبر سے پریشانی ہوئی کہ مشرکین کی مدد کے لیے کرز بن جابر محاربی آرہا ہے۔ اس ڈر کو مسلمانوں کے دلوں سے دُور کرنے اور ان کی ڈھارس بندھانے کے لیے ان سے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں تمہاری مدد کے لیے فرشتے آرہے ہیں لیکن ادھر کرز نہ اپنی جماعت کے ساتھ آیا اور نہ اللہ نے پانچ ہزار فرشتوں کی کمک روانہ کی۔ اور اُحد میں یہ بات آپ نے اس وقت فرمائی جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہو گیا اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں میں جیسا کہ اوپر والی آیت میں ذکر ہے اس سے بددلی پھیلی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تین سو آدمی الگ ہو گئے تو کیا بات ہے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تین سو کمزور اور پست ہمت آدمیوں کی جگہ تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد فرمائے۔ اتارے ہوئے سے مقصود اس امر کی طرف اشارا ہے کہ وہ اسی کارِ خاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ دم کمک کے طور پر آسمان سے اتارے جائیں گے۔

۱۲۹۔ اے پیغمبر وہ وقت یاد کرو جب اہلِ ایمان سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ تمہاری تین ہزار نازل کردہ فرشتوں سے مدد کرے۔ یعنی جو آسمان سے خاص اسی کام کے لیے اتارے گئے ہوں اکثر علماء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر کا ہے جب کفار کی جمعیت اور تیاری دیکھ کر مسلمانوں کو تشویش ہوئی تو آپ نے تسلی کے لیے ایسا فرمایا چنانچہ فرشتوں کی کمک آسمان سے پہنچی۔ سورۂ انفال میں اس کا مفصل ذکر آئے گا وہیں نزولِ ملائکہ کی حکمت اور عددِ ملائکہ کے ظاہری تعارض پر کلام کیا جائے گا۔[1] امدادِ غیبی کے موقعہ پر صفتِ ربوبیت کا اظہار اور وہ بھی مخاطبوں کی طرف اضافت کے ساتھ بہترین پیرایہ بلاغت اور اسلوبِ بیان ہے۔ آج کے ماہرینِ حرب پر خوب روشن ہے کہ سپاہ کی ہمت قائم رکھنا ان کے مورل کا درست رکھنا جنگ میں کامیابی کا کتنا بڑا اور اہم عنصر ہے۔[2]

آلوسی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ نفی میں تاکید اور زور یہ بتا رہا ہے کہ مخاطبوں میں سامان کی کمی اور تعداد کی قلت سے بہت مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔
[2] تفسیر ماجدی

نصرتِ غیبی کی شرطیں

۲۳۰ - ہاں بلاشبہ اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کا تم پر فوری حملہ ہوگا تو تمہارا پروردگار صرف تین ہزار سے نہیں بلکہ پانچ ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یعنی تین ہزار بے شک کافی ہیں تاہم اگر تم نے صبر و استقلال کا ثبوت دیا اور تقویٰ اختیار کر کے نافرمانی سے بچتے رہے اور کفار کی فوج ایک دم تم پر لوٹ پڑے تو تین ہزار کے بجائے پانچ ہزار فرشتے بھیج دیے جائیں گے جن کی خاص علامتیں ہوں گی اور ان کے گھوڑوں پر بھی خاص نشان ہوں گے۔ چونکہ بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اولاً اس کے مناسب ایک ہزار فرشتوں کا وعدہ فرمایا جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے۔ پھر مسلمانوں میں گھبراہٹ دور فرمانے کے لیے تعداد تگنی کر دی گئی کیونکہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی اس کے بعد شعبی کی روایت کے مطابق جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ کرز بن جابر بڑی کمک لے کر مشرکین کی مدد کے لیے آ رہا ہے تو ایک جدید اضطراب پیدا ہو گیا۔ اس وقت مزید تسکین کے لیے وعدہ فرمایا کہ اگر تم صبر و تقویٰ سے کام لو گے تو ہم پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے اگر مشرکین کی کمک بالکل ناگہانی طور پر آ پہنچے تب بھی فکر نہ کرو خدا تعالیٰ تمہاری بروقت مدد کرے گا۔ شاید پانچ ہزار کا عدد اس لیے رکھا ہو کہ فوج کے پانچ حصے ہوتے تھے۔ ہر ایک حصہ کو ایک ہزار کی کمک پہنچا دی جائے گی۔ چونکہ کرز بن جابر کی مدد مشرکین کو نہیں پہنچی اس لیے کچھ کہتے ہیں کہ پانچ ہزار کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا کیونکہ وہ یاتوکم من فورہم پر معلق تھا اور بعض کا قول ہے کہ پانچ ہزار فرشتے نازل ہوئے۔ مزید تفصیل سورۂ انفال میں آ رہی ہے[1]

یہ تمام تشریح اس بنیاد پر ہے کہ حضور انور کا یہ ارشاد بدر میں تھا اور قرآن اسی تاریخی واقعہ کو بیان کر رہا ہے لیکن جن بزرگوں کی رائے میں اس ارشاد کا تعلق اُحد سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اُحد میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ مسلمانوں کو یہ دیکھ کر اضطراب ہوا۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی پر نہ جاؤ۔ اللہ پاک اپنے ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنے نبی کی تائید فرمائی اور اپنے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

فضل سے اس پر دو ہزار کا اضافہ فرما دیا لیکن تین شرطوں کے ساتھ۔ اوّل یہ کہ تم صبر کا مظاہرہ کرو۔ دوسرے یہ کہ تم میں تقویٰ ہو، تیسرے یہ کہ دشمن تم پر اچانک حملہ کر دے۔ جنگ اُحد کے واقعات شاہد ہیں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے صبر کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اس لیے خدا کے وعدۂ نصرت سے وہ محروم رہ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ اقدس کی حفاظت کے لیے دو فرشتے ساتھ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ اُحد میں دو سفید پوش آدمیوں کو دیکھا جو آپ کی طرف سے سخت جانبازی کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا[1] صحیح مسلم کی روایت ہے کہ یہ دونوں فرشتے جبریل و میکائیل تھے۔

فرشتوں کی آمد کی غرض

۱۲۶ – اور دیکھو یہ بات اس لیے ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دلوں میں اس کے ذریعے اطمینان آجائے ورنہ یاد رکھو فتح و نصرت کا مرکز تو اللہ کی ذات ہے جو سب پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ یعنی یہ سب غیبی سامان غیر معمولی طور پر ظاہری اسباب کی صورت میں محض اس لیے مہیا کیے گئے کہ تمہارے دلوں سے اضطراب و ہراس دُور ہو کر سکون و اطمینان نصیب ہو ورنہ خدا کی مدد کچھ ان چیزوں پر محدود و مقصود نہیں، نہ اسباب کی پابند ہے وہ چاہے تو محض اپنی قدرت سے بدون فرشتوں کے تمہارا کام بنا دے یا بدون تمہارے توسط کے کفار کو خائب و خاسر کر دے یا ایک فرشتے سے وہ کام لے لے جو پانچ ہزار سے لیا جاتا ہے۔ فرشتے بھی جو امداد پہنچاتے ہیں وہ اسی خداوندِ قدوس کی قدرت و مشیت سے پہنچا سکتے ہیں مستقل طاقت و اختیار کسی میں نہیں آگے یہ اس کی حکمت ہے کہ کس موقع پر کس قسم کے اسباب و وسائط سے کام لینا مناسب ہے تکوینیات کے رازوں کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را۔[2]

اس آیت میں ما جعلہ اللہ اللہ نے نہیں بنایا اس کی ضمیر کے مرجع میں علماء کے خیالات مختلف

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام۔

ہیں کسی نے وعدہ امداد کو مرجع بنایا ہے اور کسی نے تفول کے قول کو۔ ہمارے خیال میں قول کو مرجع بنانا زیادہ اچھا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ کی جانب سے ملائکہ کی امداد کا کوئی وعدہ نہیں۔ صرف حضور انور کے ارشاد کو اللہ پاک نے نقل کیا ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ اللہ کے رسول نے صحابہ سے یوں کہا۔ اب اس آیت میں حضور انور کے ارشاد کا فائدہ بتایا جا رہا ہے یعنی آپ نے صحابہ سے یہ بات کیوں فرمائی۔ اس لیے فرمائی تاکہ اے مخاطبو تمہیں فتح کی بشارت اور خوشی حاصل ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو اضطراب اور پریشانی سے اطمینان حاصل ہو۔ اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔ اس طرح حضور انور کے کہنے کی دو حکمتیں بتائی ہیں ایک بشارت فتح اور دوسرے اطمینان قلوب بھی دو باتیں یہاں تسلی دینے کے لیے کافی تھیں کہ نفع بھی حاصل ہو اور مجاہد ضرر سے بھی بچیں۔ اگر ضمیر کا مرجع وعدۂ نصرت ہو جیساکہ بعض کا خیال ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر اللہ نے فرشتوں کے ذریعے جو تمہاری مدد کا خاص طور پر وعدہ فرمایا تو یہ اس لیے کہ یہ تمہارے لیے خوشی کا باعث ہو اور تمہیں مخالفین کے رویہ سے جو بزدلی ہوئی ہے وہ دور ہو جائے اور یہ جو فرمایا کہ مدد تو بس اللہ کی طرف سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ حقیقۃً متصرف تو اللہ کی ذات ہے۔ فرشتے ہوں یا کوئی اور کسی کا بھی ذریعہ امداد ہونا سبب ظاہری کے درجہ سے زیادہ نہیں ہے یعنی کامیابی اور فتح تو اللہ کے قبضے میں ہے اور وہ اسباب کے محتاج نہیں ہیں لیکن وہ حکیم ہیں اس لیے نظامِ عالم کو اسی حکمت کے تحت قائم رکھا ہے اس لیے تمہیں صرف اسباب پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ عزیز ہیں یعنی اس پر قادر ہیں کہ جب اور جیسے بلا اسباب ظاہر بلکہ خلاف اسباب ظاہر فتح دلائے اور کامیاب کر دے۔ وہ حکیم ہیں یعنی عام فطرت بشری کی رعایت سے اسباب ظاہر کو فراہم کر دے۔

اللہ کی مدد کا مقصد

۱۲۷۔ اور اس لیے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک حصہ کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ نامراد ہو کر واپس ہو جائیں۔ یعنی فرشتے بھیجنے سے مقصود تمہاری مدد کرنا کہ تمہارے دل مضبوط ہوں اور خدا کی طرف سے بشارت و طمانیت پا کر پوری دلجمعی اور پامردی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرو جس سے یہ غرض تھی کہ کافروں کا زور ٹوٹے۔ ان کا بازو کٹ جائے۔ پرانے نامور مشرک کچھ مارے جائیں، کچھ ذلیل و خوار ہوں اور بقیۃ السیف بہزار رسوائی و ناکامی واپس ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ستر سردار جن میں امت کا فرعون ابو جہل بھی تھا مارے گئے۔ ستر قید ہوئے۔ نہایت ذلیل اور نامراد

ہوکر مکہ واپس جانا پڑا[1]

عام شارحین قرآن کی رائے میں اس کا تعلق بھی واقعہ بدر سے ہے اور وہ اس لیے اس کا پیوند لقد نصرکم اللہ سے قائم کرتے ہیں لیکن کچھ کی رائے ہیں اس کا تعلق واقعہ اُحد سے ہے اور یہ دما النصر سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مدد کا مقصد صرف یہ ہے کہ منکرین حق کے ایک گروہ کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جاتے یا ان میں سے کچھ کو اس قدر ذلیل و رسوا کیا جائے کہ وہ ناکام و نامراد ہوکر واپس ہو۔ کبت کے معنے رُسوا کر دینا، توڑ دینا، کسی کو اٹھا کر پھینک دینا اور پچھاڑ دینا۔ اور آؤ تو تنویع کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک بات ہو جائے یا دونوں باتیں ہو جائیں۔

اربابِ سیرۃ کا بیان ہے کہ مشرکین کے مقتولین اُحد میں ۲۰ تھے۔ سیرۃ ابن ہشام میں ۲۲ بتائی ہے مگر حیرت ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت حمزہ ہی نے صرف ۳۰ مارے۔ اور دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ صرف ۲۰ مارے گئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ مشرکین مسلمان شہداء کی لاشوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے اس لیے انہوں نے اس اندیشہ سے کہ کہیں مسلمان بھی ہمارے مقتولین کے ساتھ بھی برتاؤ نہ کریں اپنے مقتولین کو دفن کر دیا۔ لڑائی کے ختم ہونے پر ان کے مقتولین کی جو تعداد ۲۰ معلوم ہوئی وہ ان کی ہے جو دفن نہ ہو سکے۔ ورنہ ان کے مقتولین کی تعداد کافی تھی۔

اُحد میں لیقطع طرفا من الذین کی واقعاتی تفسیر اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو سیرۃ کی کتابوں میں واقعات کا مطالعہ کیجیے۔ آغازِ جنگ میں عرب اُصولِ جنگ کے مطابق سب سے پہلے انفرادی مقابلہ ہوا۔ اس انفرادی مقابلہ میں مشرکین سے گیارہ آدمی میدان میں آتے گیارہ میں سے ابوعامر فاسق کے علاوہ کوئی بچ کر نہیں گیا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوئی۔ حضرت ابو دجانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ابو دجانہ صفوں کو چیرتے چلے جاتے۔ جو سامنے آتا اسی کی لاش زمین پر ہوتی تھی حضرت حمزہ کے حملے سے کفار سخت پریشان تھے جس پر تلوار اٹھاتے اسی کی لاش زمین پر آتی۔ اس عام لڑائی کا نتیجہ یہ بھی لکھا ہے کہ

> مسلمانوں کے ان دلیرانہ حملوں سے قریش کے میدان جنگ سے پیر اکھڑ گئے،
> اِدھر اُدھر منہ چھپا کر اور پشت دکھا کر بھاگنے لگے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ذرا سوچئے کہ قریش کی فوجی نفری ۳ ہزار ہے ان میں ۷۰۰ زرہ پوش دو سو گھوڑے تین ہزار اونٹ ہیں۔ کیا یہ بات آپ کا ذہن باور کر سکتا ہے کہ صرف ۱۰ یا ۱۲ آدمیوں کے قتل نے تین ہزار کی مسلح فوج کو پسپا کر دیا ہو اور پاؤں اکھاڑ دیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مورخین مشرکین کے مقتولین کی جو تعداد بتاتے ہیں وہ صرف انفرادی مقابلے کی ہے۔ عام جنگ شروع ہونے اور فتح ہو جانے کے بعد چونکہ جنگ کا نقشہ اچانک تبدیل ہو گیا تھا اور ایسی ہنگامی حالت پیدا ہو گئی کہ اپنی پڑ گئی اور کسی کو اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ ان کے مقتولین کو شمار کرتا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ
ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَن
يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٩﴾ ع ۱۳ / ۴

اے پیغمبر اس معاملہ میں تمہارا کوئی دخل نہیں، چاہے ان سے درگزر کرے اور چاہے تو ان کو عذاب دے کیونکہ وہ یقیناً ظالم ہیں۔[۲۳۳] آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کے لیے ہے وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[۲۳۴]

تعذیب و مغفرت اللہ ہی کا کام ہے

اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت غزوۂ اُحد کے بارے میں آئی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں بحوالہ انس آیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب آپ کا دندان مبارک شہید ہوا تو آپ نے فرمایا وہ لوگ کیسے فلاح پا سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے پیغمبر کے چہرے کو زخمی کیا ہو حالانکہ پیغمبر ان کو خدا کی طرف بلا رہا ہے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسی بخاری میں بحوالہ عبداللہ ابن عمر آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد کے دن جب یہ دُعا فرمائی اے اللہ ابوسفیان پر لعنت بر سا اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر اے اللہ سہیل اور

صفوان ابن اُمیہ کو اپنی رحمت سے دُور کر تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ یہ آیت اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو پھر اس سے پہلی آیات بھی یقیناً اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ لیس لک من الامر شیئٌ جملہ معترضہ ہے۔ اصل فقرہ لیقطع طرفاً سے شروع ہو کر فانھم ظالمون پر ختم ہوا ہے۔ او یتوب علیھم کا او یکبتھم پر عطف ہے۔ حافظ ابن جریر نے پورے فقرے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ کی نصرت اس لیے آئی ہے تاکہ وہ کافروں کو ہلاک کردے یا ان کو ذلیل و رسوا کرے، یا ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ او یتوب میں او حتیٰ کے معنے میں ہو لیکن پہلی بات زیادہ درست ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی معاملہ خالق کے سوا کسی سے متعلق نہیں ہے اور لیس لک من الامر شیئٌ کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر میری مخلوق کا معاملہ تمہارے سپرد نہیں ہے۔ تمہارا کام تو میرے احکام کو پہنچانا اور چلانا ہے باقی سارا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور ان کا فیصلہ کرنا بھی اللہ کا کام ہے نہ کسی اور کا۔ یہ میرا کام ہے کہ میں فیصلہ کروں کہ کون کفر سے توبہ کرتا ہے اور کس کو کفر کی پاداش میں عذاب ہوتا ہے دنیا میں قتل و ہلاکت کے ذریعے اور آخرت میں عذاب کے ذریعے [1]

گویا اس جملہ معترضہ کے ذریعے بتا دیا کہ ظلم و کفر کرنے والوں کی بدعملیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہوں لیکن نبوت کو ہدایت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور نہ رحمت و بخشش کی طلب کے سوا کوئی اور جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ بخشنا نہ بخشنا خدا کا کام ہے اور اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جنگ اُحد میں خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمنوں نے پے درپے حملے کیے اور آپ کو ختم کرنا چاہا تاہم اللہ سبحانہ نے پسند نہیں کیا کہ دشمنوں کی ہدایت و بخشش کے سوا کوئی جذبہ آپ کے قلب مطہر میں پیدا ہو صلی اللہ علیہ وسلم

۲۲۳ ۔ اے پیغمبر تمہارا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں، چاہے ان سے درگزر کرے اور چاہے ان کو عذاب دے کیونکہ وہ یقیناً ظالم ہیں۔ اُحد میں ستر صحابہ شہید ہوئے، جن میں حضور کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مشرکین نے نہایت وحشیانہ طور پر شہداء کا مثلہ کیا، ناک کان وغیرہ کاٹے، پیٹ چاک کیے۔ حتیٰ کہ حضرت حمزہ کا جگر نکال کر ہندہ نے چبایا۔ مفصل واقعہ آگے آئے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لڑائی میں چشم زخم پہنچا۔ سامنے کے چار دانتوں میں نیچے کا دایاں دندان مبارک شہید ہوا۔ خود کی کڑیاں کٹ کر رخسار مبارک میں گھس گئیں، پیشانی مبارک

---

[1] ابن جریر

زخمی ہوئی اور بدن مبارک لہولہان تھا۔ اسی حالت میں آپ کا پائے مبارک لڑکھڑایا اور زمین پر گر کر بیہوش ہو گئے۔ کفار نے مشہور کر دیا "ان محمداً قد قُتِلَ" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے) اس سے مجمع بدحواس ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کو ہوش آیا اس وقت زبان مبارک سے نکلا کہ وہ قوم کیوں کر فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا چہرہ زخمی کر دیا جو ان کو خدا کی طرف بلاتا تھا۔ مشرکین کے وحشیانہ تشدد و مظالم کو دیکھ کر آپ سے رہا نہ گیا۔ اور ان میں سے چند نامور اشخاص کے حق میں آپ نے بددعا کا ارادہ کیا یا شروع کر دی جس میں ظاہر ہے کہ آپ ہر طرح حق بجانب تھے۔ مگر خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپ اپنے منصب جلیل کے موافق اس سے بھی بلند مقام پر کھڑے ہوں کہ وہ ظلم کرتے جائیں۔ آپ خاموش رہیں۔ جتنی بات کا آپ کو حکم ہے مثلاً دعوت و تبلیغ و جہاد وغیرہ اسے انجام دیتے رہیں باقی ان کا انجام خدا کے حوالے کریں۔ اس کی جو حکمت ہو گی کرے گا۔ آپ کی بددعا سے وہ ہلاک کر دیے جائیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان ہی دشمنوں کو اسلام کا محافظ اور آپ کا جاں نثار عاشق بنا دیا جائے۔ چنانچہ جن لوگوں کے حق میں آپ بددعا کرتے تھے چند روز کے بعد سب کو خدا تعالیٰ نے آپ کے قدموں میں لا ڈالا۔ اور اسلام کا جانباز سپاہی بنا دیا۔ غرض لیس لک من الامر شیئٌ میں آنحضرت کو متنبہ فرما دیا کہ بندہ کو اختیار نہیں نہ اس کا علم محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے سو کرے۔ اگرچہ کافر تمہارے دشمن ہیں اور ظلم پر ہیں لیکن چاہے تو وہ ان کو ہدایت دے دے چاہے عذاب کرے تم اپنی طرف سے بددعا نہ کرو۔ بعض روایات میں ان آیات کا شانِ نزول کچھ اور بھی آیا ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔[1]

ایک ضروری نکتہ

جس طرح جنگ بدر کی فتح سے مسلمانوں کی تربیت مدِ نظر تھی۔ اسی جنگ کی ناکامی میں بھی تربیت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ ایک دوڑنے والے کی مشق کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا کہ بے روک ٹوک دوڑتا چلا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایک دو مرتبہ گر کر گرنے اور سنبھلنے کا سبق سیکھ لے بدر کی فتح مندی نے استعداد و سعی کی برکتیں دکھا دی تھیں ضرورت تھی کہ اب کمزوری و تغافل کے نتائج کا بھی تجربہ ہو جائے۔ چنانچہ احد کے حادثہ نے یہ مقصد پورا کر دیا۔

بدر کی فتح اور تائید الٰہی کی بشارتوں نے بہت سے مسلمانوں میں یہ نشہ پیدا ہو گیا تھا کہ نبوت کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دُعا و زاری اور آپ کے استغفار کے نتیجے میں اللہ نے ساری بے سروسامانیوں کے باوجود کامیابی عطا فرمائی۔ وہ یہ سمجھ کر کہ اللہ کا رسُول اب بھی ہم میں موجود ہے اللہ کی مدد ضرور آئے گی سعی و تدبیر کی کاوشوں سے کچھ بے پرواہ ہو گئے اور سمجھنے لگے کہ ہم کوشش کریں یا نہ کریں ہر حال میں ہمارے لیے فتح ہی فتح ہے۔ اس قسم کے تصورات ابتدائی فتح مندیوں کے بعد پیدا ہو جایا کرتے ہیں لیکن اسلام دینِ فطرت ہے دینِ خوارق نہیں اس لیے ضروری تھا کہ اس ذہن کی نشوونما روک دی جائے کہ نبوّت و رسالت خدائی پیغام پہنچانے کا نام ہے۔ کائناتی نظام کو چلانے کا نام نہیں ہے۔ اس طرح قرآن نے مخاطبوں کے ذہنوں میں توحید کا یہ کامل ترین، موثر ترین اور محبوب ترین نقش اتار دیا کہ کائنات کا مدبّر اور اس میں تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اس کا کوئی مشیر اور وزیر نہیں ہے۔ حالات کے اس بحران اور مصائب کے ہجوم میں قرآن کا حضور انور کو مخاطب کر کے یہ کہنا لیس لک من الامر شیئٌ آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جہاں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دُعا و طلبگاری، یاری و مددگاری، استعانت اور استغاثہ توکل و اعتماد میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے وہاں اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت کا وعدہ برحق ہے۔ لیکن اس کے تمام کاموں کی طرح اس کی تائید و نصرت کے بھی قوانین و ضوابط ہیں اور ضروری ہے کہ ان ہی کے مطابق نتائج بھی ظہور میں آئیں۔ جو جماعت کمزوری و غفلت میں مبتلا ہو جائے گی صبر و ثبات میں پوری نہ اترے گی اور جو اطاعت و تنظیم میں کچی ہو گی وہ خدا کی تائید و نصرت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اللہ اختیارِ ناطق کا مالک ہے

۲۳۴۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کے لیے ہے وہ جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی تمام زمین و آسمان میں خدائے واحد کا اختیار چلتا ہے سب اسی کی مملوک و مخلوق ہے وہ جس کو مناسب جانے ایمان کی توفیق دے کر بخش دے اور جسے چاہے کفر کی سزا میں پکڑ لے۔ شاید آخر میں واللہ غفور رحیم فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان لوگوں کو جن کے حق میں آپ بددعا کرنا چاہتے تھے ایمان دے کر مغفرت و رحمت کا مورد بنا دے گا۔[1] یہاں سے یہ بات بھی الم نشرح ہو گئی کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ثابت اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

متنق ہوجاتے تو اس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں چھڑا سکتے۔ ان بے خبروں کی ستم ظریفی اس کے مقابلے میں قابلِ افسوس ہے جو بھرے مجموں اور جلسوں میں یہ شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

خدا جس کو پکڑے چھڑائے محمد محمد جو پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکتا

اور ایسے ہی جس پر اللہ کی جانب سے رحمت ثابت ہو جاتے اس کے لیے پیغمبر کو بد دعا کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ صحیح بخاری کے حوالے سے سُن آئے ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفوان، حضرت سہیل اور حضرت حارث ابن ہشام کے لیے بد دعا مانگی جبکہ یہ تینوں حضرات کافر و مشرک تھے اور آپ کو تکلیف دینے میں کوئی کمی نہ کرتے تھے چونکہ یہ حضرات حق تعالیٰ کے علم میں مسلمان ہونے والے تھے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے آپ کو اس دعا سے روک دیا۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ تینوں فتح مکہ میں مشرف باسلام ہوئے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بد دعا کرنا اجتہاداً تھا اس سے پہلے آپ کو ممانعت نہیں کی گئی تھی اس لیے آپ کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس آیت میں اس اختیار پر جو نفی فرمائی ہے اس کی مزید تاکید ہے اور اس پر دلیل ہے کہ یہ اختیار تمہیں کیوں نہیں ہے اور ہم کو کیوں ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی تربیت فرمائی کہ بندے کو اختیار نہیں ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے سو کرے اگرچہ کافر تمہارے دشمن ہیں اور ظلم پر ہیں لیکن چاہے ان کو ہدایت دے اور چاہے ان کو عذاب کرے اپنی طرف سے بد دعا نہ کرو۔[1]

یہ اُمت بھی کیا خوش قسمت ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کے لیے پیغمبر سے دریافت کرے تو پیغمبر رضامند نہ ہو جیسا کہ طائف میں ہوا اور کبھی پیغمبر بد دعا پر آمادہ ہوں تو اللہ تعالیٰ روک دے ۔

صد شکر کہ ہستیم میاں دو کریم

آخر میں غفور رحیم ہونے کا اعلان فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ معاف کرنے اور مہربانی کرنے میں بڑا فیاض ہے بشرطیکہ قانون میں ملزم کے لیے تھوڑی سی بھی گنجائش ہو۔

---

[1] موضح القرآن

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَأْكُلُواْ ٱلرِّبَوٰٓاْ أَضْعَٰفًا مُّضَٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَٱتَّقُواْ ٱلنَّارَ ٱلَّتِىٓ أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ ۝ وَأَطِيعُواْ
ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

اے ایمان والو! سُود مت کھاؤ دگنا چوگنا[۲۳۵] بنا کر اور اللہ کی
نافرمانی سے بچو تاکہ فلاح سے ہمدوش[۲۳۶] ہو جاؤ۔ اور دیکھو
اس آگ سے ڈرو جو کُفر کی راہ چلنے والوں کے لیے تیار کی
گئی ہے[۲۳۷]۔ اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرو تاکہ
رحمتِ الٰہی کے مستحق[۲۳۸] ہو جاؤ۔

مال و دولت کی طمع کی پرہیز

اس موقع پر سُود کی حرمت کا ذکر بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اس لیے شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق بات کو مربوط بنانے کے لیے اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

جنگِ اُحد کے سلسلے میں سُود کی ممانعت کا ذکر بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر شاید یہ مناسبت ہو کہ اوپر اِذ ھمّت طائفتان میں جہاد کے موقعہ پر نامردی دکھلانے کا ذکر ہوا تھا اور سُود کھانے

نامردی پیدا ہوتی ہے دو سبب سے، ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق طاعت کم ہوتی ہے اور بڑی طاعت جہاد ہے دوسرے یہ کہ سُود لینا انتہائی بُخل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سود خور چاہتا ہے کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لے اور بیچ میں کسی کا کام نکلا یہ بھی مفت نہ چھوڑے اس کا علیحدہ معاوضہ لے تو جس کو مال میں اتنا بُخل ہو کہ خدا کے لیے کسی کی ذرہ بھر ہمدردی نہ کر سکے وہ خدا کی راہ میں جان کب دے گا۔

ابوحیان نے لکھا ہے کہ اس وقت یہودیوں سے مسلمانوں کے سُودی معاملات اکثر ہوتے رہتے تھے اسی لیے ان سے تعلقات منقطع کرنا مشکل تھا چونکہ پہلے لا تتخذوا بطانۃ من دونکم کا حکم ہو چکا ہے اور اُحد کے قصے میں بھی یہود کی حرکات کو بہت دخل تھا اس لیے متنبہ فرمایا کہ سُودی لین دین ترک کر دو ورنہ اس کی وجہ سے خواہی نہ خواہی ان ملعونوں کے ساتھ تعلقات رہیں گے جو آئندہ نقصان اٹھانے کا موجب ہوں گے[1]

مولانا اشرف علی فرماتے ہیں ؛

ذیل آیت واذ تقول للمومنین عنوان فائدہ میں لکھا گیا ہے کہ اُحد میں عدم نصرت بسبب اختلال تقویٰ کے ہوا ایک اختلال قبل واقعہ کے دوسرا عین واقعہ میں۔ اس سے ثابت ہوا کہ بعض اوقات خطایاتے سابقہ دوسری خطاؤں کے صدور اور بعض طاعات میں خلل ہو جانے کا سبب ہو جاتی ہیں اس لیے آگے تقویٰ کی تاکید اور اس کے بعض فروع مہمہ کی تصریح اور بڑے معاصی سے مثل ربوا کے اجتناب کا حکم فرماتے ہیں تاکہ پابند حدود شرعیہ رہیں تو آئندہ پھر کسی موقعہ پر کوئی مضرت پیش نہ آوے[2]

مولانا آزاد فرماتے ہیں :

اے پیروان دعوت حق جو ٹھوکر تمہیں جنگ اُحد میں لگی ہے اگر چاہتے ہو کہ اس سے عبرت پکڑو تو چاہیے کہ ان آلودگیوں سے پاک وصاف ہو جاؤ جو تمہارے دلوں میں کمزوری کا روگ پیدا کرنے والی ہیں۔ ازاں جملہ مال و دولت کی حرص ہے جب تک یہ روگ دلوں میں موجود ہے جاں فروشی کی سچی روح پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اُحد میں مورچہ چھوڑنے والوں کی لغزش کا اصلی سبب مال و دولت کی طمع تھی۔ اور مال و دولت کی طمع کا ایک بڑا آلہ سُود کا لین دین تھا۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

یہاں اس کا ذکر کیا گیا۔ سود در سود کی وجہ سے بڑی بڑی رقمیں قرضداروں کے سر چڑھ گئی تھیں قدرتی طور پر ان کا چھوڑنا لوگوں پر شاق گزرتا تھا۔ پس حکم الٰہی ہوا کہ تمہارے دلوں کے تزکیہ کے لیے اسی بات میں سب سے بڑی آزمائش ہے۔ لہٰذا سود در سود کی وجہ سے کتنی ہی رقم قرضداروں پر کیوں نہ چڑھ گئی ہو لیکن اسے یک قلم چھوڑ دو[1]

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

اُحد کی شکست کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت کو لوٹنے لگے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سودخواری سے باز آجاؤ جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی چلی جاتی ہے[2]

مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں:

گزشتہ آیات میں صبر و تقویٰ کا حکم تھا اور کفار کے ساتھ دوستی اور ان کو رازدار بنانے کی ممانعت تھی۔ اب ان آیات میں پھر صبر و تقویٰ کو بیان کرتے ہیں کہ صبر و تقویٰ کیا چیز ہے اور صابر و متقی کون لوگ ہیں اور ان کے اوصاف کیا ہیں؟ جن میں سب سے پہلے سود کی ممانعت فرمائی[3]

۱۳۵۔ اے ایمان والو سود مت کھاؤ دگنا چوگنا بنا کر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تھوڑا سود لے لیا کرو لوٹنے پر دو مات لو۔ بات یہ ہے کہ جاہلیت میں سود اسی طرح لیا جاتا تھا جیسے ہمارے یہاں کے بنیئے لیتے ہیں۔ سو روپے دیے اور سود در سود بڑھاتے چلے گئے یہاں تک کہ سو روپے میں ہزاروں روپے کی جائدادوں کے مالک بن بیٹھے۔ اسی صورت کو یہاں اضعافاً مضاعفۃ سے تعبیر فرمایا یعنی اوّل سود حرام ہے اور یہ صورت تو بہت ہی زیادہ قبیح و شنیع ہے جیسے کوئی کہے میاں مسجد میں گالیاں مت بکو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد سے باہر گالیاں بکنے کی اجازت ہے بلکہ تقبیح و تشنیع کے موقع پر ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں[4]

مطلب یہ ہے کہ اضعافاً مضاعفۃ کی قید صرف سود کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہیں مثلاً لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اس میں ممانعت

---

[1] ترجمان القرآن [2] تفہیم القرآن [3] معارف م ا [4] افادات شیخ الاسلام

درحقیقت قتل کی ہے خشیۃ املاق کی قید محض اس کی کراہت اور قباحت کو واضح تر کرنے کے لیے ہے اور جیسے لا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں۔) اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے ان اردن تحصنا کی قید محض اس کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح یہاں اضعافاً مضاعفۃً کی قید محض صورتِ حال کی تصویر اور اس کے گھناؤنے پن کو بتانے کے لیے ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اسلام میں ممنوع صرف سُود در سُود ہے۔ عرب میں یہ دستور تھا اور ایسا ہی دستور تمام سود خواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی اور قرضہ ادا نہ ہوتا تو سُود کو اصل رقم میں بڑھا کر پھر از سرِ نو اس پر سُود لگایا جاتا اور یوں تھوڑی مدت میں مدیون کی ناداری سے ایک چھوٹی سی رقم بڑی بھاری رقم بن جاتی لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سُود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعادِ متعینہ کے لیے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے۔ جب مدت گزر چکتی اور تقاضا پر مدیون اس رقم کو ادا نہ کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضے میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے یہاں تک کہ کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا اسی طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی۔ یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو ہو جاتا۔ قرآن کی یہ آیت اسی صورتِ حال کو ختم کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ بس یہی ناجائز ہے اور ربا تی جائز ہے۔ اسی صورتِ حال کا نقشہ حضرت زید نے اپنے اس بیان میں پیش کیا ہے :

زمانہ جاہلیت میں سُود کا یہ طریقہ رائج تھا کہ جانور کی صورت میں جب مدت گزر جاتی تو قرض خواہ قرضدار کے پاس آتا اور کہتا ادائیگی کرتے ہو یا اضافہ کرتے ہو۔ قرضدار کے پاس اگر ادائیگی کی وسعت ہوتی تو ادا کر دیتا ورنہ آئندہ پر محول کر دیتا۔ اگر ایک سال کی اونٹنی کا بچہ واجب الادا ہوتا تو اگلے سال دو سالہ اونٹنی کا بچہ وصول کرتا پھر تیسرے سال تین سالہ عمر کا بچہ وصول کرتا، چوتھے سال چار سالہ بچہ، اسی طرح اس کے آگے سلسلہ جاری ہو جاتا۔ اور رقم کی صورت میں قرض خواہ قرضدار کے پاس آتا۔ اور وصول نہ ہونے کی صورت میں لے آئندہ سال دوگنا کر دیتا۔ اگر دوسرے سال ادائیگی

نہ ہوتی تو لے پھر دوگنا کر دیتا ایک سو روپیہ آئندہ سال دو سو ہو جاتا اور پھر سال گزرنے پر چار سو۔ پھر سال گزرنے پر آٹھ سو، اسی طرح پھر ہر سال بڑھتا رہتا۔

یہی ربوٰ آج کے دور میں سُود مرکب کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کی پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتی ہے بخلاف قرضدار کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سُود اس طرح دے رہا ہے کہ اس نے اس روپے سے کوئی آمدنی پیدا نہیں کی۔ اور اگر تجارت وغیرہ کے لیے لیا ہے تو تجارت کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں ہے لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بالکل محفوظ اور اس کی دن دونی آمدنی بھی۔ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان کیا۔ اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے سارے دروازے بند ہوں اور صرف نفع کیا نفع؟ اضعافاً مضاعفہ دو گنے ہو گنے کے حساب سے منافع کے دروازے اس پر کھلے ہوتے ہوں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے جو کبھی اچھا کبھی بیمار ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یک طرفہ دولت کی گردش ہوتی ہے تو نتیجہ یہی ہے کہ ملک کا ایک قلیل طبقہ یعنی ایسے لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ ہو جب یہ اپنے روپے کو سُود کی راہ پر ڈال دیں تو ان کا بھی روپیہ ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتا ہے اور ایک سو سال کے بعد قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

خطرناک نتیجہ

بات یہیں آکر نہیں رُک جاتی۔ ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی طاقت رکھتی ہے۔ تنگ آکر ان سُود خواروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا شدید حملہ ہوتا ہے اس کے نتیجے میں سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں۔ امن و امان غارت ہوتا ہے، غربا بھوک کے غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولت مندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ان نتائج کو یورپ میں دُہرا رہی ہے۔ یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے۔ یہی معاشی کاروبار میں لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفہ کے "قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔

خود سوچو کہ سود خوار کو جب اس کا روپیہ بجنسہٖ واپس مل جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے دوگنا

قرض خواہوں سے سُود کا روپیہ کس بنیاد پر لیتا ہے۔ ارسطو کا یہ سوال بڑا معنے خیز ہے
کیا تمہارے روپے بچے دیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب قانونی اجازت ہوگی اور اس کے دائرے میں وسعت ہوگی تو سرمایہ داروں کا طبقہ ملک کے اکثر افراد کے لیے شدید معاشی ضرر کا باعث ہو جائے گا۔ اس قسم کا کاروبار اسی ملک میں پروان چڑھتا ہے جس کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لیے یا اپنے خاندان ہی کے لیے سمجھتے ہوں اور اپنے ملک شہر گاؤں کے دوسرے افراد سے ان کو کوئی تعلق نہ ہو۔

حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور نیشن فیلنگ کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علمبردار کہتا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سُود خواروں ہی کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بینکنگ سسٹم جاری کرکے اس نے موقع فراہم کر دیا ہے کہ جن کو سُود خواری کی فرصت نہیں وہ بھی اب باسانی سُود خواروں کی کمیٹی میں شامل ہو کر ملک کی اکثریت کا معاشی خون چوسنے میں مشغول ہوں۔ اور اس لیے مغربی سُود خواری نے اپنے ردِ عمل کو دُنیا پر جلد ظاہر کر دیا۔ یہ ایک حیثیت سے اچھا ہوا ہلکے بخار سے تیز بخار کا ابھر کر آ جانا مریض کو چونکا دینے کے لیے زیادہ مفید ہے۔ آج یورپ اشتراکی حیوانوں کے زبانوں سے محظوظ ہو رہا ہے سُودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت کو جنگ کا اعلان کر دیا۔ چیلنج قبول کیا گیا۔ اسی سُود کے بل بوتے پر وہ جنگ لڑی جا رہی ہے جس کی نظیر دُنیا نے پہلے نہ دیکھی تھی۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سُود پر باسانی حکومتوں کو اگر روپیہ قرض نہ ملتا تو روزانہ کروڑ ہا روپے کی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سُود ہی اعلانِ جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ ہواؤں میں کچھ جہاز تارپیڈو اور خدا جانے کیا کیا بن کر سمندر کے پانیوں میں برباد ہو رہی ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جنگِ اُحد کے ذکر میں قرآن نے سُود کے مسئلہ کو چھیڑا ہی اس لیے ہے کہ عموماً دُنیا نے جنگ کی کامیابی کا دارومدار سُود ہی کو قرار دیا ہے اور یہ صرف آج کی بات نہیں کہ سُود کے روپے سے جنگ کو جاری رکھا جاتا ہے اور جس قدر جو قوم زیادہ سُودی روپیہ لے سکتی ہے اسی پر اس کی جنگ میں کامیابی کا دارومدار ہے بلکہ عرب میں بھی جنگ کا انحصار بہت کچھ سُود پر تھا۔ اسی سورۃ بقرہ میں جنگ کے ذکر میں شراب اور جُوئے سے منع

کیا تھا تو اب جنگ ہی کے ذکر میں سُود سے روکا ہے۔ چنانچہ کچھ مفسرین نے بھی اس طرف اشارا کیا ہے کہ مشرکوں کے پاس مال اور سرمایہ سُود سے جمع ہوتا تھا اور یہی جمع شدہ سرمایہ وہ فوج پر خرچ کرتے تھے۔

معاشی زندگی کا عظیم مفسدہ

یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے کہ سُود خواہ مفرد ہو یا مرکب اسلام نے اسے ممنوع قرار دے کر معاشی زندگی کے ایک بہت بڑے مفسدہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ سُود کی وجہ سے زبردست ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور ان کی گاڑھی کمائی سے اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں۔ سُود کا عام رواج دولت کی نامساوی تقسیم کا بھی سبب ہے جس سوسائٹی میں یہ رواج عام ہوگا اس پر ہمیشہ طبقاتی کشمکش اور غربت و فلاکت کی لعنت مسلط رہے گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن نے ہر طرح کے سُود کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ یہ مفرد ہو یا مرکب اور چاہے یہ تجارتی اور کاروباری ہو یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ آج کل بہت سے تجدد پسند اصحاب کہا کرتے ہیں کہ تجارتی اور معاشی کاروبار کے سلسلے میں جو سُود لیا جاتا ہے اس کی نوعیت اس سُود سے بالکل مختلف ہے جس کی قرآن نے ممانعت کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کی رُو سے ہر قسم کا سُود قطعاً ناجائز ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی اور کاروباری سُود چیز ہی اور ہے وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موجودہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد یہی سُود ہے اور آج چونکہ ہیں سُود کو ممنوع قرار دے دیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ سُود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے اسے کاروبار کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ سُود کی معینہ رقم حاصل کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ کاروبار سے منفعت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ سُود کے بغیر سرمایہ جمع کرنا ممکن نہیں ہے اور بغیر سرمایہ کے بڑے پیمانہ پر صنعتوں کو چلانا محال ہے حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر سُود کو مٹا کر اس کی جگہ منافع کی بنیاد پر معاشی تنظیم استوار کی جائے تو اس کی وجہ سے موجودہ زمانے کی بے شمار معاشی خرابیاں اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔

سُود اور منافع میں فرق

سُود اور منافع میں بڑا فرق یہ ہے کہ سُود ایک معیّنہ رقم ہے لیکن منافع میں رقم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک شخص اپنی جمع کی ہوئی رقم پر ۵ فی صد سُود حاصل کرتا ہے تو اسے بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ سال کے ختم پر اتنی رقم ملے گی لیکن اگر کاروبار اصولِ منفعت پر چل رہا ہو اور اسے بتا دیا جائے کہ اتنا فیصد حصّہ منافع کا ملے گا پھر بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ سال کے ختم پر اسے کیا ملے گا کیونکہ پہلے تو وہ یہی نہیں جانتا کہ تجارت میں نفع ہوگا یا نقصان اور اگر نفع کا تعین بھی ہے پھر بھی وہ اپنا حصّہ مقرر نہیں کر سکتا۔

سُود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے انہیں تو سال کے ختم پر سُود کی وصولی سے مطلب ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ بند کر کے وہ اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی پر انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کی کارروائیوں پر انہیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ ان کا کوئی نمائندہ بنک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کا تابع ہو رہتا ہے۔ پھر چونکہ بنکنگ کا پورا نظام ایک محدود جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بطورِ لازمی نتیجہ کے ساری تجارت، ساری صنعت اور سارے مالی ذرائع پر بھی یہی محدود جماعت قابض رہتی ہے کیونکہ بنکنگ نظامِ تجارت وصنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی تجارت کوئی صنعت بنکوں کے تعاون یا ان کی امداد کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مالی نظام جس طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ تجارت وصنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہو گا۔ اسی صورتِ حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطورِ طنز لکھا ہے کہ بنک آف انگلینڈ کا صدر زارِ روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار و اختیار کا مالک ہوتا ہے۔ یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

اگر سُود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط سے کام لے گا کیونکہ وہ اس صورت میں صرف نفع کا شریک نہ ہوگا نقصان میں بھی اسے شرکت کرنی پڑے گی۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بنک کے انتظام میں مؤثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بنک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر نظر رکھیں گے[1]

[1] نظامِ اسلام

انشورنس اور اسلام

اس زمانے میں دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ انشورنس کا معاملہ بھی بہت زیادہ عام ہو چکا ہے اس کی بنیاد سُود اور جُوئے پر ہے۔ ان دونوں کی حرمت اسلام میں بدیہی ہے۔ ان میں اُمّت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

یہ بات کہ انشورنس جوا اور سُود اپنے دامن میں کیسے سمیٹے ہوتے ہے تحقیق طلب نہیں ہاں البتہ ذرا تفصیل طلب ہے۔

لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کرکے شائع کیا اس کا جواب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مفتی ولی حسن ٹونکی نے دیا ہے۔ دارالاشاعت کراچی نے ان جوابوں کو شائع کر دیا ہے۔ دونوں جواب اپنے موضوع پر مفید معلومات کے حامل ہیں مفتی ولی حسن صاحب کا جواب چونکہ مفصل ہے اس لیے میں یہاں ناظرینِ معالم القرآن کی ضیافتِ طبع کے لیے اس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ بیمہ کی ابتداء دہلی کے "تاجرانِ اسلحہ سے ہوئی۔ ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگدستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا حل یہ نکالا کہ اگر کسی شخص کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک مقررہ رقم ادا کیا کریں۔ یہی تحریک ترقی کرکے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ ہر ایک ممبر ایک مقررہ رقم ادا کرے تاکہ اس قسم کے حوادث و خطرات کے موقعہ پر نقصان کا کچھ نہ کچھ تدارک کیا جا سکے۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اندلس کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں نے تجارتی بیمہ کی طرح ڈالی۔ ابتداء میں بیمہ کی سادہ سی صورت تھی۔ بعد میں اس کی نئی نئی صورتیں نکلتی رہیں۔ اور تجربے ہوتے رہے۔ ہالینڈ اس تجربہ میں پیش پیش رہا۔ موجودہ دور میں بیمہ کاری کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جسے سرمایہ کارانہ نظامِ بیمہ کہا جاتا ہے۔ اب دُنیا کی حکومتیں بیمہ کو لازمی قرار دے رہی ہیں جسے ریاستی بیمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بیمہ کی ابتداء سنہ ۱۴۰۰ء سے ہوئی، ابتداء ہوتے ہی اسے بہت زیادہ فروغ ہوا۔ اور اس کے مقدمات اس کثرت سے عدالتوں میں آنے لگے کہ سنہ ۱۴۳۵ میں اس کے لیے خاص عدالتیں مقرر ہوئیں جو

صرف بیمہ کے مقدمات کی سماعت کرتی تھیں۔ بیمہ بحری کے بہت عرصہ بعد بیمہ بری شروع ہوا۔
آل عثمان کے زمانہ حکومت میں جب ترکی حکومت کے تجارتی تعلقات یورپ کے ملکوں سے قائم ہوئے تو یورپین تاجروں کے توسط سے بیمہ اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور اس کے بارے میں علماء وقت سے سوالات شروع ہوئے۔ چنانچہ تیرھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین الشامی تحریر فرماتے ہیں:

طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ تاجر جب کسی حربی سے کوئی بحری جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو اس کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دارالحرب کے کسی باشندے کو اپنے علاقہ میں مقیم رہتا ہے کچھ رقم اس شرط پر دیتے ہیں کہ جہاز میں لدے ہوئے مال کے آتش زدگی، غرقابی اور لوٹ مار ہو جانے کی صورت میں یہ شخص مال کا ضامن ہوگا اور اس کو رقم "سوکرہ" (بیمہ کی رقم) کہا جاتا ہے۔ اس کا ایجنٹ ہمارے ملک کے ساحلی شہروں میں شاہی اجازت نامہ کے بعد مستامن بن کر رہتا ہے جو تاجروں سے بیمہ کی رقم وصول کرتا ہے اور مال کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں تاجروں کا پورا پورا معاوضہ ادا کرتا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ بیمہ بحری کو اس زمانے میں خاصا فروغ ہو چکا تھا۔ یورپین ممالک سے جو جہاز کرایہ پر لیے جاتے تھے ان کا لازمی طور پر بیمہ کرایا جاتا تھا۔ بیمہ کمپنیوں کا عمل دخل ترکی حکومت میں جاری تھا۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ترکی کی بندرگاہوں پر باضابطہ سلطانی اجازت کے بعد مقیم تھے اور انہوں نے اپنے دفاتر قائم کر لیے تھے یہاں تک کہ اہل علم کے پاس اس سے متعلق سوالات آنے لگے اور کتب فتاوی میں ردالمحتار وہ منفرد کتاب ہے جس میں انشورنس اور بیمہ کے متعلق تفصیل سے جواب دیا گیا ہے۔

بیمہ کی ابتدا جس جذبے کے تحت ہوئی اور جن ارتقائی منزلوں سے گزرا وہ سب کے سامنے ہے لیکن اس کا انجام فاضل جلیل استاذ علامہ ابوزہرہ کے الفاظ میں یہ ہے:

اگرچہ اس کی اصلیت تو تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ کی طرح ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا۔ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد تعاون علی البر والتقوی پر تھی ایک ایسے نظام میں تبدیل کر دیا جس میں جوا اور سود دونوں

---

[1] رد محتار ج ۳ ص ۲۴۹۔

موجود ہیں [1]

مصر و شام میں اس پر بحثیں مدت سے ہو رہی ہیں۔ وہاں بیمہ کے نظام کو سمجھانے کے لیے متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

مصر میں تین چار سال پہلے نئے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک مجلس ترتیب دی گئی تھی، جس میں استاذ ابوزہرہ، استاد خلاف اور دیگر علماء شریک ہوتے۔ اس کے پہلے اجلاس میں جو مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ بیمہ کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اس جلسہ کی پوری رو داد مجلہ لواء الاسلام قاہرہ میں شائع ہوئی۔

پھر شام کے مشہور فاضل مصطفےٰ الزرقا نے مجلہ حضارۃ الاسلام (دمشق) کے صفحات پر عقد التامین و موقف الشریعہ کے عنوان سے بحث چھیڑی اور علماء کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کریں چنانچہ استاذ ابوزہرہ نے استاذ الزرقا کے جواب میں نہایت مدلل مقالہ سپرد قلم فرمایا۔

استاذ الزرقا کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء مصر و شام اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں۔ اگرچہ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ بیمہ ناجائز ہے اور جب تک بیمہ کے موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ مختلف الخیال حضرات کی آراء اور ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر قسم کا بیمہ جائز ہے۔ یہ حضرات بیمہ کے موجودہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی حلت اور جواز کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ امدادِ باہمی کی ایک شکل ہے۔ تعاون اور امدادِ باہمی اسلامی حکم ہے۔ جیسے بیع بالوفا کو گوارا کر لیا۔ اسی طرح اس کو بھی گوارا کر لیا جائے۔ بیمہ کمپنی ضرورت مندوں کو قرض دیتی ہے اور اس پر جو سود لگاتی ہے یا بیمہ دار کو اصل مع منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی ربٰو سود نہیں ہے۔

دوسرا گروہ جس کی قیادت استاذ زرقا کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ غیر سودی بیمہ جائز ہے۔ بیمہ میں اگر قباحت ہے تو وہ سود ہے اس کو ختم کرنے کے بعد بیمہ کی ہمہ اقسام جائز ہیں۔ ان حضرات کے دلائل کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] لواء الاسلام بحوالہ ماہنامہ برہان

الف ، عقد موالات پر قیاس کر اس میں ایک غیر شخص دیت وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں میراث کا حقدار ہو جاتا ہے ایسے ہی بیمہ بھی ہے ۔
ب ، ودیعت باجر اور مسئلہ ضمان خطر الطریق میں بیمہ کی بعض صورتوں کو داخل کیا جا سکتا ہے ۔[1]

---

[1] استاذ مصطفیٰ الزرقا نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب المدخل الفقہی العام میں اس موضوع پر دو جگہ بحث کی ہے ۔ یہاں اس علمی بحث کا پیش کر دینا مفید ہے ۔

عقد موالاۃ میں انشورنس اور تامین کے جواز اور صحت کی بنیاد بننے کی پوری پوری صلاحیت ہے یہ آج کل تجارتی معاملات میں رائج ہے ۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تجارتی سامان اور اثاثہ نقصان سے محفوظ رہے اور اس نقصان کے بدلے میں کمپنی مالک کو وہ رقم ادا کرے جو معاملہ میں طے ہو جاتے اور مالک کمپنی کو معمولی رقم دے ۔ علماء اور مفتیان کرام اس معاملہ کی صحت میں متردد ہیں اور کچھ اس کو حرام قرار دیتے ہیں ۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ معاملہ قطعاً درست ہے اور اسلامی شریعت کے اصول اس میں رکاوٹ نہیں ہیں ۔ اس طریقہ سے تاجر اور دوسرے حضرات کو جو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے ان سے تعاون کیا جاتا ہے بجائے اس کے کہ فرد واحد نقصان برداشت کرے کمپنی نقصان برداشت کر لیتی ہے ۔ آج کے دور میں جبکہ تمام بیرونی تجارتیں نقل و حمل کے ان تیز رفتار ذرائع کی موجودگی میں خطروں سے دوچار رہتی ہیں اس کی بے حد ضرورت ہے کوئی تاجر اس کے بغیر اپنی مایہ کے بارے میں مطمئن نہیں ہوتا ہے ۔ ہمارے فقہاء نے مقررہ صورتوں ضمان خطر طریق کی صحت کو بیان کیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ اس راستہ میں چلو راستہ قابل اطمینان ہے اگر تم پر کوئی افتاد آئی تو میں ذمہ دار ہوں ۔ راستہ میں لوٹ لیا گیا تو ضامن کو ضمان دینا ہوگا (رد مختار کتاب الکفالہ)

انشورنس کے جواز کے لیے اصول شریعت اور فقہ میں ہم کو کوئی صریح نص نہیں ملتی ہے کیونکہ یہ معاملہ نیا ہے ۔ یہاں صرف قیاسی دلائل کافی ہیں ۔ ہاں مرحوم ابن عابدین شامی نے اس کو موضوع بحث بنایا ہے لیکن انہوں نے اس پر دوسرے زاویہ نظر سے غور کیا اور وہ اپنے غور و فکر کے نتیجہ میں اسے ناجائز کہتے ہیں ۔

ج - مالکیہ کے نزدیک اگر کوئی شخص کسی سے وعدہ کرے بدون کسی عقد کے تو وہ وعدہ لازم ہو جاتا ہے اور نقصان کی صورت میں وعدہ کرنے پر معاوضہ نقصان ضروری ہوتا ہے

تیسرا گروہ جس کی قیادت استاذ ابوزہرہ کے ہاتھ میں ہے اس کا قائل ہے کہ بیمہ مطلقاً ناجائز ہے ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱- بیمہ اپنی اصل وضع میں قمار ہے جبکہ مدت مقررہ کے اختتام سے قبل ہی بیمہ دار کی موت واقع ہو جائے یا ربوا ہے جبکہ کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ مع منافع حاصل کرے قمار اور ربوا دونوں حرام ہیں۔

۲- بیمہ میں صفقتان فی صفقۃ[1] پایا جاتا ہے اس کی ممانعت نص حدیث سے ثابت ہے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

۳- بیمہ سے نظام میراث درہم برہم ہو جاتا ہے کیونکہ بیمہ دار کے نامزد کردہ شخص کو بیمہ کی رقم ادا کی جاتی ہے جبکہ ہر شرعی وارث مال متروکہ کا حقدار ہے۔

۴- یہ عقد صرف[2] ہے جس میں مجلس میں قبضہ ضروری ہے اور یہاں یہ شرط مفقود ہے۔

۵- عقیدہ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیے جائیں اور یہاں بیمہ کرنے والے اس عقیدے سے فرار کرتے ہیں۔

ابن عابدین شامی کا فتویٰ

علامہ ابن عابدین شامی نے انشورنس کا مسئلہ ردمحتار میں مستامن کے باب میں ذکر کیا ہے۔ ان تاجروں کو ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ التزام ما لا یلزم کی صورت ہے یعنی جو چیز قانوناً لازم اور ضروری نہیں ہے اس کو اپنے ذمہ لازم کرنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امانت رکھنے والا امانت کی حفاظت پر اجرت وصول کرے اور مال ضائع ہو جائے تو وہ ضامن ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے

---

[1] یعنی ایک معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے اس میں دوسرا معاملہ داخل کر دیا جاتے۔

[2] عقد صرف روپے کی بیع روپے یا سونے چاندی کی باہم بیع کو صرف کہتے ہیں۔ اس میں شرط ہے کہ معاملہ کرنے کے بعد مجلس ختم ہونے سے پہلے مال پر قبضہ کر لیں۔

کیونکہ یہاں مال بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ بحری جہازوں کے یا اس کے مالکوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ بیمہ کمپنی ہی کا جہاز بھی ہو پھر بھی ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بیمہ کمپنی اجیر مشترک ہے جس نے مال کی حفاظت اور مال کے لے جانے دونوں کی اجرت لی ہے اور ظاہر ہے کہ اجیر مشترک ناگہانی مال کے تلف ہو جانے کی صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔ اگر یہ خدشہ ہو کہ باب الکفالت میں یہ مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اس راستہ پر سفر کرو راستہ قابلِ اطمینان ہے۔ شخص مذکور نے سفر کیا۔ سفر میں مال ضائع ہو گیا تو راستہ کا اطمینان دلانے والا ضامن نہیں ہوگا اس کے برعکس اگر اس نے ضمانت لی اور کہا کہ تیرا مال چھیننے کی صورت میں، میں ضامن ہوں راستہ میں مال ضائع ہو گیا تو ضمانت دینے والا شخص نقصان کا معاوضہ دے گا۔ صاحب درمختار نے دونوں مسئلوں میں فرق اس طرح کیا ہے کہ دوسرے مسئلہ میں ضمانت کے الفاظ صراحۃً موجود ہیں پہلے میں نہیں۔ اور جامع الفصولین میں اس فرق کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ "قاعدہ یہ ہے کہ جسے دھوکہ دیا جائے وہ دھوکہ باز سے ضمان لینے کا اس وقت حقدار ہے جبکہ دھوکہ عقد معاوضہ میں ہو۔ یا دھوکہ باز نے مال کے محفوظ رہنے کی ذمہ داری قبول کی ہو مثلاً ایک شخص کسی چکی والے کے پاس گیہوں پسانے گیا۔ چکی والے نے اس سے کہا کہ اس برتن میں ڈال دو۔ اتفاق سے برتن میں سوراخ تھا اور چکی والا اس سے واقف بھی تھا پھر بھی اس نے گیہوں برتن میں ڈالنے کے لیے کہا۔ گیہوں سب ضائع ہو گئے۔ چکی کا مالک نقصان کا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے عقد ہی میں دھوکہ دیا ہے حالانکہ معاملہ کا تقاضا یہ تھا کہ مال کی حفاظت ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں یہ قید ناگزیر ہے کہ دھوکہ دینے والا نقصان سے واقف ہو اور دوسرا اس سے ناواقف ہو۔ ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنیوں کا مقصد تاجروں کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا اور نہ ان کو جہاز کے ڈوب جانے یا آگ لگ جانے کا علم ہوتا ہے۔ رہا عام خطرہ تو وہ تاجر اور بیمہ کمپنی دونوں کو ہوتا ہے کیونکہ تاجر بیمہ کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کو خطرہ ہو اور ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینے کی طمع ہو لہٰذا بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر مسلمان تاجر کا کوئی حربی شریک ہو اور وہ دارالحرب میں بیمہ کمپنی سے معاملہ طے کرے اور مال ہلاک ہونے کی صورت میں معاوضہ کی رقم میں کچھ مسلمان تاجر کا بھی حصہ لگائے تو یہ رقم مسلمان کے لیے حلال ہے کیونکہ عقد فاسد دارالحرب میں رہنے والے دو شخصوں کے درمیان ہوا ہے اور دارالحرب والوں کا مال ان کی رضامندی سے مسلمانوں کو

پہنچا ہے لہٰذا اس کے لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان تاجر دارالحرب میں ہوتا ہے اور وہاں ان کے سامنے یہ معاملہ طے کرتا ہے اور معاوضہ دارالاسلام میں لیتا ہے۔ کبھی اس کے برعکس بھی صورت ہوتی ہے یعنی معاملہ دارالاسلام میں ہوا اور وصولی دارالحرب میں ہوئی۔ پہلی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے کیونکہ دارالحرب میں طے کیا ہوا معاملہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ اور یہ کہیں گے کہ حربی کا مال اس کی خوشی سے لیا گیا ہے اس لیے جائز ہے دوسری صورت میں چونکہ عقد دارالاسلام میں قرار پایا ہے اس لیے عقد پر فساد کا حکم لگایا جائے گا اور معاوضہ ناجائز ہوگا۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ ساتویں پارے میں آئے گی۔

کامیابی اہلِ تقویٰ کے لیے ہے

۲۳۶۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ۔ یعنی سُود کھانا چھوڑ دو اس میں کوئی بھلا نہیں بلکہ تمہارا بھلا اس میں ہے کہ خدا سے ڈر کر سُود کھانا چھوڑ دو[1] مطلب یہ ہے کہ ناداروں، حاجت مندوں اور غریبوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ قرض کی صورت میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرو جو ان کی زندگی کی تباہی کا باعث ہو جائے۔ آیت میں فلاح کو تقویٰ پر مرتب کر کے ان کے لزوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ فلاح و کامیابی یا دُنیا میں عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا راز تقویٰ سے وابستگی میں ہے۔ اگر قرآن کی ساری تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو لفظ تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح پیدا کرنا ہے۔ قرآن نے اپنی دوسری سُورۃ کے شروع میں یہ اعلان کیا ہے ھدی للمتقین اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں۔ اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے۔ ایمان اگر فکری تطہیر ہے تو تقویٰ اسی فکری تطہیر کے بعد عملی تطہیر کا نام ہے۔ گویا ایمان کے بعد ہر مومن کا دوسرا قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ یہ دیکھے کہ میرے اس ایمان میں کتنی طاقت، کیسی کچھ عملی تاثیر اور کتنی زندگی ہے۔ وہ روزمرہ کے معاملات میں ہم کو خدا پرستانہ زندگی اختیار کرنے پر کتنا ابھارتا ہے ہم اس کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کرتے ہیں؟ اگر اس عملی جائزے میں آپ کو یہ حقیقت محسوس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہو کر کتر یا بیشتر کہ ہمارے عمل کی باگ ڈور خوفِ آخرت کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہے تو خود ساختہ تاویلوں اور حیلہ جوئیوں کی روش عام سے بچ کر ایک سیدھے مسلمان کی طرح اپنی کوتاہیوں کا دل میں اعتراف کر لینا چاہیے اور یقین کر لینا چاہیے کہ جس خوفِ آخرت کے ذکر سے ہماری زبان کو اتنا تعلق ہے اس کے تذکرہ اور تبلیغ سے ہمارے دلوں کو اتنا تعلق نہیں ہے اور ہمارے اندر جو ایمان ہے اس کی رُوح فی الواقع ابھی تک غفلت اور پژمردگی کی حالت میں ہے۔ اس احساس واعتراف کے کے بعد دوسرا فرض یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا جائے۔ یہ علاج کیا ہے تقویٰ اسی علاج کا نام ہے یعنی دل میں اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کی جائے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جائے۔

کفر ناقابلِ معافی جُرم ہے

۱۳۷۔ اور دیکھو اس آگ سے ڈرو جو کُفر کی راہ چلنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے یعنی سُود کھانے والا دوزخ میں جاتا ہے جو اصل میں کافروں کے لیے بنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم کی آگ اصلاً کافروں ہی کے لیے ہے۔ کہیں تم کافروں جیسے اعمال کر کے اپنے کو ان کی لپیٹ میں نہ لے آنا۔ اکثر ائمہ تعبیر اس طرف گئے ہیں کہ یہ وعید ان لوگوں کے لیے ہے جو سود خواری کو حلال سمجھتے ہوں اور اس لیے حدودِ کفر میں داخل ہیں۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ ایمان کو ڈانٹ بتائی جا رہی ہے تاکہ وہ سُود کو حلال نہ سمجھیں۔ امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ یہ آیت بہت ہی ڈرانے والی ہے کیونکہ اس میں دوزخ سے جو فی الواقع کفر کی سزا ہے ان لوگوں کو بھی ڈرایا گیا ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نہیں بچتے ہیں۔ (مدارک)

درا صل احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق دل سے ہے اور جو بمنزلہ اصل کے ہے اسی کو قرآن کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدہ اوّل کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضاء وجوارح سے ہے اس کو ہم مختصراً عمل کہتے ہیں۔ شرک و کفر کے گناہ کا تعلق اصلاً قسمِ اوّل سے ہے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسمِ دوم سے۔ دلوں میں ایمان،

علم اور عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدے کی روشنی کی اُمید کسی طرح کی جاسکتی ہے مگر جس کا سینہ و دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے نا اُمیدی ہے۔ اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہوتے ہیں اور جہاں ایمان کی کچھ بھی رمق موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے۔ البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے جن کی تلافی عذاب دوزخ سے یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے۔ ایمان علم وعرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے اس کا حصول موت کے بعد ہماری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا اس بنا پر کفر و شرک کے گناہ کی مغفرت کی اُمید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے۔ البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کمل ہوتی مثال یہ ہے کہ دُنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیے گئے ہیں۔ اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفر محض ہے۔ تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے۔ لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب کر سکتا ہے

الغرض ایمان وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک و کافر ہے اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی دنیوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

نظم وطاعت پر زور

۲۳۸۔ اللہ اور اس کے رسُول کی طاعت کرو تاکہ رحمتِ الٰہی کے مستحق ہو جاؤ۔ رسُول کا حکم ماننا بھی فی الحقیقت خدا ہی کا حکم ماننا ہے کیونکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ ہم پیغمبر کا حکم مانیں اور اُن کی پوری طاعت کریں۔ جن احمقوں کو عبادت اور طاعت میں فرق نظر نہ آیا وہ طاعتِ رسول کو شرک کہنے لگے۔ چونکہ جنگِ اُحد میں رسُول کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی جیسا کہ آگے آتا ہے اس لیے آئندہ کے لیے ہوشیار کیا جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت فلاح وکامیابی کی اُمید اسی وقت ہو سکتی ہے جب اللہ اور اس کے رسُول کے کہے پر چلو۔ [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پہلے بتایا تھا کہ فلاح چاہتے ہو تو تقویٰ اختیار کرو۔ یہاں بتایا کہ اللہ کی رحمت سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو تو اللہ ورسول کی طاعت کرو۔ گویا بتادیا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں اصل کامیابی تمہاری یہ نہیں ہے کہ تمہیں مال غنیمت مل جاتے بلکہ اصلی کامیابی یہ ہے کہ تم پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں۔ رحمتِ حق سے قریب ہونے کا راستہ صرف یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو۔ جنگ اُحد میں شکست کا اصلی سبب یہی تھا کہ نظم و طاعت یعنی ڈسپلن کی رُوح پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے ضروری ہوا کہ اب کسی ایسی بات پر زور دیا جائے جس کی فوری تعمیل میں طاعت و فرمانبرداری کی پوری پوری آزمائش ہو جائے۔ اس امتحان کے لیے ایک زبردست اور عظیم پرچہ امتحان مقرر کیا گیا اور وہ یہ کہ سُود لینا چھوڑ دو ظاہر ہے کہ اس سے بڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی تھی سُود کی حرمت سے قرض خواہوں کو ایک ایسی بات چھوڑ دینی پڑتی تھی جسے صدیوں سے اپنا جائز حق سمجھتے رہے تھے اور ان کی مال و دولت کی افزائش کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ سُود پر قدغن قائم کرنے کے بعد فوراً اللہ اور رسُول کی طاعت پر زور دیا۔ اور زور بھی ایسا کہ اس پر خدا کی رحمت کو موقوف کر دیا۔

طاعت اور عبادت میں فرق

عبادت نام ہے انتہائی تذلّل اور بے نہایت خشوع و خضوع کے اظہار کا۔ یہ اسی کے لیے مناسب ہے جس میں انتہائی عظمت موجود ہو۔ ایسی عظمت کہ اس سے برتر وہم وگمان میں بھی نہ آسکے اس درجہ کی عظمت صرف ایک ذات میں منحصر ہے۔ اس لیے اس میں غیر مستقل طور پر بھی کسی شرکت کی گنجائش نہیں۔ اس میں ہر قسم کی شرکت شرک ہے۔ اور اطاعت کے لیے صرف حکمرانی کی لیاقت درکار ہے۔ یہ بطریق نیابت اجازت کے بعد مخلوق میں بھی پیدا ہو سکتی ہے اس لیے نیابۃً غیر اللہ کی اطاعت شرک نہیں ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُمت کے چند فرق افراط و تفریط کے شکار ہو گئے۔ کچھ تو تاویل کر کے غیر اللہ کی عبادت کو جائز بتانے لگے اور کچھ نے مجتہدین کی اطاعت کو بھی شرک کہہ دیا اور کچھ نے اطاعت رسُول کو بھی شرک کا ایک شعبہ قرار دے دیا۔ یہ تمام راہیں حقیقت سے ناآشنا ہونے کی دلیل ہیں۔ قرآن نے اس موضوع کو علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے واضح کر دیا ہے۔ علمی لحاظ سے تو اس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ رسُول کی اطاعت اللہ کی طاعت سے علیحدہ نہیں ہے اس کو مستقل طاعت سمجھنا ہی غلط ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

عبادت کے موضوع پر اس قسم کا کہیں ایک فقرہ بھی نہیں آیا ہے جس سے یہ وسوسہ پیدا ہو سکے کہ غیر اللہ کی عبادت کسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو سکتی ہے اور عملی دائرے میں رسول کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت کو خود قرآن نے ضروری قرار دیا پھر اس کو شرک کیسے کہا جا سکتا ہے اس کے برعکس عبادت میں کسی کی شرکت کو کسی طرح سے بھی گوارا نہیں کیا بلکہ ایک ادنیٰ سی ریاکاری کی نیت کو بھی شرک سے تعبیر کیا ہے اور فوز و فلاح کے لیے اس سے بچنا شرط اول قرار دے دیا پس جتنی بات قرآن کریم سے بغیر تاویل کے صاف اور صریح طور پر سمجھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے حکم کے تحت کچھ اشخاص یا جماعتوں کی اطاعت تو جائز ہے اور عبادت میں اس کا حکم ہی یہ ہے کہ

امر الا تعبدوا الا ایاہ

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ پنجم میں آرہی ہے -

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ
اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ
جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝

اور دوڑ کر چلو اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف[۲۳۹] اور اس جنت
کی طرف جس کی پہنائی آسمان و زمین ہیں[۲۴۰] اور ایسی جنت جو ان متقی
لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے[۲۴۱]۔ جو خوشحالی اور تنگ حالی میں
خرچ کرتے ہیں[۲۴۲] اور جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو

معاف کرتے ہیں[۲۴۳] اور اللہ نیکوکار لوگوں سے محبت کرتا ہے[۲۴۴] اور وہ لوگ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان سے کوئی سخت بُرائی کی بات ہو جاتی ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے پر ظلم کر بیٹھتے[۲۴۵] ہیں تو فوراً اللہ کی یاد ان میں جاگ اُٹھتی ہے اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں[۲۴۶]، اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کون کرتا ہے[۲۴۷] اور جو کچھ کر چکے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے[۲۴۸]۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں کہ ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس یہ ہے کہ ان کو معاف کر دے اور ان کی جزا ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ انہی باغوں میں رہیں گے، کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا[۲۴۹]۔

سُود اور صدقہ کا تقابلی مطالعہ

سُود کی حُرمت کا اعلان کرنے کے بعد صدقہ و انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے اسلوب بھی بڑا ہی جذباتی اختیار فرمایا ہے۔ دسا رعوا یعنی دوڑ دھوپ مچاؤ، دوڑ کر

چلو یا نیز کام ہو جاؤ۔ سُود خوری جس معاشرے میں ہوتی ہے اس کے اندر سُود خوری کی وجہ سے دو قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ سُود لینے والے میں حرص، طمع، بخل اور خود غرضی اور سُود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بغض وحسد۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو بتا رہا ہے کہ سُود خواری سے جو اخلاقی رذائل پیدا ہوتے ہیں ان کے بالکل برعکس انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ سے دوسری قسم کے فضائل پیدا ہوتے ہیں اور اللہ کی بخشش اور جنت فضائل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ رذائل سے۔

اسلام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ رذائل کو وہ ضابطہ اور قانون کی بندش میں جکڑ دیتا ہے۔ لیکن فضائل کی حد تک انسانوں کے ارادے اور مرضی سے اپیل کرتا ہے۔ اگر وہ فضائل میں بھی ضابطہ اور قانون کی بندش قائم کر دیتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطل میں رہتے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطل اس کی موت ہے جس دُنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقربا کی امداد، غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں جہاں کسی شخص کو انفرادی طور پر اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے، غصہ کو پینے، کسی کے کام آنے، کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقع نہ ہو۔ جس جماعت کے افراد باہمی معاملات اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی رُوح سے خالی ہوں۔ اس میں اخلاقی احساسات کا نشوونما ناممکن ہے۔ قرآن رذائل کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ اور قانون کی طاقت کے حوالے کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے سُود پر قدغن قائم کرنے کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کی پر زور تلقین کی اور بتایا کہ سارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ گویا حکومت اور قانون کو حرکت میں لائے بغیر قرآن ایک مومن کے اخلاقی احساسات کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دُنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے انسان کی اعانت و دستگیری، درگزر اور عفو کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔ پورا قرآن انفاق کی ترغیب سے بھرا ہوا ہے۔ بلاشبہ جس جماعت میں انفاق فی سبیل اللہ کی رُوح کام کر رہی ہو گی۔ اس میں غربت، افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سُنی جا سکیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری، محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبر گیری، اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسرِ کار ہو۔ وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت ناپید ہو گی۔ جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں

وہاں گردش میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند ہوگا۔ کیونکہ دُنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جتنی مکمل ہوگی معاشی زندگی اتنی ہی پرسکون ہوگی۔

خدا کی بخشائش کے لیے تیز گامی

۲۳۹ ۔ اور دوڑ کر چلو اپنے پروردگار کی بخشائش کی طرف۔ یعنی ان اعمال و اخلاق کی طرف جھپٹو جو حسب وعدہ خداوندی اس کی بخشش اور جنت کا مستحق بناتے ہیں [1]

آیت میں مغفرت سے مراد اسباب مغفرت ہیں یعنی وہ اعمال صالحہ جو باعث مغفرت ہیں صحابہؓ و تابعین سے مغفرت کی تفسیر مختلف آتی ہے لیکن حاصل سب کا ایک ہے۔ علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ادائے فرائض میں جلدی کرو۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اسلام کرو۔ ابوالعالیہ نے ہجرت کو اس کا مصداق بتایا ہے۔ انس بن مالک نے تکبیر اولیٰ کہا ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ طاعات میں سرشاریاں دکھاؤ، ضحاک کا کہنا ہے کہ جہاد کرو۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ سب کا حاصل یہی ہے کہ اسباب مغفرت اختیار کرو اور وہ کام کرو کہ جن سے اللہ کی مغفرت کے مستحق ہو جاؤ۔ رذائل سے دامن پاک رکھو اور فضائل و محاسن کا سرمایہ فراہم کرو۔ سُود سے بچو اور صدقہ میں بڑھو۔ بلکہ عارفین کہتے ہیں کہ ہر وقت جو چیز اس وقت کے لحاظ سے خیر و مصلحت ہو اس کی طرف تیز گام ہونا ہی مسارعۃ الی المغفرۃ من ربکم کا مدلول ہے۔

مغفرت کا جنت سے پہلے ذکر

آیت میں جنت پر مغفرت کو مقدم لاکر اشارہ کر دیا کہ جنت حاصل کر لینا مغفرت الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔ انسان اگر تمام عمر بھی نیکیاں کرتا ہے۔ اور گناہوں سے کنارہ کش ہے۔ پھر بھی اس کے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں۔ جنت صرف مغفرت ہی کے ذریعے ملے گی اور مغفرت اللہ سبحانہ کا فضل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راستی اور حق کو اختیار کرو۔ میانہ روی کو اپناؤ اور فضل الٰہی پر خوشیاں مناؤ۔ کیونکہ کسی شخص کو اس کا عمل جنّت میں لے جانے کی علّت نہیں ہے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا آپ کا عمل بھی جنّت میں لے جانے کی علّت نہیں فرمایا نہیں میرا عمل بھی جنّت میں نہیں پہنچا تے گا تا آنکہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنّت کی قیمت نہیں اور جنّت میں جانے کی علّت نہیں ہیں بلکہ بہانہ اور سبب ہیں، علّت تو صرف اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے۔ قرآن میں جن مقامات پر جنّت کے ذکر میں بما کانوا یعملون آیا ہے وہاں با، مقابلہ نہیں بلکہ با سببیہ ہے یعنی اعمال جنّت میں جانے کا سبب ضرور ہیں مگر اعمال جنّت کا بدل اور اس کی قیمت نہیں ہیں۔

تیز گامی اور نماز

اصل ارشاد میں سارعوا آیا ہے۔ اس کا مصدر مسارعت ہے۔ اس کے معنے مسابقت اور مبادرت کے ہیں اور اس کا منشا یہ ہے کہ نیک کاموں میں تیز گامی اور دوڑ دھوپ مچانی چاہیے۔ لیکن نماز نیکیوں میں سب سے بڑی نیکی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

نماز کے لیے دوڑتے بھاگتے نہ آیا کرو بلکہ اس طرح آؤ کہ تم سراپا سکون و وقار ہو۔

آیت قرآنی کہتی ہے کہ تیز گام ہو جاؤ مگر نماز کے بارے میں ارشاد ہے کہ دوڑ دھوپ نہ مچاؤ۔ آیت قرآنی میں مسارعت سے اہتمام مقصود ہے اور ہر وقت دوڑ دھوپ روح اہتمام کے خلاف ہے۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ نماز کے موضوع پر اس مخصوص ادب میں جو بڑی حقیقت پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے لیے جب ایک خاص جگہ مقرر کر دی گئی ہے۔ اس کے لیے اذان کے ذریعے اعلان بھی ہو گیا اور آنکھوں سے نظر آ رہا ہے کہ مختلف سمتوں سے مختلف جماعتیں کسی ایک مقصد کی خاطر ایک جگہ جمع ہونے آ رہی ہیں۔ اگر وہ بھاگ بھاگ کر جائیں گے تو دیکھنے والوں کے دماغ میں یہ نقشہ آ سکتا ہے کہ جس طرح اور مذاہب میں ان کے معبود کسی ایک جگہ رکھے ہوتے ہیں شاید ان کا معبود بھی کسی مسجد میں رکھا ہوا ہے جس کی طرف یہ والہانہ انداز میں بھاگے جاتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تم مت بھاگا کرو بلکہ اس طرح جایا کرو کہ ہر دیکھنے والا سمجھ جائے کہ جہاں تم جا رہے ہو وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم ایسے معبود کی عبادت کرتے ہو جو یہاں بھی ہے اور

وہاں بھی، ہر حال میں وہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔

آخرت میں مقامِ عیش وراحت

۲۴۰ - اور اس جنت کی طرف جس کی پہنائی آسمان وزمین ہیں۔ چونکہ آدمی کے دماغ میں آسمان وزمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت نہیں آسکتی تھی اس لیے سمجھانے کے لیے جنت کے عرض کو اسی سے تشبیہہ دی گئی گویا بتا دیا کہ جنت کا عرض زیادہ سے زیادہ سمجھو۔ پھر جب عرض یہ ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا کچھ ہوگا[1] مطلب یہ ہے کہ جنت بے انتہا وسیع ہے۔ جنت کی بجنسہٖ پیمائش بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اس کی بے انتہا وسعت اور گنجائش کا اظہار مقصود ہے۔ عربی محاورے میں انتہائے وسعت کے اظہار کا یہی پیرایہ ادا ہے۔
آخرت کے خانہ عیش وراحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور وبے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز وشاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقامِ آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ پوری دُنیا ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنے ہے۔ کیا دُنیا کے سرسبز وشاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ وراغ اور رنگ وگل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے۔ انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز وشاداب قطعات باغ وبہار اور کنارِ آب ونہر کو عیش وراحت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی رُوح وجد کرتی ہے۔
اس استعارے کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے۔ انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل وعیال اور دولت ومال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں۔ مگر جب انسان سیر وتفریح کے لیے باغ وچمن کا رُخ کرتا ہے تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا ہے اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں وفرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے

[1] افادات شیخ الاسلام

دُور ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھیچ جائے۔

جنت اہلِ تقویٰ کا مقام ہے

۲۴۱۔ ایسی جنت جو متقی انسانوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ بات قرآن میں بار بار دُہرائی گئی ہے کہ جنت اہلِ تقویٰ کا مقام ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ ان المتقین فی مقام امین اور کہیں بتایا ان المتقین فی جنات و نعیم۔ کبھی ارشاد ہوا ان المتقین فی جنات و عیون اور کبھی اعلان کیا ان المتقین فی جنات و نھر اور کبھی اظہار کیا ان المتقین فی ظلال و عیون اور کہیں منادی کی گئی ان للمتقین عند ربھم جنات النعیم۔ اور کہیں بشارت سنائی گئی ان للمتقین مفازاً۔ بلاشبہ کامیاب اہلِ تقویٰ ہیں اور ان کو محبوبیت، معیت اور قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ بات کہ اہلِ تقویٰ کون ہیں؟ اس کے لیے آپ کو معالم القرآن کی دوسری جلد میں آیت نمبر ۱۳۲ کا مطالعہ کرنا چاہیے اس میں اہلِ تقویٰ کا پورا چہرہ پیش کیا گیا ہے جس میں عقائد، اعمال، اخلاق کی تقویٰ پر مبنی پوری تصویر کھینچی گئی ہے اور جس کے بارے میں محققین نے لکھا ہے کہ یہ اسلام کے بنیادی مسائل کے موضوع پر اہم ترین آیت ہے۔ یگانے تو یگانے حق پوش بیگانے بھی اس آیتِ قرآنی کی عظمت کا لوہا مان گئے۔

جاں فروشی اور ایثار و قربانی

۲۴۲۔ جو خوش حالی اور تنگ حالی میں خرچ کرتے ہیں۔ یعنی نہ عیش و خوشی میں خدا کو بھولتے ہیں نہ تنگی و تکلیف کے وقت خرچ کرنے سے جان چراتے ہیں۔ ہر موقع پر اور ہر حال میں حسبِ مقدرت خرچ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ سُود خواروں کی طرح بخیل اور پیسہ کے پجاری نہیں گویا جانی جہاد کے ساتھ مالی جہاد بھی کرتے ہیں۔[1]

یہاں سُود کے مقابلے میں انفاق کا ذکر کیا ہے۔ سُود خواری حرص، طمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے۔ حرص و طمع تو یوں کہ سُود خوار اس سُود کے ذریعے چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پاس آجاتے۔ بخل یوں کہ وہ کسی مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارِ خیر میں دے کر اپنے سر لینے میں کمی پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے سُود خوری کا ذکر انفاق فی سبیل اللہ کے مقابلے پر کیا ہے اور ظلم یوں کہ وہ سُود اور سُود در سُود کے ذریعے لوگوں کو ان کی محنتوں سے محروم کرتا ہے اور رحم نہیں کرتا۔ اسی لیے سُود کی ممانعت کے موقعہ پر لا تظلمون ولا تظلمون فرمایا ہے۔ اس کے برعکس انفاق کے معنے اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کرنے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اپنا حق کسی کو معاف کر دینا۔ اپنا بچا ہوا مال کسی کو دے دینا۔ اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی کو دینا۔ دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا۔ اپنی آبرو کو خطرے میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب انفاق کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انفاق کتنے وسیع معنے کو گھیرے ہوئے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیمات کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رُکن نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ زکوٰۃ کی اصلی رُوح بھی انفاق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں انفاق کی حیثیت بالکل بنیادی ہے یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق الٰہی کی بنیاد ہے اسی طرح انفاق بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے۔ جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا۔

ان متقین کا قرآن نے پہلا وصف یہ بیان کیا ہے جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے کہ وہ سراء اور ضراء دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں یعنی خوش حالی اور بدحالی صحت اور مرض، خوشی اور غمی کی حالت میں خرچ کرتے ہیں۔

متقین کی اس صفت کا تعلق سرتاسر حقوق العباد سے ہے جبکہ آنے والی صفت یعنی ذکر اللہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ حقوق العباد سے متعلق صفت کو پہلے لا کر اشارہ فرما دیا کہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے حقوق اللہ مقدم ہیں لیکن حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ایک جوہری فرق ہے۔ اللہ سبحانہ نے جو حقوق اپنے سے متعلق بندوں پر لازم کیے ہیں ان سے اللہ سبحانہ کی کوئی اپنی منفعت وابستہ نہیں ہے اور عدم ادائیگی سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس کی ذات غنی ہے

برخلاف حقوق العباد کے کہ وہ انسانی ضرورت سے متعلق ہیں۔ ان کی عدم ادائیگی سے متعلقہ افراد کا نقصان ہوتا ہے اس لیے زندگی میں حقوق العباد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی اہمیت کی خاطر یہاں حقوق العباد کو پہلے لاتے ہیں۔

انسانی زندگی دو ہی حالتوں سے عبارت ہے خوشی اور غم، خوش حالی اور بدحالی۔ خوش حالی میں انسان پھل کر اتراہٹ اور گھمنڈ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں خدا فراموش ہو جاتا ہے اور جب تنگی اور مصیبت ہو تو مایوسی اور ناشکری کی تصویر بن جاتا ہے۔ قرآن نے یہ دو لفظ بول کر بتا دیا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو ہر حال میں انفاق کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت جس طرح سُود خواری میں سمٹی ہوئی ہے ایسے ہی اس کی سعادت کی ساری کہانی انفاق میں محصور ہے۔ سُود خواری کی لعنت سے بچ کر انفاق کی رُوح جس میں آگئی سمجھو کہ ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔

اخلاقی فضائل کی تعلیم

۲۴۳۔ اور جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اس میں اہلِ تقویٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ غصہ کو پی جاتے ہیں۔ اصل ارشاد میں الفاظ یہ آئے ہیں کہ والکاظمین الغیظ کظم کہتے ہیں غصہ کے ضبط کر جانے کو۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو غصہ سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ اس سے مقابلہ کر کے اسے زیر کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں۔

غیظ و غضب سے بچنا

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی بُرائی ہے۔ بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم و پشیمان ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے لے[1]

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری

حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جاریہ ابن قدامہ، حضرت ابو الدرداء وغیرہ کئی صحابہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی۔ آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ فی الواقع ساری برائیوں کے لیے بس کی گانٹھ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ایک بار آپ نے بعد نماز عصر صحابہ کو نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی۔ فرمایا آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیے گئے ہیں ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آجاتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے۔ تو ہاں ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آتے اور دور جلد ہو جاتے اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو۔ ہاں غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے۔ دیکھتے نہیں اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔

ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وضو کرلے۔

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔[1]

صحیحین میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب کو غصہ آیا کہ چہرہ لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

---

[1] صحیح بخاری۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کے تین علاج بتائے ہیں ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔

" واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ

اگر آپ کو شیطان کی جانب سے چھیڑ محسوس ہو تو فوراً اللہ کی پناہ مانگیے۔

یعنی یہ کہ غصہ چونکہ شیطان کی جانب سے ہے اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے اور دعائی پیمانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعوذ باللہ بتایا ہے۔ اللہ سبحانہ اس کی دعا سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت ہٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دُور ہو جائے گی۔

عفو و درگزر

اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ غصہ کو پی جانا ہی بڑا کمال ہے اس پر مزید یہ کہ لوگوں کی زیادتی یا غلطیوں کو بالکل معاف کر دیتے ہیں[1] انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے لیکن اس ارشادِ ربانی کی روشنی یہ ہے کہ ایمان کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔

زیر تشریح آیت میں اہلِ تقویٰ کے دو وصف ہیں۔ ایک ہر حال میں انفاق یعنی خرچ کرنا دوسرے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا۔ اور ان کے لیے مغفرت اور جنت دو جزائیں رکھی ہیں۔ اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا تو معاوضہ وہ جنت ہے جس کی پہنائی آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنے اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا خدا کی مغفرت ہو گی۔ انفاق یعنی تم نے یہاں سب کچھ دیا ہے جان دی ہے مال دیا ہے وقت دیا ہے غرض سب کچھ دیا ہے اس دین کے مقابلہ میں ہم وہاں جنت دیں گے اور تم نے یہاں غصہ پیا ہے اور عفو و درگزر سے کام لیا ہے اس کے بدلے میں ہم وہاں تمہیں معاف کریں گے اور درگزر سے کام لیں گے۔

عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جزء شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہو جاتے۔ اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو جو ذلت اور پستی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام نے عفو و درگزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی باقی رہتی ہے ارشاد ہے کہ:

> بُرائی کا بدلہ بُرائی ہے۔ اس پر بھی جو معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔

بُرائی کا بدلہ بُرائی جماعت کا قانون ہے اور عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے۔ جماعتی قانون کی قوت ہوتے ہوتے افراد کا آپس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک مثالی بلند اخلاقی ہے۔

احسان اور نیکوکاری

۲۴ ۔ اور اللہ نیکوکار بندوں سے محبت کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف معاف کرتے ہیں بلکہ احسان اور نیکی سے پیش آتے ہیں۔ غالباً پہلے جن لوگوں کی نسبت بددعا کرنے سے روکا تھا۔ یہاں ان کے متعلق غصہ دبانے اور عفو و درگزر سے کام لینے کی ترغیب دی ہے۔ نیز جن بعض صحابہ نے جنگِ اُحد میں حکم عدولی کی تھی یا فرار اختیار کیا تھا۔ ان کی تقصیر معاف کرنے اور شانِ عفو احسان اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے[1] اصل ارشاد میں محسنین کا لفظ آیا ہے۔ عربی میں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔

احسان کے معنے اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے ہیں۔ اُردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب وہ خاص معنے مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں الی باب کے صلے کے ساتھ ہوگا۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں محسن یا محسنون اور محسنین کے الفاظ بلاصلہ آتے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنے لیے جائیں گے۔ اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہے لیکن وہ اسی میں محدود نہیں ہے جیسے

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین اور واللہ یحب المحسنین

بہرحال احسان ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا ایک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

رذائل اخلاق سے بچ کر رہنے کی تعلیم

۱۳۵۔ اور وہ لوگ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان سے کوئی سخت بُرائی کی بات ہو جاتی ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ یعنی کھلم کھلا کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں جس کا اثر دوسروں تک متعدی ہو یا کسی اور بُری حرکت کے مرتکب ہوں جس کا ضرر ان ہی کی ذات تک محدود رہے[1]

فضائل اخلاق بیان فرمانے کے بعد یہاں رذائل کو بیان کیا جا رہا ہے۔ رذائل دو قسم کے ہیں ایک وہ جن سے معاشرہ متاثر ہو۔ دوسرے وہ جس سے صرف کرنے والے کی ذات متاثر ہو۔ اوّل متعدی گناہ اور دوم ذاتی گناہ کہلاتے ہیں۔ متعدی رذائل کے لیے قرآن نے فاحشہ کی تعبیر اختیار کی ہے اور ذاتی گناہ کے لیے ظلم نفس بولا ہے۔ فاحشہ کا لفظ فحش سے بنا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے بُرائی کے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا بُرائی ہے یا یہ کہ جو بُرائی حد سے بڑھ جائے وہ فاحشہ کہلاتی ہے۔ قرآن پاک نے حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے لیے بھی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فاحشہ اور فحشاء کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کی ہیں۔ اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ ظلم کے معنے وضع الشئی فی غیر محلہ کے ہیں یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیے وہاں نہ ہو بے محل ہو تو لغت میں اس حالت کو ظلم کہیں گے۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بات بے محل نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا اپنی جگہ پر نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو ظلم ہے اطاعت کی جگہ عصیان بھی ظلم ہے۔ اسی لیے شارحین قرآن نے ظلمِ نفس کے معنے گناہ کیے ہیں۔

اللہ سے معافی کی طلبگاری

۲۴۶۔ فوراً اللہ کی یاد ان میں جاگ اٹھتی ہے اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ لفظ ذکر کی تعبیر اختیار کر کے اشارا کر دیا ہے کہ ان سے نافرمانیاں پورے قصد و تمرد کے بعد خباثتِ نفس کی بنا پر سرزد نہیں ہوتی ہیں بلکہ وقتی طور پر احکامِ الٰہی کا ذہول ان کے ذہن سے ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گاہ گاہ لغزشوں کا صادر ہوتے رہنا قرب و تعلق مع اللہ کے منافی نہیں ہے اصل اور مقدم چیز ہر غلطی کی اور کوتاہی کی تلافی اور تدارک کی فکر اور مناسب تدبیر ہے۔ صحیح اور معتبر استغفار وہی ہے جو محض زبان سے نہیں دل کی حسرت اور ندامت کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ ہو کہ اب وہ گناہ دوبارہ نہیں ہونے پائے گا ورنہ اگر ہاتھ میں تسبیح چل رہی ہے اور دل بدستور گناہوں سے لذت یاب ہو رہا ہے تو بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ استغفار خود محتاجِ استغفار ہے اور عجب نہیں کہ ایسی استغفار کا شمار استہزاء میں ہو جائے۔[1]

گناہوں کی بخشش کرنا اللہ ہی کا کام ہے

۲۴۷۔ اور اللہ کے سوا کون گناہ معاف کرتا ہے۔ اس فقرے کے ذریعے صرف اتنی ہی

---

[1] تفسیر ماجدی

بات نہیں بتائی جارہی ہے کہ گناہوں کی معافی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ علامہ آلوسی نے محققین کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے کہ یہ فقرہ ہمارے لیے اس کے علاوہ اور بہت سی باتوں کے لیے رہنما اصول بتا رہا ہے۔ یہ باتیں کچھ اللہ کی جانب سے ہیں اور کچھ بندے کی جانب سے، اللہ کی جانب سے ہونے والی باتوں میں جو کچھ اس فقرے کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کو سمجھانا چاہتا ہے یہ ہے کہ،

اولاً لفظ اللہ کا استعمال اور پھر فقرے کی ساخت اخباری نہیں انشائی بنا کر یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ کی ذات وسیع مغفرت والی ہے گویا مخاطبوں سے پوچھا گیا ہے کیا تمہیں ایسی ذات کا علم ہے جو سب گناہوں کو معاف کرنے کی قدرت رکھتی ہے چھوٹے ہوں یا بڑے گزشتہ ہوں یا پیوستہ سوائے اس کے جس کی رحمت کی وسعتوں میں ہر چیز سمٹی ہوئی ہے۔

ثانیاً یہ کہ اس فقرے کو اپنے مقام سے ہٹا کر جملہ معترضہ بنا کر لایا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب بھی استغفار کی جائے گی تو اس کے نتیجہ میں لازماً مغفرت آئے گی۔

ثالثاً یہ کہ ذنب کی جمع ذنوب پر الف لام اس مقصد کی خاطر لگایا ہے کہ گناہ خواہ کتنے ہوں جب بارگاہِ الٰہی میں مغفرت کے لیے دستِ سوال پھیلایا جائے گا سب کے لیے رحمتِ الٰہی کی جانب سے مغفرت کا پروانہ مل جائے گا۔

رابعاً جملہ کو حصر کے انداز میں پیش کرکے خبردار کیا گیا ہے کہ گنہ گاروں کے لیے پناہ اللہ کے کرم و فضل کے سوا کسی کا کوئی رحم و کرم نہیں ہے۔

خامساً گناہوں کی بخشش کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف کرکے بتایا ہے کہ استغفار کے بعد بخشش کا ہونا یقینی ہے۔

یہ باتیں تو اس فقرے میں وہ ہیں جن کا تعلق اللہ سبحانہٗ سے ہے اب وہ بھی سن لیجیے جن کا تعلق خود بندوں سے ہے۔

اولاً رحمت و مغفرت سے جملہ کا آغاز کرکے بندوں کو عظیم بشارت دی ہے۔

ثانیاً بندہ جب اس بے پایاں مہربانی اور توبہ کے لیے اس عظیم اہتمام کو دیکھے گا تو اس میں گناہوں سے مغفرت کے لیے خود بخود ایک قسم کا جوش پیدا ہوگا۔

ثالثاً سارے گناہوں کا ذکر کرکے مغفرت کے بارے میں مایوسیوں کی جڑ اکھاڑ دی اسی لیے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی اسی فقرہ کو علت بنا کر لاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ان اللہ یغفر

الذنوب جمیعاً ۔

رابعاً یہ کہ گناہوں کا بلاقید ذکر فرمایا اس میں فاحشۃ اور ظلمِ نفس کی کوئی قید نہیں لگائی حالانکہ بات کا تقاضا یہی تھا کہ یوں کہا جاتا کہ من یفعل الفاحشۃ او یظلم نفسہ وذکر اللہ فاستغفر فیغفر اللہ یعنی جو شخص بدکاری کرے گا یا اپنے آپ پر ظلم کرے گا اور اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے گا اللہ اسے معاف کرے گا لیکن عبارت میں گناہوں کو بلاقید اس لیے لایا گیا کہ بتا دیا جائے کہ اللہ کی مغفرت عظیم سے عظیم تر ہے خواہ گناہ کتنے ہی ہوں اس کی مغفرت کے ناپیدا کنار سمندر کے سامنے بندوں کے گناہوں کی حیثیت قطرہ کی بھی نہیں۔ مشہور پیمانہ استغفار میں اسی کی طرف اشارہ ہے رب مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجی عندی من عملی

دراصل خدائی صفات کمالیہ کا یہ کمال ہے کہ ہر ایک اپنی جگہ اتنی کامل ہے کہ ایک کا نظارہ دوسرے کے تصور سے غافل بنا دیتا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات کا کمال یہ ہے کہ اس کی ہر شان ہر وقت یکساں اپنی نمود رکھتی ہے وہ عین رحمت کے حال میں غضب اور عین غضب میں رحمت و مغفرت کرتا رہتا ہے۔ ارشاد ہے ۔

نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی ھو العذاب الالیم

غیر محدود مغفرت و رحمت کے تصور سے انسان عاجز ہے ۔ ایک ارشادِ نبوت میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کیے ۔ ننانوے حصے تو اپنے لیے محفوظ رکھے ہیں۔ صرف ایک حصہ زمین والوں کو بخشا ہے یہی ایک حصہ ہے جس سے مخلوق باہم ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتی ہے یہاں تک کہ جانور اپنا پاؤں اپنے بچہ سے ہٹا لیتا ہے اس خوف سے کہ کہیں اس پر پڑ نہ جائے ۔

سمجھانا یہ ہے کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی رحمت اور تنہا خدا کی اس رحمت و مغفرت میں جو یوم حساب میں بندوں کے لیے ظاہر ہوگی کیا تفاوت ہے اسی تفاوت کو ذہن نشین کرنے کے لیے ارشادِ نبوت میں ایک فرضی حساب اور قرآن میں یہ انشائی پیمانہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ فکرِ انسانی کو غیر محدود مغفرت اور لامتناہی رحمت کے اندازہ کرنے کا راستہ مل جائے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ درجاتِ جنت سو ہیں اور جنت میں جانا چونکہ بلا رحمتِ الٰہیہ ہو نہیں سکتا اس لیے ہر درجہ کے مقابلہ میں رحمت کا ایک جز بتا دیا گیا ہے۔

اللھم اجعلنی منھم

گناہوں پر اصرار نہ کرنا

۲۴۸ - اور جو کچھ کر چکے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔ یعنی خدا کی عظمت و جلال اس کے عذاب و ثواب، اس کے حقوق و احکام، اس کی عدالت کی پیشی اور وعدہ و وعید کو دل سے یاد کر کے زبان سے بھی اس کی یاد شروع کر دی۔ خوفزدہ اور مضطرب ہو کر اسے پکارا۔ اس کے سامنے سربسجود ہوتے جیسا کہ صلاۃ التوبہ کی حدیث میں آیا ہے۔ پھر جو شرعی طریقہ گناہوں کے معاف کرانے کا ہے اس کے موافق معافی اور بخشش طلب کی مثلاً اہلِ حقوق کے حقوق ادا کیے یا ان سے معاف کرائے اور اللہ کے سامنے توبہ و استغفار کیا اس کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ یہ لوگ بھی دوسرے درجہ کے متقین ہیں جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے۔ حق تعالیٰ ان تائبین کے گناہ معاف کر کے ان کو اپنی جنت میں جگہ دے گا اور جو توبہ یا اور عمل نیک کیے ہوں گے۔ ان کا بہترین معاوضہ ملے گا[1]

جان بوجھ کر کرنے کی نہیں بلکہ اصرار نہ کرنے کی قید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے یہ مطلب نہیں کہ وہ جان بوجھ کر گناہ کرتے ہیں۔ اور پھر تعبیر کو زیادہ لطیف اور بلیغ بنانے کے لیے یہ بات ذکر نہیں فرمائی کہ کیا جانتے ہوئے وہ اصرار نہیں کرتے یعنی یعلمون کا مفعول ذکر نہیں کیا۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ کو گناہ جانتے ہوتے گناہ پر محض خوفِ خداوندی کی وجہ سے اصرار نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہ کسل مندی یا طبعی کراہت کی بنا پر گناہ نہیں کرتے کیونکہ جزا بنیت طاعت اپنے آپ کو گناہ سے روکنے پر ملتی ہے صرف کسی کام کے نہ کرنے پر جزا نہیں ملتی ہے۔ ہاں نہ کرنا سزا سے ضرور مانع ہو جاتا ہے مفسر ضحاک کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ مغفرت اللہ ہی کی دسترس میں ہے۔ الحسین بن الفضل کہتے ہیں کہ ان کو پتہ ہے کہ ان کو بخشنے والا مولیٰ و مالک ہے۔ ایک حدیث قدسی سے جسے شیخین نے بحوالہ ابی ہریرہ روایت کیا ہے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ ایک بندہ نے گناہ کیا اور کہا کہ اے اللہ میرے گناہ کو معاف کر دے۔ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں میرے بندے نے گناہ کیا اور یہ جانا کہ اس کا کوئی رب بھی ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

گرفت کرتا ہے کچھ مدت بعد پھر وہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے رب میرا گناہ بخش دے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتا ہے میرے بندہ نے گناہ کیا اور یہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو اسے بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد وہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے بخش دے۔ اللہ سبحانہٗ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا مولیٰ مالک ہے جو گناہوں کو بخشتا اور اس پر مواخذہ کرتا ہے تو اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔

یعنی خدا کی رحمت پر اعتماد اور اس کی مغفرت پر پورا یقین رکھنے کی دھن میں اس کی بخشش کا سب سے بڑا سامان ہیں۔ حدیث انا عند ظن عبدی بی کا بھی یہی مفہوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا اپنے بندہ سے معاملہ اس کے اعتماد و وثوق کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اس کو یقین ہے کہ گناہوں پر گرفت یا چشم پوشی کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے اس حسن عقیدت کا خلاف کرنا پسند نہیں کرتا اور اس کے لیے مغفرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ توبہ کرنے والے بندہ مومن کو حب الٰہی کی بشارت دی ہے۔ ارشاد ہے:

اللہ سبحانہٗ اپنے اس مومن بندے سے محبت کرتا ہے جو فتنوں کی آماجگاہ بنے اور ہمیشہ توبہ کرتا رہے (احمد)

جب گناہ بندے کے خمیر میں ہے تو توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیے لہٰذا اگر وہ اپنی فطرت کی بنا پر طرح طرح کے فتنوں میں گرفتار ہوتا ہے مگر ہر بار اپنی صفت توبہ و استغفار کو فراموش نہیں کرتا تو وہ اللہ سبحانہٗ کی نظروں میں کیوں نہ محبوب ہو۔ یہاں محبت اس کے تکرار جرم پر نہیں بلکہ ہر بار اس کی صفت توبہ و استغفار پر ہے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں پر اصرار کریں بلکہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو نادم و شرمسار ہیں وہ دل شکستہ نہ ہوں اور اپنی اس ندامت کی بدولت عصیان کے بعد بھی خدا تعالیٰ کی محبت کی خوشخبری سن لیں۔ ندامت پر محبت کی خوش خبری بندہ میں گناہ کی جرأت پیدا نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی فطرت سے معصیت اور نافرمانی کا تخم جڑ سے نکال دیتی ہے۔

اعمال کی جزا

۲۴۹۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں کہ ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس یہ ہے کہ ان کو معاف

کرے اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان ہی باغوں میں رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔ مطلب یہ ہے کہ ان اوصاف کے رکھنے والوں کو مغفرت سے نوازا جائے گا اور وہ جنت جو متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے اس میں ان کو داخل کیا جائے گا، باغ اور ان کے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اب تک متقیوں کے پانچ اوصاف بیان ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ یہ لوگ خوش حالی اور بدحالی میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں

دوم یہ کہ یہ لوگ اپنے غیظ و غضب اور غصہ پر پورا پورا قابو رکھتے ہیں۔

سوم یہ کہ یہ لوگ لوگوں کو ان کی کوتاہیوں پر معاف کرتے ہیں

چہارم یہ کہ یہ لوگ اپنے تمام کاموں میں حسن کار ہیں

پنجم یہ کہ اگر ان سے کبھی کوتاہی و نافرمانی ہو جاتی ہے تو ان میں توبہ و استغفار کی رُوح بیدار ہو جاتی ہے۔

ان اوصاف کے رکھنے والوں کی طرف اولئک سے اشارہ کیا ہے اور آخر میں نعم اجر العاملین فرما کر اشارہ کر دیا کہ یہ جزا ان کے اعمال کی ہے۔ اس لیے اے اہل ایمان تمہیں ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے میدانِ عمل میں مسارعت کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایمان و عمل ہی ان مراتب تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

آیت قرآنی میں صحابہ کا چہرہ

ایک زمانہ وہ تھا جب ان کے شعراء طنزاً کہتے تھے

اموت ثم بعث ثم نشر   حدیث خرافۃ یا ام عمر

کیا مرنا ہے پھر جینا ہے اور پھر اکٹھا ہونا ہے   اے عمر کی ماں یہ خرافات کی بات ہے۔

لیکن قرآن پاک کی تاثیر اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تربیت سے نہ صرف ان کا انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ چند سال ہی کے بعد یہ طنز انکار رمز یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا کہ ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے اُمید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند جگہ کیا ہے عرض کیا۔ یا رسول جنت ہے آپ فرماتے ہیں انشاء اللہ

دیکھو جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جاتی ہیں۔ ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا۔

جن کو مرکر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا۔ جن کو آخرت کے مواخذے کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی کوئی پروا نہ تھی۔ جو جزا و سزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے جو جنت و دوزخ کے تصور سے ناآشنا تھے وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے۔ دوسری زندگی پر ان کو اس طرح یقین آگیا جس طرح آج کی زندگی پر ہے۔ آخرت کے مواخذے سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے۔ اعمال کی جوابدہی سے ترساں ولرزاں رہنے لگے۔ جزا و سزا کے اندیشے سے وہ اپنے ہر عمل کی بازپرس خود کرنے لگے۔ جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا آخرت کے عقیدے اور جنت کے اشتیاق نے ان میں مسارعت کی ایسی رُوح پھونک دی تھی جو بالکل خارق عادت تھی۔ ان میں جنت کا عجیب و غریب شوق اور زندگی کی تحقیر پیدا کر دی تھی۔ جنت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح تھا جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ اس طرح جنت کی طرف تیز گام تھے جیسے نامہ بر کبوتر اپنی اڑان میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتا اور اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔

معرکۂ اُحد میں جب کہ بہت سے میدان چھوڑ چکے تھے حضرت انس ابن النضر بڑھے۔ انہوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے اے سعد بن معاذ خدا کی قسم جنت کی خوشبو اُحد پہاڑ کے اس طرف سے آرہی ہے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم نے اسی سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے کچھ تلوار کے تھے، کچھ نیزے کے اور کچھ تیروں کے تھے۔ ہم نے اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے ان کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے کسی نے ان کو انگلی کے پورسے شناخت کیا اور کوئی نہ پہچان سکا۔[1]

بدر میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا سارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا السمٰوات والارض بڑھو اس جنت کی طرف جس کی پہنائی آسمان و زمین ہیں تو عمر بن حمام انصاری نے کہا کہ یا رسُول اللہ اس کی پہنائی آسمان و زمین ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، کیا تم کو شک ہے کہنے لگے نہیں یا رسُول اللہ۔ میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا۔ آپ نے فرمایا ہاں پا لوگے۔ وہ چند کھجور کے دانے نکال کر کھانے لگے پھر بولے کہ اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت وقت لگ جائے گا

---

[1] بخاری و مسلم۔

پھر تمام کھجوریں پھینک دیں اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی [1]

یہ اور اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اس آیت گرامی کا کیسے مصداق تھے۔ اسی مسارعت کی تلقین نے ان کو راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے چونکا دیا تھا۔ اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنا دیا تھا تنہائی اور تاریکیوں میں ان کے دل اور بدن کو برائیوں سے بچا لیا تھا ان کے دماغ اور دل کے صفحات ہر وقت اللہ سبحانہٗ کے سامنے کھلے رہتے تھے۔

---

[1] مسلم

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى
وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ
قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ
الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ۝
وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ۝

یقیناً تم سے پہلے دستور و قوانین رہ چکے ہیں لہٰذا دُنیا کی سیر کرو اور
دیکھو جو لوگ احکامِ حق جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ [۲۵۰]
یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور اہلِ تقویٰ کے لیے ہدایت
اور موعظت ہے۔ [۲۵۱] اور نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی سر بلند
ہو بشرطیکہ تم مومن ہو۔ [۲۵۲] اگر تمہیں کوئی زخم پہنچتا ہے تو اسی جیسا

لوگوں کو زخم پہلے پہنچ چکا ہے۔[۲۵۳] اور در اصل یہ ایام ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان اِدھر اُدھر کرتے رہتے ہیں[۲۵۴] (اور دیکھو یہ اس لیے بھی ہوا ہے) تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے شہداء بنا دے اور اللہ ظلم کار لوگوں کو پسند نہیں کرتا[۲۵۵] (اور اس لیے ہوا) کہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو تمام کمزوریوں سے پاک وصاف کر دے اور اس لیے ہوا ہے کہ منکرینِ حق کو ملیا میٹ کر دے۔[۲۵۶]

اجتماعی قوانین دائمی ہیں

اسلام کا اولین مقصدِ حیات یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کُفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزومند اور کشمکش حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں ایمان اس کا تنہا مدِ مقابل ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کُفر کی ضد ہے ایمان اور کُفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلا فصل قائم ہے۔ یہ لڑائی دُنیا کی تمام دوسری لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی لڑائیاں اور نزاعیں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور ملتا ہے کُفر کی طاقتیں اسلام کی ترقی میں مزاحم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی یہ مزاحمت حق وصداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اسے صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے اسی طرح اسلام بھی کُفر سے نبرد آزما ہو کر اپنے قویٰ کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا

چاہتا ہے لیکن ایمان وکفر کی اس کشمکش میں کامیابی اور فتح مندی کے کچھ قوانین وضوابط ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے جیسے آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت اور دودھ سے طاقت آتی ہے ٹھیک اسی طرح اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے بھی کچھ معنوی قوانین ہیں۔ ان کو قرآن سنن کہہ کر پکارتا ہے یعنی قوموں کے عروج وزوال کے قوانین وضوابط، قرآن یہاں اسی کی طرف صراحتہً متوجہ کر رہا ہے اور بقول مفتی عبدہ مصری یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہم نے قرآن کے بیان کردہ ان اجتماعی قوانین کو ایک فن اور علم بنا کر دوسرے علوم کی طرح مدون نہیں کیا جیسے علم کلام علم اصول اور علم الفقہ، لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ زمانہ کے اثرات اور مسلمانوں کی بے توجہی سے یہ حصہ عام احساس کے دائرے سے دور اور اہل فکر کی نظروں سے اوجھل رہا ہے ورنہ نظری حیثیت سے یہ پہلو موجود ضرور ہے اور شاید حالات، تقاضے اور ضروریات اس کو فن بنا کر پیش کر دیں۔

بہر حال یہ آیات سنن اجتماعیہ کے موضوع پر ہیں۔

قیامِ حق میں سننِ الٰہیہ

۲۵۰۔ یقیناً تم سے پہلے دستور و قوانین ہو چکے ہیں لہٰذا دنیا کی سیر کرو اور دیکھو جو لوگ احکام جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا۔ یعنی تم سے پہلے بہت قومیں اور ملتیں گزر چکی ہیں۔ بڑے بڑے واقعات پیش آ چکے۔ خدا تعالیٰ کی عادت بھی بار بار معلوم کرا دی گئی کہ ان میں سے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی عداوت اور حق کی تکذیب پر کمر باندھی اور خدا و رسول کی تصدیق و طاعت سے منہ پھیر کر حرام خوری اور ظلم وعصیان پر اصرار کرتے رہے ان کا کیسا بُرا انجام ہوا یقین نہ ہو تو زمین میں چل پھر کر ان کی تباہی کے آثار دیکھ لو جو آج بھی تمہارے ملک کے قریب ہیں۔ ان واقعات پر غور کرنے سے معرکہ اُحد کے دونوں فریقوں کو سبق لینا چاہیے یعنی مشرکین جو پیغمبر خدا کی عداوت میں حق کو کچلنے کے لیے نکلے اپنی تھوڑی سی عارضی کامیابی پر مغرور نہ ہوں کہ ان کا آخری انجام بجز ہلاکت و بربادی کے کچھ نہیں اور مسلمان کفار کی سختیوں اور وحشیانہ دراز دستیوں یا اپنی ہنگامی حالت سے ملول و مایوس نہ ہوں کہ آخر حق غالب ہو کر رہے گا۔ قدیم سے سنۃ اللہ یہی ہے جو ٹل نہیں سکتی[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں لفظ سنن آیا ہے یہ سنت کی جمع ہے اور سنت طریقہ کو کہتے ہیں۔ لیکن ہر طریقہ کو نہیں بلکہ وہ طریقہ جو چل چل کر خوب روند دیا گیا ہے یا وہ سیرت جس کی پیروی کی جارہی ہو یا وہ مثال جس کی کاپی کی جارہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں انسانی زندگی کا رشتہ قوانین و ضوابط سے وابستہ ہے نہ یہ اٹکل اور تخمین ہے اور نہ جبر و استبداد ہے۔

سنن الٰہیہ کا قرآن کے دوسرے مواقع پر بھی ذکر آیا ہے۔ بدر کے واقعہ میں ہے فقد مضت سنۃ الاولین اُمتوں کے احوال کے ذکر میں ہے و قد خلت سنۃ الاولین اور یہ بھی قرآن ہی نے بتایا ہے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ احزاب اور سورۃ فتح میں ہے۔

قرآن میں سنت کا مفہوم

قرآن میں "سنت" کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن میں آیا ہے۔

خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ سبحانہ خیر کو شر پر حق کو باطل پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند و موعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے اور بالآخر وہ بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلے کی تھرتھراہٹ آندھی کی گڑگڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے اسی مفہوم میں آیا ہے۔ ان آیاتِ قرآنی کو پڑھیے

قریش حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالنے کی تیاری کرتے ہیں اور دعوتِ نبوت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا

ہم تم سے پہلے پیغمبر روانہ کر چکے ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا ایسا ہی قاعدہ رہا ہے اور ہمارے قاعدوں کو کبھی تبدیل نہ دیکھو گے۔

مدینے کے منافقین اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ جہاں پائے جائیں

پکڑ لیے جائیں اور ان کو قتل کر دیا جاتے ارشاد ہے:

سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا

یہ اللہ کا قاعدہ ہے ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے اور اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پائے گا۔

حدیبیہ کے موقعہ پر کفار قریش کو تنبیہہ اور اہل ایمان کو تسکین دی جاتی ہے کہ اگر یہ کافر تم سے لڑتے تو پیٹھ پھیر دیتے پھر ان کو کوئی مددگار نہ ملتا۔ ارشاد ہے،

سنة الله التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا

اللہ کا یہ دستور پہلے سے چلا آتا ہے اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے

بہرحال سنن سے وہ ضابطے اور قاعدے مراد ہیں جن کے تحت اللہ سبحانہ' قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے روانہ کردہ رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو آبرومند کرتا ہے۔

برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام و قوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے لیکن مکذبین کی اس تباہی اور مومنین کی فتح مندی کے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں۔ یعنی جب حق و باطل میں کشمکش ہوتی ہے تو اہل حق کو غلبہ اس وقت ہوتا ہے جب ان میں حق کی بھرپور لگن ہونے کے ساتھ حق کے ساتھ علم و عمل میں پوری وابستگی ہو۔ اہل باطل کی ان کے اعمال میں کاپی نہ ہو اور اہل باطل سے ان کے روابط اور علائق نہ ہوں اور بالآخر میدان مقابلہ میں ان میں صبر و تقویٰ کی روح کار فرما ہو۔

زمین میں چلو اور دیکھو قوموں پر کیا بیتی ہے تاکہ تمہیں علی وجہ البصیرت پتہ لگ جائے کہ کامیابی اور ناکامی کے ضوابط کیا ہیں۔ گویا بتا دیا گیا کہ جو کچھ تمہیں پیش آ رہا ہے تو صرف تمہارے ہی لیے نہیں ہوا ہے بلکہ ہمیشہ قانون الٰہی کی ایسی ہی کارفرمائیاں رہ چکی ہیں جو جماعت احکام حق پر عمل کرتی ہے کامیاب ہوتی ہے جو اعراض کرتی ہے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ دُنیا میں نکلو اس کے ہر گوشے میں تم دیکھو گے کہ برباد شدہ قوموں کے آثار، اجڑی ہوئی آبادی کے کھنڈرات، سربفلک محلوں کی گری ہوئی دیواریں زبان حال سے اپنا افسانہ عبرت سنا رہی ہیں [1]

---

[1] ترجمان القرآن

قوانینِ اجتماع اہلِ ایمان کے لیے ہدایت ہیں

۲۵۱ - یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور اہلِ تقویٰ کے لیے ہدایت و موعظت ہے یعنی عام لوگوں کے کان کھول کر سننے کے لیے قرآن میں یہ مضامین بیان کیے جا رہے ہیں جن کو سن کر خدا سے ڈرنے والے ہدایت و نصیحت حاصل کرتے ہیں باقی جس کے دل میں خوفِ خدا نہ ہو وہ ناصحانہ تنبیہات سے کیا منتفع ہو سکتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ یہ فتح و شکست کے قوانین ہیں تو سب کے لیے لیکن متقین کے لیے یہ رہنمائی کا کام دینے والے اور نصیحت کا پیغام ہیں۔ یعنی نتائج کا اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ظہور سب کے لیے حجت ہے۔ گویا اس میں مشرکین اور منافقین پر ایک طنز ہے جو یہ کہتے تھے کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہوتے تو اُحد میں آپ کو تکلیف نہ ہوتی۔ دندان مبارک شہید نہ ہوتا۔ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں۔ خواہ کوئی ہو۔ جب بھی فوج اپنے قائد کی اطاعت نہیں کرے گی۔ اس کے نتائج لازماً یہی پیدا ہوں گے جو اُحد میں رونما ہوئے قتل، باہمی تنازع، اختلاف اور انتشار کا ہر جگہ حکم یہی ہے۔ اس لحاظ سے جو بات قد خلت من قبلکم سنن میں کہی گئی ہے۔ پوری انسانیت کے لیے بیان ہے لیکن اہلِ تقویٰ کے لیے بھی قوانینِ زندگی میں خصوصاً رہنما اصول ہیں اور جن احوال و ظروف کے تحت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے یہ قواعد آئے ہیں وہ سراپا موعظت و نصیحت ہیں۔

برتری اور غلبہ اہلِ ایمان کے لیے ہے

۲۵۲ - اور نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی سربلند ہو بشرطیکہ مومن ہو۔ یہ آیات جنگِ اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ جب مسلمان مجاہدین زخموں سے چُور چُور ہو رہے تھے ان کے بڑے بڑے بہادروں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے مثلہ کی ہوئی پڑی تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اشقیا نے مجروح کر دیا تھا اور بظاہر کامل ہزیمت کا سامان نظر آ رہا تھا۔ اس ہجومِ شدائد میں خداوند قدوس کی آواز سنائی دی۔ دیکھو! سختیوں سے گھبرا کر دشمنانِ خدا کے مقابلہ میں نامردی اور سستی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نہ آنے پاتے۔ پیش آمدہ حوادث پر غمگین ہو کر بیٹھ رہنا ایمان کا شیوہ نہیں ہے۔ یاد رکھو آج بھی تم ہی معزز اور سربلند ہو کر حق کی حمایت میں تکلیفیں اٹھائے ہو اور جا نیں دے رہے ہو اور یقیناً آخری فتح بھی تمہاری ہے۔ انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے بشرطیکہ ایمان و ایقان کے راستے پر مستقیم رہو اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر کامل وثوق رکھتے ہوتے اطاعتِ رسُول اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔ اس خدائی آرزو نے ٹوٹے ہوتے دلوں کو جوڑ دیا اور پژمردہ جسموں میں حیات تازہ پھونک دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفار جو بظاہر غالب آرہے تھے زخم خوردہ مجاہدین کے جوابی حملہ کی تاب نہ لا سکے اور سر پاؤں پر رکھ کر میدان سے بھاگ گئے[1]

اصل ارشاد میں لا تھنوا آیا ہے یہ وہن سے بنا ہے۔ عمل، ارادے، کردار اور رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور حزن کسی محبوب اور پسندیدہ کے گم ہونے پر قلق اور ارمان کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جنگ اور اس کے لوازم میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو اور جس افتاد کا تم شکار ہو چکے ہو اس پر رنجیدہ نہ ہو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گے جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں صحابہ نے پوچھا کہ یارسُول اللہ کیا یہ اس لیے ہو گا کہ ہماری تعداد کم ہو گی فرمایا نہیں بلکہ تمہاری تعداد بہت زیادہ ہو گی لیکن تم سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہو جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یارسُول اللہ اس کا سبب کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا تمہارے اندر وہن پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یارسُول اللہ وہن کیا ہے؟ فرمایا حب الدنیا وکراھیۃ الموت دنیا کی محبت اور موت کی ناگواری۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادے کی وہ پستی جو دُنیا اور دُنیا کی زندگی کی محبت اور موت کی ناگواری سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو راہِ حق میں جہاد سے روکتی ہے وہ "وہن" ہے۔ یہ حدیث اس لفظ کی بہترین تشریح ہے یہاں بھی لا تھنوا سے یہی مراد ہے کہ احد میں جو تمہیں افتاد پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوفزدہ ہو کر ہمت نہ ہارو گویا پوری بات یوں ہے لا تھنوا فیما اصابکم و لا تحزنوا علی ما فاتکم نہ اس شکست کی وجہ سے ہمت ہارو اور نہ اس نقصان کا

[1] افادات شیخ الاسلام

کوئی غم کرو۔[1]

صحابہ کا مقام رفیع

اگرچہ شارحین قرآن نے اس آیت پر بہت کچھ لکھا ہے مگر ہمیں زیادہ پسند یہ ہے کہ انتم الاعلون کا فقرہ جملہ معترضہ ہے اور آئندہ کے لیے بشارت کی خاطر لایا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو پھر یہ کمزوری کیوں؟ اور ماضی پر افسوس و ملال کیوں؟ جو کچھ ہو چکا ہو چکا آئندہ تم ہی سربلند رہو گے۔ علامہ قرطبی نے یہ بات بہت اونچی لکھی ہے کہ اسی بشارت کے نتیجے میں اُحد کے بعد حضور کے زمانے میں اور حضور کے بعد ہر اس مہم میں جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابی بھی شریک ہوا ہے کبھی ناکامی اور شکست نہیں ہوئی ہے۔

اس فقرے میں ہم صحابہ کرام کا چہرہ بھی دیکھ سکتے ہیں جو بات اللہ سبحانہ نے فرعون کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ سے کہی تھی، انك انت الاعلیٰ وہی بات اللہ سبحانہ نے کفر کے مقابلہ میں صحابہ سے فرمائی ہے (انتم الاعلون)

امر واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کا یہ یقین کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا ہے۔ ان کے دلوں کا اطمینان اور خود اعتمادی انتم الاعلون کا نتیجہ تھی۔ جنگ یرموک میں جب امراء نے حضرت ابو بکر و عمر کو اپنی مشکلات کا حال لکھا۔ رومیوں کی کثرت تعداد اور ان کی جنگی تیاری کی اطلاع دی تو انہوں نے لکھا۔

> تم سب مجتمع رہو اور ایک فوج بن کر مشرکین کا مقابلہ کرو تم اللہ کے مددگار رہو۔ اللہ اپنے مددگاروں کی مدد کرتا ہے تم کو قلت سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر نقصان پہنچ سکتا ہے تو اپنے گناہوں سے پس ان سے بچتے رہو۔[2]

اسی طرح جب حضرت عمر نے نہاوند کے معرکہ میں عراق جانے کا ارادہ کیا اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو حضرت علی نے کہا۔

> اے امیر المومنین! اس معاملہ میں کامیابی اور ناکامی کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے دین کو غالب بنایا ہے۔ اپنی فوج کو عزت دی اور ملائکہ

---

[1] تدبر قرآن [2] البدایہ والنہایہ۔

کے ذریعے اس کی مدد کی یہاں تک کہ اسلام کو یہ قوت حاصل ہوئی۔ ہمیں خدا کے وعدے پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ اپنے وعدہ کو ضرور پورا کرے گا اور اپنی فوج کی مدد کرے گا[1]

اسی انتم الاعلون کی بشارت کی بدولت مسلمانوں میں عجیب قسم کی بے خوفی پیدا ہو گئی تھی وہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے تھے اور ایسے ایسے کام کر گزرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں یہ واقعہ بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے گھوڑے دریائے دجلہ میں ڈال دیے اور اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے چلتے رہے گویا وہ دریا میں نہیں خشکی پر چل رہے ہیں۔

اس عقیدے نے مسلمانوں میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی کیسے ہی ناخوشگوار اور ناموافق حالات پیش آتے ان کے عزم و ارادے میں کوئی ضعف نہ آتا۔ ان کے سکون و اطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ تعداد اور ساز و سامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے تھے۔ مادہ اور اسباب کی پرستش سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ ہمیں اللہ نے برتر ہونے کی بشارت دی ہے۔ اسی کی قوت سے ہم لڑتے اور اسی کی برکت سے ہم فتح پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس جذبہ کا بڑا احترام تھا اور اسی کو اپنی عزیز ترین متاع اور اصل قوت یقین کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ ہمیں جو کچھ عزت حاصل ہوئی ہے وہ انتم الاعلون کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے چنانچہ جب کوئی فتح ہوتی تو وہ کہتے کہ یہ وہ ہے جس کا ہم سے اللہ نے وعدہ کیا تھا اور ان کے ایمان و طاعت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

جنگ یرموک کے دن ابو عبیدہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں شہادت کے لیے بالکل تیار ہوں اور ان شاء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچوں گا۔ آپ کوئی پیغام دینا چاہیں تو دے دیجئے۔ انہوں نے فرمایا ہاں آپ کو میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ یا رسول اللہ ہم نے اپنے خدا کا وعدہ سچا پایا[2]

اُحد میں افتاد اور صحابہ کو تسلی

۲۵۳۔ اگر تمہیں کوئی زخم پہنچا ہے تو اسی جیسا زخم اس سے پہلے لوگوں کو پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کو جو جنگ میں شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا اس سے سخت شکستہ خاطر تھے۔ مزید براں منافقوں اور دشمنوں کے طعنے سن کر اور زیادہ اذیت پہنچتی تھی کیونکہ منافقین کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1][2] البدایہ والنہایہ

سچے نبی ہوتے تو یہ نقصانات کیوں پہنچتے۔ یا تھوڑی دیر کے لیے بھی یہ عارضی ہزیمت کیوں پیش آئی۔
حق تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا یا تکلیف اٹھانی پڑی تو اس طرح کے حوادث فریق مقابل کو پیش آچکے ہیں۔ اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے تو ایک سال پہلے بدر میں ان کے ستر آدمی جہنم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں اور خود اس لڑائی میں بھی ابتدا میں ان کے بہت آدمی مارے گئے جیسا کہ ولقد صدقکم اللہ وعدہ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ پھر بدر میں ان کے ستر آدمی ذلت کے ساتھ قید ہوئے۔ تمہارے ایک فرد نے بھی یہ ذلت قبول نہ کی بہر حال اپنے نقصان کا ان کے نقصان سے مقابلہ کرو تو غم و افسوس کا کوئی موقعہ نہیں ہے نہ ان کے لیے کبر و غرور سے سر اٹھانے کی جگہ ہے۔[1]
اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف مطلب یہ ہے کہ جب اس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمت نہیں ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمت ہارتے ہو۔[2]
دراصل سمجھانی یہ بات ہے کہ مقاصد کی راہ میں تکلیفیں اور محنتیں مومن کو بھی پیش آتی ہیں اور کافر کو بھی۔ لیکن مومن کے لیے ان کا جھیلنا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے سامنے ایسی اُمیدیں رکھتا ہے جو کافر کو میسر نہیں وہ یقین رکھتا ہے کہ میں جو کچھ جھیل رہا ہوں حق کی راہ میں ہے۔ اور میرے لیے دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آخرت میں بھی۔
قرح دونوں طرح آیا ہے قاف کے زبر کے ساتھ بھی اور پیش کے ساتھ بھی، دونوں کے معنے جراحت اور زخم کے ہیں۔ چونکہ غزوۂ اُحد میں مسلمان شہید بھی ہوئے اور زخمی بھی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم سے مسلمانوں کو صدمہ بھی ہوا اور بظاہر ہزیمت بھی ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں آئندہ کو ہمت ہارنے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس پر غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر ان کے ہتھیاروں نے روز اُحد تمہارے اندر جولانیاں دکھائی ہیں تو اس جیسی جولانی بدر کے دن تمہارے ہتھیار بھی دکھا چکے ہیں اس سے عبرت پکڑنی چاہیے اور آئندہ کے لیے اپنے اعمال کی نگہداشت کرنی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ اس کی کوفت میں ایسے کھوئے جاؤ کہ آئندہ کے لیے ہمت ہار بیٹھو۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔ [2] تفہیم القرآن۔

ایک اجتماعی قانون

۲۵۴۔ اور دراصل یہ ایام ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ یعنی ہماری ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ سختی، نرمی، دکھ سکھ، تکلیف و راحت کے دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں جس میں بہت سی حکمتیں مضمر ہیں۔ پھر جب وہ دکھ اٹھا کر باطل کی حمایت میں ہمت نہیں ہارتے تو تم حق کی حمایت میں کیوں کر ہمت ہار سکتے ہو۔[1]

یہ بھی آیت نمبر ۱۳۰ کی طرح ایک اہم اجتماعی قانون کی نشاندہی کر رہی ہے یعنی یہ بھی اللہ سبحانہ کا ضابطہ ہے کہ کبھی کسی کو فاتح اور کسی کو مفتوح بناتے ہیں۔ اس عالم تکوین میں کسی کے ساتھ نمایاں اور خصوصی معاملہ نہیں ہے۔ یہاں انسان اپنے اعمال کے نتائج سے بندھا ہوا ہے اور جو برائی بھی اسے پیش آتی ہے خود اسی کے اعمال کی پیداوار ہے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ مومن ہوں یا کافر دونوں کے سامنے یکساں طریقہ پر دنیوی نتائج کا دروازہ کھول دیا ہے۔ گزشتہ سال تم کو غلبہ ہوا تھا اب کے سال تمہارے مخالف غالب آگئے۔ یہ تو ہمارا طریقہ ہے۔ یہ دستور نہ صرف قوموں اور جماعتوں میں رائج ہے بلکہ افراد میں بھی پایا جاتا ہے۔ کبھی کوئی سربلند ہوتا ہے کبھی کوئی کبھی کوئی خاندان آبرومند ہوتا ہے اور کبھی کوئی۔ کبھی کوئی قوم برسراقتدار ہوتی ہے اور کبھی کوئی۔ یاد رہے آیت میں الناس کا لفظ جماعت قوم یا گروہ کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ افراد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ حق و باطل کی کشمکش میں اس عالم دنیا میں اعمال و اسباب کے مطابق نتائج پیدا کرتا ہے اور شکست و فتح کے اسباب عام انسانوں میں یکساں رکھتا ہے۔ ہرقل بادشاہ روم نے جب ابوسفیان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق طویل سوالات کیے تو ان میں ایک سوال آپ کی فتح و شکست کے متعلق بھی تھا۔ پھر جب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کو شکست بھی ہوتی ہے تو وہ بے ساختہ بول پڑا کہ رسولوں کی شان یہی ہے وہ شکست بھی کھاتے ہیں مگر آخر کار بول بالا انہی کا ہوتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر احد کے میدان میں اللہ کی یہ سنت بھی پوری ہو گئی اور اس دردانگیز منظر کے ساتھ پوری ہوئی کہ روئے انور زخمی ہے۔ دندان مبارک شہید ہے اور سر مبارک کا خود چکنا چور ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا اب بھی اس شبہ کا کوئی موقعہ ہے۔ کہ رسول بشر نہیں ہوتے۔ اللہ کی فتح و شکست میں جو سنت نہیں جانتے ان کو اگر تردد ہو تو ہو مگر اس سے جو واقف تھے ان میں بادشاہ ہرقل جیسے دانا نے تو آپ کی شکست ہی کو صداقت کی علامات میں شمار کر لیا۔[1]

اللہ کا قانون آزمائش

۲۵۵ - (اور دیکھو یہ اس لیے ہوا ہے) تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے شہداء بنا دے اور اللہ ظلم کار لوگوں کو پسند نہیں کرتا یعنی سچے ایمان والوں کو منافقوں سے الگ کر کے دونوں کا رنگ صاف صاف اور جدا جدا نظر آنے لگے۔ اور ظالمین سے مراد اگر مشرکین ہیں جو اُحد میں فریق مقابل تھے تو یہ مطلب ہے کہ ان کی عارضی کامیابی کا سبب یہ نہیں کہ خدا ان سے محبت کرتا ہے بلکہ دوسرے اسباب ہیں اور منافقین مراد ہوں جو عین موقعہ پر مسلمانوں سے الگ ہو گئے تو بتلا دیا کہ وہ خدا کے نزدیک مبغوض تھے اس لیے ایمان و شہادت کے مقام سے انہیں دُور پھینک دیا۔[2]

اس فقرے کا واو عطف کے ذریعے آغاز بتا رہا ہے کہ یہاں معطوف محذوف ہے اسے ہم نے ترجمہ میں ظاہر کر دیا ہے۔ شارحین قرآن نے یہاں معطوف علیہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق مقرر کیا ہے۔ کسی نے بتایا ہے کہ ہم نے یہ کام اس لیے کیا ہے تاکہ زمانے کے ادلنے بدلنے کی ہماری سنت کو نفاذ کا موقعہ مل جاتے اور معلوم ہو جاتے کہ مومن کون ہے اور منافق کون۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ اصل میں بات یوں تھی کہ ہم زمانے کو انسانوں میں بہت حکمتوں اور مصلحتوں کی خاطر ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور اس لیے کہ پتہ لگ جاتے کہ اہل ایمان خود جادۂ ایمان پر دوسروں کے مقابلہ میں کیسے ممتاز ہیں۔ ہمارے خیال میں "قانون اجتماعی بیان کرنے کے بعد اس آیت میں قانون ابتلا بیان کیا جا رہا ہے۔ اور یہ اس کی تمہید ہے۔ اصل عبارت یوں تھی کہ اللہ نے اُحد میں یہ حالات اس لیے رونما کیے ہیں تاکہ اللہ تم کو آزمائے اور تاکہ جان لے کہ ایمان والے کون ہیں اور تاکہ تم میں سے شہداء بنا دے۔ ظاہر بات ہے کہ ادعائے ایمان کی اگر صداقت معلوم کی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقے سے اور وہ ہے ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا

[1] ترجمان السنۃ [2] افادات شیخ الاسلام

جائزہ۔ کسی چھپی ہوئی اور ان دیکھی حقیقت کا وجود اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب اس کے لوازم کا مشاہدہ ہو جاتے۔ یہی لوازم اور مقتضیات وہ معیار ہیں جن پر کسی شے کے واقعی وجود کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے اور پھر اس کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

یوں تو دنیا کا کوئی مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعوے سے پورا ہو جاتے مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ ہی نظیر ہو اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر ایمان، اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اس کی اقامت کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی مقصد لے کر اٹھیں راہ میں کہیں نہ کہیں روکاوٹیں ضرور پیش آئیں گی لیکن یہ مقصود گراں تو ایسا ہے جس کی راہ میں دور دور تک پہاڑی چٹانوں، گہرے غاروں، سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

یعنی بات صرف اتنی نہیں ہے کہ اس عالم کے دستور کے مطابق جس طرح اور مقاصد کا حصول کم و بیش کچھ نہ کچھ قربانیوں پر موقوف ہے اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہاں عام دستور سے بھی زیادہ کہیں زیادہ مشکلیں برداشت کرنی ہوتی ہیں۔ تحویل قبلہ کے موقع پر بھی ایسی ہی تعبیر آئی تھی لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی سچی پیروی کرتا ہے اور کون ادعائے پیروی میں خام کار ہے۔ گویا صداقت ایمانی کی جانچ اللہ سبحانہ کی نگاہوں میں اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے لیے اصل قبلہ کے اعلان کو بھی ایک عرصہ تک ملتوی رکھا۔ مطلب یہ ہے کہ احد میں یہ حالات اس لیے رونما ہوئے ہیں تاکہ تمہارا ایمان و اخلاص کھل کر سامنے آجاتے اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اللہ تم میں سے شہداء بناتے۔ اصل الفاظ ہیں ویتخذ منکم شھداء اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزت بخشنا چاہتا تھا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اور منافقین کے مخلوط گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو فی الواقع شہداء علی الناس ہیں۔ یعنی اس منصب جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے امت مسلمہ کو سرفراز کیا ہے[1] قرآن کا سیاق تو بادی النظر میں اسی کو چاہتا ہے کہ پہلے معنے مراد ہوں۔ لیکن اصل موضوع کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرے معنے مراد ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی بنیاد پر

---

[1] تفہیم القرآن

اہلِ ایمان کو اُمت وسط، خیر اُمت بنایا گیا ہے اور جس مخصوص ذمہ داری کی خاطر اہلِ ایمان مجتبیٰ اور مصطفیٰ بنائے گئے ہیں۔ احد کی گرمی کے ذریعے اللہ سبحانہٗ اس مقصد عظیم کے لیے اہلِ ایمان کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس بھٹی سے نکلنے کے بعد اہلِ ایمان شہادت علی الناس کی ذمہ داری پوری کر سکیں گے اور آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ ظلم کار لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ ایک شبہ کو دور کرنے کے لیے جملہ معترضہ لائے ہیں کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ ظالموں کے ساتھ ہماری کوئی ہمدردی ہے یا ہم کافروں اور مشرکوں کو پسند کرتے ہیں، ہماری پسندیدہ چیز تو ایمان وطاعت اور صبر و استقلال ہے۔ یہ باتیں جس میں ہوں گی وہ ہمارا محبوب ہے۔ کافرو مشرک میں یہ باتیں کہاں ہیں جو وہ ہمارے محبوب اور پسندیدہ ہوں گے اور نہ یہ فتح و شکست پر موقوف ہے کہ کوئی یہ سمجھ لے کہ جس کی فتح ہوتی وہی خدا کا دوست ہے اور جس کی شکست ہوئی وہ خدا مبغوض ہے۔ فتح و شکست تو جنگ کے لازمی نتائج ہیں ان سے محبت نہیں جانچی جاتی ہے۔

ایمان کا نکھار اور کفر کا خاتمہ

۲۵۶۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جو ایمان والے ہیں اللہ ان کو تمام کمزوریوں سے پاک و صاف کر دے اور اس لیے ہوا کہ اللہ منکرین حق کو ملیا میٹ کر دے یعنی فتح و شکست تو بدلتی چیز ہے مسلمانوں کو مقام شہادت عطا کرنا تھا۔ مومن و منافق کا پرکھنا، مسلمانوں کو سدھارنا یا گناہوں سے پاک کرنا اور کافروں کو آہستہ آہستہ مٹا دینا منظور تھا کہ جب وہ اپنے عارضی غلبہ اور وقتی کامیابی پر مسرور و مغرور ہو کر کفر و طغیان میں بیش از بیش غلو کریں گے۔ خدا کے قہر و غضب کے اور زیادہ مستحق ہوں گے۔ اس واسطے یہ عارضی ہزیمت مسلمانوں کی ہوئی ورنہ اللہ کافروں سے راضی نہیں ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے اعمال و اخلاق کو نکھار دیں اور ان سے میل و کچیل کو صاف کر دیں۔ تمحیص کے معنے ہیں نکھارنا۔ جس طرح سونے چاندی کو گلا کر ان کا میل کچیل صاف کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا مقصد یہ تھا کہ تم کو مصائب و شدائد میں مبتلا کر کے ہر قسم کے میل و کچیل سے صاف کر دیں اور تمہارے اخلاق و اعمال کو نکھار دیں۔ اور آخری بات یہ فرمائی کہ اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طرح ہم کافروں کو آہستہ آہستہ مٹا دیں ۔ محق کے معنے تھوڑا تھوڑا کسی چیز کو کم کر دینا جس طرح چاند کا نور آہستہ آہستہ روز بروز کم ہوتا رہتا ہے اور آخر ایک دن سب نور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ہماری حکمت یہ ہے کہ آہستہ آہستہ کر کے کافروں کی قوت ختم کر دیں۔ اگر ہر سال تمہارا ہی غلبہ رہے تو کفر مقابلے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اور اگر کبھی تم بھی مغلوب ہو جاؤ گے تو پھر ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور وہ تم سے لڑنے کو آئیں گے اور اس طرح ہم ان کا آہستہ آہستہ زور توڑ دیں گے ۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

> یعنی فتح و شکست بدلتی چیز ہے اور مسلمانوں کو شہادت کا درجہ ملنا تھا اور مومن و منافق کا پرکھنا منظور تھا اور مسلمانوں کو سدھارنا اس واسطے اتنی شکست ہوئی ورنہ اللہ تو کافروں سے راضی نہیں ہے ۔

سبحان اللہ حضرت شاہ صاحب نے کس قدر مختصر اور جامع خلاصہ بیان کیا ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا کمال ہے کہ یعلم کا ترجمہ پرکھنا اور یمحص کا ترجمہ سدھارنا کیا ہے ۔ بھلا اس اردو کا جواب کیا ہو سکتا ہے ۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا
مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ
مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ع ۱۳

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممتاز نہیں کیا جو جہاد کرنے والے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کو نمایاں کیا ہے جو صبر کرنے والے ہیں[۲۵۷]۔ اور بلاشبہ تم تو موت کی ملاقات سے پہلے ہی راہ حق میں مرنے کی تمنائیں کرتے تھے۔ بلاشبہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی اور تم دیکھ رہے تھے[۲۵۸]۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان

زمانۂ نبوت میں جن لوگوں نے ایمان قبول کیا تھا اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں وہ ایک جاندار، انقلاب انگیز اور متحرک نظامِ فکر و عمل تھا جس کا خمیر جہاد و صبر کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں افراد

کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ عالم انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص و اتقاء کا پیمانہ تھا۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز فکر کی تبلیغ ان کی زندگی کا اتنا عظیم سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری ریاضتیں اور محنتیں ان کی نگاہ میں بیکار ہو جاتیں۔

ذرا غور فرمایئے یہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جا رہی ہے ان سے جن کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص وللہیت سے معمور تھیں۔ جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علوِ مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے اس کے باوجود ان سے کہا جا رہا ہے ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ کہ جنت میں داخلے کے لیے صرف ایمان کا دعویٰ نہیں بلکہ اس کے لوازم جہاد اور صبر کا ہونا ضروری ہے آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا دعویٰ ایمان، اسلامی نام، نبی کا اُمتی ہونا اور مسلمان ہونا اخروی نجات و فلاح کے لیے کافی ہے انہیں غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام سے قرآن داخلہ جنت کے لیے جہاد کا مطالبہ کر رہا ہے تو ہم لوگ کس شمار و قطار میں ہیں جب کہ ہم خدا کے دین کو بلند کرنے اور اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اس تمنا اور آرزو سے خالی ہو چکے ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانون سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو قرآن کے اس سوال کا جواب سوچو۔

۲۵۷۔ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تم میں سے ان لوگوں کو ممتاز نہیں کیا جو جہاد کرنے والے ہیں اور نہ ان لوگوں کو نمایاں کیا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ یعنی جنت کے جن اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر خدا تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یوں ہی آرام سے تم پہنچ جاؤ گے۔ اور خدا تمہارا امتحان نے کر یہ نہ دیکھے گا کہ تم میں کتنے خدا کی راہ میں لڑنے والے اور کتنے لڑائی کے وقت میں ثابت قدم رہنے والے ہیں ایسا خیال نہ کرنا مقامات عالیہ پر وہی لوگ فائز کیے جاتے ہیں جو خدا کے راستہ میں ہر قسم کی سختیاں جھیلنے اور قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر بغیر جہاد کیے اور بغیر تکلیف اٹھائے ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ خوب جان لو کہ جب تک حق تعالیٰ تمہارا امتحان لے کر مجاہدین کو غیر مجاہدین سے اور صابرین کو غیر صابرین سے لوگوں کی نظر میں واضح طور پر جُدا اور ممتاز نہ کر دے گا۔ اس وقت تک درجاتِ عالیہ کی تمنا ایک خیال خام ہے۔ [1]

راہِ حق میں آزمائشیں ناگزیر ہیں

اُحد کی شکست سے جو لوگ بددل ہوئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا یہ گمان تھا کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ایک ٹھنڈی سڑک سے سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے تو یہ تمہارا خیال غلط ہے۔ خدا کی جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک امتحان سے یہ متعین نہ ہو جائے کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں چنانچہ اسی چیز کی آزمائش کے لیے یہ اُحد کی آزمائش پیش آئی۔ [2]

اس حق کی خاطر جو نبوت کی راہ سے آیا ہے اور جسے اپنایا اور قبول کیا گیا ہے عیش و آرام، اہل وعیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا جہاد ہے۔

یہ دُنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے۔ یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کر لینے کے لیے برابر جان لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ اگر روکی جائے تو اس کے لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں اہل ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

قرآن اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے مسلسل کی جائے اور آخر تک کی جائے۔ اسی کوشش کو قرآن کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ جہاد کے لفظی معنے یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششیں صرف کر ڈالی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جائے۔ اس لیے اللہ کی راہ میں جہاد

---

[1] معارف م ا　[2] تدبر قرآن

کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جاتے جو بس میں ہو۔

ظاہر بات ہے کہ کسی مقصد کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات ہوتے ہیں انہی کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ کوئی جدوجہد محض جدوجہد کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی مقصد کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب اور کیا ہو اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ تین ہیں۔ داخلی جہاد، دعوتی اور فکری جہاد اور مسلح جہاد۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی صورت میں داخلی جہاد کا ذکر کیا گیا ہے اور دعوت الی الخیر کے عنوان سے دعوتی اور فکری جہاد کا تذکرہ ہوا اب اُحد کے موضوع پر مسلح جہاد کا ذکر ہو رہا ہے۔ جہاد خواہ کوئی ہو جب عزم و ہمت کے ساتھ میدان میں اتر جاتے تو بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی کے مظاہرے کا نام صبر ہے۔ قرآن نے لفظ صبر کو اس معنے میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف کے حامل بنے صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا سچا کر دکھایا۔ اگر مسلح جہاد آن پڑے تو قرآن نے اس میں کامیابی کی چار شرطیں بتائی ہیں۔ خدا کی یاد، اللہ و رسول کی طاعت، باہم اتحاد اور میدانِ جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت۔

اے ایمان والو جب حملہ آوروں کی کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو
لڑائی میں ثابت قدم رہو اور زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ
اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو
تمہاری طاقت سست پڑ جاتے گی اور صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

(پارہ ۱۰ سورہ ۸ آیت ۴۵، ۴۶)

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے۔ قرآن نے یہ نکتہ اپنے ماننے والوں کو اسی وقت بتا

دیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔ تاریخ اسلام میں مجاہدین اسلام کے سنہری کارنامے اس کا واضح اور بین ثبوت ہیں ۔

غزوۂ بدر میں صرف ۳۱۳ جاں نثاروں کی بے مثال بہادری اور صابرانہ مقابلہ میں ایک ہزار مسلح آہن پوش فوج کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ ۰۰ کافر مارے گئے اور ۰۰ قیدی بنا لیے گئے اور باقی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ۔

جنگ خندق میں تین ہزار مسلمان تھے اور مقابلہ میں چوبیس ہزار سے زیادہ تھے۔ کفر کی فوج ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ لیکن اہل ایمان کے صابرانہ مقابلہ اور اللہ کی غیبی امداد و تائید نے بالآخر کافروں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور وہ تقریباً ایک ماہ تک مدینہ منورہ کا محاصرہ رکھنے کے باوجود بے نیل مرام واپس چلے گئے ۔

خیبر کی لڑائی میں سولہ سو بلکہ صحیح روایت کے مطابق پندرہ سو مجاہدین اسلام کا مقابلہ بیس ہزار یہودیوں سے ہوا اور چند روز کی صبر آزما لڑائی کے بعد خیبر کا سارا علاقہ فتح ہو گیا اور یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس لڑائی میں صرف بیس مسلمان شہید ہوئے اور ترانوے یہودی مارے گئے ۔

جنگ قادسیہ میں تیس ہزار سے زیادہ مسلمان تھے اور ان کے مقابلہ میں ایک لاکھ بیس ہزار ایرانی تھے اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی اہل ایمان کو عطا فرمائی ۔

جنگ یرموک میں بتیس ہزار مسلمان تھے اور مقابلہ میں دو لاکھ رومی تھے لیکن یہ میدان بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیا اور کافروں کو شکست فاش ہوئی۔

جنگ ہسپانیہ میں بارہ ہزار مسلمان تھے اور مقابلہ میں ایک لاکھ فوج تھی مگر کامیابی مسلمانوں کو ہوئی ۔

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص نے امیرالمومنین عمر سے ایک فوجی مہم کے لیے تین ہزار کی کمک طلب کی۔ حضرت عمر نے تین حضرات روانہ کیے اور فرمایا کہ یہ تین ہزار ہیں۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں حضرت خارجہ ابن حذافہ، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہم

خلافت راشدہ ہی کے دور میں ایک معرکہ میں غالباً جنگ یرموک کے کسی محاذ پر صرف ساٹھ مسلمانوں کا ساٹھ ہزار سے مقابلہ ہوا لیکن فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی ۔ کافروں نے شکست کھائی اور پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔ جنگ ختم ہونے پر جب لاشیں شمار کی گئیں تو معلوم ہوا کہ صرف ۱۰ لاشیں مسلمانوں کی ہیں اور دس ہزار لاشیں بیگانوں کی ہیں۔ اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

عنہ ی سنتون لھم ستون الفاً

و مع ھذا تولوا مدبرینا

بہرحال مطلب یہ ہے کہ جہاد پوری طرح ہو اور اس جہاد میں مصائب اور تکالیف کو برابر برداشت کیا جائے ورنہ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ یعلم کا مطلب وہی ہے جو پہلے بتایا جا چکا ہے۔ دوسرے پارے میں اس کی تفصیل حضرت شیخ الہند کی زبانی سُن چکے ہو نہ جاننے سے مراد شی کی نفی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کے علم کا تعلق معلومات سے ہوتا ہے جب علم کی نفی فرمادی تو معلومات جو علم کا متعلق ہیں ان کی نفی خود بخود ہو گئی جیسے بولتے ہیں ما علم اللہ فیہ خیرا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں شخص میں خیر ہی نہیں ہے اگر ہوتی تو علم الٰہی میں ہوتی۔ یہاں بھی مطلب ہے کہ نہ تم میں سے کسی نے اب تک جم کر جہاد کیا اور نہ جہاد کے مصائب پر صبر کیا اگر کوئی ایسا کرتا تو اللہ تعالیٰ کے علم کا اس سے تعلق ہوتا اور وہ اس کی معلومات میں سے ہوتا۔

دوسری صورت وہ ہے جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی جہاد کرنے والوں کو جہاد نہ کرنے والوں سے ممتاز نہیں فرمایا نہ صابرین کو غیر صابرین سے نمایاں کیا ہے۔

راہِ حق میں مرنے کی تمنائیں کرنا

۲۵۸۔ اور بلاشبہ تم تو موت کی ملاقات سے پہلے ہی راہ حق میں مرنے کی تمنائیں کرتے تھے۔ بلاشبہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی اور تم دیکھ رہے تھے۔ جو صحابہ بدر کی شرکت سے محروم رہ گئے تھے۔ شہدائے بدر کے فضائل سُن سُن کر تمنائیں کرتے کہ خدا ہم کو کوئی موقعہ لائے جو ہم بھی خدا کی راہ میں مارے جائیں اور شہادت کے مراتب حاصل کریں۔ انہی حضرات نے اُحد میں یہ مشورہ دیا تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنا چاہیے۔ ان کو فرمایا کہ جس چیز کی پہلے تمنا رکھتے تھے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آ چکی ہے۔ اب آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنا کیسا؟ حدیث میں ہے کہ لقائے عدو کی تمنا نہ کرو اور جب ایسا موقعہ درپیش آ جائے تو ثابت قدم رہو۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ کچھ مسلمان شہدائے بدر کے فضائل سُن کر شہادت کی تمنائیں کرنے لگے کہ کاش ہمیں بھی ایسا کوئی موقعہ مل جائے اور ہم بھی شہادت کا درجہ پائیں اور ان فضائل کو حاصل کریں جو شہدائے بدر کو حاصل ہوتے تھے ان کو اس آیت میں تنبیہ ہے کہ یا تو شوقِ شہادت کا یہ عالم تھا اور یا اب یہ حالت ہے کہ جب شہادت کا موقعہ آیا اور شہادت کا سامان نظر آیا اور مرنے اور جان دینے کا وقت آیا تو میدان چھوڑ نکلے۔

تمنائے شہادت

آیت میں تمنائے شہادت پر نکیر نہیں بلکہ اس کے موقع سے فائدہ نہ اٹھانے پر نکیر ہے۔ شہادت کی تمنا تو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> میری چاہت اور مرضی یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔

خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو سب آرزوؤں سے بالا ہے۔ جب ہجرت کے دوسرے سال ماہِ رمضان میں حق و باطل اور اسلام و کفر کے پہلے معرکہ جنگ بدر کی تیاری ہوئی تو جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص کے کمسن بھائی عمیر بن ابی وقاص کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کرنا چاہا کہ یہ کمسنی میں دشمن سے کیا مقابلہ کرے گا لیکن حضرت عمیر رو پڑے۔ آپ نے ان کا یہ جذبہ اور تڑپ دیکھ کر انہیں اجازت مرحمت فرمادی اور خود اپنے دست مبارک سے ان کے گلے میں تلوار لٹکائی۔ (مستدرک حاکم)

اسی جنگ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن خیثمہ کا یہ واقعہ منقول ہے کہ جب حضرت سعد اور ان کے والد حضرت خیثمہ دونوں جنگ بدر میں شرکت پر مُصر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ایک جہاد میں شریک ہو اور دوسرا اہل خانہ کی خبر گیری کرے۔ حضرت خیثمہ نے اپنے فرزند سے کہا کہ تم یہاں رہو میں جاتا ہوں۔ حضرت سعد نے فرمایا کہ اگر جنت کے بغیر اور کوئی سودا ہوتا تو میں آپ کو ترجیح دیتا۔ لیکن یہ معاملہ تو جنت کا ہے لہٰذا میں خود اس میں شریک ہوں گا اور اُمید ہے کہ مجھے شہادت کی دولت نصیب ہوگی بالآخر دونوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ حضرت سعد کے نام نکلا اور وہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور شہید ہوئے۔ (مستدرک حاکم)

غزوہ اُحد کے معرکہ سے ایک روز پہلے حضرت عبداللہ بن جحش نے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ اے میرے مالک میں تجھ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ جب کل دُشمنوں سے میری ملاقات ہو تو وہ مجھے بُری قتل کریں کہ میرا پیٹ چاک کر دیں میری ناک اور کان تک کاٹ ڈالیں تاکہ جب میں تیرے دربار میں حاضر ہوں اور تو مجھ سے سوال کرے کہ یہ کارروائی کیوں ہوئی ہے تو میں عرض کروں کہ اے مالک یہ محض تیری رضا کے لیے ۔　　　　(مستدرک حاکم)

یہ اور اس قسم کے واقعات سے صحابہ کی تمنائے شہادت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

شدید غلط فہمی اور تباہ کُن خوش گمانی

ہم قرآن میں یہ اور اس قسم کی دوسری آیات پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ قرآن ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے ؟ یہ سوال کم ذہنوں میں آتا ہے ۔ انسان اپنے آپ کو رعایتیں دینے میں بہت فراخدل واقع ہوا ہے اس لیے اس بے فکری پر کوئی خاص حیرت نہیں ہے ۔ اگرچہ اس بے فکری کے نتائج اس قدر ہولناک ہیں کہ ان کی نظیر ملنی مشکل ہے ۔ لوگ جب قرآن میں اس قسم کی آیات پڑھتے ہیں تو ان پاک نفسوں کو ان کی استقامت ایمانی پر جی کھول کر ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں اور پیش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی آیات میں خود ان کے لیے کوئی درس ہدایت نہیں ہے بلکہ کچھ بعید نہیں کہ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوں کہ ہم اس بھاری آزمائش سے محفوظ رکھے گئے ہیں ۔ اگر ایسا ہے تو بڑی شدید غلط فہمی بلکہ ایک تباہ کُن خوش فہمی ہے ۔ ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ قانون آزمائش کا تعلق نہ نبوت اور بعثت سے ہے اور نہ حضور کی رفاقت اور صحبت سے بلکہ ادعائے ایمان سے ہے ۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ نبی کی رفاقت کا امتحان لیا جانا ضروری ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ ایمان کے دعویٰ کرنے والوں کا دعویٰ پرکھا جانا ضروری ہے ۔ ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے کہ اس طرح کی آیتوں میں جس چیز کو اللہ سبحانہٗ نے وجہ امتحان بلکہ مورد امتحان قرار دیا ہے وہ ایمان ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جنت کا ملنا ایمان پر اور خود ایمان کا کارآمد ہونا اس کے ثمرات و نتائج یعنی راہ حق کے مجاہدات اور صبر و ثبات پر موقوف ہے اس کا یہ اعلان فلیعلمن اللہ الذین آمنوا وہ جان کر رہے گا کہ کون ایمان والا ہے ۔ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ آزمائشوں کا مبنیٰ صرف دعوئ ایمان ہے اور ایمانی دعویٰ کا سچا ہونا لوازم ایمانی پر موقوف ہے ورنہ جہاں تک

جاننے کا تعلق ہے کیا چیز ہے جو اللہ کے علم میں نہیں۔

قرآن کی ان تصریحات سے اس بے بنیاد نظریہ کی کوئی قیمت نہیں رہتی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ابتلاء و آزمائش صرف اصحاب نبی سے تعلق رکھتا ہے۔ عام اہل ایمان پر نہ اس کا اطلاق ہوتا ہے نہ نفاذ۔ یہ نظریہ نہیں بلکہ نفس کی ایک خواہش ہے جس نے تصور اور نظریہ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ
اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ
يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ
مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اللہ کے رسول
ہیں [۲۵۹]، آپ سے پہلے اور رسول بھی ہوتے [۲۶۰] ہیں، اگر آپ کا وصال
ہو جاتے یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے
یاد رکھو جو بھی اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا
اور اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو بدلہ دے گا [۲۶۱]۔ اور دیکھو اللہ کے حکم
کے بغیر کوئی جان مر نہیں سکتی [۲۶۲] موت کا وقت مقرر ہے۔ اور

جو بھی دُنیا کے فائدے پر نظر رکھتا ہے ہم اسے دُنیا میں سے دیں گے اور جو آخرت کے ثواب کے لیے ارادہ کرتا ہے وہ آخرت کا ثواب پائے گا ہم اپنے شکر گزار بندوں کو ضرور اجر عطا کریں گے۔"[۲۶۳]

بنائے کار اصول و عقائد ہیں

اُحد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس نقشہ جنگ قائم کیا۔ تمام منہیں درست فرمانے کے بعد پہاڑ کا ایک درہ باقی رہ گیا۔ جہاں سے اندیشہ تھا کہ دشمن لشکر اسلام پر حملہ آور ہو جائے۔ اس پر آپ نے پچاس تیر اندازوں کو جن کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر تھے مامور فرما کر تاکید کر دی کہ ہم خواہ کسی حالت میں ہوں تم یہاں سے نہ ہلنا، مسلمان غالب ہوں یا مغلوب، حتیٰ کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ان کا گوشت نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا وانا لن نزال غالبین ما ثبتم مکانکم (بغوی) ہم برابر اس وقت تک غالب رہیں گے جب تک تم اپنی جگہ قائم رہو گے۔ الغرض فوج کو پوری ہدایت دینے کے بعد جنگ شروع کی گئی۔ میدان کارزار گرم تھا۔ غازیان اسلام بڑھ بڑھ کر جوہر شجاعت دکھا رہے تھے۔ ابو دجانہ، علی مرتضیٰ اور دوسرے مجاہدین کی بسالت و بے جگری کے سامنے مشرکین کی کمریں ٹوٹ گئیں۔ ان کو راہ فرار کے سوا اب کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ کفار کو شکست فاش ہوئی۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگے۔ ان کی عورتیں جو غیرت دلانے کو آئی تھیں پائنچے چڑھا کر ادھر اُدھر بھاگتی نظر آئیں۔ مجاہدین نے مال غنیمت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ منظر جب تیر اندازوں نے دیکھا تو سمجھے کہ اب فتح کامل ہو چکی۔ دشمن بھاگ رہا ہے یہاں ٹھہرنا بیکار ہے، چل کر دشمن کا تعاقب کریں اور غنیمت میں حصہ لیں۔ عبداللہ بن جبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد دلایا۔ وہ سمجھے کہ آپ کے ارشاد کا اصلی منشا ہم پورا کر چکے ہیں یہاں ٹھہرنے کی حاجت نہیں۔ یہ خیال کر کے سب غنیمت پر جا پڑے۔ صرف عبداللہ بن جبیر اور ان کے گیارہ ساتھی درہ کی حفاظت پر باقی رہ گئے۔ مشرکین کے سواروں کا دستہ خالد بن ولید کے زیر کمان تھا جو اس وقت

تک حضرت اور رضی اللہ عنہ نہیں ہٹے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر درّے کی طرف حملہ کر دیا۔ دس بارہ تیر انداز ڈھائی سو سواروں کی یلغار کو کہاں روک سکتے تھے۔ تاہم عبداللہ بن جبیر اور ان کے رفقاء نے مدافعت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اسی میں جان دے دی۔ مسلمان مجاہدین اپنے عقب سے مطمئن تھے کہ ناگہانی مشرکین کا رسالہ ان کے سروں پر آپہنچا اور سامنے سے مشرکین کی فوج جو بھاگی جا رہی تھی پیچھے پلٹ پڑی۔ مسلمان دونوں طرف سے گھر گئے اور بہت زور کا رن پڑا، کتنے ہی مسلمان شہید اور زخمی ہوئے۔ اسی افراتفری میں ابن قمیہ نے ایک بھاری پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پھینکا۔ جس سے دندان مبارک شہید اور چہرۂ اقدس زخمی ہوا۔ ابن قمیہ نے چاہا کہ آپ کو قتل کرے مگر مصعب بن عمیر نے جن کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا تھا مدافعت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخم کی شدت سے زمین پر گرے کسی شیطان نے آواز لگادی کہ آپ قتل کر دیے گئے۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے اور پاؤں اکھڑ گئے۔ بعض مسلمان ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہے۔ کچھ ضعفاء کو خیال ہوا کہ مشرکین کے سردار ابوسفیان سے امن حاصل کر لیں۔ کچھ منافقین کہنے لگے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیے گئے تو اسلام چھوڑ کر اپنے مذہب قدیم میں واپس چلا جانا چاہیے۔ اس وقت انس بن مالک کے چچا انس ابن النضر نے کہا کہ اگر محمد قتل ہو گئے تو اب محمد تو مقتول نہیں ہوتے حضور کے بعد تمہارا زندہ رہنا کس کام کا؟ جس چیز پر آپ قتل ہوئے تم بھی اسی پر کٹ مرو۔ اور جس چیز پر آپ نے جان دی ہے اسی پر تم بھی جان دے دو۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے حملہ کیا لڑے اور شہید ہوئے رضی اللہ عنہ۔ اسی اثنا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی الی عباد اللہ انا رسول اللہ اللہ کے بندو ادھر آؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ کعب بن مالک آپ کو پہچان کر چلائے مسلمانو! بشارت ہو رسول اللہ یہاں موجود ہیں آواز کا سننا تھا کہ مسلمان ادھر ہی سمٹنا شروع ہو گئے۔ تیس صحابہ نے آپ کے قریب ہو کر مدافعت کی اور مشرکین کی فوج کو منتشر کیا۔ اس موقعہ پر سعد بن ابی وقاص، طلحہ، ابوطلحہ اور قتادہ بن النعمان نے بڑی جانبازیاں دکھائیں۔ آخر مشرکین میدان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوئے۔ ان آیات میں ان ہی واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

۲۵۹ ۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخر خدا تو نہیں ایک رسول ہیں[1]۔ محمد اسم مبارک قرآن میں پہلی بار آیا ہے۔ اس پر علامہ نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں ہم مولانا بدر عالم مرحوم اور مولانا عبدالرحمان ندوی کے مقالات کے کچھ اقتباسات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

آپ کا اسم نامی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہ ہے کہ وہ ذات جس کی تعریف کی گئی اس ترجمہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ لیکن اس جامعیت کبریٰ برزخ کامل اور مقصود آفرینش کے فضائل و کمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے۔ خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجب توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم، فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح و ستائش ہیں۔ اس لیے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تفحص کو اور زیادہ وسعت دیں۔ صاحب مفردات محمد کے معنے لکھتے ہیں الذی جمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ محمد کے معنی مجموعہ خوبی کے ہیں۔

اے کہ تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

کارساز قدرت کی وسعت لامحدود، اس کے کرشمے ناقابل شمار اس کی تخلیق کا دروازہ ہمیشہ کے لیے وا ہے۔ غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہے۔ مخلوقات کی ہر نوع کا ایک درجہ کمال ہے کہ جس کے آگے اس کا قدم نہیں بڑھتا، حیوانات، نباتات اور جمادات تک میں اس کے شواہد مل سکتے ہیں صورتیں ایک ہیں۔ شکلیں متحد ہیں اوصاف مختلف ہیں لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں ہے۔ ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جاکر ختم ہوجاتے ہیں۔ ہم مقصود فطرت اور نقطہ تخلیق کہتے ہیں۔ اس نقطہ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ یہ بات تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

مر دوسری تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔ دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بین فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سینکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوع مستقل ہے۔ آفرینش انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل و

شباہت، اس کے اعضاء وجوارح اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے۔ سب چیزیں وہی ہیں جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں لیکن دماغی کیفیتوں کا حال ان سے جداگانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء واختلاف جاری ہے۔ اگر انسان کے اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد ازیں زمانوں کی تاریخ میں ارتقائے دماغی کی آخر ترین سرحد اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ صاحب قاموس نے لفظ محمد کے ایک معنے قضاء الحق کے بھی بتائے ہیں۔ پس لفظ محمد کے ایک معنے یہ بھی ہیں وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو یعنی اللہ کی جانب سے نوع انسان کو جس سرحد کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق مقرر تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا علم و عمل، خلق وخُلق، دماغ وکیریکٹر ارتقائے ذہنی ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لب لباب ہیں۔ اول ثانی کے لیے بنیاد ہے عمل علم پر کیریکٹر دماغ پر خُلق خَلق پر قائم ہے۔ یہ ایک عجیب نکتہ ہے کہ جتنی بھی کسی انسان کی حالت مکمل ہوگی اسی قدر اس کی خُلقی کیفیت راسخ اور مستحکم ہوگی۔ ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے۔ تاریخی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ کیریکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت کی ذات مبارک نے پیش کیا عالم انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے حتیٰ کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو فرمادیا گیا انک لعلی خلق عظیم محاورات عرب سے حمد کے معنے یہ بھی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا۔ حماسیات میں نیزے کے بھرپور حملے کے موقعہ پر حمدت بلادہ کا محاورہ مشہور ہے یعنی میں نے وار پورا کیا۔ اس معنے کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر کے مضمون کو پیش نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد کے معنے مخلوق کامل کے ہیں۔

منجملہ دیگر کمالات نبوت کے ایک کمال خود حضور کا نام نامی ہے۔ یہ زندہ جاوید معجزہ زمانہ بعثت سے تاحال اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے محمد الذی یحمد مرۃ بعد مرۃ جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے اور انسان اپنی بساط کے مطابق ترقی کر رہا ہے محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعتہً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے۔ علماء وفضلائے یورپ کی اکثریت تاریخ اسلام کے تحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جا رہی

ہے۔ دُنیا کی مختلف پریشانیوں اور بے قراریوں کو معدوم کرنے کی جتنی ضرورت ان کے خیال میں بڑھتی جا رہی ہے بادلِ ناخواستہ ان کو اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلا شبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون دُنیا کی ضرورتوں کا کفیل اور ان کی زندگی انسان کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہلِ ایشیا کا رُجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے اسی قدر وہ پیغمبر عالم محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دُنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نامِ مبارک تیرہ سو سال پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتہ دے رہا ہے۔ مستقبل میں دُنیا کی عمر جس قدر دراز ہو گی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر اُمید نہیں ہے اور خواہ اپنے پچھلے سبق دُہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالاتِ نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا۔ اس حیثیت سے نامِ مبارک کا ترجمہ سلسلہ اوصاف و محامد ہوگا۔

حضورؐ کا نام آپ کی زندگی کا آئینہ دار ہے

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام حیات کا آئینہ اور اس کے شعبہائے زندگی کی تفصیل ہو۔ مگر حضور انور کا نام نامی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام رکھنے کی ضرورت عبد المطلب کو غیبی تحریک سے ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دُشمن کی یکساں تنقید، حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ علم و عمل ظاہر و باطن، خلق و خُلق ہر حیثیت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قابلِ تعریف تھی۔ اور اسی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

نام میں ختمِ نبوت کی دلیل

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ آپ کا نام نہ صرف نبی ہونے بلکہ خاتم النبیین ہونے کی بھی دلیل ہے۔ کمال علم و کمال اخلاق بھی انبیا علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں دوسرے انبیا علیہم سلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا لیکن حضور کی جامعیت آپ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ لفظ محمد کے معنے مجموعہ خوبی اور مخلوق کامل

کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے آگے کوئی نقطہ نہیں ہے۔ اسی حالت پر کمال کل کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔

مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے وہ باوجود ہزار سعی تنقیص کے اعتراف کمال پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعثت کے حالات سیرۃ طیبہ تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی خاصیت اور بے اختیارانہ کشش کو نام مبارک محمد میں بیان کیا گیا۔ لفظ محمد عربی زبان میں تحمید سے بنا ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس باب کے معنوی خواص میں سے کسی کام کا وجود میں آنا اس طور سے مانا جاتا ہے کہ گویا کسی مخفی طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لیے مجبور کیا جیسے صرّف پھیر دیا یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کر کے پھیر دیا اسی طرح لفظ محمد کے معنے ہیں وہ جس کی بے اختیار تعریف کی گئی ہو۔ اس معنے سے قوت جاذبہ اور کشش اصلی کی طرف اشارہ ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کو اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصا کیے ہوتے ہے کوئی اس سے چھوٹا ہوا نہیں۔ بولا جاتا ہے قتلہ تقتیلا یعنی اس کو بوٹی بوٹی کر دیا اس کا لحاظ رکھتے ہوتے نام مبارک کے معنے یہ معلوم ہوتے ہیں کہ محمد یعنی جس کا جز جز قابل تعریف ہے۔ اصلاح نفس، تدبیر منزل اور تدبیر مدن کی وہ کون کا شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہیں کر دیا۔ انبیا علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا۔ یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد نہایت کو پہنچا تو ضرورت ہوئی کہ عالم انسانی کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جاتے جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو جس کی زندگی کو سامنے رکھ کر موسویا نہ مستی مسیحانہ اخلاق ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آتے اور پھر اپنے ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی کی جامع اور برزخ کامل ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اسی لیے حضرت مسیح نے اپنی بشارت میں لفظ احمد فرمایا۔ یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہو گا۔

دنیا کے تمام مذاہب کے برعکس اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے وہ جن جن ملکوں

میں گیا اور جن جماعتوں میں پھیلا اخلاق و روحانیت سے گیا۔ تلوار اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی نظریں اس معاملہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خالص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بس لفظ محمد کے ایک معنے یہ بھی قرار دیے جا سکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش اسلوبی خوش تدبیری نے ترقی کی۔ آپ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا جس کی سرعت اور بغیر جدوجہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دنیا حیران ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع بہترے فضائل کا خلاصہ ہے۔ اگر آپ اس ساری تفصیل کا نچوڑ دیکھنا چاہتے ہیں تو تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ بیان پڑھیے کہ قاموس میں حمد کے معنے شکر، رضا، قضاء حق اور تحمید کے معنے تابڑ توڑ تعریف کرنے کے لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ اسی سے لفظ محمد ہے جس کے معنے مرۃ بعد مرۃ تعریف کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں بے نہایت محمد کے ہیں امام بغوی فرماتے ہیں محمد وہ ہے جو تمام خوبیوں اور محامد کا استغراق رکھتا ہو۔ خوبیوں اور تعریفوں کا ظرف وہی ہو سکتا ہے جو ہر پہلو میں کمال ہی کمال رکھتا ہو۔ تحمید حمد سے زیادہ ہے اس کا مستحق وہ نہیں جو صرف اس کی اہلیت رکھتا ہو بلکہ وہ ہے جو ہر قسم کے کمال پر تا ابد غالب ہو۔ حسان بن ثابت فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَرْسَلَ عَبْدَہٗ ۔۔۔ بِبُرْھَانِہٖ وَ اللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَمْجَدُ
وَ شَقَّ لَہٗ مِنْ اِسْمِہٖ لِیُجِلَّہٗ ۔۔۔ فَذُوالْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَ ھٰذَا مُحَمَّدٌ

احمد و محمد صلی اللہ علیہ وسلم

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بے نظیر تھی آپ کے یہ اسماء بھی بے مثل ہی تھے۔ آپ سے پہلے کسی کے ذہن میں ان اسماء کا خطور بھی نہ ہوا تھا کہ جب آپ کی ولادت کا زمانہ نزدیک آ گیا کاہنوں منجموں اور اہل کتاب نے نام لے کر آپ کی بشارتیں دیں تو لوگوں نے اس نبی کی طمع میں اپنی اولاد کا نام محمد و احمد رکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے جن کے نام محمد و احمد رکھے گئے تھے ان کی کل تعداد چھ تک ہے ساتواں کوئی شخص ثابت نہیں ہوتا۔ سہیلی صرف تین بتلاتے ہیں۔ ۱۔ محمد بن سفیان

بن مجاشع ، ۲- محمد بن احیحہ بن الجلاح ، ۳- محمد بن عمران بن ربیعہ ، سہیلی سے پہلے ابوعبداللہ بن خالویہ کا خیال بھی یہی تھا۔ حافظ ابن حجرؒ آٹھویں صدی میں جب پھر اس کے درپے ہوتے تو انہوں نے ان کی تعداد بیس تک پہنچا دی اور تکرار و اوہام حذف کرنے کے بعد منقح تعداد پندرہ قرار دی جن میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن عدی ربیعہ ہیں۔ ان کا واقعہ بغوی ، ابن سعد ، ابن شاہین اور ابن السکن ، وغیرہم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ خلیفہ عبداللہ نے محمد بن عدی سے پوچھا تمہارے والد نے تمہارا نام زمانہ جاہلیت میں محمد کیسے رکھ دیا انہوں نے جواب دیا اس کے متعلق جیسا تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسا ہی میں نے اپنے والد سے پوچھا تھا انہوں نے فرمایا تھا کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے تین اور شخصوں کے ہمراہ ابن جفنیہ غسانی کی ملاقات کے لیے ایک مرتبہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسے چشمے پر جا کر اترے جو گرجا کے قریب تھا گرجا کا منتظم ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں تم دوڑ کر ان کو قبول کر لینا ہم نے کہا ان کا نام ، اس نے کہا ان کا نام محمد ہے جب اس سفر سے ہم واپس ہوئے تو اتفاقاً ہم سب کے یہاں لڑکے پیدا ہوتے اور اس لیے ہم سب نے اپنے اپنے لڑکوں کا نام محمد رکھ دیا۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر نے اور اشخاص کے نام بھی بتفصیل تحریر کیے ہیں۔ دیکھو فتح الباری باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، حافظ سہیلی فرماتے ہیں کہ تورات میں آپ کا جو اسم مبارک مذکور ہے وہ احمد ہے حافظ ابن قیم اس رائے سے متفق نہیں وہ اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ تورات میں آپ کی آمد کی پیش گوئی اسم محمد کے ساتھ بھی صاف موجود ہے ۔ اس کے بعد حافظ ابن قیم اسم محمد کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں۔ محمود بھی اسم مفعول کا صیغہ ہے مگر جو مبالغہ باب تفعیل میں ہوتا ہے وہ ثلاثی مجرد میں نہیں ہوتا اس لیے محمد محمود سے زیادہ بلیغ ہے ۔

محمد اس کو کہتے ہیں جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جاتے اسی لیے تورات میں آپ کا نام محمد ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آپ کے اوصافِ حمیدہ آپ کی اُمت اور آپ کے دین کے فضائل و کمالات کا اتنی کثرت سے اس میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسے اولو العزم رسول کو بھی آپ کی اُمت میں ہونے کی آرزو ہونے لگی۔ احمد یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں احمد الحامدین لربہم یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا - دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں احق الناس واولاھم بان یحمد ، تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور

ثنا کا مستحق اس بنا پر محمد و احمد میں فرق یہ ہے گا کہ محمود وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جاتے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جاتے۔ پس محمد بلحاظ کمیت ہے اور احمد بلحاظِ کیفیت ہے۔ دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنے خلق و خصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپ کی ہو۔ اس تحقیق کے بعد ان دونوں مضمونوں کے لحاظ سے سطحِ عالم پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسمائے حسنٰی جتنی حقیقت اور جتنی صداقت کے ساتھ آپ کی ذات مبارک پر چسپاں ہیں اتنے کسی اور پر نہیں۔ اگر یہاں اسم تفضیل کو اسم مفعول کے معنی میں لیجیے تو خالق سے مخلوق تک انبیاء علیہم السلام سے لے کر جن و ملک تک حیوانات سے لے کر جمادات تک غرض ہر ذی روح اور غیر ذی روح سب ہی نے آپ کی تعریفیں کی ہیں اور آج بھی چالیس کروڑ انسانوں کی زبانیں دن میں نہ معلوم کتنی بار آپ کی تعریف کے لیے متحرک رہتی ہیں حتیٰ کہ کفار میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ آپ کا دین تسلیم نہیں کرتا مگر آپ کی دیانت و امانت، عدل و انصاف، صداقت و راستبازی، ہوش و خرد کا ثناخواں ہے اس لیے اگر اپنے خیال میں آپ ذرا علیحدہ ہو کر ازل سے ابد تک کی دُنیا کی طرف کان لگائیں تو جس کی سب سے زیادہ اور سب سے بہتر تعریف آپ کے کان سنیں گے وہ مبارک ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہوگی۔

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفت گوئی او دارد

اس لیے محمد یا احمد (بمعنی اسم مفعول) نام کی مستحق جتنی کہ آپ کی ذات ہو سکتی ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہو سکتی اور اگر احمد کو اسم فاعل کے معنے میں لیجیے تو بھی اس اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپ ہی کی ذات پاک ہے کیونکہ جس قدر خدا کی تعریف آپ نے کی ہے اتنی کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح اپنی اُمت کو بھی موقعہ بموقعہ خدا کی اتنی حمد سکھائی کہ کتب مقدسہ میں اس اُمت کا لقب ہی حمادون پڑ گیا۔ یعنی خدا کی بہت تعریف کرنے والی اُمت۔ صحیحین میں ہے کہ حشر میں جب شفاعت کے لیے آپ تشریف لے جائیں گے تو آپ پر خدا کی حمد و ثنا کا دروازہ کھولا جائے گا جو اس سے پیشتر کسی پر نہیں کھولا گیا تھا۔ پس سب انبیاء تو حماد ہیں اور ان حمادوں میں آپ احمد ہیں۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ پہلے آپ احمد تھے پھر محمد ہوتے کیونکہ سب سے پہلے آپ نے خدا کی تعریف کی پھر آپ کے بعد مخلوق نے آپ کی تعریف کی اسی طرح حشر میں سب سے پہلے

آپ ہی خدا کی حمد کریں گے جب آپ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا تو پھر اہل حشر آپ کی حمد کریں گے اس لیے پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد۔ بلحاظ وجود بھی پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد۔ اسی وجہ سے کتب سابقہ میں آپ کی بشارت اسم احمد سے مذکور ہے اور جب عالم وجود میں تشریف لے آئے تو محمد کے نام سے پکارے گئے (دیکھو فتح الباری) خلاصہ یہ ہے کہ احمد بمعنی محمد ہو یا بمعنی احمد الحامدین ہر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حمد کو ہر پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے اسی بنا پر سورۃ الحمد خاص کر آپ ہی کو مرحمت ہوئی۔ آپ کی ہی اُمت کا لقب حمادون ہوا اور حشر میں لواء الحمد (حمد کا جھنڈا) آپ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا اور آپ ہی کے مخصوص مقام کا نام محمود ہے آپ کی شریعت میں بھی کھانے کے بعد، پینے کے بعد، دعا کے بعد، سفر سے واپسی کے بعد غرض بہت سے مختلف مواقع پر خدا کی حمد سکھائی گئی پھر یہ مختلف اور متنوع تعریفیں جب ہر زمانہ میں بے شمار انسانوں کی زبانوں سے ہوتی ہیں وہ درحقیقت آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے اس لیے ان تمام تعریفوں کو بجا طور پر آپ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اس کے بعد اب سوچو کہ جتنی خدا کی تعریف فضاء عالم میں آپ کے ذریعہ سے گونجی کیا کبھی کسی اور کے ذریعہ سے گونجی ہے اور اسی کے ساتھ جتنی کثرت کے ساتھ خدا کی غیر متناہی مخلوق نے آپ کی تعریفیں کیں اتنی کسی اور شخصیت کی ہیں۔ پس ہر اعتبار سے حمد کی جتنی خصوصیت آپ کی ذات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اتنی کسی اور ذات کے ساتھ نہیں ہوتی اس لیے احمد و محمد نام پانے کے لیے بھی آپ ہی کی ذات منتخب ہونی چاہیے۔ اسی لیے آپ سے پہلے بھی جس نے یہ نام رکھا آپ کی اتباع میں رکھا اور بعد میں بھی جس نے اس نام کو اختیار کیا آپ ہی کی اتباع میں کیا

اللھم صل وسلم وبارک علیہ

شیخ اکبر یہاں ایک اور عجیب نکتہ لکھ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے جب ہم کھا پی کر فارغ ہو لیتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ جب سفر ختم کر کے گھر واپس آتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اسی طرح جب دُنیا کا طویل و عریض سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو خدا کی حمد کریں گے واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین (دیکھو روح المعانی ج ا ص ۱۴) اس دستور کے مطابق مناسب ہے کہ جب سلسلہ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں خدا کی حمد ہو اس لیے سب سے آخر میں آتے ان کا نام محمد رکھا گیا بے شک جو ذات پاک کہ حسن و خوبی کی تمام رعنائیوں اور زیبائشوں کا مجموعہ ہو اس کے اسماء بھی حسن و خوبی کا مجموعہ ہونے چاہئیں۔

لفظ رسول کی تشریح

اس فقرے نے بتا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا ہیں نہ خدا کا کوئی جزو نہ مظہر خدا نہ بروز نہ اوتار۔ وہ تو صرف رسول ہیں۔ رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لیے خود لفظ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ سے محبت اور عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لیے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں۔ اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ ہو جاتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خط فاصل ہو سکتی ہیں اسی لیے خدا تعالیٰ کے سب رسولوں نے اسی لفظ سے اپنا تعارف پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن حکیم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا ہے وہ بھی لفظ رسول ہے وما محمد الا رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف اللہ کے رسول ہیں اس کے سوا الوہیت کا اپنے اندر شائبہ تک نہیں رکھتے۔

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پرعظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی کلمہ نہیں ہے۔ صوفیا نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کیے ہیں وجود کا نقطۂ اول، حقیقۃ الحقائق، برزخیۃ الکبریٰ مگر انصاف یہ ہے کہ ان کلمات سے کچھ غلط فہمیاں تو ضرور پیدا ہو گئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر بھی اتنا معلوم نہ ہو سکا جتنا لفظ رسول سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا۔ اس کے لوازم سب کے ذہن نشین تھے اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھے۔ اس کی شخصیت اور احترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش و کرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اس لیے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو کبھی کہہ دیتا کہ میں احکم الحاکمین ملک الملوک کا ایک ایسا ہی رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوتے ہیں۔ بس اسی ایک لفظ سے سامعین کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں دوڑنے لگتیں۔ محبت و توقیر، اطاعت و فرمانبرداری کے وہ تمام جذبات امنڈ آتے جو ایسے رسول کے لیے امنڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصل رہنی چاہئیں۔ اسی لیے محبت و طاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید بھی کفر و شرک کی گرد سے آلودہ نہ ہوتا۔

ہمیشہ دُنیا میں رہنا نبوت کا کام نہیں ہے

۲۷۰- آپ سے پہلے اور رسُول بھی ہو چکے ہیں۔ ان سے پہلے کتنے رسُول گزر چکے ہیں۔ جن کے بعد ان کے متبعین نے دین کو سنبھالا اور جان و مال فدا کر کے قائم کیا[1] ان سب نے اپنے وقت پر دُنیا کو خیر باد کہا سو یہ بھی اپنے وقت موعود پر وفات پا ئیں گے اور اس میں کوئی بات حیرت کی ہوگی اور نہ کوئی پہلو آپ کی اہانت کا نکلے گا۔ اس فقرے کی تشریح کو اُردو کے عام شارحین قرآن نے اپنی تشریحات میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے اس لیے ہم یہاں کچھ عربی تفاسیر کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ نسفی اور زمخشری رقمطراز ہیں۔

آپ سے پہلے رسُول جا چکے ہیں آپ بھی ایسے ہی تشریف لے جائیں گے جیسے سب گئے۔ ان انبیاء کی روانگی کے بعد ان کے متبعین ہی دین کو نبھانے والے تھے۔ مسلمانو! تمہیں بھی آپ کے دُنیا سے روانہ ہو جانے کے بعد آپ کے دین کو تھامنا ہوگا کیونکہ انبیاء کی بعثت کا مقصد لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانا ہے لوگوں میں نبیوں کا رہنا مقصود نہیں ہے۔

امام رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے انبیاء بھی روانہ ہو گئے آپ بھی روانہ ہو جائیں گے تمہارا کام یہ ہے کہ ان کے روانہ ہونے کے بعد ان کی دعوت اور پیغام کو زندہ رکھو کیونکہ نبوت کی غرض صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے انبیاء کی طرح اللہ کا پیغام پہنچانے آئے ہیں۔ انبیاء کے لائے ہوئے خدائی پیغام کے بقاء میں نبیوں کا رہنا شرط نہیں ہے بلکہ دستور یہی ہے کہ انبیاء تشریف لے جاتے ہیں اور ان کی لائی ہوئی شریعتیں باقی رہتی ہیں۔ سب انبیاء آئے اور تشریف لے گئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ قرطبی فرماتے ہیں :

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ
نبی ہمیشہ اپنی قوم میں باقی نہیں رہتے ۔ نبوت کی دعوت اور اس کی تعلیمات سے وابستگی ہونی چاہیے چاہے نبی موت یا قتل کے ذریعے دنیا سے روانہ ہو جائے ۔

حافظ ابن جریر لکھتے ہیں :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے رسولوں کی طرح رسول ہیں جن کو اللہ نے دنیا میں اپنی عبادت اور طاعت کی دعوت کے لیے روانہ فرمایا ہے وہ دنیا سے روانہ ہو گئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اللہ سبحانہ ایک روز یہی معاملہ کرنے والا ہے ۔

سید رشید رضا لکھتے ہیں :

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جامہ انسانیت میں ملبوس خدا کے پیغمبر ہیں ۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبر ہوتے ہیں کچھ انتقال فرما گئے اور کچھ شہید ہو گئے کسی کے لیے یہاں بقائے دوام نہیں ہوا ہے ۔ آپ کو بھی اس راہ سے گزرنا ہے یعنی آپ کو بھی دنیا سے جانا ہے جیسا کہ آپ سے پہلے جا چکے ہیں ۔ بقائے دوام تو صرف اللہ کے لیے ہے اور یہ بات مومن کو زیب نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے لیے بقاء دوام کا اعتقاد رکھے ۔

حضرت ابوبکر الصدیق کی استقامت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حادثہ صحابہ کے لیے اس قدر سخت تھا اور بقول حافظ ابن القیم کہ اُحد میں آپ کی وفات کی خبر اڑا کر صحابہ کرام کو وفات کے حادثہ کے لیے تیار کیا گیا اور ان کو تربیت دی گئی کہ ایسا ہونا ہے اس کے لیے پہلے ہی تیار ہو جانا چاہیے ۔ اس کے باوجود جب حادثہ رونما ہوا تو سب کے ہوش وحواس پر بجلی گر گئی کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گا ۔ اُحد میں وفات کی خبر سن کر حضرت انس بن النضر نے کہا تھا

لوگو ! اگر حضور کی وفات ہو گئی تو کیا بات ہے رب محمد تو زندہ ہے تم بھی اسی کام پر کٹ مرو جس پر حضور اللہ کو پیارے ہو گئے تلوار سونتی اور حملہ کر دیا تا آنکہ جام شہادت نوش کر گئے ۔

لیکن جب فی الواقع یہ حادثہ پیش آ ہی گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صبح کی نماز کے بعد حضور انور کی طبع مبارک بظاہر بہتر دیکھ کر سُنح چلے گئے تھے وہ وفات کی خبر سُن کر آئے تو مسجد اور حجرہ عائشہؓ میں قیامت برپا تھی۔ انتہائی رقت قلب کے باوجود اب حضرت ابوبکرؓ استقامت و استواری کی چٹان تھے کیونکہ اب اس متاعِ عزیز کا تحفظ سب سے پہلا کام تھا جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

اس باب میں متعدد روایتیں ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ معمول کے مطابق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ لوگوں نے کہا کہ آج آپ کے پاس جانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں وہ بولے کیا تم سچ کہتے ہو؟ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آتے ہی چہرہ مبارک سے چادر اُٹھائی اور انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا پھر فرمایا کہ واللہ رسُول اللہ کی وفات ہو گئی ہے۔ پھر آپ کے سرِ مبارک کی جانب سے ہٹ گئے اور کہا ہائے نبی، منہ جھکایا اور آپ کے چہرے کو بوسہ دیا پھر کہا ہائے خلیل، منہ جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا پھر کہا ہائے صفی منہ جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر چادر اُٹھا کر باہر چلے گئے ایک روایت میں ہے کہ چہرہ مبارک کھول کر بوسہ دیا اور روئے، ساتھ ہی کہا میرے والدین آپ پر قربان ہوں بخدا اللہ آپ پر دو موتیں کبھی جمع نہ کرے گا جو موت آپ پر لکھی جا چکی تھی اس کا ذائقہ آپ نے چکھ لیا اب ابد تک موت آپ کا دامن نہ چھو سکے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یہ بھی کہا کہ طبت حیا وطبت میتا میرے والدین آپ پر قربان ہوں آپ کی زندگی بھی کتنی پاکیزہ تھی اور موت بھی کتنی پاکیزہ ہے۔ مسجد میں پہنچے تو حضرت عمرؓ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ میں کسی کو یہ کہتے نہ سنوں کہ حضور انور وفات پا گئے۔ انہیں بلایا گیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ کو بلایا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ عمر چپ ہو جاؤ۔ پھر منبر پر چڑھے۔ حمد و ثنا کے بعد سب سے پہلے یہ آیت پڑھی۔

انک میت وانھم میتون تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔ پھر فرمایا تم میں سے جو شخص محمد رسُول اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد مصطفیٰ تو وفات پا گئے اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اور کبھی وفات نہ پائے گا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل اسی مختصر سی تقریر نے سب کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا یقین دلا دیا جنہیں احساس تھا کہ وفات پا گئے وہ بھی منزلِ یقین پر پہنچ گئے۔ کچھ نے تو اعتراف کیا

کہ جب تک حضرت ابوبکر نے یہ آیت نہیں پڑھی تھی اس وقت تک احساس نہ تھا کہ یہ آیت بھی نازل ہو چکی ہے۔ حضرت عمر نے یہ آیت سُنی تو کہا میرے پاؤں ٹوٹ گئے اور کھڑے رہنے کی تاب مجھ میں نہ رہی اور یقین ہو گیا کہ واقعی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا سے رحلت فرما گئے۔

آیت کی تشریح ختم ہو گئی مگر ایک ضروری بات رہ گئی۔ اس کی طرف شیخ الاسلام نے اشارہ کیا ہے وہ بھی سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں قد خلت من قبلہ الرسل میں خلت خلو سے مشتق ہے جس کے معنے ہو چکنے اور گزرنے اور چھوڑ کر چلے جانے کے ہیں۔ اس کے لیے موت لازم نہیں جیسے فرمایا واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا واذا خلوا الی شیاطینھم یعنی جب تمہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ نیز الرسل میں لام استغراق نہیں جنس ہے۔ کیونکہ یہاں اثبات مدعا میں استغراق کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کا جملہ حضرت مسیح کے بارے میں فرمایا: ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل کیا لام استغراق ہے کہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تمام پیغمبر حضرت مسیح سے پہلے ہو چکے ہیں کوئی ان کے بعد آنے والا نہیں رہا۔ لامحالہ لام جنس لینا ہوگا وہ ہی یہاں لیا جائے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف اور ابن عباس کی قرأت میں الرسل نہیں رسلٌ نکرہ ہے باقی خلو کی تفصیل میں صرف موت یا قتل کا ذکر اس لیے کیا کہ موت طبعی بہرحال آنے والی تھی اور قتل کی خبر اس وقت مشہور کی گئی تھی۔ اور چونکہ صورت موت کا وقوع میں آنا مقدر تھا اس لیے اس کو قتل پر مقدم کیا۔ ابوبکر الصدیق نے حضور کی وفات کے وقت سب صحابہ کے مجمع میں یہ پوری آیت تلاوت کی بلکہ آیت انک میت' بھی پڑھی تو لوگ قد خلت اور افائن مات اور انک میت سے خلو اور موت پر جواز و عدم استبعاد پر متنبہ ہو گئے جو صدیق اکبر کی غرض تھی۔ موت کے واقع ہو چکنے پر نہ صدیق اکبر نے اس سے استدلال کیا نہ کسی اور نے یہ سمجھا۔ اگر یہ الفاظ موت کے واقع ہو چکنے کی خبر دیتے تو چاہیے تھا کہ نزول آیت کے وقت یعنی وفات سے ، سال پہلے ہی سمجھ لیا جاتا کہ آپ کی وفات ہو چکی ہے۔ اس تقریر سے بعض محرفین کی سب تحریفات ہباءً منثورا ہو جاتی ہیں بخوف تطویل ہم زیادہ بسط نہیں کر سکتے" اہل علم کے لیے اشارات کافی ہیں۔

ادائے فرض میں کوتاہی روا نہیں

۲۶۱۔ اگر آپ کا وصال ہو جاتے یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے۔ یاد

رکھو جو بھی اُلٹے پاؤں پلٹے گا وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا اور اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو جزا دے گا۔
یعنی آپ کا اس دنیا سے گزر جانا کچھ اچنبا نہیں ہے۔ اس وقت نہ سہی اگر کسی وقت آپ کی وفات ہو گئی یا شہید کر دیے گئے تو کیا تم دین کی خدمت و حفاظت کے راستہ سے اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دو گے جیسے اس وقت محض قتل کی خبر سن کر بہت سے لوگ حوصلہ چھوڑ بیٹھے تھے یا منافقین کے مشورے کے موافق العیاذ باللہ سرے سے دین کو خیر باد کہہ دو گے تم سے ایسی اُمید ہرگز نہیں ہے اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اپنا ہی نقصان کرے گا اللہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں بلکہ تم شکر کرو اگر اس نے تمہیں اپنے دین کی خدمت کا موقعہ دے دیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی ‏ ‏ ‏ ‏ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اور شکر یہی ہے کہ تم بیش از بیش خدمتِ دین میں مضبوط ثابت ہو۔ اس سے یہ بھی اشارہ نکلتا ہے کہ حضورِ انور کی وفات پر کچھ لوگ دین سے پھر جائیں گے اور جو قائم رہیں گے ان کو بڑا ثواب ہے اسی طرح ہوا کہ کچھ حضورِ انور کے وصال مبارک کے بعد مرتد ہو گئے۔ صدیقِ اکبر نے ان کو پھر مسلمان کیا اور کچھ مارے گئے۔[1]

دراصل اس آیت میں اس اصلِ عظیم کا اعلان ہے کہ بنائے کار اصول و عقائد ہیں نہ کہ شخصیت و افراد۔ شخصیت کتنی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے شخصیت ہم میں موجود نہ ہے یا درمیان سے ہٹ جائے تو ہم سچائی کی راہ سے کیوں منہ موڑیں۔ سچائی کی وجہ سے شخصیت قبول کی جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ شخصیت کی وجہ سے سچائی سچائی ہو گئی ہو۔ جنگِ اُحد میں کسی مخالف نے یہ بات اُڑا دی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ سن کر بہت سے مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ کچھ نے کہا کہ جب پیغمبر نہیں رہے تو لڑنے سے کیا فائدہ۔ کچھ لوگ جو علانیہ منافق تھے انہوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر یہ نبی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ جنگ میں مارے جاتے۔ یہاں تک آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو بھی ایک روز دُنیا سے جانا ہے لہٰذا اگر وہ دُنیا سے رحلت فرماتے دارِ بقا ہو جائیں گے تو کیا تم حق پرستی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی راہ سے ہٹ جاؤ گے اور تمہاری حق پرستی حق کے لیے نہیں بلکہ محض ایک خاص شخصیت کے لیے تھی۔ فرض کردہ کہ جنگ اُحد والی بات صحیح ہوتی تو کیا حضور کی موت کے ساتھ تمہاری حق پرستی پر بھی موت طاری ہو جاتی۔ اگر تم حق کے لیے لڑ رہے تھے تو جس طرح وہ ان کی زندگی میں حق تھا اسی طرح وہ ان کی وفات کے بعد بھی حق ہے اور ہمیشہ حق رہے گا۔[1]

موت ایک نوشتہ الٰہی ہے

۲۶۲ ۔ اور دیکھو اللہ کے حکم کے بغیر کوئی جان نہیں مر سکتی جب کوئی شخص بغیر حکم الٰہی مر نہیں سکتا خواہ کتنے ہی اسباب موت جمع ہوں۔ اور ہر ایک کی موت وقت مقررہ پر آئی ضرور ہے خواہ بیماری سے ہو یا قتل سے یا کسی اور سبب سے تو خدا پر توکل کرنے والوں کو اس سے گھبرانا نہ چاہیے اور نہ کسی بڑے یا چھوٹے کی موت کو سن کر مایوس اور بددل ہو کر بیٹھنا چاہیے۔[2]

اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمہارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت بھی تمہیں حاصل ہے اس میں تمہاری محنت و کوشش کا مقصود کیا ہے دُنیا یا آخرت۔[3]

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ہر شخص کی موت نوشتہ الٰہی ہے جب تک اس نوشتہ کی مقررہ مدت پوری نہیں ہوتی اس وقت تک کسی کی موت نہیں آتی۔ موت جب بھی آئے گی حکم خداوندی سے آئے گی اس کے بغیر نہیں آسکتی اور پھر جب آئے گی وقت موعود پر آئے گی اس سے پہلے نہیں آسکتی خواہ خطرات کیسے ہی شدید ہوں۔ ان حقائق کا اگر استحضار ہے تو موت کا طبعی خوف بھی حدِ اعتدال پر قائم رہے۔

کتاباً موجّلاً کی تشریح

کتاباً موجّلاً یعنی موت کا وقت لکھا ہوا ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ موت کی اسی تاجیل

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام [3] تفہیم القرآن

کو دوسری جگہ تقدیر کہا ہے نحن قدرنا بینکم الموت یعنی ہر شخص کی زندگی کے لیے اللہ نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام مقرر فرما دیے ہیں جن کی طاعت اس پر واجب ہے۔ علیٰ ہٰذا انسانوں کی ترقی و زوال امور و حیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیے ہیں۔ غرض ان کو آرام و تکلیف جو بھی پیش آتی ہے۔ خدا کے علم و اجازت سے پیش آتی ہے ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدر کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بدلتی نہیں ہے ایسے ہی یہ بات بھی مٹ نہیں سکتی اور بدلتی نہیں ہے۔

طالبِ دُنیا اور طالبِ آخرت

۲۶۳ - اور جو بھی دُنیا کے فائدے پر نظر رکھے گا ہم اسے دُنیا میں سے دیں گے اور جو آخرت کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ آخرت کا ثواب پائے گا ہم اپنے شکر گزار بندوں کو ضرور اجر عطا کریں گے یعنی اگر چاہیں گا قال عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن نرید اور آخرت کے ارادہ کرنے والوں کو آخرت میں یقیناً بدلہ ملے گا۔ اس آیت کے پہلے جملہ میں ان لوگوں پر تعریض ہے۔ جنہوں نے مالِ غنیمت کی طمع میں حکم عدولی کی اور دوسرے میں ان کا ذکر ہے جو برابر فرمانبرداری میں ثابت قدم رہے اور آخر میں فرمایا کہ جو لوگ اس دین پر ثابت قدم رہیں گے ان کو دین بھی ملے گا اور دُنیا بھی لیکن جو کوئی اس نعمت کی قدر جانے کذا فی الموضح [1]

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے اس کمزوری کی نشاندہی فرمائی ہے کہ انسان کی نظر مادی فوائد پر ہے اور روحانی فوائد اس کی نگاہ میں بے حقیقت ہیں۔ وہ اپنی تمام محنتوں اور کوششوں کا قبلۂ توجہ دنیوی منافع کو قرار دیتے ہیں۔ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر روحانی فوائد کے پیچھے پڑے تو دُنیا کے فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ دُنیا کے طالبوں کو دُنیا سے اتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے اور وہ آخرت کے اجر سے بالکل محروم رہتے ہیں اس کے برعکس جو آخرت کا طالب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو آخرت کے انعامات سے نوازتا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور دُنیا میں بھی اس کو اس قدر دیتا ہے جتنا اس کے لیے مقدر ہوتا ہے۔

آیت میں ثواب کا لفظ آیا ہے ثواب کے معنے ہیں نتیجہ عمل۔ ثوابِ دُنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اسی دُنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثوابِ آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اس سعی و عمل کے نتیجے میں آخرت کی پائدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اخلاق کے معاملہ میں فیصلہ کن سوال یہی ہے کہ اس کارزارِ حیات میں جو دوڑ دھوپ آدمی کر رہا ہے اس میں آیا وہ دُنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اخروی نتائج پر[1]

قرآن میں شکر کا مفہوم

یہ جو فرمایا ہے کہ ہم شکر کرنے والوں کو ان کی جزا ضرور دیں گے۔ یہ فقرہ نہ صرف پہلی بات کی تاکید اور تائید ہے بلکہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس میں اور اضافہ کا وعدہ ہے اور یہ اضافہ کیا اور کتنا ہوگا؟ اس کی جلالتِ قدر کو ظاہر کرنے کے لیے سین تاکید لگایا ہے اور جزا میں ابہام رکھا ہے پہلی آیت میں نیک اعمال بجا لانے والوں کو شاکرین کہا اور اس آیت میں آخرت میں ثواب کا ارادہ رکھنے والوں کو شاکرین کہا ہے۔ لغت میں شکر کے معنے جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تر و تازگی ہونا اور دودھ زیادہ دینا ہیں۔ اس سے انسانوں کے محاورے میں یہ معنے پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے۔ یہ قدر شناسی تین طرح ہوتی ہے دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے۔ یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں کہ کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو دوسری نعمتوں کے ساتھ سب سے بڑی نعمت دین کی مرحمت فرمائی ہے۔ آیت میں شاکرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی اس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انہیں دُنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالم کی خبر دی اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دُنیا کی

---

[1] تفہیم القرآن

چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم تک ان کا سلسلہ دراز ہے۔ یہ وسعتِ نظر یہ دُور بینی، عاقبت اندیشی حاصل ہونے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اس دُنیوی زندگی کے ابتدائی مراحل میں بار آور ہوتے نہ دیکھے یا اس کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے اور اس کے باوجود اللہ پر بھروسہ کرکے وہ کام کرتا چلا جاتے جس کے بارے میں اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ آخرت میں اس کا نتیجہ بہتر ہے وہ شکرگزار بندہ ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا ہوں جن کا حال یہ ہے کہ دُنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے ہیں ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جھک پڑیں اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بارآور ہونے کی اُمید نہ ہو یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو ان میں آخرت کے نتائج خیر کی اُمید پر اپنا وقت اپنا مال اور اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں وہ ناشکرے ہیں اور اس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے ان کو نبوّت کے ذریعے عطا کیا ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا
أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ
وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ
الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ ع

(اور دیکھو) کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ میں حصہ لیا بس اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر آتی ہیں ان کی وجہ سے کبھی وہ بے ہمت نہیں ہوتے اور نہ کمزور پڑے اور نہ وہ ظالموں کے سامنے سرنگوں ہوتے اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہے جو صبر کرتے ہیں۔[۲۶۴] ان کی دعا بس یہ ہوتی تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور

کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کو معاف فرما، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے پر ہماری مدد فرما[۲۶۵]۔ ان کو اللہ نے دنیا میں اجر عطا فرمایا اور آخرت کا بھی بہتر ثواب دیا اور اللہ نیکو کار لوگوں ہی کو پسند کرتا ہے[۲۶۶]۔

قانونِ آزمائش کی تاریخ

اس آیت میں قانونِ آزمائش کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جو کچھ اُحد میں تمہارے ساتھ ہوا ہے وہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوا بلکہ جب سے حق و باطل کی کشمکش کا آغاز ہوا ہے اسی وقت سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خدیجۃ الکبریٰ ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں ورقہ نے حضور کے آغازِ نبوت کی داستان سُن کر پہلے یہ بات کہی کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ پر اللہ نے اتارا تھا اور پھر بتایا کہ اے کاش میں آپ کے زمانہ نبوت میں تنومند اور توانا ہوتا اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کرے گی۔ حضور انور نے بڑی حیرت سے دریافت کیا کیا میری قوم مجھے نکال دے گی۔ ورقہ نے کہا جی ہاں۔ جب بھی کوئی خدا کا رسول اللہ کا دین لے کر آیا ہے ہمیشہ اس سے دشمنی کی گئی ہے یعنی نبوت کی تاریخ یہی ہے۔

[illegible] مصائب کا طوفان آتا ہے۔ ستر مسلمان خاک و خون میں لت پت ہو کر راہِ خدا میں جان دیتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن و ملال کا ازالہ پچھلے پیغمبروں کی زندگی میں قانونِ آزمائش کے نفاذ کی روداد سُنا کر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی یہ صورت روزِ اول ہی سے متعین فرما رکھی ہے۔ یہاں کامیاب وہ ہے جو آزمائشوں میں

نہ تو بے ہمت ہو نہ کمزور پڑے اور نہ کسی حال میں ظالموں کے سامنے عجز و بے چارگی کا اظہار کرے۔ وہن، ضعف اور استکانت فی الحقیقت ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

۲۶۴ - اور دیکھو کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر اللہ والوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر آئی ہیں ان کی وجہ سے نہ وہ بے ہمت ہوتے نہ کمزور پڑے اور نہ وہ ظالموں کے سامنے سرنگوں ہوتے اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہے جو صبر کرتے ہیں۔ یعنی تم سے پہلے بہت اللہ والوں نے نبیوں کے ساتھ ہو کر کفار سے جنگ کی ہے جس میں بہت تکلیفیں اور سختیاں ان کو اٹھانی پڑی ہیں لیکن ان شدائد و مصائب سے نہ ان کے ارادوں میں سستی ہوئی نہ ہمت ہارے نہ کمزوری دکھائی نہ دشمن کے سامنے دبے اللہ تعالیٰ ایسے ثابت قدم رہنے والوں سے خاص محبت کرتا ہے۔ یہ ان مسلمانوں کو تنبیہہ فرمائی اور غیرت دلائی جنہوں نے اُحد میں کمزوری دکھائی تھی حتیٰ کہ بعض نے یہ کہہ دیا تھا کہ کسی کو بیچ میں ڈال کر ابو سفیان سے امن حاصل کر لیا جائے مطلب یہ ہے کہ جب پہلی اُمتوں کے حق پرستوں نے مصائب و شدائد میں اس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا تو اس اُمت کو جو خیر الامم ہے ان سے بڑھ کر صبر و استقامت کا ثبوت دینا چاہیے۔[1]

آیت کا مطلب واضح اور صاف لفظوں میں یہ ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں گزر چکی ہیں کہ اللہ کے نبیوں نے جہاد کیا ہے اور اس جہاد میں اللہ کے بہت نیک بندے شامل ہوئے ہیں اور ان کو اس راہ میں مصیبتوں، ہزیمتوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے لیکن اس چیز کا اثر ان پر یہ نہیں پڑا کہ وہ ہمت ہار جائیں، بھوڑ ولا پن دکھائیں یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیں بلکہ انہوں نے راہِ حق میں استقامت دکھائی اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ نہ تو نبی اور اس کے صحابہ کے لیے جنگ پیش آنا کوئی انوکھی بات ہے اور نہ مصائب و شدائد سے ان کا گزرنا کوئی نیا حادثہ ہے۔ یہ تو انبیاء کی ایک سنت اور خدا کے قانونِ آزمائش کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اور اس کے ساتھی اللہ کے قانونِ آزمائش سے گزرے بغیر ہی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ مولانا دریا بادی نے کیسی لطیف بات لکھی ہے کہ جہاد کی سنت انبیاء قدیم کے وقت سے چلی آتی ہے اور اس راہ کے رہرووں کو برابر ان منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں جنگ کے موضوع پر تین چیزوں کی نفی فرماکر ایک بات کا اثبات کیا ہے۔ جن تین کی نفی فرماتی ہے یہ ہیں۔ وہن، ضعف اور استکانۃ اور جس چیز کو ثابت کیا ہے بلکہ جسے مدارِ محبت قرار دیا ہے وہ صبر ہے۔

وہن کے معنے پہلے بتائے جاچکے ہیں کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کی محبت اور موت کی ناگواری کو وہن قرار دیا ہے۔ اصل یہی ہے اور بے ہمتی یا قتادہ کے لفظوں میں عاجزی یا زجاج کی رائے کے مطابق بزدلی اور نامردی اس کا نتیجہ ہیں۔ بلاشبہ جسے حُبِّ دُنیا کا روگ لگ جائے، اس میں نامردی، بے ہمتی اور عجز و بے چارگی کی بیماریاں ناگزیر ہیں۔ ضعف یہ ہے کہ میدان میں نکلے مگر کمزوری دکھاتے اور اس کو ارادہ کی کمزوری کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ لسان العرب میں وہن اور ضعف دونوں کے معنے اس طرح بتائے ہیں کہ دشمن سے جنگ میں نہ توقف کیا اور نہ بزدل ہوئے۔

استکانۃ یہ ہے کہ لاچار ہو کر حریف کے آگے گڑگڑانے لگے۔ اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اس کا اشتقاق کان سے مان کر اسے استفعال کے وزن پر بتایا ہے اور لسان العرب میں اس کا مادہ سکن یا سکون مان کر افتعال کے وزن پر بتایا ہے۔ مادہ کچھ ہو معنے دونوں کے ایک ہیں عاجزی اختیار کرنا۔ اگر استفعال کہا جائے تو استکنوا ہونا چاہیے۔ صاحبِ لسان نے اشباع کا سہارا لیا ہے۔ کچھ ہو ان تینوں میں گہرا معنوی ربط ہے۔ موت سے خوف اور دُنیا کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے یہ وہن ہے اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل رونما ہوتا ہے یہ ضعف ہے اور اس ضعف سے مدِ مقابل کے سامنے گڑگڑانے کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اس کا نام استکانۃ ہے۔ آخر میں واللہ یحب الصابرین کہہ کر غلط فہمیوں کے ان تو بر تو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرے پر پڑے ہوتے ہیں۔ اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی مجبوری سے درگزر کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لاتے کا نام ہے۔ ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آنے پر بھی دل برداشتہ نہ ہو ہمت سے کام لے ارادہ میں قوت پیدا کرے اور اپوزیشن کے سامنے تن کر رہے۔

مصائب کے ہجوم میں اللہ کا سہارا

۲۶۵ - ان کی دعا بس یہ ہوتی تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوتی ہیں ان کو معاف فرما اور ہمارے قدم جما اور کافروں کے مقابلے پر ہماری مدد فرما۔ یعنی مصائب و شدائد کے ہجوم میں نہ گھبراہٹ کی کوئی بات کی، نہ مقابلے سے ہٹ جانے اور دشمن کی اطاعت قبول کرنے کا ایک لفظ زبان سے نکلا بولے تو یہ بولے کہ خداوندا تو ہم سب کی تقصیرات اور زیادتیوں کو معاف فرمائے ہمارے دلوں کو مضبوط اور مستقل رکھ، تاکہ ہمارا قدم جادۂ حق سے نہ لڑکھڑائے اور ہم کو کافروں کے مقابلے میں مدد پہنچا۔ وہ سمجھے کہ بسا اوقات مصیبتوں کے آنے میں لوگوں کے گناہوں اور کوتاہیوں کو دخل ہوتا ہے اور ہم میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس سے کبھی تقصیر نہیں ہوتی ہو گی۔ بہرحال بجائے اس کے کہ گھبرا کر مخلوق کی طرف جھکتے اپنے خالق و مالک کی طرف جھکے ہیں[1]

گویا اس کردار کے ساتھ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ میدان جنگ میں یہ اللہ والے بے ہمت نہیں ہوتے ان کے ارادوں میں کمزوری نمایاں نہیں ہوتی اور اپنے مدمقابل کے آگے نہیں گرگڑاتے۔ ان اللہ والوں کی گفتار یہ تھی کہ اے اللہ ہماری گزشتہ ناکامی کے قصور کہ جو ہماری کوتاہی و ذنب یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرما اور ہمیں مزید ثبات قدم عطا کر کے دشمنوں پر کامیابی بخش۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ ان لوگوں کے کردار میں کیا لغزش ہوئی۔ زبان تک ان کے کلمات تمجید و تحمید اور اعتراف عجز و قصور کے لیے وقف رہی۔

نیز اس میں تعلیم ہے کہ جب مصیبت آوے ظاہری تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرے اور اپنے گناہ بخشوائے کہ اکثر مصیبت کا سبب گناہ ہوتا ہے۔

غم چو بینی زود استغفار کن[2]

قرآن نے اپنے پیرووں میں میدان جنگ میں مقابلہ کا جو طریق کار بتایا ہے اگرچہ اس میں مادی قوتوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن اس نے مقابلہ میں کامیابی کی عمارت اس پر قائم نہیں کی ہے بلکہ آپ آگے چل کر قرآن ہی میں سورۂ منافقون میں پڑھیں گے کہ قرآن نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹاپے کا مذاق اڑایا ہے کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان و یقین سے خالی ہے اس لیے ان میں بہادری نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد اللہ سے لگاؤ، اس کی محبت اور اس پر یقین رکھنا ہے یہاں اگر ایک طرف ان کی مادیت اور جسمانیت کا اشارہ کیا تو دوسری طرف ان کی معنویت اور روحانیت کو صراحۃً سراہا۔

اسی لیے نفسیات و اخلاق کے علماء اس اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں کہ میدانِ جنگ میں ثبات اور جماؤ کا جو مظاہرہ اہلِ ایمان کرتے ہیں وہ منکرین کو نصیب نہیں ہے۔

یہاں اور وہاں کی کامیابی

۲۶۶۔ ان کو اللہ نے دُنیا میں بھی اجر عطا فرمایا اور آخرت کا بھی بہترین ثواب دیا اور اللہ نیکوکار لوگوں کو پسند کرتا ہے یعنی دُنیا میں ان کی فتح و ظفر کا سکہ بٹھا دیا۔ وجاہت و قبول عطا کیا اور آخرت کا جو بہترین ثواب ملا اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ دیکھو جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ ٹھیک رکھیں اور نیک کام کریں ان سے خدا ایسی محبت کرتا ہے اور ایسا پھل دیتا ہے [1]

گویا ان کو یہ صلہ ملا کہ دُنیا میں بھی اللہ نے ان کو اقتدار و حکومت سے نوازا اور آخرت میں بھی ان کے لیے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے [2]

آیت کا آخری فقرہ یعنی ان اللہ یحب المحسنین کہ اللہ حسن کاروں سے محبت کرتا ہے گہری معنویت رکھتا ہے اس سے پہلے پڑھ چکے ہو کہ واللہ یحب الصابرین اللہ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے۔ قرآن میں اس قسم کی تعبیر مختلف اعمال کے بارے میں آئی ہے مثلاً توبہ، توکل، اقساط، تقویٰ، قتال فی سبیل اللہ، طہارت یعنی ایمان و عملِ صالح کے بعد ان ذریعوں سے اللہ کی محبت اور پیار کی دولت ملتی ہے۔

مسندِ احمد میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں سے پیار نہیں کرتا۔ محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوصِ نیت سے اپنی جان فدا کرتے ہیں۔ اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کرکے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اُٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے تین محروم ہیں۔ اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کر مال فروخت کرنے والا سوداگر۔[1]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندے کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخش جاتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے رسول اللہ کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ہے۔

اللّٰھم اجعلنی منھم

---

[1] مسند احمد بسند ابوذر

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ
أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ
خَيْرُ النَّاصِرِينَ ۝ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ
وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ۝ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ
تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَ
عَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ
لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۝

اے اہل ایمان! اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو یاد رکھو کہ وہ تمہیں راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھیر دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔[۲۶۸] (یہ دشمنانِ حق

تمہارے کام نہ آئیں گے، بلکہ اللہ تمہارا کارساز ہے اور مددگاروں
میں وہ ہی سب سے بہتر مددگار ہے[268]۔ عنقریب وہ وقت آرہا ہے
کہ جب ہم اہلِ کفر کے دلوں میں تمہاری ہیبت ڈال دیں گے۔
کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو شریک کیا ہے جن کے
شریک ہونے پر اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے، اور ان
کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ظالموں کی قیام گاہ بہت ہی بُری ہے[269]
اور دیکھو یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت سچا کر دکھایا تھا
جب کہ تم اس کے حکم سے بے دریغ قتل کر رہے تھے[270]۔ مگر جب
تم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا اور اس معاملہ میں باہم دگر جھگڑنے
لگے اور باوجودیکہ اللہ نے تمہیں تمہاری محبوب چیز یعنی فتح کا
جلوہ دکھادیا تھا تم نافرمانی کر بیٹھے[271]۔ تم میں سے کچھ لوگ دُنیا
کے طالب تھے اور کچھ تم میں سے آخرت کی خواہش رکھتے تھے[272]

پھر اللہ نے تم کو دشمن کی جانب سے اس لیے ہٹا دیا کہ وہ تمہاری آزمائش کرے[۲۶۳]۔ بلاشبہ اور فی الواقع اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تو اہلِ ایمان پر بڑی مہربانی والا ہے[۲۶۴]۔

آزمائشوں کا تنوع

آیاتِ سابقہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ ایمان کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو ہمیشہ آزمائشوں کے دور سے گزرنا پڑا ہے۔ ایک نظری انسان کو تو اتنی روشنی کافی ہے لیکن ایک عملی انسان کو ایسے انسان کو جو اس کا علم صرف برائے علم نہیں بلکہ برائے عمل چاہتا ہو اس سے زیادہ تیز روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ چونکہ دُور کا تماشائی نہیں بلکہ بذاتِ خود اس راستہ کا راہرو ہے۔ اس لیے وہ اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو دیکھنا چاہتا ہے وہ بس اتنا جان کر خاموش اور بے فکر نہ ہو گا کہ ایمان کی راہ مشکلات سے گھری ہوتی ہے بلکہ اسے تجسس ہو گا کہ یہ مشکلیں کس طرح کی ہوں گی تاکہ ان کے لیے وہ پہلے سے اپنے دل و دماغ کو تیار کرے۔ اور اچانک ان کا سامنا ہو جانے پر انتشارِ فکر و عمل کا شکار نہ ہو جاتے اس لیے تین رکوع میں ان مشکلات و مصائب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ کا یہ قانونِ آزمائش کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کن کن طریقوں سے علمبردارانِ حق کو آزمایا جاتا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشیں ہمہ جہتی ہوتی ہیں۔ انسان کو ہر طرف سے ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ چھانا جاتا ہے اور اس کے جذبات کا کوئی تار نہیں جس پر مضرابِ ابتلاء کی ضرب نہ پڑتی ہو۔ ان آزمائشوں کو ہم حسبِ ذیل قسموں میں تبدیل کرتے ہیں۔

چکمے اور دلفریب باتیں

۲۶۵۔ اے اہلِ ایمان اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی تو یاد رکھو وہ

تمہیں راہِ حق سے اُلٹے پاؤں ہٹا دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ یعنی جنگ اُحد میں اہلِ ایمان کے دل ٹوٹے تو کافروں اور منافقوں نے موقع پایا الزام اور طعنہ دینے لگے۔ بعض خیرخواہی کے پردے میں سمجھانے لگے تاکہ آئندہ لڑائی پر دلیری نہ کریں۔ حق تعالیٰ خبردار کرتا ہے کہ دشمن کا فریب مت کھاؤ۔ اگر خدا نہ کرے تم ان کے چکموں میں آگئے تو جس ظلمت سے تمہیں خدا نے نکالا ہے پھر اُلٹے پاؤں اسی میں جا گرو گے اور رفتہ رفتہ دینِ حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ جس کا نتیجہ دُنیا و آخرت کے خسارے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پہلے اہلِ حق اور اللہ والوں کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی تھی۔ یہاں بدباطن اور شریر انسانوں کا کہا ماننے سے منع کیا تاکہ اہلِ ایمان ہوشیار ہو جائیں اور اپنا نفع و نقصان سمجھ سکیں۔[1]

منافقین اور یہودی اُحد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے آج فتح ہے تو کل شکست خدا کی جس حمایت و نصرت کا انہوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔[2]

یہ پروپیگنڈہ اُحد کی ناکامی کو سامنے رکھ کر دراصل بدر کی فتح کے اثرات کو مٹانے کے لیے تھا انہوں نے اپنے منظم پروپیگنڈے سے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمہارا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ حضور انور خدا کے فرستادے ہیں۔ اور ان کو خدا اور فرشتوں کی مدد حاصل ہے اگر بات یہ ہوتی تو تم اُحد میں شکست کیوں کھاتے۔ بدر میں تم نے فتح حاصل کی۔ اُحد میں ہم فتحیاب رہے یہ تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے۔ اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کرنا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ کر بیٹھنا محض طفلانہ خام خیالی ہے۔[3]

عوام فریب پروپیگنڈے کی یہ ایک مثال ہے۔ نفسیاتِ انسانی کی روشنی میں ذرا اس کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ انہوں نے اہلِ ایمان کی قوتِ فیصلہ پر کیسا زبردست شب خون مارا ہوگا اور اہلِ ایمان بھی وہ جو مصیبت زدہ ہوں اور پھر اس کا اندازہ کیجئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر کیا بیتی ہوگی جب وہ دیکھتے کہ ان کی گھنٹوں دنوں اور مہینوں کی داعیانہ مساعی کا حاصل بس ایک چلتے ہوئے فقرے کی نذر ہو گیا مگر اللہ سبحانہٗ نے کیا فرمایا یہ کہ دلوں کو نہ ٹوٹنے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] تدبرِ قرآن

دو۔ ان کا کہا نہ مانو ہمیشہ یوں ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی یوں ہی ہوگا۔ اگر دعوتِ حق سے تمہیں قلبی تعلق ہے اور چاہتے ہو کہ یہ کامیاب ہو تو اس کا یہ طریق نہیں ہے کہ ان باتوں کو سنو اور ان کو مانو۔ اگر ان کا کہا مانو گے تو پھر تمہارے قدم دعوتِ حق پر جمے نہ رہیں گے۔ اس میں تمہاری تباہی ہے اس کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ ان کا کہا مانو بلکہ اللہ کا کہا مانو۔

دشمنانِ حق کی نہیں اللہ کی طاعت کرو

۲۶۸۔ یہ دشمنانِ حق تمہارے کام نہ آئیں گے بلکہ اللہ تمہارا کارساز ہے اور مددگاروں میں وہی سب سے بہتر مددگار ہے۔ لہٰذا تمہیں اسی کا کہا ماننا چاہیے۔ اسی کی مدد پر بھروسہ کرنا چاہیے جس کی مدد پر خدا ہو اس کو کیا حاجت ہے کہ دشمنانِ خدا کی مدد کا منتظر رہے یا ان کے سامنے گردن طاعت خم کرے۔ حدیث میں ہے کہ اُحد سے واپسی کے وقت ابوسفیان نے ہبل کی جے پکاری اور کہا لنا العزی ولا عزی لکم آپ نے فرمایا کہ جواب دو کہ اللہ مولانا ولا مولی لکم [1]

شیخ الاسلام نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل صحیح بخاری میں اس طرح آئی ہے کہ اُحد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اٹھا کر آخر میں پھر ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زخموں کی تاب نہ لا کر گر گئے تھے اور آپ کے وصال کی خبر بھی مشہور ہو گئی تھی تو ابوسفیان نے میدان سے واپس ہوتے وقت بلند آواز سے کہا کہ کیا قوم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا قوم میں ابوبکر ہیں پھر آپ نے فرمایا کہ جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا قوم میں عمر بن الخطاب ہیں اور ساتھ ہی کہا کہ اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ تب حضرت عمر نے فرمایا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لیے زندہ ہیں۔ تب ابوسفیان پکارا "اعلی ھبل" یعنی ہبل بت کی جے۔ حضور انور نے فرمایا کہ جواب دو اللہ اعلی و اجل اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلال والا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا لنا العزی ولا عزی لکم ہمارا بُت عزیٰ ہے تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب دو اللہ مولانا ولا مولی لکم اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ آیت کے الفاظ بل اللہ مولٰکم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں اس طرف اشارا معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم توحید الٰہی کی حد تک کس قدر غیور تھے جب اپنی زندگی یا موت کا سوال ہوا تو خاموشی کا حکم دیا۔ لیکن جب بُت کی بڑائی کی گئی تو چونکہ یہ توحید الٰہی پر حملہ تھا اس لیے آپ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا اور بتایا کہ ہم یعنی مسلمان کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارا مولیٰ اور مددگار اللہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے:

ذالک بان اللہ مولی الذین آمنوا وان الکافرین لا مولی لھم

اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

علامہ آلوسی نے یہ لطیف بات بتائی ہے کہ یہ فقرہ دو طرح سے پڑھا گیا ہے۔ ایک صورت تو وہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں یعنی بل اللہ میں اللہ کی ہ پر پیش ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ کفار تمہارے کارساز نہیں ہیں کہ تم ان کی اطاعت کرو اور نہ وہ تمہارے مددگار ہیں بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ اسمیہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کی ہ پر زبر پڑھو اور اسے فعل محذوف کا مفعول بناؤ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ان کفار کی اطاعت نہ کرو بلکہ اس اللہ کی اطاعت کرو جو تمہارا آقا و مالک ہے۔ مولانا عثمانی کا میلان دوسری طرف ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم کفار کی اس لیے اطاعت کرتے ہو کہ ان سے تمہیں مدد ملے گی۔ یہ نادانی ہے کیونکہ یہ تو خود عاجز ہیں تمہیں تو اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے کہ وہ فی الواقع کارساز و مددگار ہے۔

رُعب و ہیبت اور اس کی وجہ

۲۶۹۔ عنقریب وہ وقت آ رہا ہے جب ہم اہل کفر کے دلوں میں ہیبت ڈال دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو شریک کیا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ظالموں کی قیامگاہ بہت بُری ہے۔

یہ تو تمہارا امتحان تھا۔ اب کافروں کے دل میں ایسی ہیبت اور رُعب ڈالیں گے کہ وہ باوجود تمہارے زخمی اور کمزور ہونے اور نقصان اٹھانے کے تم پر پلٹ کر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ابوسفیان اپنی فوج لے کر بے نیل مرام میدان سے بھاگا۔ راستہ میں ایک مرتبہ خیال بھی آیا کہ ایک تھکی ماندہ زخم خوردہ فوج کو ہم یوں ہی آزاد چھوڑ کر چلے آئے۔

چلو پھر واپس ہو کر ان کا کام تمام کر دیں مگر ہیبتِ حق اور رعبِ اسلام کے اثر سے ہمت نہ ہوئی کہ اس خیال کو عمل میں لا سکے برخلاف اس کے مسلمان مجاہدین نے حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا اور اس کے بعد کبھی موقعہ نہ دیا کہ اُحد کے واقعات کا اعادہ ہو سکے۔ مشرک خواہ کتنا ہی زور دکھائے اس کا دل کمزور ہوتا ہے جیسا معبود ویسے عابد ضعف الطالب والمطلوب اور ویسے بھی اصل زلاد قوت تو اللہ کی تائید و امداد سے حاصل ہے جس سے کفار و مشرکین بلاشبہ محروم ہیں۔ اسی لیے جب تک مسلمان مسلمان رہے ہمیشہ کفار ان سے خائف و مرعوب رہے بلکہ ہم آج تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود مسلمانوں کے سخت انتشار و تشتت اور ضعف و تنزل کے دُنیا کی تمام کافر طاقتیں اس سوئے ہوئے زخمی شیر سے ڈرتی رہتی ہیں اور ہمیشہ فکر رکھتی ہیں کہ کہیں یہ شیر بیدار نہ ہو جائے۔ علمی اور مذہبی مناظروں میں بھی اسلام کا یہی رُعب مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ حدیث میں آپ نے فرمایا کہ میرا رُعب ایک ماہ کی مسافت سے دُشمنوں کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے بے شک اسی کا اثر ہے جو اُمتِ مسلمہ کو ملا۔[1]

تاریخ کی بے لاگ عدالت کا فیصلہ ہے کہ اُحد کے میدان میں باوجود اہلِ ایمان کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب تھا ان کو صاف معلوم ہو گیا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بقیدِ حیات ہیں اور ابوبکر و عمر زندہ ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ظاہر ہے جو اُوپر ہدیۂ ناظرین کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے تو اس نے اپنی بہتری اس میں دیکھی فوراً مکہ کی راہ لے۔ اور رُعب کی وجہ سے ابوسفیان اگلے سال باوجود وعدے کے مقابلہ کے لیے نہ آیا اور جنگِ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو لے کر آیا تب بھی راتوں رات یہ عظیم الشان لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی حقیقت نہ تھی بھاگ اٹھا اور پھر اس کے بعد تو ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف خود ان کے حملوں کا انقطاع ہو گیا بلکہ جب ۸ھ میں ان کی عہد شکنی کی وجہ سے حضور انور دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو کوئی مقابلہ نہ کر سکے۔

حضور انور کا رُعب آپ کے خصائص میں سے ہے

جس حدیث کی طرف شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں اشارہ کیا ہے وہ صحیحین میں حضرت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اس طرح آئی ہے :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں ہیں۔ مجھے رُعب اور دھاک کے ذریعے فتح و نصرت دی گئی، میرے لیے تمام رُوئے زمین مسجد بنادی گئی۔ غنیمت کا مال میرے لیے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لیے حلال نہ تھا۔ شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا۔ مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام دُنیا کے لیے مبعوث ہو کر آیا ہوں۔

ہم یہاں صرف ،،رعب و نصرت،، کے موضوع پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء دُنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے یا وہ بظاہر کمزور بے یار و مددگار رہتے اور ان کو دنیوی طاقت کا کوئی حصہ عطا نہیں ہوا تھا۔ انبیاء کی بڑی تعداد ایسی تھی۔ دوسرے وہ انبیاء ہیں جن کو دُنیا کی ظاہری طاقت بھی دی گئی اور وہ صرف چند ہیں، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان مگر ان میں سے کسی کو بھی رُعب و ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا اور تاریخ اس بیان پر شاہد ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز اگرچہ ابراہیمی بیچارگی اور مسیحی غربت سے ہوا مگر انجام موسوی طاقت داؤدی سلطنت اور سلیمانی شان و شکوہ پر ہوا۔ اور ان سب مافوق یہ تھا کہ آپ کی تمام تر قوت، طاقت، رُعب و ہیبت سب خدا کی راہ میں صرف ہوئی۔ اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا۔ بھولوں نے یاد کیا، سننے والوں نے آوازدی اور یہ اثر پیدا ہوا کہ آپ جس راستے سے نکل گئے گنہ گار اور مجرم سر اطاعت خم کر دیتے اور اپنی سیہ کاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے۔ متعدد حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے فتح و نصرت، رُعب و ہیبت دی گئی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں فنونِ جنگ پر بحث کرتے ہوتے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی ایک فریق کی جو فتح ہوتی ہے وہ اسی وقت ہوتی ہے جب دوسرے فریق پر پہلے کی خداداد مرعوبیت چھا جاتی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف اس لیے عطا ہوا ہے کہ مزید خونریزی کے بغیر ملک میں امن و امان ہو جائے اور صدائے حق کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ اللہ سبحانہٗ نے اس

آیت میں یہ وصف عطا کرنے کا وعدہ فرمایا چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے اس کی شہادت دی۔
وقذف فی قلوبھم الرعب بڑے بڑے دل گردے کے بہادر زرہ میں تلوار بجا بجا کر آتے مگر جب رُوئے روشن پر نظر پڑی تو کانپ کر رہ گئے۔ بڑے بڑے سرکش قبائل آپ کا نام سن کر دم بخود ہو جاتے۔ مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرمانروائی کرتے تھے اور جن کو اپنی فوجی قوت اور طاقت پر ناز تھا جب انہوں نے سرتابی کی بے لڑے بھڑے آپ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی۔ خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے جب ایک صبح ان کے قلعوں کے سامنے دفعتہً اسلام طلوع ہوا تو ان کے منہ سے بیخ نکل گئی کہ "محمد کا لشکر" ابوسفیان جو بارہا ایک فریق مقابل کی حیثیت سے میدان جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا فتح مکہ کے دن جب حضرت عباس اس کو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الٰہی کا نظارہ دکھا رہے تھے اور رنگ برنگ کے علم نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے تو ہر نئے دستہ اور نئے علم کو دیکھ کر کانپ کانپ اٹھتا تھا۔

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست (رومی)[1]

اور یہ جو فرمایا کہ نبوت کے مد مقابل ہونے کی وجہ یہ تھی اشرکوا باللہ تو امرِ واقعہ یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت اہلِ ایمان کی جو جماعت پیدا ہو گئی تھی اس کے مقابلے میں مشرکین عرب کا یہی حال تھا۔ وہ تعداد میں بہت اور سروسامان میں طاقتور تھے مگر اللہ پر ایمان و یقین کی دولت سے محروم تھے۔ مسلمان تعداد میں تھوڑے اور سروسامان سے محروم تھے مگر ایمان و یقین کی روح سے معمور تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلت کی ہیبت سے کثرت کے دل کانپ اٹھے اور مٹھی بھر انسانوں نے عرب کی پوری دنیا کو شکست دے دی۔ اور اس فقرے کو مرعوبیت کی دلیل بنا کر اس اجتماعی قانون کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ جن لوگوں کے سامنے ایمان و یقین کی کوئی روشن و ثابت حقیقت نہیں ہوتی اور خدا کو چھوڑ کر اعتقاد و پرستش کے بہت سے ٹھکانے بنا لیتے ہیں ان کے اندر عزم و یقین کی وہ روح پیدا نہیں ہو سکتی جو اہلِ حق و ایمان کے لیے مخصوص ہے۔ وہ جب کبھی کسی ایسی جماعت کے مقابلے میں نکلیں گے جو ایمان و یقین کی روح سے معمور

---

[1] سیرۃ النبی

ہو گی تو خواہ وہ کتنی شان و شوکت رکھتے ہوں لیکن کبھی اسے مرعوب نہ کر سکیں گے۔

اُحد میں وعدۂ نصرت پورا ہو گیا تھا

۱۵۲۔ اور دیکھو یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم اس کے حکم سے بید ریغ قتل کر رہے تھے۔ نبی کریمؐ نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ اگر صبر و استقلال سے کام لو گے حق تم کو غالب کرے گا۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے اپنا وعدہ ابتدائے جنگ میں سچا کر دکھایا۔ انہوں نے خدا کے حکم سے کفار کو مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ سات یا نو آدمی جن کے ہاتھ مشرکین کے جھنڈے تھے سب وہیں کھیت ہوئے آخر بدحواس ہو کر بھاگے۔ مسلمان فتح و کامرانی کا چہرہ صاف دیکھ رہے تھے اور اموالِ غنیمت ان کے سامنے پڑے تھے کہ تیر اندازوں کی غلطی سے خالد بن الولید نے فائدہ اٹھایا اور یک بیک لڑائی کا نقشہ بدل دیا جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔[1]

یہ گویا ایک شبہ کا جواب ہے کہ اگر خیر الناصرین نے امداد و اعانت کا وعدہ فرمایا تھا تو پھر اُحد میں یہ ہزیمت اور شکست کیوں ہوئی۔ اس کے جواب میں اللہ سبحانہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدۂ نصرت اس موقعہ پر بھی پورا کر دیا۔ اس وعدہ سے عام وعدۂ نصرت مراد ہے اور کچھ کی رائے ہے کہ وہ وعدہ مراد ہے جو بلیٰ ان تصبروا و تتقوا میں کیا گیا تھا۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ وعدہ سے حضور انورؐ کا وہ وعدہ مراد ہے جو آپ نے اُحد میں آغازِ جنگ میں کیا تھا۔ کہ اگر تم صبر و استقلال سے کام لو گے تو اللہ سبحانہٗ تم کو غالب کرے گا۔ حافظ ابن جریر کا میلان بھی اسی طرف ہے اور شیخ الاسلام نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ آیت میں نصرت کا وعدہ پورا کرنے کی عالمِ واقعات میں صورت یہ بتائی ہے کہ اذ تحسونھم باذنہٖ حس کے معنے قتل کے آتے ہیں جیسے مقتول کر کہتے ہیں۔ مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہاں تک قتل کرنا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اُٹھے تاریخی واقعات ہیں۔ کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہاں تک تہ تیغ کیا کہ ان کا صاحبِ لواء مارا گیا بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں جھنڈا تھا سب یکے بعد دیگرے مارے گئے اور یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں اس قدر لوگ زخمی ہو گئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھ پر اٹھا کر لے گئے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور کچھ عیسائی مورخین کا یہ لکھنا کہ یہ شکست نہیں بلکہ قریش کی ایک جنگی چال تھی حقائق سے چشم پوشی ہے۔ کوئی واقعہ جنگ اس کی تائید نہیں کرتا۔ جن کی تباہی کے لیے اس قدر سامان جنگ لے کر آئے ان کو اسی طرح چھوڑ کر چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ کوئی چال نہ تھی۔ حقیقت اور امر واقعہ یہ ہے کہ مشرکین ہزیمت اور شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ اگر مسلمانوں کی غلطی سے خالد بن ولید فائدہ نہ اٹھاتے۔ مسلمانوں سے کیا غلطی ہوئی۔ اسی کا قرآن نے آگے جواب دیا ہے۔

فشل، تنازع اور عصیان کا نتیجہ

۱۷۶۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اس معاملہ میں باہم جھگڑنے لگے اور باوجودیکہ اللہ نے تمہیں تمہاری محبوب چیز یعنی فتح کا جلوہ دکھا دیا تھا تم نافرمانی کر بیٹھے۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم تیر اندازوں کو دیا تھا اس کے خلاف کیا اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہمیں یہیں جمار رہنا چاہیے۔ اکثر نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں چل کر غنیمت حاصل کرنی چاہیے۔ آخر اکثر تیر انداز اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے۔ مشرکین نے اسی راستہ سے دفعۃً حملہ کر دیا۔ دوسری طرف حضور کے قتل کی خبر مشہور ہوئی ان چیزوں نے قلوب میں کمزوری پیدا کر دی جس کا نتیجہ فشل و جبن کی صورت میں ظاہر ہوا گویا فشل کا سبب تنازع اور تنازع کا سبب عصیان تھا[1]

مطلب یہ ہے کہ منافق جنگ احد کی شکست یاد دلا کر تمہیں ڈراتے ہیں تاکہ آئندہ دشمنوں کے مقابلہ کی جرأت نہ کرو۔ لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ احد کے میدان میں جو کچھ پیش آیا اس کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کا وعدہ نصرت اس موقعہ پر بھی پورا ہوا اور دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے تھے لیکن جب تم نے عین میدان جنگ میں حکم رسول کی نافرمانی کی اور ایک گروہ مال غنیمت لوٹنے کی خاطر مورچہ چھوڑ کر تتر بتر ہو گیا تو میدان جنگ کی ہوا پلٹ گئی۔ اور فتح نے شکست کی صورت اختیار کر لی۔ لہٰذا یہ جو کچھ ہوا دشمنوں کی طاقت و کثرت سے نہیں ہوا بلکہ خود تمہاری نافرمانی سے ہمتی اور آپس کے جھگڑے سے ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دشمنوں کی طاقت و کثرت سے مرعوب ہو بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنے اندر صبر و تقویٰ کی سچی روح پیدا کرو[2]

اس آیت میں یہ بات کھول دی کہ ماتحبون وہ چیز جو تمہیں پسند اور محبوب تھی یعنی فتح تین باتوں

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

کی وجہ سے آئی ہوئی واپس ہوگئی۔ وہ تین باتیں یہ ہیں۔ فشل، تنازع فی الامر اور عصیان۔
فشل کے معنے سست پڑجانے، ڈھیلے پڑجانے اور کمزوری دکھانے کے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ جہاں وہ چھ باتیں بتائی ہیں جو فتح و کامرانی کا اصلی سرچشمہ ہیں وہاں بتایا ہے کہ ثابت قدم رہو، اللہ کو بہت یاد کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو، باہمی نزاع سے دور رہو ورنہ بے ہمت اور سست پڑجاؤ گے۔ مشکلات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو۔ غور کرو اُحد میں ان چھ باتوں سے کیسی بے رخی برتی گئی۔ غنیمت کو دیکھ کر یادِ الٰہی سے غفلت ہوئی اور جہاں جم جانے کا حکم ہوا وہاں سے ہٹ گئے۔ حضور انور نے اس سلسلہ میں جو حکم دیا کہ

تم کو اپنی جگہ نہیں چھوڑنا۔ اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آگئے تم اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اگر دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آگئے ہیں تو تم ہرگز ہماری مدد کے لیے نہ آنا۔[1]

تم نے اس ارشادِ گرامی کی تاویل کرکے اس کی مراد میں باہم تنازعہ کر اپنا لیا اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے رسول کی طاعت کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر عصیان کی بھیانک شکل نمایاں ہوگئی۔ بالآخر تم میں سستی آگئی اور تم بے ہمت ہوکر رہ گئے اور بنی بنائی بات آنکھوں دیکھتے دیکھتے بگڑ گئی۔

اس میں اس قانونِ اجتماعی کی طرف اشارہ ہے کہ فشل، تنازعہ اور عصیان وہ جراثیم ہیں جن کے نتیجہ میں صرف ناکامی نہیں بلکہ آئی ہوئی کامیابی بھی واپس ہوجاتی ہے خواہ یہ جراثیم کہیں ہوں ہم تو کس گنتی کے بھتوے ہیں اس معاملہ میں تو قانون نے ان کا بھی لحاظ نہیں کیا جن کے اعمالِ صالحہ اور فضائل و اخلاق دُنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علوِ ہمت پر خود قرآن گواہ ہے۔

عشقِ رسُول کی قرآن میں اہمیت

۲۷۲۔ کچھ تم میں سے دُنیا کے طالب تھے اور کچھ تم میں سے آخرت کی خواہش رکھتے تھے یعنی کچھ لوگ دنیوی متاع مالِ غنیمت کی خوشی میں پھسل پڑے جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا

[1] صحیح بخاری۔

تھا کہ ہم میں کوئی شخص دُنیا کا طالب بھی ہے[1] ان الفاظ میں سب کا نہیں بلکہ ان پچاس کا چھٹ پیش کیا ہے جو تیر اندازی پر متعین کیے گئے من یرید الدنیا وہ لوگ ہیں جو مالِ غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے اور حکم کی نافرمانی کی اور من یرید الاخرۃ میں عبداللہ بن جبیر اور ان کے وہ ساتھی جنہوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے جب از روئے قانون مالِ غنیمت حلال ہے اور تقسیم کے وقت میں سب کو حصہ ملتا ہے تو ان پچاس تیر اندازوں میں سے چالیس نے یہ سمجھ کر کہ فتح ہو چکی، دُشمن پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ رہا ہے مالِ غنیمت لینے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے عملاً قدم بھی اٹھا دیا تو اس میں ایسی کون سی سنگینی ہے جس کی وجہ سے قرآن نے ان مقدسین کو طالبِ دنیا اور اس کا مرید کہا ہے۔ اس کا جواب بہتوں نے دیا ہے مگر جو لطافت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان میں ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

آیت میں دُنیا بالذات مراد نہیں ہے اور اس پر قرینہ عقلی یہ ہے کہ اگر یہ حضرات مالِ غنیمت جمع بھی نہ کرتے پھر بھی اختتامِ جنگ پر حسبِ قانونِ شرعی یقیناً وہ شریک اور مستحق غنیمت ہوتے اس سے معلوم ہوا کہ ان کے اس اقدام میں بھی آخرت ہی مقصود تھی کہ مورچہ کی حفاظت کا ثواب حاصل کرنے کے بعد ترہیب و تخریب کا ثواب بھی حاصل کریں۔ لیکن چونکہ ثواب حاصل کرنے کا یہ طریق نص اور ارشادِ نبوت کے خلاف تھا۔ اس لیے قابلِ ستائش نہیں ہے۔ اگرچہ خطائے اجتہادی کی وجہ سے ان کو قانون کا مجرم نہ کہا جائے گا۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے عبداللہ بن مسعود کے اس بیان کا جس کا حوالہ شیخ الاسلام نے دیا ہے، مطلب یہ بتایا ہے کہ پوری جماعتِ صحابہ میں ایک شخص بھی ان چالیس کے علاوہ کوئی طالبِ دُنیا نہ تھا اور یہ چالیس بھی صرف اس روز اور اس وقت اور بس۔

میرے خیال میں بات کچھ اور ہے اندازِ سخن اور پیرایۂ بیان میں یہ سنگینی یقیناً ان ذہنوں کے لیے ضرور بوجھ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کے تعلقات محض قانونی سمجھتے ہیں بلاشبہ قانونی تعلقات کی حد تک یہ لب و لہجہ سنگین ہے لیکن صحابہ کے حضور سے صرف قانونی تعلقات نہیں بلکہ محبت و وداد کے تعلقات بھی تھے۔ اس لب و لہجہ اور اندازِ بیان میں جذباتی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عنصر زیادہ کارفرما ہے۔ بلاشبہ یہ جذباتی عنصر کہیں بھی اس طرح نمایاں طور پر آشکارا نہیں ہوا جتنا مسلمانوں اور ان کے رسول کے درمیان تعلقات کی نوعیت میں۔ دُنیا کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ کسی تحریک کے لیڈر نے آج تک اپنے متبعین کے مودّت و محبت کا ایسا استوار اور ناقابل شکست پیمان نہیں کیا جو رسُول عربی نے پیروانِ دعوت سے کیا اور کسی واحد انسان نے نوعِ انسانی کی مسلسل نسلوں سے متواتر زمان و مکان کے لامحدود بعد کے باوجود کبھی اتنا خراجِ عقیدت و اُلفت وصول نہیں کیا جتنا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لے۔ روسو، مارکس، نطشے سے محبت کیے بغیر ان کے فلسفۂ حیات کا اتباع کیا جاسکتا ہے لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو انتہا درجہ کی محبت نہ ہو۔ آپ خواہ عقلی طور پر اس کی پیش کردہ دعوت کے قائل بھی ہوں۔ آپ صحیح معنوں میں مسلمان کامل نہیں کہلا سکتے۔ عصبیت کی تلخ و تند تعریض کے بعد چاہنے والوں کو یہ دنیا لذنیا کہہ کر گدگدایا ہے۔ اتباع، ڈسپلن، اطاعت ہر ایک لیڈر اپنے پیروکاروں سے ان کی توقع رکھے گا لیکن محبت نہیں بلکہ احبیت سب سے زیادہ محبت غالباً آج تک کسی نے اپنے پیرودں سے یہ توقع نہیں رکھی اور نہ ایسا تقاضا کیا۔

نبوّت پر صحابہ کی جاں نثاری

۲۷۳۔ پھر اللہ نے تم کو دُشمن کی جانب سے ہٹا دیا تاکہ وہ تم کو آزمائے یعنی یا تو وہ تمہارے سامنے سے بھاگ رہے تھے اب تم ان کے آگے سے بھاگنے لگے، تمہاری غلطی اور کوتاہی سے معاملہ اُلٹ گیا اور اس میں بھی تمہاری آزمائش تھی تاکہ پکے اور کچے صاف ظاہر ہوجائیں[1]۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا رُخ دشمنوں کی طرف سے پھیر دیا "تاکہ تمہیں اس حادثہ سے آزمائیں۔ یہ دنیا دار ابتلا ہے یہاں کبھی فتح و نصرت میں امتحان ہوتا ہے اور کبھی مصائب و آلام کے ذریعے امتحان ہوتا ہے۔ کامیابی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ دیکھیں کہاں تک شکر بجالاتے ہیں اور مصائب و آلام اور ناکامی اس لیے آتی ہے کہ پتہ لگ جائے کہاں تک صبر کرتے ہیں۔

یہ تعبیر کس قدر جذبات محبت سے لبریز ہے یہ نہیں فرمایا کہ جب تم کافروں کے مقابلے میں پسپائی اختیار کر گئے تھے بلکہ فرمایا کہ جب تم کو اللہ تعالیٰ نے کافروں سے ہٹا دیا تھا۔ ہٹانا اللہ نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنی طرف اس لیے منسوب کیا کہ جب ایک گروہ نے غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا تو چونکہ یہ ایک غلطی کی سزا تھی جو اللہ نے دی اس لیے اس کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے اور اس کی غرض یہ تھی کہ اہل کمال کے کمالات کا اظہار ہو جائے اور جن میں کمزوری ہے ان کی کمزوری بے نقاب ہو جائے۔ چنانچہ جانفشانی، جواں مردی، شجاعت اور ہمت کا جو مظاہرہ صحابہ نے کیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ باوجود اس خبر کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ دشمن کے مقابلہ سے رکے نہیں اور قتال میں مصروف رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ابن قمیہ حملہ آور ہوتا ہے تو مصعب بن عمیر حضور انور کی حفاظت میں اپنی جان دے دیتے ہیں۔ ایک شخص تلوار کا وار کرتا ہے تو طلحہ اپنا ہاتھ کٹوا دیتے ہیں اور حضور انور پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ عشاقِ نبوت ایک آہنی دیوار سے زیادہ مضبوط دیوار کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آہنی دیوار میں سے جب ایک شخص گرتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے اور دشمن اپنی آہنی سخت گرفت کے باوجود حضور انور تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ ابودجانہ کون ابودجانہ وہی جو آغاز جنگ میں مبارزت کے لیے اکڑتے ہوئے نکلے تھے اور حضور نے ان کی چال کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ چال اللہ کہیں اور کبھی پسند نہیں کرتا مگر ابودجانہ کی یہ چال اللہ کو پسند ہے دشمن کی طرف پیٹھ کر کے حضور انور کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں سوچئے کہ صرف دس پندرہ آدمیوں کے بھاگ جانے پر کیا سات سو صحابہ پر کوئی عقلمند آدمی بزدلی کا الزام لے سکتا ہے اسی لیے فرمایا کہ تم نہیں ہٹے اللہ نے تم کو دشمن سے ہٹا دیا اور اس لیے ہٹایا تھا کہ اللہ کے قانون آزمائش کا تقاضا پورا ہو جائے۔

غیر مشروط معافی کا پروانہ

۴۷ ۲۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تو اہل ایمان پر بڑی مہربانی والا ہے یعنی جو غلطی ہوئی اللہ نے اسے بالکل معاف کر دیا اب کسی کو جائز نہیں ہے کہ ان پر اس حرکت کی وجہ سے طعن و تشنیع کرے اور اللہ تو اہل ایمان پر بہت ہی مہربان ہے یعنی ان کی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے اور عتاب میں لطف و شفقت کا پہلو ملحوظ رکھتا ہے [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔

اس آیت سے صحابہ کے حال پر بڑی عنایت معلوم ہوتی کہ عتاب میں چند در چند تسلیاں دی جارہی ہیں ایک یہ کہ یہ سزا نہ تھی بلکہ اس میں تمہاری مصلحت تھی۔ پھر مواخذہ آخرت سے معافی کا اعلان کر کے بے فکر کر دیا [1]

آیات کی تشریحات ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن ان سے جو اجتماعی قوانین دلالۃً معلوم ہو رہے ہیں لیجئے ان پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈال لیجئے یہ آیات بتا رہی ہیں کہ

۱۔ امیر کی مخالفت اور اس کی نافرمانی کا کبھی خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔

۲۔ پیغمبر کی عدول حکمی خواہ عوام کی جانب سے ہو مگر عتاب میں خواص بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۳۔ عصیان سے نعمت سلب ہو جاتی ہے جیسا کہ فتح کی نعمت ہاتھ سے جاتی رہی۔

۴۔ جس طرح ایک نیکی سے دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے ایسے ہی ایک غلطی سے بہت سی غلطیوں کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۵۔ دُنیا کی رغبت بعض دفعہ بہت سی خطاؤں کا باعث ہو جاتی ہے۔

۶۔ اجتہادی غلطی قابلِ عفو ہے بلکہ حدیث میں اجر کی بھی بشارت آئی ہے۔

۷۔ صحابہ کرام کا اللہ سبحانہٗ کے یہاں بہت اونچا مقام ہے۔

۸۔ دنیوی مصائب کفارۂ سیئات کا کام دیتے ہیں اور اُخروی گرفت کو ہٹا دیتے ہیں۔

---

[1] بیان القرآن

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي
أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا
أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن
بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ
أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ
يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ
يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ
الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ
وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

اس وقت کو یاد کرو جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی کو تم پلٹ کر بھی
نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار[٢٨٥] رہا تھا۔ پھر اللہ نے

تم کو ایک غم کے بدلے دوسرا غم دے دیا تاکہ تم آئندہ کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے اور کسی مصیبت کے پیش آنے پر غمگین نہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پورا باخبر ہے[۲۸۶]۔ پھر اللہ نے اس رنج کے بعد تم پر اطمینان نازل کیا یعنی نیند جو تم میں سے ایک گروہ پر بالکل چھا رہی تھی[۲۸۷]، اور ایک کو صرف اپنی ہی فکر دامنگیر تھی[۲۸۸]۔ یہ لوگ اللہ کے بارے میں ناحق زمانۂ جاہلیت کے گمان کر رہے تھے[۲۸۹]۔ یہ گروہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات تھی[۲۸۰]۔ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو اسی پر کیا موقوف ہے سارے معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں[۲۸۱]۔ اصل یہ ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے، ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ اگر قیادت کے اختیارات ہمارے قبضہ میں ہوتے تو ہم یہاں نہ مارے جاتے[۲۸۲]۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں

میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کا مارا جانا لکھا ہوا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں
تک پہنچ جاتے[۲۸۳]۔ اور یہ صورت حال تو اس لیے پیش آئی ہے کہ جو
کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اسے آزمائے یعنی ظاہر کر دے
اور جو کچھ کدورتیں تمہارے دلوں میں ہیں ان کو صاف کر دے اور
اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو سینوں میں ہے[۲۸۴]۔

قانونِ آزمائش کے ذریعے تربیت

ان آیات میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر والی آیت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اوپر فرمایا تھا ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ اللہ نے تم کو دشمن سے ہٹا دیا تاکہ تمہارے لیے اپنا قانونِ آزمائش استعمال کرے اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ یہ ابتلا یعنی قانونِ آزمائش اس لیے حرکت میں آیا کہ اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ اہلِ ایمان کو سزا دینے کے بجائے ان کو معاف کرے اور ان پر اپنا فضل فرمائے۔ اس کے بعد ان آیات میں غمًا بغم تک اس ابتلا کی تفصیل بتائی ہے۔ بعد ازیں اس ابتلا کا فائدہ بتایا ہے۔

یہ حقیقت الم نشرح ہے کہ ابتلا خدا کا عذاب نہیں بلکہ اس کی رحمت ہے۔ عذاب کا نشانہ کفار ہوتے ہیں اور ابتلا اہلِ ایمان کے لیے ہوتا ہے۔ عذاب کا مقصد کفار کا استیصال ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہلِ ایمان کی تربیت ہوتا ہے ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ اللہ کا دستور ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے بلکہ مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کے ذریعے ان کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دُور فرماتا رہتا ہے۔

جس طرح جنگ بدر کی فتح مندی سے مسلمانوں کی تربیت مدنظر تھی اسی طرح جنگ اُحد کی عارضی شکست میں بھی تربیت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ ایک دوڑنے والے کی مشق کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا کہ بے روک دوڑتا چلا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک دو مرتبہ گر گر کر گرنے اور سنبھلنے کا بھی سبق سیکھ لے۔ بدر کی فتح مندی نے استعداد و سعی کی برکتیں دکھلا دی تھیں۔ ضرورت تھی کہ اب کمزوری و تغافل کے نتائج کا بھی تجربہ ہو جائے چنانچہ اُحد کے حادثہ نے یہ مقصد پورا کر دیا۔

بدر کی فتح اور تائید الٰہی کی بشارتوں نے بہت سے مسلمانوں میں ایک طرح کی بے پروائی اور غفلت پیدا کر دی تھی۔ وہ سعی و تدبیر کی کاوشوں سے بے نیاز ہو گئے اور سمجھنے لگے تھے کہ ہم کوشش کریں یا نہ کریں ہر حال میں فتح ہماری ہے۔ اس طرح کی خام خیالیاں ابتدائی فتح مندیوں کے بعد پیدا ہو جایا کرتی ہیں لیکن یہ ایک خطرناک حالت ہوتی ہے اس کا نتیجہ غفلت اور بے پروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ضروری تھا کہ اس کی نشوونما روک دی جاتے۔ اُحد کے تجربہ نے مسلمانوں کو بتلا دیا کہ اللہ کی تائید و نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن اس کے تمام کاموں کی طرح اس کی تائید و نصرت کے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں اور ضروری ہے کہ ان کے مطابق نتائج ظہور میں آئیں۔ جو جماعت کمزوری و غفلت میں مبتلا ہو جائے گی صبر و ثبات میں پوری نہیں اترے گی اطاعت و نظام میں کچی ہوگی وہ اللہ سبحانہٗ کی نصرت کے قابل نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے پہلے بھی اس مصلحت کی طرف اشارہ کیا تھا اور یہاں صراحۃً فرمایا لیبتلیکم اور لیبتلی اللّٰہ ما فی صدورکم ——

حکیم الامت مولانا اشرف علی نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں اسی بات کو اس طرح پیش فرمایا ہے۔

یہاں لیبتلیکم میں صحابہ کے حال پر عنایت مترشح ہوتی ہے کہ اس سے اخلاق کی تربیت مقصود تھی تاکہ مصائب کے عادی ہو کر ان میں استقلال و ثبات رونما ہو اور خواص عباد پر جو مصائب آتے ہیں ان میں بھی حکمتیں ہوتی ہیں۔ این بلائے دوست تطہیر شما است۔

چونکہ قبض آمد تو در وے بہ بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو   آں صلاح تست آتش دل مشو

اُحد میں نبوت کی پکار

۲۷۵۔ اس وقت کو یاد کرو جب تم چڑھے جارہے تھے اور کسی کو تم پلٹ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسُول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا یعنی تم بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں کو چڑھے جارہے تھے۔

اور گھبراہٹ میں پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اس وقت خدا کا پیغمبر بدستور اپنی جگہ کھڑا تم کو اس قبیح حرکت سے روک رہا تھا اور اپنی طرف بلا رہا تھا مگر تم "شورش و اضطراب میں آواز کہاں سننے والے تھے۔ آخر جب کعب بن مالک چلائے تب لوگوں نے سُنا اور واپس آکر اپنے نبی کے گرد جمع ہو گئے [1]

مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی بڑی تعداد مضطرب ہو کر بھاگ رہی تھی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چند جان نثاروں کے حلقے میں کھڑے پکار رہے تھے الی عباد اللہ الی عباد اللہ اے اللہ کے بندو کہاں جاتے ہو میری طرف میری طرف آؤ۔ ان آیات میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جب مسلمانوں پر اچانک دو طرف سے حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی تو کچھ لوگ مدینہ کی طرف بھاگ گئے اور اُحد پر چڑھ گئے مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا۔ دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی مگر اللہ کا رسول اس نازک موقعہ پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا الی عباد اللہ [2]

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت

اس آیت میں اُحد میں جس منظر کو پیش کیا گیا ہے وہ بے حد دردناک ہونے کے ساتھ خطرناک بھی ہے مسلمان دشمن کی زد میں آکر بھاگ رہے ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو آواز دے رہے ہیں۔ ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو سنبھالنا، اپنے آپ کو آگے بڑھانا، دشمن کے حملہ کی زد میں اپنے کو کر دینا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال شجاعت کی غمازی کر رہا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ کی مدد پر کس قدر اعتماد تھا کہ میدان جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہو کر گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور آپ نے صرف یہی نہیں کہ آواز دی بلکہ آپ خود صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس گھیرے سے باہر نکلنے کے لیے سامنے آئے جو مشرکین کی فوجوں نے مسلمانوں کے گرد ڈال رکھا تھا۔ اس طرح آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ ایک جرنیل کو میدان جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس طرح آگے کرنا چاہیے اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہیے کہ وہ جان کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آواز ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کیا اور ان کی منتشر جمعیت مجتمع ہو گئی۔ گویا اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو اس مضبوط نرغے سے بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت علی مرتضیٰ نے آپ کی شجاعت کا نقشہ اس طرح پیش فرمایا ہے :

جب میدان جنگ گرم ہوتا اور گھمسان کی جنگ ہوتی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے۔ آپ ہم میں سب سے زیادہ دشمن کے قریب ہوتے [1]

صحیح مسلم میں صحابہ کا یہ تاثر بھی بتایا گیا ہے کہ :

ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑا ہوتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا نو اور سات آدمیوں کے ساتھ رہ جانا حدیث سے ثابت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف اکیلے رہ گئے تھے اور فوج منتشر حالت میں تھی اور اسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت حملہ ہوا یہاں تک کہ سات آدمی انصار میں سے یکے بعد دیگرے آپ کی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے مارے گئے۔ حضرت طلحہ کے جسم پر ستر زخم آئے اور ان کی انگلیاں بھی کٹ گئیں اور آخر میں جب ابی بن خلف نے حملہ کیا تو آپ نے اپنا نیزہ اسے مارا اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :

اشتد غضب اللہ علی من قتل رسول اللہ بیدہ

اللہ غضبناک ہوتا ہے اس پر جسے اللہ کا رسول اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

اس کے علاوہ آپ نے کبھی کسی جنگ میں کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔

حضور نے صحابہ کو کب پکارا ؟

آیت کی تشریح ختم ہے لیکن یدعوکم کے سلسلہ میں ایک ضروری بات رہ گئی ہے وہ یہ کہ آپ کی اس پکار کا وقت کون سا ہے ؟ یعنی جنگ کے کس مرحلہ پر آپ نے لوگوں کو پکارا۔ عام شارحین قرآن نے یہی لکھا ہے کہ صحابہ ہزیمت خوردہ فوج کی طرح سراسیمہ اور بدحواس بھاگ گئے

---

[1] مسند امام احمد

چلے جاتے تھے اور حضور انور کی وفات کی خبر سن کر اور بھی حواس باختہ ہو گئے۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نشیب میں سے پکارا اس لیے جب آپ کی آواز سنی گئی تو کعب بن مالک نے للکارا چنانچہ کعب کی آواز پر سب جمع ہو گئے۔ چونکہ بات ایسی نامناسب تھی کہ رسول کا پکارنا اور مسلمانوں کا پلٹ کر نہ دیکھنا سنگین جرم تھا۔ اس پر عتاب فرمایا اور تنبیہہ کی کہ اگر تم ذرا توجہ کے ساتھ سنتے تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ یہ پکار واجب التعمیل ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے اس پکار کا وقت جو بتایا ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجیے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب ابتداءً فتح ہوئی اور کافر بھاگے جا رہے تھے تو مسلمانوں نے تعاقب کیا تاکہ ہر کافر جس قدر مال چھوڑ جائیں اچھا ہے کیونکہ ہم ان کا پیچھا کریں گے تو یہ سب سامان چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت پکار رہے تھے کہ واپس آجاؤ اور غنیمت کے لالچ میں دور نہ جاؤ۔ اگر غور سے دیکھو تو شاہ صاحب کی بات میں معنویت ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی جانب سے مشرکین کی فوج کا تعاقب ہی اس موقع پر ہزیمت کا باعث ہوا ہے۔ نہ وہ تعاقب میں آگے جاتے اور نہ تیر انداز اپنا مورچہ چھوڑتے اور نہ خالد بن ولید خالی مورچہ دیکھ کر حملہ آور ہوتے بہرحال گنجائش دونوں مطالب کی ہے۔

غم بالائے غم کا ابتلاء

۲۷۶۔ پھر اللہ نے تم کو ایک غم کے بدلے دوسرا غم دے دیا تاکہ تم آئندہ کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے اور کسی مصیبت کے پیش آنے پر غمگین نہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پورا باخبر ہے۔ یعنی تم نے رسول کا دل تنگ کیا اس کے بدلے تم پر تنگی آئی۔ غم کا بدلہ غم ملا تاکہ آگے یاد رہے کہ ہر حالت میں حکم رسول پر چلنا چاہیے خواہ کوئی نفع کی چیز مثلاً غنیمت وغیرہ ہاتھ سے جاتی رہے یا کچھ بلا سامنے آتے۔

اکثر مفسرین نے فاثابکم غما بغم کے معنے یوں بتائے ہیں کہ خدا نے تم کو غم پر غم دیا۔ یعنی ایک غم تو ابتداءِ فتح کے فوت ہونے کا تھا۔ دوسرا اپنے آدمیوں کے مارے جانے اور زخمی ہونے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہونے کا کچھ نے یہ مطلب بتایا ہے کہ فتح و کامرانی کے فوت ہونے، غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے اور نقصان جانی و مالی اٹھانے کا جو غم تھا اس کے عوض میں ایک ایسا بڑا غم دیا جس نے سب غموں کو بھلا دیا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اسی غم کی شدت میں آگے پیچھے کا کچھ ہوش نہ رہا،

حتیٰ کہ حضور کی آواز بھی نہ سُنی جیساکہ ایک طرف ہمہ تن ملتفت ہونے کے وقت دوسری طرف سے ذہول و غفلت پیش آجاتی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ تمہارے احوال اور نیتوں کو جانتا ہے اور اسی کے موافق معاملہ کرتا ہے[1]

شارحین قرآن کے بیان کردہ مطالب کی طرف شیخ الاسلام نے ایک سرسری اشارہ کر دیا ہے، حضور انور کا عصیان حضور انور کے غم کا باعث ہوا۔ یہ عصیان کب رونما ہوا۔ ہزیمت کے وقت میں یا اس وقت جب فتح کی سرشاریوں میں مسلمان فوج مشرکین کا تعاقب کر رہی تھی اور حضور پکار رہے تھے جیساکہ شاہ عبدالقادر کی رائے ہے۔ عصیان خواہ کسی وقت ہوا ہو اس سے نبوت کو غم ہوا اور نبوت کے اسی غم کی پاداش میں سب کو غم بھگتنا پڑا۔ اور اگر غمّاً بغمٍّ کا یہ مطلب ہو کہ اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تو غم بالائے غم ظاہر ہی ہے۔ ابتدائی کامرانی کے فوت ہونے کا غم، پھر مسلمانوں کے مارے جانے اور زخمی ہونے کا غم، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات کا غم۔

صحابہ کرام کی حضور انور سے محبت

اصل بات یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پکار پر الیٰ عباد اللہ انی رسول اللہ دُشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالا۔ آپ کے گرد صرف بارہ صحابہ موجود تھے یعنی ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر، ابوعبیدہ، حارث ابن الصامت اور کچھ دوسرے مسلمان۔ قبل اس کے کہ آپ کی آواز پر دوسرے صحابہ جمع ہوں دشمن نے آپ کو سخت زخم پہنچائے یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ ادھر کعب بن مالک کی نگاہ آپ پر پڑی اور انہوں نے پہچان کر للکارا کہ البشریٰ اخو شخبری ہو کہ حضور بقید حیات ہیں۔ اس آواز نے منتشر مسلمانوں کو جمع کر دیا۔ پہلا غم تو یہ تھا کہ دشمن ان کے تعاقب سے بچ گیا اور اُلٹا ان کو مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا مگر اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت دیکھی تو سب اپنا غم بھول گئے اور اس کے ساتھ نبوت کے زخم کا چرکہ لگ گیا۔ کیونکہ صحابہ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ ایسی شدید تھی کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی ان کو اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدان جنگ میں نو مرد تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرادی تکلیف سے بچانے کے لیے اپنی گردنیں کٹانے کو تیار تھے بلکہ اسی میں راحت پاتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب آپ پر حملہ ہوا تو آپ کی حفاظت کی خاطر بارہ میں سے سات آدمیوں نے اپنی جانیں قربان کردیں اور یہ ساتوں انصار تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں، بیٹوں، بھائیوں کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب ان کو معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔

آگے اس کی حکمت بتائی ہے کہ غم بالائے غم کے شکار تم اس لیے ہوئے تاکہ آئندہ کوئی چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے یا زمانہ کی بڑی سے بڑی افتاد تم پر آجائے تو تم کو صدمہ نہ ہو اور اس کو برداشت کرنے کے خوگر ہو جاؤ۔ آخر میں بتادیا کہ اللہ سبحانہٗ ہر شخص کے اعمال اور اس کی نیت سے باخبر ہے جو کچھ کرو یہ سوچ کر کرو کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کاموں کی خبر ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم نے رسول کا دل تنگ کیا اس کے بدلے تم پر تنگی آئی تاکہ آئندہ نبی کے حکم پر چلنا تمہیں یاد رہے خواہ کچھ ہو۔

میدانِ جنگ میں نیند

۲۷۔ پھر اللہ نے اس رنج کے بعد تم پر اطمینان نازل کیا یعنی نیند جو تم میں سے ایک گروہ پر چھا رہی تھی۔ یعنی اس جنگ میں جن کو شہید ہونا تھا ہو چکے اور جن کو ہٹنا تھا ہٹ گئے اور جو میدان میں باقی رہ گئے ان میں سے مخلص مسلمانوں پر اللہ نے ایک دم غنودگی طاری کردی۔ لوگ کھڑے کھڑے اونگھنے لگے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہٗ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر زمین پر گری۔ یہ ایک حسی اثر اس باطنی سکون و اطمینان کا تھا جو ایسے ہنگامہ رستخیز میں مومنین کے قلوب پر محض خدا کے فضل و کرم سے وارد ہوا۔ اس کے بعد دشمن کا خوف و ہراس سب کافور ہوگیا۔ یہ کیفیت عین اس وقت پیش آئی جب لشکرِ مجاہدین میں نظم و ضبط قائم نہ رہا تھا۔ بیسیوں لاشیں خاک و خون میں تڑپ رہی تھیں۔ سپاہی زخموں سے چور ہو رہے تھے۔ حضور کے قتل کی افواہ نے رہے سہے ہوش و حواس کھو دیے تھے۔ گویا یہ سونا بیدار ہونے کا پیش خیمہ تھا۔ غنودگی طاری کرکے ان کی ساری تھکن دور کردی گئی اور متنبہ فرمادیا کہ خوف و ہراس اور تشویش و اضطراب کا وقت جا چکا۔ اب مامون و مطمئن ہو کر اپنا فرض انجام دو۔ فوراً صحابہ نے حضور کے اردگرد جمع ہو کر لڑائی کا محاذ قائم کردیا۔ تھوڑی دیر بعد مطلع صاف تھا دشمن سامنے سے بھاگتا نظر آیا۔ عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ لڑائی کے موقع پر اونگھ اور نیند کا طاری ہونا اللہ کی طرف سے فتح و ظفر کی علامت ہے۔ حضرت علی کی فوج کو

صفین میں ایسا ہی واقعہ پیش آیا[1]

نیند اطمینان وراحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی نشانی بھی جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جایا کرتی ہے اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال وعزیمت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دوران جنگ فوج کے لیے سونے کا موقع ملنا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ نیند کی اسی اہمیت کے پیش نظر دشمن فوج کے حوصلے پست کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ کسی فوج کو سونے کا موقع مل جائے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے کیونکہ اس سے فائدہ اٹھانا صرف موقع ملنے ہی پر منحصر نہیں بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی وقلبی صلاحیت پر بھی موقوف ہے[2]

امنۃ نعاسًا کا یہ مطلب ہے کہ ایک ایسی غنودگی طاری کر دی گئی جو امن وسکون والی تھی اور جس سے مسلمانوں کا خوف وہراس اور ہر قسم کی پریشانی اور خطرات سب دُور ہو گئے تھے اور سارا غم غلط ہو گیا یغشی طائفۃ سے یہ مراد ہے کہ اس غنودگی کا مسلمانوں پر گہرا اثر ہوا۔

دراصل اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اگرچہ تکلیف اٹھائی مگر شکست نہیں کھائی کیونکہ وہ میدان جنگ میں موجود رہے وہ ایسے مطمئن اور دُشمن سے ایسے بے خوف تھے کہ ان کو نیند آ گئی ورنہ معرکۂ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اُڑ جاتی ہے مگر یہ تسکین عالم کا یہ اعجاز تھا کہ بدر و اُحد کے کارزاروں میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری و بے خوفی کے لیے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا تاکہ کسی خوف وخطر کا خیال کیے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جس جماعت پر نیند طاری کی گئی تھی وہ جماعت ان اہل ایمان کی تھی جو یقین وثبات اور استقامت وتوکل کی پوری صداقت کے حامل تھے اور ان کو یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسُول کی ضرور مدد کرے گا۔

ان کو اپنی ہی پڑی ہوئی ہے

۲۷۸۔ اور ایک گروہ کو اپنی ہی فکر دامنگیر تھی۔ یہ بزدل اور ڈرپوک منافقین ہیں جن کو نہ اسلام

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کی فکر تھی نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ محض اپنی جان بچانے کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کہیں ابوسفیان کی فوج نے دوبارہ حملہ کر دیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا اس خوف و فکر میں اونگھ یا نیند کہاں تھی؟

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کے کچے یا منافق تھے انہیں اپنی جانوں ہی کی فکر لگی رہی اگر دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جانا ہوگا۔ اپنی جان کی فکر بجائے خود کوئی بری بات نہیں لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ ان منافقین کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔ نہ دین کی کوئی فکر تھی اور نہ رسول کا کوئی خیال تھا۔ یہ اطمینان اور امن کی نیند سے بالکل محروم تھے۔ انہیں تو یہ فکر تھی کہ یہاں سے کس طرح جان بچا کر نکلیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر اونگھ نازل کر کے ان کے دلوں سے دشمنوں کا خوف دُور کر دیا۔ منافقین پر نہ نیند طاری کی اس لیے ان پر دشمنوں کا خوف مستولی رہا اور خوف کی وجہ سے منافقوں کو اپنی جانوں کی فکر پڑ گئی۔

اللہ سبحانہٗ کے بارے میں بدگمانی

۲۷۹۔ یہ گروہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات تھی۔ یعنی وہ اللہ کے وعدے کہاں گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قصہ ختم ہوا۔ اب پیغمبر اور مسلمان گھر واپس جانے والے نہیں۔ سب یہیں کام آئیں گے جیسے دوسری جگہ فرمایا بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمومنون الی اھلیھم ابداً (فتح رکوع ۲) [لہ]

اصل ارشاد یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ ہے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت جاہلیت کے خیالات رکھتے تھے۔

یہ خیالات کیا تھے؟

اس موضوع پر شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں ایک خیال تو وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلام فرما رہے ہیں کہ ان کا ظن اور خیال جسے قرآن یہاں غیر الحق اور ظن الجاہلیہ قرار دے رہا ہے اور جسے قرآن نے سورۂ فتح میں ان کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے یعنی ان کی یہ آرزو کہ حضور انور اور اہل ایمان جنگ سے صحیح واپس نہ آئیں گے۔ اس حیثیت سے یہ بلاشبہ ظن ہے کہ مستقبل کے بارے میں یہ محض تخمین اور اٹکل سے بات کہی گئی ہے۔ لیکن اس میں خلاف حقیقت اور جاہلیت

لہ افادات شیخ الاسلام

والے گمان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ یہ اللہ کے بارے میں ہے بلکہ ان کا یہ خیال خود حضور اور مسلمانوں کے بارے میں ہے۔

اس بنا پر کچھ شارحین قرآن کی رائے یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت اور جاہلیت والے گمان کی تشریح خود آنے والی آیت کر رہی ہے گویا یہ اجمال ہے اور آگے اس کی تفصیل ہے۔ یہاں تو اس بدگمانی کا صرف چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ خلاف حقیقت ہے اور اس سے بڑھ کر یہ جاہلیت کی یادگار ہے۔ جاہلیت محاورۂ قرآنی میں علوم نبوت سے بیگانہ دور کا نام ہے۔

چہ میگوئیاں

۲۸۰۔ یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ جو کچھ ہوا اس میں اختیار کی کیا بات ہے یعنی جو جو کچھ بھی ہمارا کام بنا ہے یا بالکل بگڑ چکا یا یہ کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے والوں کے ہاتھ میں کچھ بھی فتح و ظفر آئی یا یہ معنے کہ اللہ نے جو چاہا سو کیا ہمارا یا کسی کا کیا اختیار یہ تو الفاظ کے ظاہری معنے تھے لیکن جو دل میں نیت تھی وہ آگے آ رہی ہے[1]

یہ دراصل ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے جب یہ کہا گیا کہ وہ خلاف حقیقت اور زمانۂ جاہلیت کے خیالات رکھتے ہیں معاً سوال پیدا ہوا کہ وہ خیال کیا ہے جواب دیا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات تھی؟ یعنی اس میں ہمارا کیا قصور ہے اگر خدا فتح و نصرت دیتا تو ایسی حالت کیوں پیش آتی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ عہد جاہلیت کے سے خیالات ہیں اور ان دلوں میں نہیں گزر سکتے جو اسلام کی تعلیم سے روشن ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ فتح و نصرت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے لیکن فتح و نصرت ان کو ہی دیتا ہے جو صبر و تقویٰ میں پکے ہوتے ہیں[2]

یہاں کے ظن جاہلیت کی ایک مثال ہے اسی کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے پہلے تمہید پیش کی گئی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ یہ لوگ ادعائے ایمان کے باوجود اب تک خدا کی صفات اور انسانی زندگی سے اس کے تعلق کے باب میں ذہن صاف نہیں رکھتے ہیں۔

اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ لشکر میں جو منافق تھے ان کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

اللہ تعالیٰ کے بارے میں مختلف قسم کے جاہلانہ خیالات قائم کر رہے تھے اور جب کوئی ان سے دریافت کرتا کہ یہ شکست کیوں ہوئی تو ایک معصوم سا فقرہ کہہ دیتے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں ہے اور ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے۔ لوگ یہ سمجھتے کہ یہ پختہ مسلمان ہیں کامیابی اور ناکامی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے حوالے کر رہے ہیں۔

اگرچہ اس فقرے کے اور مطالب بھی ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ کچھ بنے گا یا سب بگڑا رہے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ غنیمت وغیرہ مسلمانوں کے ہاتھ لگے گی یا خالی ہاتھ رہیں گے مگر ہم نے جو مطلب اختیار کیا ہے وہ زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اس میں معنویت ہے۔

اللہ سبحانہٗ کی حقیقی عظمت

۱۸۱ ۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اسی پر کیا موقوف ہے سارے معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ یعنی منافقین کا یہ قول هل لنا من الامر من شئی ایک ایسی بات ہے جو ہے تو صحیح مگر یہ کہہ کر وہ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں بے شک یہ صحیح ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے بنا دے جس کو چاہے بگاڑ دے، غالب کرے یا مغلوب، اُفت بھیجے یا راحت، کامیاب کرے یا ناکام ایک ہی واقعہ کو ایک قوم کے حق میں رحمت اور دوسری کے لیے نعمت بنا دے سب اس کے قبضے میں ہے مگر تم اس بات سے اپنے دل میں جو معنے لے رہے ہو خدا تعالیٰ دل کے چور سے واقف ہے جسے آگے بیان کیا جاتا ہے گا[1]

اس جواب میں بہت گہری معنویت ہے اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانے کا تنہا مالک سمجھتے تھے اور خلق کے بعد امر کی حدود میں اللہ کے ساتھی اور ساجھی بناتے تھے۔ قرآن نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ منافقین کے اس مقولہ هل لنا من الامر میں اگر امر سے مراد حکومت ہے۔ جیسا کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کچھ مفسرین نے بتایا ہے یعنی حکومت میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن نے اس آیت میں کھول کر جواب دیا ہے کہ الامر سب کا سب اللہ کے لیے ہے واقعی اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے کیونکہ سب کمزور ہیں وہ ہی ایک قوت والا ہے۔ سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہ ہی ایک بے نیاز ہے۔ سب مامور ہیں وہ ہی ایک آمر ہے، سب محکوم ہیں وہی ایک حاکم ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے اس لیے الامر کلہ للہ یعنی صرف جنگ میں مدد کا معاملہ ہی اس کے قبضے میں نہیں بلکہ سارے ہی معاملات اللہ کے قبضے میں ہیں۔

کمزوری بے نقاب ہو گئی

۲۸۲۔ اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر قیادت و حکومت کے اختیارات ہمارے قبضہ میں ہوتے تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ اصل دل کا چور یہ تھا ھل لنا من الامر من شیئ کہہ کر دل میں یہ مطلب لیتے تھے اور پکے مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر آپس میں ہی کہتے ہوں گے کہ میاں شروع میں ہماری رائے نہ مانی۔ چند جوشیلے اور ناتجربہ کار نوجوانوں کے کہنے پر مدینہ سے باہر لڑنے چلے آئے۔ آخر منہ کی کھائی۔ اگر کچھ کام ہمارے اختیار میں ہوتا اور ہمارے مشورے پر عمل کیا جاتا تو اس قدر نقصان کیوں اٹھاتے۔ ہماری برادری کے اتنے آدمی مارے گئے یہ کیوں مارے جاتے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کے موافق فتح وظفر اور غلبہ مسلمانوں کے لیے ہے تو یہ قتل وجرح کی مصیبت ہم پر کیوں ٹوٹی؟[1]

بتانا یہ ہے کہ جو کچھ ان کے دلوں میں بھرا ہوا ہے اور جو کچھ ان کے جی میں پوشیدہ ہے اے پیغمبر یہ لوگ اسے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے اور کھل کر نہیں کہتے۔ ظاہر میں وہ سیدھی سی اور معصوم بات کہہ رہے ہیں لیکن ان کا اصلی منشا یہ ہے کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا اور ہماری بات مانی جاتی اور ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا اور ہم اس جنگ میں قتل نہ کیے جاتے اور جو لوگ مقتول ہوئے ہیں وہ قتل نہ ہوتے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک بے حد اہم سوال

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب منافقین لڑائی کے آغاز سے پہلے ہی میدان جنگ سے عبداللہ ابن ابی کی سرگردگی میں واپس ہو گئے تھے تو پھر میدان جنگ میں قرآن کن لوگوں کا چہرہ پیش کر رہا ہے۔

سید رشید رضا کہتے ہیں کہ قرآن کمزور مسلمانوں کا ذکر کر رہا ہے ھذہ الطائفۃ من المومنین الضعفاء اور شاہ عبدالقادر بھی یہی فرماتے ہیں جیسا کہ ابھی آپ پڑھیں گے لیکن عام شارحین قرآن اس گروہ کو منافقین ہی کا گروہ قرار دیتے ہیں۔ اب یہی دو صورتیں ہیں کہ یا تو یہ باتیں منافقین نے مدینہ میں کہی ہیں یا شکست کی خبر سن کر جہاں اور لوگ آتے گئے آئیں، یہ منافقین بھی آدھمکے اور یا پھر میدان جنگ کے مسلمانوں میں ایک عنصر منافقوں کا تھا۔ شیخ الاسلام کا میلان پہلی صورت کی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"بظاہر یہ باتیں منافقین نے مدینہ میں کہیں کیونکہ عبداللہ بن ابی جنگ شروع ہونے سے پیشتر اپنی جمعیت کو ساتھ لے کر واپس ہو گیا تھا اس صورت میں ھاھنا یہاں کا اشارہ قرب کی وجہ سے اُحد کی طرف ہو گا لیکن بعض روایات میں ایک منافق معتب بن قشیر کا میدان جنگ میں یہ باتیں کرنا ثابت ہے تو شاید کچھ منافقین عبداللہ بن ابی کے ہمراہ کسی مصلحت سے واپس نہ ہوتے ہوں۔"

موت کا وقت مقرر ہے

۲۸۳۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کا مارا جانا لکھا ہے وہ ضرور اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے۔ یعنی اس طعن و تشنیع یا حسرت و افسوس سے کچھ حاصل نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی جو اجل موت کی جگہ، سبب اور وقت لکھ دیا ہے کبھی ٹل نہیں سکتا ہے اگر تم گھروں میں گھسے بیٹھے رہتے اور فرض کرو تمہاری ہی رائے سنی جاتی پھر بھی جن کی قسمت میں اُحد کے قریب جس جس پڑاؤ پر مارا جانا لکھا جا چکا تھا وہ کسی نہ کسی سبب سے ضرور ادھر نکلتے اور وہیں مارے جاتے۔ یہ خدا کا انعام ہے کہ جہاں مارا جانا مقدر تھا مارے گئے۔ اگر اللہ کے راستہ میں خوشی کے ساتھ بہادروں کی موت شہید ہوئے۔ پھر اس پر پچھتانے اور افسوس کرنے کا

کیا موقعہ؟ مردان خدا کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو لے

مطلب یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارا جاتا۔

انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے اس زہر کا تریاق یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا وقت مقرر ہے جو نہ ٹلائے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آسکتا ہے۔ اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے بار بار اس عقیدے کی تلقین کی ہے کہ جس کو جہاں مرنا ہوتا ہے وہیں مرتا ہے۔

اس میں ایک طرف اگر منافقین کو ان کے زعم فاسد کا جواب دے کر بے نقاب کیا ہے دوسری طرف یہ بھی اشارہ کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو صحابہ رہ گئے تھے اور جنہوں نے خالد کے حملے سے اسلامی لشکر میں افراتفری کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں انسانی فداکاری کے معجزے دکھائے تھے وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوتے۔ وہ اس طرح جان دینے کو تیار تھے کہ اگر مدینے میں بھی جنگ ہوتی وہ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے نہ رہتے بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جاں نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے۔

دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی

۲۸۴۔ اور یہ صورتِ حال تو اس لیے پیش آئی ہے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اسے آزمائے یعنی ظاہر کر دے اور جو کچھ کدورتیں تمہارے دلوں میں ہیں ان کو صاف کر دے اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو دلوں کے پوشیدہ بھید جانتا ہے اس سے کسی کی کوئی حالت پوشیدہ نہیں ہے۔ مقصود یہ تھا کہ تم سب کو ایک آزمائش میں ڈالا جائے تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے وہ باہر نکل پڑے۔ امتحان کی بھٹی میں کھرا کھوٹا الگ ہو جائے۔ مخلصین کامیابی کا صلہ پائیں اور ان کے قلوب آئندہ کے لیے وساوس اور کمزوریوں سے پاک و صاف ہوں۔ منافقین کا اندرونی نفاق کھل جائے اور لوگ صاف طور پر ان کے خبثِ باطن کو سمجھنے لگیں لے

لے افاداتِ شیخ الاسلام

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ اس شکست سے جن کو شہید ہونا تھا ہو چکے اور جن کو ہٹنا تھا ہٹ گئے اور جو میدان میں باقی رہ گئے ان پر اُونگھ آ ئی۔ اس کے بعد رُعب اور وہشت دُور ہو گیا اور اتنی دیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غشی رہی۔ پھر جب ہوشیار ہوتے سب نے حضور کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی اور سست ایمان والے کہنے لگے کہ کچھ بھی کام ہمارے ہاتھ سے ظاہر ہو یعنے کہ اس شکست کے بعد کچھ بھی ہمارا کام بنا رہے گا یا بالکل بگڑ چکا ہے یا یہ معنے کہ اللہ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار اور نیت میں یہ معنے تھے کہ ہمارے مشورے پر عمل نہیں کیا جو اتنے لوگ مرے اللہ نے دونوں معنوں کا جواب دیا اور بتا دیا کہ اللہ کو اس میں حکمت منظور تھی تاکہ صادق اور منافق معلوم ہو جائیں۔ (موضح القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ
الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ
ع ۱۶ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾

بلاشبہ تم میں سے جن لوگوں نے اس روز لڑائی سے مُنہ موڑ لیا تھا جس روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر آئیں[285] تو ان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے یعنی یہ بات نہ تھی کہ ان کے ایمان میں فتور آگیا تھا[286]۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی ہے وہ یقیناً بخشنے والا اور بُردبار ہے[287]۔

میدان جنگ سے بھاگنے والوں کی معافی

اوپر آیت ۱۲۲ میں گزر چکا ہے کہ منافقین کی شرارت سے کچھ کمزور قسم کے مسلمان بھی متاثر

ہوتے لیکن فوراً سنبھل گئے۔ ان میں ایک چھوٹا سا گروہ کمزوری کا شکار ہو گیا اور میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ ان بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی؟ روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں ایک تہائی فوج بھاگ گئی تھی ایک تہائی زخمی ہوتے اور ایک تہائی میدان میں رہے۔ دونوں باتیں بالبداہت غلط ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد اگر سات سو ہے تو ان میں سے اگر صرف دو سو افراد ہی حضور کے ساتھ رہ جاتے تو تین ہزار کفار مکہ کی فوج ان کو میدان جنگ میں چھوڑ کر کبھی مکہ واپس نہ ہوتی۔ ابوالقاسم بلخی نے تو حد کر دی کہ ۱۳ نفوس قدسی کو چھوڑ کر سب کو بھگا دیا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو کفار کے دوبارہ حملے کی ابتداء میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے کیونکہ سب لوگ تعاقب میں لگے ہوتے تھے۔

دراصل بات یہ ہے کہ خالد کے حملے نے مسلمانوں میں جو ابتری پیدا کی اس کی وجہ سے مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ میدان سے بھاگ گیا ان میں سے بعض مدینے پہنچے اور بعض اس سے بھی آگے مشرقی جانب نکل گئے۔ روایتوں میں دو مقاموں کا ذکر آیا ہے اول "منقی" دوم "جلعب" یہ دونوں اعوص نامی مقام کے قریب بتائے گئے ہیں۔ اعوص مدینہ کے مشرق میں کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے گروہ نے میدان نہ چھوڑا لیکن رسول اللہ کی وفات کی خبر ان پر بجلی بن کر گری اور تعطل کی سی کیفیت طاری کر دی اور ان میں ہی وہ بھی تھے جو حضور انور کی ذات گرامی کے گرد جان نثاری اور فداکاری میں سرگرم عمل تھے۔ امام رازی بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں چنانچہ وہ قفال مروزی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

> والذی تدل علیہ الاخبار فی الجملۃ ان نفرا منھم تولوا وبعدوا منھم من دخل المدینۃ ومنھم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانھم نزلوا عند الجبل واجتمعوا ھناک
>
> روایات تاریخی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک چھوٹی ٹولی بھاگ گئی تھی اور دور نکل گئی۔ کچھ مدینے گئے اور کچھ اطراف میں چلے گئے لیکن اکثریت پہاڑ کے دامن میں جمع ہو گئی۔

یہ بات عقل بھی باور کرتی ہے۔ دونوں جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے پہلے حملہ میں جب مشرکین کو شکست ہوئی تو وہاں اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا کہ تین ہزار کی فوج صرف اٹھارہ کے

مرنے پر بھاگ گئی اور یہاں مبالغہ کیا کہ ایک تہائی رہ گئے سب بھاگ گئے نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ

۲۸۵۔ بلاشبہ تم میں سے جن لوگوں نے اس روز لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر آئیں۔ یعنی جس دن اُحد کے میدان میں دو جماعتیں باہم نبرد آزما ہوئی تھیں اور آپس میں بھڑی تھیں اس دن جو لوگ میدان سے ہٹ گئے اور جنہوں نے پشت پھیری تھی۔ یہ سوال کہ بھاگنے والوں میں کون کون تھے؟ اکثر روایات میں مخلصین میں سے صرف حضرت عثمانؓ کا اور ان کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ کا نام پایا جاتا ہے۔

شیعہ اور خوارج نے حضرت عثمانؓ کے نام کو بہت اچھالا ہے اور اپنے خیال میں اس کو بھی خلافت کی نااہلیت کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کا قانونی جواب دیا ہے کہ ہم صحابہ میں نہ تو عصمت کے قائل ہیں اور نہ ہی خلافت کے لیے عصمت کو شرط گردانتے ہیں۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ صحابہ کے بعض معاندین نے اس واقعہ سے صحابہ پر خصوصاً حضرت عثمانؓ پر طعن کیا ہے اور اس سے عدم صلاحیت خلافت مستنبط کی ہے لیکن محض مہمل بات ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا اب دوسروں کو مواخذہ کرنے کا کیا حق ہے۔ رہا قصہ خلافت کا تو اہل حق کے نزدیک خلافت کے لیے عصمت شرط نہیں ہے۔ بھی صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فیصلہ ہے کہ

> عثمان بن موہب کہتے ہیں کہ ایک شخص حج کے لیے بیت اللہ آیا۔ وہاں اس نے کئی لوگ بیٹھے دیکھے اور پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ بتانے والوں نے بتایا کہ قریش ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ بوڑھا ان میں کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عبداللہ بن عمرؓ، وہ شخص عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور بولا کہ میں آپ سے کچھ پوچھتا ہوں کیا آپ مجھے جواب دیں گے چنانچہ وہ بولا کہ میں اس گھر کی حرمت کی قسم دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اُحد والے دن حضرت عثمانؓ بھاگ گئے تھے؟ فرمایا ہاں، پھر بولا کیا بدر کے روز حضرت غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے فرمایا کہ ہاں، بولا کیا تم جانتے ہو کہ بیعت الرضوان میں موجود نہ تھے فرمایا ہاں۔ اس شخص نے اللہ اکبر کہا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا آؤ میں تم کو بتا دوں اور تمہارے سوالات کی وضاحت کر دوں۔ فرمایا کہ اُحد کے دن بھاگ جانا تو میں گواہی دیتا ہوں کہ اُحد میں بھاگنے والوں کو اللہ نے معاف کر دیا اور بدر کے دن ان کی غیر حاضری اس لیے تھی کہ آپ کی اہلیہ محترمہ یعنی حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی بیمار تھیں حضور انور نے خود ان کو ان کی تیمارداری کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس شخص کو جو جنگ میں شریک ہوگا اور ایک آدمی کا حصہ بھی مال غنیمت سے ملے گا۔ آپ کی بیعت الرضوان سے غیر حاضری، تو بات یہ ہے کہ اگر عثمان سے زیادہ کوئی عزت و شان والا ہوتا تو حضور انور اسی کو مکہ روانہ کرتے، آپ نے عثمان کو سفیر بنا کر روانہ کیا۔ بیعت الرضوان میں حضور انور نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا تھا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان کی بیعت قرار دیا۔ پوچھنے والے سے عبداللہ بن عمر نے آخر میں فرمایا جاؤ اور ان باتوں کو ساتھ لے جاؤ۔

لغزش کا باعث

۲۸۶۔ تو ان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے۔ یعنی یہ بات نہ تھی کہ ان کے ایمان میں کوئی فتور تھا۔ مخلصین سے بھی بعض اوقات کوئی چھوٹا بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور جس طرح ایک طاعت سے دوسری طاعت کی توفیق ملتی ہے۔ ایک گناہ کی نحوست سے شیطان کو موقع ملتا ہے کہ دوسری غلطیوں اور لغزشوں کی طرف آمادہ کرے۔ جنگ احد میں بھی جو مخلص مسلمان پیچھے ہٹ گئے تھے کسی پچھلے گناہ کی نشامت سے شیطان نے بہکا کر ان کا قدم ڈگمگا دیا۔ چنانچہ ایک گناہ تو یہی تھا کہ تیر اندازوں کی بڑی تعداد نے حضور انور کے حکم کی پابندی نہ کی [1] شیخ الاسلام کے خیال مبارک میں ما کسبوا سے مراد تیر اندازوں کی وہ نافرمانی ہے جو انہوں نے مورچہ چھوڑ کر کی۔ یہ نافرمانی سبب بن گئی دوسری نافرمانی میدان جنگ سے بھاگنے کی۔ اور یہ سمجھانے کے لیے کہ ان کا یہ بھاگنا نافرمانی تھی مگر یہ نافرمانی دیدہ دانستہ نہ تھی بلکہ شیطان کے ازلال کی وجہ سے بمقتضائے بشریت لغزش قدم تھی استزلھم الشیطان کا اضافہ فرمایا۔

ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب

شیخ الاسلام نے پوری قوت سے یہ بات سمجھائی ہے کہ آیتِ قرآنی بتا رہی ہے کہ ایک گناہ دوسرے

[1] افادات شیخ الاسلام

گناہ کا سبب ہو جاتا ہے جیسے ایک نیکی دوسری نیکی کا ذریعہ ہو جاتی ہے یعنی اعمال حسنہ اور سیئہ میں تجاذب کا قانون جاری ہے جب انسان ایک نیک کام کرتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کو دوسری نیکیوں کی توفیق مل جاتی ہے اس کے دل میں نیک اعمال کی رغبت بڑھ جاتی ہے اسی طرح انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے دوسرے گناہوں کی راہ ہموار کر دیتا ہے دل میں گناہ کی ظلمت ہو جاتی ہے[1]

سب کو معافی کا پروانہ مل گیا

۲۸۷۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے ان کی یہ لغزش معاف فرمادی ہے وہ یقیناً بخشنے والا بُردبار ہے۔ یعنی ان حضرات پر اب کوئی گناہ نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ کلیۃً ان کی تقصیر معاف فرما چکا ہے کسی کو طعن و ملامت کا حق نہیں ہے[2]

صحابہ کرام کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے اس موقف کی یہ آیت کھلے لفظوں میں تائید کرتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود امت کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان کی طرف کسی برائی یا عیب کو منسوب کرے۔ غور کرو کہ جب اللہ سبحانہ نے ان کی اتنی بڑی غلطی کو معاف کر کے ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کیا اور ان کو تمام رضوان مرحمت فرمایا تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے کہ ہم ان میں سے کسی کی برائی کا تذکرہ کریں۔ اسی بنا پر اہل السنۃ والجماعۃ نے بطور مسلک یہ پالیسی اپنائی ہوئی ہے کہ صحابہ پر طعن و اعتراض سے پرہیز ضروری ہے۔ عقائد نسفی میں ہے؛

صحابہ کرام کا ذکر ہمیشہ خیر اور بھلائی ہی سے کرے۔

شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں:

جمیع صحابہ کرام کا تزکیہ اور ان کی مدح وثنا تمام اہل السنۃ کا اعتقاد ہے

شرح مواقف میں ہے؛

تمام صحابہ کی تعظیم ضروری ہے اور ان پر طعن ناجائز ہے۔[3]

[1-3] معارف قرآن مشش　[2] افادات شیخ الاسلام

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ
إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا
وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَ
يُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾
وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾

اے اہلِ ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی[۲۸۸] اور انہوں نے اپنے سفر میں جانے والے یا جنگ میں شریک ہونے والے بھائیوں[۲۸۹] سے کہا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے، اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[۲۹۰] ورنہ اصل میں جلانا اور مارنا تو اللہ ہی کا کام ہے[۲۹۱]، اور اللہ

تمہاری حرکات پر خوب نگران ہے[۲۹۲]۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ کی جو بخشش اور رحمت تمہارے لیے ہے ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جنہیں پونجی بنا کر وہ جمع کرتے رہتے ہیں[۲۹۳]۔ اور دیکھو خواہ تم اپنی موت مر جاؤ یا مارے جاؤ ہر حال میں تمہیں سمٹ کر اللہ کے حضور میں جانا ہے[۲۹۴]۔

فرائض سے فرار میں زندگی کا بچاؤ نہیں

اس اُمت کو اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ اسی وقت میسر آسکتا ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع اُمت ہو، یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو تقویٰ کے سچے اور طاعت کے مخلص ہوں۔ دوسری طرف اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کی اساس اعتصام بحبل اللہ یعنی نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہو۔ اس کے بغیر قرآن کی نظر میں کوئی جماعت اُمت نہیں ہو سکتی۔

اس معاملے میں اس کو نہ دوسری قوموں پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے دوسروں کی کاپی کرنے کی اجازت ہے۔ پہلے بھی لا تکونوا کالذین تفرقوا میں اہل کتاب کی تقلید سے منع کیا تھا اب اس آیت میں لا تکونوا کالذین کفروا کہہ کر منافقین کا کردار اپنانے سے روکا ہے۔ کیونکہ دوسری قومیں اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا اقتدار حاصل کر سکتی ہیں لیکن اُمتِ مسلمہ کے لیے اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہے اس کے لیے عزت و اقتدار پانے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ ہے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے اپنانے کی راہ، اللہ کی فرمانبرداری کی روش اور اللہ کی راہ میں قربانیاں پیش کرنے کی صراطِ مستقیم۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے لیے عروج وزوال کا قانون اللہ تعالیٰ نے وہ نہیں رکھا ہے جو دوسری قوموں کے لیے مقرر ہے۔ دوسری قوموں کے لیے اس کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بنیادی قسم کی انسانی اخلاقیات اپنے اندر پیدا کر لیں اور ترقی کی ضروری مادی تدبیریں اختیار کر لیں تو اونچی اٹھ سکتی ہیں لیکن اُمت کے لیے صرف یہی چیزیں ترقی کا زینہ بننے کے لیے کافی نہیں ہیں کیونکہ یہ اُمت اس دُنیا میں اللہ کے دین کی علمبردار اور دوسری قوموں کے سامنے حق کی گواہ ہے دوسری کسی قوم کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ پوزیشن کا یہ اختلاف قطعی طور پر حقوق اور ذمہ داریوں کا اختلاف چاہتا ہے اور حقوق و ذمہ داریوں کا اختلاف ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ ضابطے بھی مختلف ہوں جن کے مطابق معاملہ ہونا چاہیے اس لیے یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ موت اور زندگی کا معاملہ اللہ کے قبضے میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے موت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے زندگی دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت جس شکل اور جس مقام پر لکھ دی ہے وہ آکر رہے گی۔ اگرچہ وہ بچنے کی کیسی تدبیریں کرلے۔ فرائض سے فرار میں زندگی کا ہرگز بچاؤ نہیں موت تو ہر حال میں آکر رہے گی یہ تو ممکن ہے کہ فرائض رہ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ زندگی رہ جائے زندگی تو بہر حال جاکر رہے گی۔

۲۸۸۔ اے اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی۔ یعنی تم ان کافر منافقوں کی طرح ایسے لغو خیالات کو زنہار دل میں جگہ نہ دو کہ گھر میں بیٹھے رہتے تو موت نہ آتی: مارے جاتے[1]

اس آیت میں الذین کفروا سے کون لوگ مراد ہیں۔ شارحین قرآن کی اکثریت کہتی ہے کہ اس سے منافق مراد ہیں۔ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ تم ان منافقوں کی طرح نہ ہو جاؤ کر ان جیسی باتیں کرنے لگو۔ اس قسم کی باتیں کرنا ایمان سے محروم ہونے کی علامت ہے۔ امام رازی نے یہاں منافقین کے حق میں الذین کفروا کے اطلاق سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صرف ایمان کا دعویٰ مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ہے جب تک قلب کی تصدیق بھی اس کی ہمنوا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن منافق کو کافر نہ کہتا جب کہ منافق اسلام کا زبانی دعویٰ کرتا ہے۔ اسی بنا پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فقہا نے زبان کے اقرار کو شرطِ ایمان قرار دیا ہے لیکن جب تک اقرار و تصدیق کے ساتھ التزامِ طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ غور فرمائیے ہرقل اور اس جیسے اور اہلِ کتاب نے تصدیق ضرور کی اور زبانی اقرار بھی کیا مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر دینِ اسلام کو عملاً اپنایا؟ کیا آپ اس کو صرف تصدیق و اقرار کی بنا پر اہلِ ایمان میں شمار کریں گے؟ انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہد و فاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے۔ ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفتِ نفس بن جائے کہ قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینے پر مجبور ہو جائے۔ اسی کو عملِ قلب کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ التزامِ طاعت اور انقیادِ قلبی بھی اس کا اہم جزء ہے۔ اگر ایک شخص تصدیق کرتا ہے مگر عہد و فاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح ایک شخص فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان تصدیق کے لیے آمادہ نہیں تو یہ بھی مومن نہیں ہے۔ عالمِ واقعات میں ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو۔ اسی کا نام شرعی تصدیق ہے اور منافق اسی سے محروم ہوتا ہے۔

منافقین مسلمانوں میں ملے جلے تھے

۲۸۹۔ انہوں نے سفر میں جانے والے یا جنگ میں شریک ہونے والے بھائیوں سے کہا۔
یعنی منافق ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے تھے اس لیے مسلمانوں کو اپنا بھائی کہا یا اس لیے کہ نسبی طور پر وہ اور انصارِ مدینہ برادری کے بھائی بند تھے اور چونکہ یہ بات خیر خواہی اور ہمدردی کے پیرائے میں کہتے ہیں اس لیے لفظ اخوان سے تعبیر کیا[1] ان توجیہات کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ منافقوں کا گروہ کافروں کا کوئی خاص سازشی گروہ تھا حالانکہ ایسا نہیں بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے جن کو قرآن منافق کہتا ہے انہوں نے اسلام کو بطورِ دین و اعتقاد اسی طرح اختیار کر لیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے، چنانچہ قرآن میں ان کے تعارف میں کفروا بعد اسلامھم اسلام لاکر پھر کفر کی باتیں کیں آیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے تھے، ان کی بیویاں ان کو مسلمان سمجھتی تھیں۔ ان کے بچے ان کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے روزہ رکھتے تھے۔ اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن کا فیصلہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انہوں نے پی لیا تھا لیکن حلق کے نیچے نہیں اترا تھا۔ کسی تعلیم کو اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم تھے۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اللہ کا کلام سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں بلکہ اس لیے کہ محض سنتے رہیں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوشی خوشی عمل کرتے۔ اور جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے مسلمان ہوتے اور جب کبھی قربانیوں کا موقعہ آجاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں۔ انفاق کا حکم ان کے لیے موت کا سامان ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں کوئی تامل نہ ہوتا[1] وہ مسلمانوں میں رہتے اس لیے ان کو بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔

غلط خیالی اور غلط بیانی

۲۹۰۔ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت واندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔ یعنی خواہ مخواہ باہر نکل کر مرے ہمارے پاس اپنے گھروں میں پڑے رہتے تو کیوں مرتے یا کیوں مارے جاتے۔ یہ کہنا اس غرض سے تھا کہ سننے والے مسلمانوں کے دلوں میں حسرت و افسوس پیدا ہو کہ واقعی بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے اور لڑائی کی آگ میں کود پڑنے کا یہ نتیجہ ہوا، گھر رہتے تو یہ مصیبت کیوں دیکھنی پڑتی مگر مسلمان ایسے کچے نہ تھے جو ان چکموں میں آجاتے۔ ان باتوں سے اُلٹا منافقین کا بھرم کھل گیا۔ بعض مفسرین نے لیجعل اللہ میں لام کو لام عاقبت لے کر معنے یوں کیے کہ منافقین کی زبانوں اور دلوں پر یہ باتیں جاری کی گئیں کہ خدا ان کو ہمیشہ حسرت و افسوس کی آگ میں جلتا چھوڑ دے اور دوسری حسرت ان کو یہ رہے کہ مسلمان ہماری طرح نہ ہوتے اور ہماری باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا۔ گویا اس طرح

---

[1] ترجمان قرآن

یعجل کا تعلق لاتکونوا سے بھی ہو سکتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ ایسے خیالات دماغ میں موجزن ہونا اور ان کا زبان پر لانا یہ خود ایک وبال ان کی منافقت اور نورِ ایمان سے محرومی کا ہے۔ دل میں ایقان تو ہوتا ہی نہیں جو تسکین پیدا کرتا ہے اس لیے ہر امرِ تکوینی و تقدیری سے ان کے دلوں میں حسرت اور کڑھن کا اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے [2]

یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ قضائے الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ تدبیروں ہی پر موقوف رکھتے ہیں ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا [3]

واضح لفظوں میں اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے کہ چونکہ یہ لوگ تقدیرِ الٰہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ پر صحیح اعتقاد نہیں رکھتے اس لیے ایسی باتیں کہا کرتے ہیں کہیں تم اے مسلمانو ایسی باتیں کرکے ان کی طرح نہ ہو جانا آگے اس غلط بات کا نتیجہ بتایا ہے کہ جس خیال کی بنا پر یہ بات ان کے منہ سے نکلتی ہے یہ غلط خیالی اور غلط بیانی ان کے لیے موجبِ حسرت و پشیمانی بنائے کیونکہ تقدیرِ الٰہی کے منکروں کو ہر حادثہ پر یہی حسرت ہوتی ہے کہ ہائے اگر فلاں تدبیر اختیار کرتے تو شاید یہ کام ہو جاتا۔

جلانا اور مارنا اللہ کا کام ہے

۲۹۱۔ ورنہ اصل میں جلانا اور مارنا اللہ ہی کا کام ہے۔ یعنی مارنا جلانا اللہ کا کام ہے۔ بہتیرے آدمی عمر بھر سفر کرتے ہیں اور لڑائیوں میں جاتے ہیں۔ مگر موت گھر میں بستر پر آتی ہے اور کتنے ہی آدمی گھر کے کونے میں پڑے رہنے کے خوگر ہیں لیکن اخیر میں خدا کوئی سبب کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ باہر نکلیں اور وہیں مریں یا مارے جائیں۔ بندہ کی روک تھام سے یہ چیز ٹلنے والی اور بدلنے والی نہیں ہے۔ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت فرمایا کہ میرے بدن پر ایک بالشت بھر جگہ تلوار یا نیزے کے زخم سے خالی نہیں مگر آج میں ایک اونٹ کی طرح گھر میں مر رہا ہوں — فلا نامت عین الجبنا خدا کرے یہ دیکھ کر نامردوں کی آنکھیں کھلیں [4]

واقعہ یہ ہے کہ موت و زندگی دونوں تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس مسبب الاسباب و علت

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] ماجدی [3] تفہیم [4] افاداتِ شیخ الاسلام

حقیقی کو چھوڑ کر نظر ظاہری اور فوری اسباب پر جانا اور سفر جہاد کو موت یا علت تامہ قرار دینا کیسی جاہلیت اور سفاہت ہے۔ امریکہ میں اس وقت سوشیالوجی (عمرانیات) کا ایک ماہر فاضل ڈینی سن اپنی کتاب EMOTION A BASIS OF CIVILISATION میں ایک جگہ لکھتا ہے "مسلمانوں کے اس عقیدہ تقدیر یا امر تکوینی کو خدا کو تفویض کر دینے کی عادت نے نیز عقیدہ شہادت نے مسلمانوں میں معرکہ جنگ کے اندر بڑی ہی قوت اور استقامت پیدا کر دی تھی۔ اس امریکی فاضل کا ایمان نہ عقیدہ تقدیر پر ہے اور نہ عقیدہ شہادت پر، اس کے باوجود بھی وہ ان عقیدوں کی نافعیت اور ان کی افادی حیثیت کی داد دینے پر اپنے آپ کو بے اختیار مجبور پا رہا ہے[1]

کردار میں کفار کی کاپی کرنا

۲۹۲۔ اور اللہ تمہاری حرکات پر خوب نگران ہے۔ منافقین و کفار کس راستے پر جا رہے ہیں۔ اور مسلمان کہاں تک ان کے تشبہ اور پیروی سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ہر ایک کو اس کی حالت کے مناسب بدلہ ملے گا۔[2]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ میں تمہاری ساری عملی زندگی ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کہاں کہاں اور کس کس گوشہ میں کفار و منافقین کی کاپی کر رہے ہو۔ گویا پہلے اقوال میں کفار کی تقلید سے روکا تھا اور اب اعمال میں ان جیسا طرز عمل ان جیسی روش اختیار کرنے سے منع کیا جا رہا ہے اللہ کو نہ یہ پسند ہے اور نہ وہ۔ اور ان دونوں میں ممانعت سے افکار میں کفار کی تقلید و پیروی کی ممانعت خود بخود نکل آئی ہے اور قرآن نے اس معاملہ میں یہ سنگینی اس لیے اختیار کی ہے کہ اُمت مسلمہ دنیائے کفر کی اپوزیشن ہے اور اسے کفر کے مقابلے میں اپوزیشن ہی رہ کر زندہ رہنا ہے اگر کفر و ایمان کے درمیان مصالحت ممکن نہیں تو پھر مومنین کو کفار کی پیروی، تقلید، اور ان کی روش کو اپنانے کی گنجائش کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس سورت میں قرآن یہ بات مختلف پیرایوں اور مختلف اندازوں میں بتا چکا ہے کہیں فرمایا یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین اور پھر فرمایا ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاءھم البینات ؕ واولٰئک لھم عذاب عظیم اور پھر بتایا یا ایھا الذین

---

[1] ماجدی [2] افادات شیخ الاسلام

آمنوا ان تطیعوا الذین کفروا یردوکم علی اعقابکم فتنقلبوا خاسرین اور اب ارشاد ہو رہا ہے یاایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا اور آخر میں یہ دھمکی دی گئی ان اللہ بما تعملون بصیر سب کا لب لباب یہ ہے کہ کفار کی تقلید اور پیروی نہ کرو اور کہیں نہ کرو۔ آیات قرآنی کے اسی زور کی وجہ سے حضور انور کا ارشاد ہے کہ

جس شخص نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہو جاتے گا۔

یہ حدیث ابوداؤد میں آتی ہے۔ اسی حدیث کو سامنے رکھ کر صحابہ و تابعین اور تمام سلف صالحین نے ہر قسم کی مثیلاً تبدیل ہیئت اور تبدیل معاشرہ کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کی اقتضاء الصراط المستقیم اور اُردو دان طبقہ کے لیے جناب قاری محمد طیب کی التشبہ فی الاسلام میں اس پر سیر حاصل بحث ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

۲۹۳۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ کی بخشش و رحمت تمہارے لیے ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جنہیں پونجی بنا کر وہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ کفار و منافقین چونکہ دُنیا کے بندے تھے۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ صرف دُنیوی فوائد کی خاطر تھی۔ اور ان کی بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کی عمریں لمبی ہوں اور وہ دُنیا میں رہ کر خوب مزے کریں۔ سفر میں مرنے والوں، اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے بارے میں ان کی بات ان کے باطنی خیالات اور قلبی رجحانات کی ترجمان تھی وہاں اس سے یہ بھی ممکن تھا کہ کہیں مسلمانوں میں کم ہمتی کا وسوسہ پیدا نہ ہو جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دی۔ یعنی اے ایمان والو اگر تم میں سے کوئی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے یا طبعی موت سے مر جائے تم کو غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ کی مغفرت و رحمت ان نفسانی حظوظ اور دُنیوی منافع سے کہیں بہتر ہے جن کو حاصل کرنے میں یہ کفار و منافقین دن رات لگے ہوتے ہیں۔[1]

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا مقصود اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دینا ہے اور یہ سمجھانا ہے کہ جہاد

---

[1] جواہر القرآن۔

میں مارا جانا دُنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے اس لیے کہ زندگی کا فائدہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ انسان زندہ رہ کر اپنی محنت و مشقت سے کچھ مال و متاع جمع کرے اور چند روزہ زندگی میں اس سے فائدہ اٹھائے اس کے برعکس راہِ خدا میں مارے جانے یا مر جانے سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا جو صلہ ملتا ہے وہ تمام دُنیا کے مال و متاع سے کہیں بہتر ہے کیونکہ دُنیا کی تمام لذتوں اور نعمتوں میں مضرتوں کی آمیزش ہے۔ دُنیا کی کوئی خیر ایسی نہیں کہ جس میں نفع ہی نفع ہو اور نقصان نہ ہو۔ پھر یہ فانی اور چند روزہ ہے لہٰذا دنیوی مال و متاع کے فوت ہو جانے کو موجب حسرت نہ سمجھو بلکہ ترکِ جہاد پر افسوس کرو۔[1]

گویا بتایا گیا ہے کہ سچا مومن وہ ہے جو موت سے نہیں ڈرتا اور کبھی اس ڈر سے قدم پیچھے نہیں ہٹاتا۔ موت سے تو کسی حال میں مفر نہیں پھر کیوں نہ اس موت کا استقبال کیا جائے جو حق کی راہ میں آئے اور جس کا نتیجہ اللہ کی مغفرت اور رحمت ہو۔

کفار کے اس کہنے کا کہ اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے دو جواب دیے ہیں ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ احیاء و اماتت اللہ کے قبضے میں ہے خواہ کوئی سفر میں ہو یا حضر میں میدانِ جنگ میں یا مجلس صلح میں، دوسرا جواب یہ دیا ہے مرنا تو ہر حال ہے پھر بجائے اس کے کہ گھر میں ایڑیاں رگڑ کر مر جاؤ اگر اللہ کی راہ میں تمہیں شہید کر دیا جائے یا اپنی موت سے ہی راہِ خدا میں مر جاؤ تو جو مغفرت اور رحمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے میسر آئے گی وہ ان چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے جو یہ کافر لوگ گھر میں بیٹھ کر جمع کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اوّل تو جہاد اور سفر کو موت میں کوئی خاص دخل نہیں بلکہ موت اور زندگی میں حقیقی دخل اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اگر فرض کر لو کہ سفر اور جہاد کو موت میں کوئی دخل ہے۔ پھر بھی جہاد اور سفر میں مرنا اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا موجب ہے اور اللہ کی یہ مغفرت و رحمت اس دولت و سرمائے سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور جس کی خاطر یہ زندگی پر جان دیتے ہیں۔ مال جمع کرنے کی نسبت کفار کی طرف کی گئی ہے کیونکہ مال و دولت کے جمع کرنے پر محنت اور وقت لگانا دُنیا دار اور دُنیا پرست کا کام ہے۔ ایمان دار مال جمع نہیں کرتا بلکہ خرچ کرتا ہے۔ ومما رزقنا ھم ینفقون

سب کی بالآخر اللہ کے حضور میں پیشی

۲۹۴۔ اور دیکھو خواہ تم اپنی موت مر جاؤ یا مارے جاؤ ہر حال میں تمہیں اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

---

[1] معارف قرآن م ا۔

یعنی فرض کرو کہ تم سفر یا جہاد میں نہ نکلے اور فی الحال موت سے بچ گئے مگر ضروری ہے کہ کبھی نہ کبھی مر و گے یا مارے جاؤ گے پھر بہر حال خدا کے سامنے سب کو جمع ہونا ہے اس وقت پتہ چل جائے گا کہ جو خوش قسمت اللہ کی راہ میں نیک کام کرتے ہوئے مرے یا مارے گئے تھے ان کو خدا تعالیٰ کی بخشش و مہربانی سے کیسا وافر حصہ ملا جس کے سامنے تمہاری دُنیا کی کمائی اور جمع کی ہوئی دولت و ثروت سب ہیچ ہے الحاصل اگر منافقین کا قول ہی تسلیم کر لیا جائے کہ گھر سے نہ نکلتے تو نہ مارے جاتے تب بھی سراسر خسارہ تھا کیونکہ اس صورت میں اس موت سے محروم رہ جاتے جس پر ایسی لاکھوں زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں بلکہ جو حقیقت میں موت نہیں حیات ابدی ہے۔

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے   جو جینا ہے تو مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔[1]

اس آیت کریمہ نے موت کے مسئلہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے یہ اسی عقیدے کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام کی گردنیں عین جنگ کی حالت میں اللہ سبحانہ کے حضور میں جھک جاتی تھیں اور ان کو موت سے کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہوتا تھا۔ مالی بیماری، مصیبت، عزیزوں کی جدائی کسی موقعہ پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہوتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اُٹھا بیٹھتے تھے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آکر رہے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا اس لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے نہ سمندر بہالے جا سکتے تھے نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ نیک کام پر نکلے یا مارے گئے تو نکلنے پر افسوس نہ کرے کہ اس میں انکار آتا ہے تقدیر کا اور آخرت کا فائدہ نہ دیکھنا دُنیا کے جینے کو عزیز رکھنا یہ سب خصلت ہے کافروں کی۔ (موضح)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ
الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ
وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ
اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ
وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى
اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

اے اللہ کے رسول یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے لیے بڑے ہی نرم مزاج واقع ہوتے ہیں[۲۹۵] ورنہ اگر آپ کہیں سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے ارد گرد سے بچھڑ جاتے[۲۹۶].

پس ان لوگوں کا قصور معاف کر دو اور اللہ سے بھی ان کے لیے بخشش مانگو اور نیز اس طرح کے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کرو پھر جب آپ کا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جاتے تو اللہ پر

بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ آپ کی مدد پر ہو تو کوئی طاقت آپ پر غالب آنے والی نہیں ہے اور اگر وہ آپ کو چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی کی ذات پر بھروسہ رکھیں"۔

رحمت و شفقت پر مبنی سیاسی نظام

اب تک قرآن نے اسلام کا سیاسی نظریہ، اسلام کا تصور قومیت اور نبوت کے علم و عمل کو قانون کا ماخذ بتایا ہے۔ اس آیت میں نظم مملکت کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ اس کی بنیاد سرتاسر شہریوں سے رحمت و شفقت پر مبنی ہے۔ یعنی قرآن ایسا سیاسی نظام چاہتا ہے جس کی عمارت رحمت و شفقت اور شوریٰ پر قائم کی گئی ہو۔ استبداد و تشدد اور جبر و اکراہ پر نہیں اسے سمجھانے کے لیے یہ مقام کس قدر موزوں ہے۔

آپ غور کریں کہ دشمن سے مقابلہ ہے اور اہل ایمان ایسے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس میں فوجی عدالتیں دلیل، اپیل اور وکیل تک کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔ قرآن ان کو عین میدان جنگ میں فشل، تنازع فی الامر اور عصیان جیسے سنگین جرائم کا مرتکب قرار دے چکا ہے۔ اس مرحلہ پر کون سربراہ اس قسم کے جرائم سے چشم پوشی کرتا ہے۔ قرآن نے اسی موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بات سے بات پیدا کر لی ہے اور حضور انور کو مخاطب کر کے بتایا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کی ذات سرتاسر شفقت و رحمت ہے۔ آپ کا نظام سیاسی رحمت، شفقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ بے شک یہ سنگین جرائم کے مرتکب ہیں لیکن آپ ان کو معاف کر دیجئے۔ اور صرف قانون اور ضابطہ کی معافی

نہیں بلکہ آپ کی شفقت کا تقاضا ہے کہ آپ ان کے لیے مغفرت کی دُعا کریں اور آئندہ اعتماد کی ایسی فضا بحال کیجئے کہ حکومت کے معاملات میں یہ آپ کے مشیر ہوں بالفاظِ دیگر یہ کہہ کر اعلان کیا گیا ہے کہ ایسے مجرموں کو بھی مسائل میں رائے زنی سے محروم نہ کیا جائے اور ان سے ووٹ کا حق سلب نہ کیا جائے کیا حد ہے اس رحمت کی آج دُنیا کی کوئی حکومت بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

آپ کی رحمت و شفقت

۲۹۵ - اللہ کے رسُول یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے لیے بڑے ہی نرم مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اصل ارشاد میں لنت لھم کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ لین سے بنا ہے اس کے معنے نرم ہونے کے آتے ہیں۔ اسی سے صفت کا صیغہ لین آتا ہے۔ حضرت موسٰی و ہارون کو جو آدابِ تبلیغ سکھائے جانے میں قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے۔

فقولا لہ قولا لینا   تم دونوں اس سے نرم بات کہنا

لیکن یہاں صرف بات کو نرم نہیں بلکہ آپ کی ذات گرامی کو سرتا سر نرم کہا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ آپ بات نرم کہتے ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ ان کے لیے سراپا نرم ہیں۔ ایک ایسی ذات گرامی میں یہ وصف نہایت اہم ہے جو دُنیا میں حق کی اقامت کا فریضہ لے کر آیا ہو تاکہ ایک طرف لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو، دوسری طرف وہ اس کے حلقہ اطاعت میں خوش دلی اور جوشِ محبت کے ساتھ داخل ہوں۔ اسی لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر رکھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام ہے جس میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے یہی لین، نرمی، رفق و تلطف ہے۔ جس طرح حسنِ فطرت، زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح لین و رفق سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی۔

> نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

اس میں جس چیز کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور

سختی بیکار بلکہ مضر ہوتی ہے الا یہ کہ قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں نرمی اور سختی کے مواقع میں امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ ام المومنین فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا البتہ جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے۔ جن میں آپ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں :

> گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا ہے۔ فتح الباری جلد ۱۰ ص ۲۲۹۔

جیسا کہ فاثابکم غما بغم میں پڑھ آتے ہو کہ تم نے رسُول کا دل تنگ کیا۔ اس کے بدلے تم پر تنگی آئی۔ بلاشبہ اس سے آپ کے قلب میں ملال و رنج ہونا ناگزیر اور اس ملال و رنج کے نتیجہ میں آپ کی پالیسی میں سختی رونما ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے فرمایا کہ یہ صرف اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم ہو گئے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ جب آپ کی ذات تھی سرتاسر لین و نرم تو پھر اس موقعہ پر خاص طور پر یہ کیوں کہا کہ صرف اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ جب ان احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیے گئے ہوں فروگذاشت ہوتی ہے یا ان احکام کی تعمیل نہیں ہوتی ہے تو قواعد جنگ کا تقاضا ہے کہ سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ یہ موقعہ لینت کے اظہار کا نہیں بلکہ شدت کے اظہار کا ہوتا ہے۔ پھر حضور انور کے ارشاد کی نافرمانی ہوئی جس کے نتیجہ میں اہلِ ایمان ہولناک مصیبت کا شکار ہوتے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ سنگین سے سنگین تر سزا دی جائے لیکن عین اس موقعہ پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو کچھ نہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی اس نرمی میں اللہ کی خاص رحمت کا ہاتھ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی نرمی کو یہاں بیان کیا ورنہ آپ کے اخلاق میں نرمی کے کوائف ناقابلِ شمار ہیں۔

یہاں خاص طور پر آپ کی نرمی کو سنانے میں یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام کے نظامِ حیات کو چلانے والے اہلِ ایمان جو دوسروں کے لیے پیشرو ہونے والے ہیں اور جن کے ہاتھ زمامِ قیادت

آنے والی ہے وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں چنانچہ ایک ارشادِ نبوت میں بھی اس طرف اشارہ ہے:

اللہ کو کوئی حلم اور نرمی سربراہِ مملکت کے حلم اور نرمی سے زیادہ پسند نہیں اور کوئی جہل سربراہِ مملکت کی جہالت سے زیادہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں ہے۔

مکمل سپردگی رحیمانہ اخلاق کا نتیجہ ہے

۲۹۶ ۔ ورنہ اگر تم کہیں سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے گرد سے بچھڑ جاتے اصل ارشاد میں فظا اور غلیظ القلب کے الفاظ آئے ہیں۔ فظ کے معنے درشت خو، دراصل برے اخلاق کی سختی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے ساتھ رہنا لوگ پسند نہ کرتے ہوں اور غلیظ القلب کے معنے سخت دل کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی میں نرمی کی جگہ سختی اور خوش مزاجی کی جگہ سخت مزاجی ہوتی تو نہ تو اللہ کے بندے آپ کی بات سنتے اور نہ عقیدت و محبت سے لبریز اطاعت کرتے۔ یہ آپ کے کریمانہ، رحیمانہ، شفیقانہ اخلاق کا کارنامہ ہے کہ عرب نے ساری جہالتوں، خرابیوں اور غلاظتوں کے باوجود مکمل طور پر آپ کو اپنی قیادت سونپ دی۔ قانونِ الٰہی کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا اور خواہشات و خودسری سے مکمل طور پر دستبردار ہو گئے وہ ایسے غلام بن گئے جو نہ اپنے مال کا مالک ہے نہ اپنی جان کا۔ جو مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف بھی نہیں کر سکتا۔ ان کی صلح و جنگ، دشمنی و دوستی، خوشی و ناراضگی، عطا و محرومی اور صلہ و قطع رحمی سب اللہ کے رسول کے حکم کے تابع تھی۔ جو کچھ بھی کرتے آپ کے حکم کے موافق کرتے۔

قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جس قیادت کی بنیاد فظاظت اور غلاظتِ قلب پر ہوگی وہ اسلامی قیادت نہیں ہے۔ اس میں عام شہری مجبورانہ اطاعت تو کر سکتے ہیں لیکن دل کی پوری خوشنودی اور دماغ کے پورے سکون کے ساتھ ہمنوائی نہ کریں گے۔ مسجد کی امامت، مدارس کی معلمی، خانقاہ کی مشیخت، انجمنوں کی سربراہی یا پھر ملک و حکومت کی صدارت ان میں سے ہر جگہ قیادت کے اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دامن فظاظت اور غلاظت کی گندگی سے بے داغ اور پاک ہو۔ اگرچہ ابوبکر الجصاص نے اس کی وسعتوں پر دعوت کا پشتہ باندھنے کی کوشش کی ہے لیکن قرآن کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہ دعوت عام ہے

خواہ زندگی کے کسی گوشہ میں ہو۔

معافی دیجئے اور اللہ سے ان کیلئے مغفرت مانگئے

۲۹۰۔ پس ان لوگوں کو معاف کردو اور اللہ سے بھی ان کے لیے بخشش کی دُعا کرو اور نیز اس طرح کے کاموں میں ان سے مشورہ کرلیا کرو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسہ پر کام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں پر متنبہ فرمانے اور معافی کا اعلان سنانے کے بعد نصیحت کی تھی کہ آئندہ اس مارِ آستین جماعت کی باتوں سے فریب مت کھانا، اس آیت میں ان کے عفو و تقصیر کی تکمیل کی گئی ہے۔ چونکہ جنگِ اُحد میں سخت خوفناک غلطی اور زبردست کوتاہی مسلمانوں سے ہوئی تھی۔ شاید آپ کا دل خفا ہوا ہوگا اور چاہا ہوگا کہ آئندہ ان سے مشورہ لے کر کام نہ کیا جائے اس لیے حق تعالیٰ نے نہایت عجیب و غریب پیرائے میں ان کی سفارش کی۔ اول اپنی طرف سے معافی کا اعلان کیا کیونکہ خدا کو معلوم تھا کہ آپ کا غصہ اور رنج خالص اپنے پروردگار کے لیے ہوتا ہے۔ پھر فرمایا فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم یعنی اللہ کی کتنی بڑی رحمت آپ پر اور ان پر ہے کہ آپ کو اس قدر خوش اخلاق بنا دیا۔ کوئی اور ہوتا تو خدا جانے ایسے سخت معاملہ میں کیا رویہ اختیار کرتا۔ یہ کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ آپ جیسا شفیق اور نرم دل پیغمبر ان کو مل گیا۔ فرض کیجئے اگر خدا نہ کردہ آپ کا دل سخت ہوتا اور مزاج میں شدت ہوتی تو یہ قوم آپ کے گرد کہاں جمع ہوتی ان سے کوئی غلطی ہوتی اور آپ سخت پکڑ کرتے تو شرم و دہشت کے مارے پاس بھی نہ پھٹکتے۔ اس طرح یہ لوگ بڑی خیر و سعادت سے محروم رہ جاتے اور جمعیت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا لیکن حق تعالیٰ نے آپ کو نرم دل اور نرم خو بنایا۔ آپ اصلاح کے ساتھ ان کی کوتاہیوں سے اغماض کرتے رہیے سو یہ کوتاہی بھی جہاں تک آپ کے حقوق کا تعلق ہے معاف کر دیجئے اور گو خدا اپنا حق معاف کر چکا ہے تاہم ان کی مزید دلجوئی اور تطییب خاطر کے لیے ہم سے بھی ان کے لیے معافی طلب کریں تاکہ یہ شکستہ دل آپ کی خوشنودی اور انبساط محسوس کر کے بالکل مطمئن اور منشرح ہو جائیں اور صرف معاف کر دینا ہی نہیں بلکہ آئندہ بدستور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کریں۔ مشاورت کے بعد جب ایک بات طے ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لیا جائے۔ پھر خدا پر توکل کر کے اس کو بلا پس و پیش کر گزریے۔ خدا تعالیٰ متوکلین کو پسند کرتا ہے اور ان کا کام بنا دیتا ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت کی ضروری تشریح تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں لیکن ضروری ہے کہ سیاق و سباق کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی اس پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس آیت کرامی کی موعظتیں اور عبرتیں پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

اسلامی حکومت کا مزاج

یہ آیت قرآنی بتاتی ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک ممتاز مزاج ہے۔ یہ حکومت ایک داعی کی حیثیت رکھتی ہے یہ اپنے دائرہ اختیار میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اقوام دنیا کے سامنے اسلام کے پیغام کو پیش کرتی ہے اس حکومت کی حیثیت مبلغ داعی اور معلم کی ہے اور اس کا سارا کام محبت، اخوت، رحم، نرمی و شفقت اور ہمدردی کی بنیادوں پر انجام پائے گا اور یہی اس کا امتیازی نشان ہے فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی امت کے افراد نے آپ سے ایسی محبت اور ایسی جاں نثاری کی ہے جس کی مثال عشاق اور اہل محبت کی تاریخ میں ملنے میں نہیں آتی ہے۔ آپ کی طاعت و تابعداری میں اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے اور گھر بار لٹا دینے کے ایسے واقعات پیش آئے جو نہ آپ سے قبل پیش آئے تھے اور نہ آئندہ ان کی امید ہے۔

اطاعت و تابعداری محبت و شفقت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب صحابہ کرام محبت کی دولت سے مالا مال ہوئے تو انہوں نے اپنی ساری طاقت آپ کی اطاعت میں صرف کر دی۔ اس کی بہترین مثال سعد بن معاذ کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنی اور جماعت انصار کی جانب سے بدر سے پہلے کہا تھا۔

> میں انصار کی طرف سے منشرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں اور ان کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں، جس کا تعلق چاہیں قائم کریں اور جس کا چاہیں توڑ دیں اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں۔ جو کچھ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے بخدا اگر آپ برک غمدان چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں گھوڑے ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے [1]

[1] زاد المعاد

اسلامی حکومت میں مشورے کی حیثیت

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک اہم رکن مشورہ ہے جس بات کو یہاں حضور کو امر کے درجے میں پیش کیا ہے اسی کو قرآن ہی میں دوسری جگہ اہل ایمان کے اوصاف میں خبر کے انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن میں ہے وامرھم شوری بینھم اس لیے مشورہ اسلامی طرز حکومت کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف یہ کہ جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوتے ضابطہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔

ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ آیت میں امر سے مراد حکومت ہے اسی سے قرآن میں ارباب حکومت کے لیے اولی الامر آیا ہے۔

اس بنیادی حقیقت کے بعد ہمارے سامنے یہ اہم سوال آتا ہے کہ اگر مشورہ اسلام کے سیاسی نظام کا اہم رکن ہے تو پھر اس کی حدود کار یا اس کا دائرہ کار کیا ہے۔ حضرت علی کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے میں نہ قرآن میں حکم ہو اور نہ آپ سے ہم نے کچھ سنا ہو تو ہم کیا کریں فرمایا:

میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کر لو اور اس معاملے کو باہم مشورے کے لیے پیش کر دو۔
کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی پھیلی ہوئی تمام وسعتیں مشورے کی حدود میں الا یہ کہ کوئی معاملہ ایسا ہو جس میں قرآن وسنت کا کوئی ناطق فیصلہ موجود ہو۔ صدر ریاست کے تقرر سے لے کر تشکیل اور تنظیم حکومت تک کے تمام سیاسی اور اجتماعی شعبے مشورے کے رہین منت ہیں یعنی مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ حکم نہایت وسیع معنے میں ہے لیکن اس میں شوری کی کوئی خاص صورت مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لیے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر شوری کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوری براہ راست تمام لوگوں سے ہو یا لوگوں کے نمائندوں سے۔ یہ نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے، انتخاب مملکت گیر ہو یا صرف صدر مقام میں انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لیے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معروف ہو۔ مجلس شوری ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن

کے لیے یکساں موزوں نہیں ہوسکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لیے ہوسکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں اس لیے اسلام کے نظام سیاسی میں نبوت نے ان اُمور کو کھلا چھوڑ دیا ہے نہ کسی خاص شکل کو مقرر کیا اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع قرار دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ — شورائیت اور مشورہ کو اسلامی حکومت کے لیے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اگر امیر مملکت مشورے سے آزاد ہوجاتے یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطۂ نظر سے مشورے کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا واجب ہے۔

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اُصولوں میں سے ہے جو امیر کہ اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ کرے اس کا معزول کرنا واجب ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں

(البحر المحیط لابی حیان[1])

شوریٰ کی بنیاد پر حکومت کی تشکیل کیسے ہو۔ صدر مملکت کا تقرر اور مجلس شوریٰ کیسے وجود میں آئے۔ اس پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ پارہ پنجم میں آئیں گی۔

ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرو

۲۹۸۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں ہے اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرسکتا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ پہلے آپ کو فرمایا تھا بھروسہ کرو اللہ پر یہاں بتلا دیا کہ بھروسہ کے لائق ایسی ہی ذات ہوسکتی ہے جو سب سے زبردست اور غالب ہو۔ سب مسلمانوں کو اس کی امداد پر توکل کرنا چاہیے۔ گویا مسلمانوں کی تقصیر خود معاف کرنے اور اپنے پیغمبر سے معاف کرا دینے کے بعد ان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ کسی کے کہنے سننے میں نہ آئیں۔ خالص خدا پر بھروسہ رکھیں اس کی مدد ہوگی تو کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی جیسے بدر میں دیکھ چکے ہو اور کسی مصلحت سے وہ مدد نہ کرے تو پھر کوئی مدد نہیں کرسکتا جیسا کہ اُحد میں تجربہ ہوگیا۔[2]

اس آیت گرامی میں اللہ کی نصرت کا ذکر کرکے بتایا ہے کہ اہل ایمان کا اصلی سرمایہ اور واقعی قوت

---

[1] معارف قرآن م ش [2] افادات شیخ الاسلام

اللہ پر توکل ہے اور یہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ توکل قرآن پاک کی اصطلاح میں بے حد اہمیت رکھتا ہے عام لوگ اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کیلئے جدو جہد اور کوشش نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کے کسی حجرے یا خانقاہ میں بیٹھے رہو اور یہ سمجھو کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا۔ یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے جس کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

توکل کے معنے

توکل کے لفظی معنے بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے نہ کرنے میں؟ غلط کار لوگوں نے ترک عمل اسباب و تدبیر سے بے پرواہی اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے۔ حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور اس کے نتائج کے لیے اپنی کوشش و محنت پر نہیں بلکہ اللہ پر یقین رکھنے کا۔ اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش نہ کرنے کا نام توکل ہوتا تو قرآن میں تلاش رزق کے لیے فامشوا فی مناکبھا و کلوا من رزقہ اور جنگ کی خاطر یاایھا الذین آمنوا خذوا حذرکم اور اعدوا لھم ما استطعتم کا حکم نہ ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ انبیاء ہی کو روانہ نہ کرتا اور ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی دسرگرمی کی تاکید نہ کرتا۔ اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا۔ نہ بدر و احد اور خندق و حنین میں سواروں، تیر اندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل میں مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے۔ اس آیت میں حکم ہو رہا ہے کہ جب کوئی لڑائی یا کوئی اجتماعی مشکل پیش آجائے تو سب سے پہلے لوگوں سے اس کے متعلق مشورہ کرلو۔ مشورے کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کو انجام دینے کا عزم کرلو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا ضرور نتیجہ پیدا کرے گا۔ اگر نتیجہ حسب دلخواہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی مصلحت اور حکمت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو اور جب خاطر خواہ نتیجہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور کاوشوں کا نتیجہ ہے بلکہ یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا اور اسی نے

تم کو کامیاب و بامراد بنایا ہے۔

اس آیت نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت واضح کر دی ہے کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نام نہیں بلکہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دینے اور یہ یقین کرنے کا نام ہے کہ خدا مدد کرے تو ہم کو کوئی ناکام نہیں کر سکتا۔

احادیث اس موضوع پر بے شمار ہیں۔ مسند احمد اور صحیحین میں بحوالہ عبداللہ ابن عباس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

میری امت میں ستر ہزار اشخاص بغیر حساب و کتاب کے جنت میں جائیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے جو شگون بد کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے بلکہ اپنے پروردگار پر توکل رکھتے ہیں۔

ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ میں اونٹ کو یوں ہی کھلا چھوڑ کر توکل کروں یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا کہ اس کو باندھ کر اللہ پر بھروسہ کر۔

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں مگر حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے منشا سے ہم آہنگ ہے۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوا کہ اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے ہی روزی پہنچاتا جیسا کہ پرندوں کو پہنچاتا ہے۔ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں [1]

اس موضوع پر سلف صالحین سے جو نقول ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی بہت ہی واضح ہیں۔

ایک شخص نے امام احمد سے دریافت کیا میں متوکلاً علی اللہ حج کا ارادہ رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ قافلہ کے ساتھ نہ جاؤ تنہا جاؤ۔ بولا میں تو قافلہ کے ساتھ جاؤں گا فرمایا کہ پھر لوگوں کے ناشتہ دانوں پر توکل کرو گے اللہ پر نہیں۔

امام احمد ہی کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا حضرت یہ لوگ متوکلین کہتے

---

[1] ترمذی۔

ہیں کہ ہمارا کام بیٹھنا ہے روزی پہنچانا اللہ کے ذمہ ہے فرمایا کہ یہ بات قطعاً بیہودہ ہے اللہ سبحانہ فرماتا ہے اذا الصلاۃ من یوم الجمعۃ الخ

امام غزالی فرماتے ہیں اللہ کی سنت کے خلاف کرنا شرطِ توکل نہیں ہے۔

جنید بغدادی کے شیخ ابو حفص کہتے ہیں کہ میں نے بیس سال تک توکل کو راز بنائے رکھا اور کبھی بازار نہیں چھوڑا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝
اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ خیانت سمیت روزِ قیامت پیش ہوگا پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔[299] کیا ایسا آدمی جو رضائے الٰہی کا پیروکار ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی ناراضگی میں اپنا ٹھکانہ بنایا ہو اور جس کا ڈیرہ جہنم ہے۔[300] اللہ کے یہاں لوگوں کے الگ الگ درجے ہیں اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔[301]

عصمتِ نبوت کا مقام

شارحین قرآن اس آیت کی تشریح میں مختلف الخیال ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ جن تیر اندازوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا لشکر لوٹا جا رہا ہے تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انہی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقعہ پر محروم رہ جائیں۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے جواب میں کچھ عذر پیش کیے جو نہایت کمزور تھے اس پر حضور نے فرمایا بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم بلکہ تمہارا خیال تھا کہ ہم تمہارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہ دیں گے۔ اس آیت کا اشارہ اسی معاملہ کی طرف ہے[1]

واقعہ حسب روایت ترمذی یہ ہے کہ غزوہ بدر میں مال غنیمت میں ایک چادر گم ہو گئی تھی کچھ لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لی ہے۔ یہ کہنے والے اگر منافق تھے تو کوئی بعید بات نہیں اور ممکن ہے کہ کوئی ناسمجھ مسلمان ہی ہو تو اس نے یہ سمجھا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا اختیار ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

صاحب جواہر القرآن کا میلان بھی اسی طرف ہے اور مولانا محمد ادریس نے یہ دونوں روایات درج فرما کر لکھا ہے کہ — بہرحال آیت غزوۂ اُحد سے متعلق ہو یا غزوہ بدر سے مقصود ایک بے عنوانی پر تنبیہہ ہے گزشتہ آیات میں جنگ اُحد کی ایک کوتاہی کو بیان فرمایا اور اس آیت میں جنگ بدر کی ایک کوتاہی یاد دلادی سا دریہ تبلا دیا کہ منصب نبوت کے ساتھ خیانت جمع نہیں ہو سکتی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں،

مترجم گوید کہ چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متصرف بودند در مال غنیمت ایں آیت نازل شد تا کسے گمان خیانت نہ کند۔

یعنی چونکہ مالیاتی نظام یعنی غنیمت پر حضور ہی کا تصرف تھا اور آپ ہی کے صوابدید پر موقوف تھا اس لیے یہاں خاص طور پر مال غنیمت کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں ان سب باتوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔

اس سے مراد مسلمانوں کی خاطر جمع کرنی ہے یہ نہ جانیں کہ حضرت نے ہم کو ظاہر میں معاف

---

[1] تفہیم [2] معارف القرآن م سش

کر دیا اور دل میں خفا ہیں۔ پھر کبھی خفگی نکالیں گے۔ یہ نبیوں کا کام نہیں ہے کہ دل میں کچھ اور ظاہر میں کچھ۔ یا مسلمانوں کو کچھ سمجھانا ہے کہ حضرت پر گمان نہ کریں کہ غنیمت کا مال کچھ چھپا رکھیں۔ شاید اس لیے فرمایا کہ وہ تیرانداز مورچہ چھوڑ کر دوڑے غنیمت کو۔ کیا حضرت ان کو حصہ نہ دیتے یا بعض چیز چھپا رکھتے اور کہتے ہیں کہ بدر کی لڑائی میں ایک چیز گم ہو گئی، کسی نے کہا کہ شاید حضرت نے اپنے واسطے رکھی ہو گی اس پر یہ آیت اتری۔

حضرت شاہ صاحب نے جس بات کو اولیت دی اور جو ان کی خداداد ذہنیت کا شاہکار ہے وہ بے حد لطیف ہے۔ قرآن کے سیاق و سباق سے بے حد مربوط ہے۔ وشاورھم فی الامر کے بعد یہ بات کہ تم بالکل مطمئن رہو۔ تمہارے لیے نبوت کی جانب سے یہ معافی نامہ دائمی ہے اور یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ کبھی مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقعہ پر تمہاری ان غلطیوں کا جو تم سے اُحد میں ہو چکی ہیں نبوت ایکشن لے گی۔ یہ شانِ نبوت نہیں ہے یعنی یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ نبی ہو کر یہ کام کرے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ منافقوں کے اس اعتراض کا بھی جواب ہو کہ ہم نے مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے لیکن انہوں نے ہماری اور ہمارے بھائیوں کی کوئی پروا نہ کی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام پر لے جا کر دشمن سے مروا دیا یہ قوم کی بدخواہی اور بے وفائی ہے۔ قرآن نے اس آیت میں ان کے الزام کی تردید کی ہے کہ تمہارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے کوئی نبی اپنی اُمت کے ساتھ کبھی بے وفائی اور بدعہدی نہیں کر سکتا۔

بہرحال کچھ ہو یہ آیتِ گرامی اگر ایک طرف اہلِ ایمان سے کہہ رہی ہے کہ جب حضور انور تمہیں معاف کر چکے ہیں تو تمہارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ان کے تمام احکام و عزائم کی بے چون و چرا اطاعت کرو وہ اللہ کے نبی ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا نبی خلقِ خدا کی امامت و پیشوائی کے فرائض میں کسی طرح کی خیانت کرے۔ دوسری طرف یہ اُمت بتا رہی ہے کہ نبی کی ذات معصوم اور بے گناہ ہے۔ یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں ہے۔ اس لیے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شانِ نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیح کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے۔ اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول

ناہوں سے پاک اور معصوم ہیں۔

۲۹۹۔ کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ خیانت سمیت روزِ قیامت پیش ہوگا۔ پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پہ کوئی ظلم نہ ہوگا۔

اس سے غرض یا تو مسلمانوں کی پوری طرح خاطر جمع کرنا ہے تاکہ یہ وسوسہ نہ لائیں کہ شاید حضرت نے ہم کو بظاہر معاف کر دیا اور دل میں خفا ہیں پھر کبھی خفگی نکالیں گے۔ یہ کام نبیوں کا نہیں کہ دل میں کچھ ظاہر میں کچھ یا مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ حضرت کی عظمت و عصمت و امانت کو پوری طرح مستحضر رکھیں۔ آپ کی نسبت کبھی کوئی لغو اور بیہودہ خیال نہ لائیں مثلاً یہ گمان نہ کریں کہ غنیمت کا کچھ مال چھپا رکھیں گے العیاذ باللہ۔ شاید یہ اس واسطے فرمایا کہ وہ تیر انداز غنیمت کے لیے مورچہ چھوڑ کر دوڑے تھے۔ کیا حضرت ان کو حصہ نہ دیتے یا کچھ چھپا لیتے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ بدر کی لڑائی میں ایک چیز غنیمت میں گم ہو گئی تھی۔ کسی نے کہا کہ شاید حضرت نے اپنے واسطے رکھی ہو گی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بہرحال مسلمانوں کو یہ سمجھانا ہے کہ اگر حضور اپنی نرم خوئی اور خوش خلقی سے تمہاری غلطیوں کو معاف کرتے ہیں تو تم کو حضور کی عظمتِ شان اور عصمت و نزاہت کا بہت زیادہ پاس رکھنا چاہیے۔ کسی قسم کا کڈ در بارگاہ خیال مومنین کے پاس نہ آنے پائے۔ دوسری طرف چونکہ آپ کی شفقت یاد دلا کر جنگِ احد کے متعلق مسلمانوں کی کوتاہی کو معاف کرایا جا رہا تھا۔ اسی ذیل میں ایک دوسری کوتاہی بھی یاد دلا دی جو بدر سے ہی متعلق تھی کہ آپ اپنی نرم خوئی سے اس پر بھی کچھ دھیان نہ کریں۔ غلول کے اصل معنے غنیمت میں خیانت کرنے کے ہیں۔ لیکن کبھی مطلق خیانت کے معنے میں آتا ہے بلکہ بعض اوقات محض ایک چیز کے چھپا لینے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا غلوا مصاحفکم اپنے قرآن چھپا لو۔[1]

آیت کی ضروری تشریح ہو چکی ہے لیکن کچھ بحث طلب امور باقی ہیں۔

غلول کے معنے

عربی زبان میں غل کے معنے کسی چیز کو چپکے سے لے لینا ہے جیسے چوری۔ اس کا زیادہ استعمال

---

[1] افادات شیخ القرآن

تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت میں چوری پر ہوتا ہے۔ دراصل یہ لفظ غلل سے بنا ہے اس کے معنے درخت کے ریشوں میں پانی پہنچنے کے ہیں۔ خیانت کو بھی غلول اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ کسی کی ملک میں چھپکے سے ناجائز طور پر دراندازی ہوتی ہے۔ اسی سے کینہ کو غل کہتے ہیں اور پیاس کی شدت کو غلیل کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل نصح کا متابل آتا ہے جس کے معنے خیرخواہی اور خیرسگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے ماکان لنبی ان یغل کی تشریح جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے ماکان لنبی ان یخون امتہ سے کی ہے یعنی نبی اپنی اُمت سے خیانت نہیں کرتا۔ نیز یہ لفظ قرآن میں متعدد جگہ غش، عداوت، کینہ اور حسد کے معنے میں استعمال ہوا ہے لا تجعل فی قلوبنا غلاً اب اس فقرے کے معنے یوں ہوں گے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ خیانت کرے۔ یہ اندازِ تعبیر زیادہ بلیغ ہے اس سے کہ یوں کہا جاتا کہ نبی خیانت نہیں کرتا ہے۔ گویا پہلے انداز میں امکان خیانت کی نفی ہے جب کہ دوسرے میں صرف خیانت کرنے کی نفی ہے۔ شاید امام رازی کی اسی نکتہ پر نظر پہنچی کہ آپ نے لکھا ہے ان النبوۃ والخیانۃ لا یجتمعان نبوت اور خیانت دونوں یکجا نہیں ہو سکتی ہیں۔ اور ابوحیان اندلسی نے بھی ایسی بات لکھی ہے کہ:

> مطلب یہ ہے کہ نبی سے ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ غلول معصیت ہے اور پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور نفی میں اشارۃً سمجھا دیا گیا ہے کہ اس کا نبی کے بارے میں وہم بھی درست نہیں ہے۔

اس موقعہ پر خاص طور پر حضور انور کا ذکر صرف اس پس منظر کی خاطر نہیں ہے جو روایات میں آیا ہے بلکہ اُمت کے اجتماعی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے ہے۔ اسی حیثیت سے آپ کو مشورے کا حکم آیا ہے ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسُول کو کسی مشورے کی حاجت نہیں۔ گویا حضور کا ذکر اس پیش منظر کی خاطر ہے کہ اُمت کے اجتماعی ادارے کے حضور کے بعد سربراہ بننے والے سمجھ لیں کہ عام فوجی تو درکنار خود سربراہِ مملکت بھی اس کا مجاز نہیں ہے کہ اس میں خیانت کرے اور چپکے سے اس میں کچھ لے لے۔

غلول کا حکم اور اجتماعی ادارے

افراد کا جذبہ تعاون اور اجتماع کا احساس ذمہ داری مختلف اداروں کو قیام عمل میں لاتا ہے جو

کسی نہ کسی نوع سے انسانی زندگی کی تعمیر و تزکیہ میں حصہ لیتے ہیں۔ افراد کا ارادہ اور اجتماعی ضرورت کا احساس مختلف اداروں کو مختلف درجوں میں وہ اخلاقی یا قانونی قوت عطا کرتا ہے جو ان کے عمل کے لیے ضروری ہیں۔ دینِ فطرت ان اداروں کا ایک مقام تسلیم کرتا ہے۔ اسلام نے اجتماع کو قیامِ دین، دعوت الی الخیر، شہادت علی الناس، امر بالمعروف نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں سونپی ہیں۔ حکومت ان کی اوّلین ذمہ دار قرار پاتی ہے۔ افراد کا اسلامی شعور اس مرکزی ادارہ سے اپنے مقصدِ زندگی کے حصول میں ہر ممکن مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلامی حکومت کے مالیاتی ذرائع میں سے ایک اہم مالی ذریعہ غنائم ہیں۔ غنیمت وہ مال ہے جو حالتِ جنگ میں مخالف فوج سے حاصل ہو۔ یہ اموال سرکاری ہوتے ہیں ان میں تقسیم کے بعد پانچواں حصہ غنیمت کا ہوتا ہے۔ قرآن نے اس مالی ذریعہ کا نام لے کر بتایا ہے کہ یہ سربراہ کی بھی ملکیت نہیں بلکہ اُمت کا اشتراکی سرمایہ ہے۔ اس میں چوری پوری اُمت کی چوری ہے اور یہ صرف مالِ غنیمت ہی کا حکم نہیں بلکہ حکومت کے تمام مشترکہ املاک کا بھی حکم ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ سرکاری ملازموں کے تحائف اور ہدایا کا بھی حکم غلول ہی کا ہے اور روزِ قیامت اس کے ساتھ معاملہ بھی وہی ہوگا جو مالِ غنیمت میں چوری کرنے والے سے ہوگا۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں مشہور صحابی ابوحمید الساعدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک شخص لتبیہ کے صاحبزادے کو ایک جگہ کا عامل (کلکٹر) مقرر کیا۔ جب وہ صدقات کی وصولیابی کے بعد حضور انور کی خدمت گرامی میں آئے تو بولے کہ یا رسول اللہ اس قدر مال تو سرکاری خزانہ کا ہے اور یہ میرا ہے کیونکہ لوگوں نے مجھے ہدیہ میں دیا ہے۔ حضور انور نے مسلمانوں کو جمع کرکے تقریر فرمائی کہ

"اس عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو ایک کام کے لیے مقرر کرتے ہیں اور جب وہ واپس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ سرکار کا ہے اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ دیا ہے۔ وہ اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے پھر دیکھے کہ اسے کون ہدیہ دیتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے۔ کہ تم میں سے جو شخص بھی جس چیز کی خیانت کرے گا روزِ قیامت اللہ کے دربار میں اسے لے کر پیش ہوگا۔ اگر وہ اونٹ ہے تو اونٹ گردن پر لائے ہوگا اور وہ ابڑاتا ہوگا اور اگر وہ بکری ہے تو بکری گردن پر لائے ہوگا اور وہ بکری میں میں کرتی ہوگی۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا۔

سنن ابوداؤد میں حضرت بریدہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ

جسے ہم سرکاری ملازم رکھ لیتے ہیں اور اسے تنخواہ دیتے ہیں تو تنخواہ کے علاوہ جو کچھ وہ لیتا ہے وہ غلول ہے۔

غلول کی آخرت میں سزا

قرآن نے سزا کے ضمن میں پہلی بات یہ بتائی ہے کہ ایسا شخص اپنی خیانت سمیت اللہ کے حضور پیش ہوگا مطلب یہ ہے کہ خیانت چھپی نہ رہے گی۔ ایک روز آئے گا وہ ظاہر ہو جائے گی۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ جس قدر خیانت کی ہے بطور سزا خیانت کا مال روز قیامت اس پر لادا جائے گا تاکہ میدان حشر میں ذلیل و رسوا ہو۔

احادیث میں یہ بات بوضاحت سمجھائی گئی ہے کہ جس نے جو چیز چھپائی ہوگی وہ روز قیامت اس طرح حاضر ہوگا کہ وہ چیز اس کی گردن پر لدی ہوئی ہوگی۔ کسی کی گردن پر اونٹ، کسی کی گردن پر گھوڑا ہوگا۔ ان روایات میں سب سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جو امام بخاری و مسلم نے بحوالہ ابوہریرہ پیش کی ہے جس میں مختلف چیزوں کا نام لے کر آپ نے بتایا ہے کہ اونٹ کی چوری کرنے والا جناب الٰہی میں اس طرح پیش ہوگا کہ اونٹ اس کی گردن پر لدا ہوگا اور اپیڑا رہا ہوگا۔ یہ شخص مجھے پکار کر کہے گا کہ اغثنی یا رسول اللہ اے اللہ کے رسول میری مدد کیجئے میں جواب دوں گا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تو تجھے اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ کچھ علماء نے اس سارے معاملہ کو تمثیل کہہ کر بے حقیقت بنانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک

دراصل عالم آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے زیر تجربہ مادی عالم سے بالکل الگ ہے تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اس لیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں یا ان کے دیکھنے یا سننے کے اس دُنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دُنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کچھ لوگ وہاں کے وقائع اور احوال کو سن کر ان ... سے بعض کو محال سمجھتے ہیں اور کچھ ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنے میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں۔ اسی لیے قرآن نے

ان نازک اور دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاسر مادی کہہ کر عالم آخرت کو عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادے سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کا اختلاف، مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی و تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے قرآن نے ایسے نپے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس عالم میں چھوٹے سے چھوٹے جرثقیل کے آلہ سے بڑے بڑے جہاز اوپر اٹھا لیے جاتے ہیں تو اس عالم میں اگر ایک شخص اونٹ اٹھا کر لے آئے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔

گناہ کی پوری سزا

ہر شخص کو اس کی کمائی کی پوری پوری جزا ملے گی اور کسی پر ظلم بالکل نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اوّلاً لوگوں کو ان کی بدعملیوں اور خیانتوں کی نمائش کی جائیگی اور بعد ازیں ان کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی۔ غرض یہ خیانت کرنے والے قیامت کے روز اللہ کے مغضوب اور معتوب ہوں گے۔

سعادت و شقاوت کا ضابطہ

۳۰۰ ۔ کیا ایسا آدمی جو رضائے الٰہی کا پیروکار ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی ناراضگی میں اپنا ٹھکانا بنا لیا ہو اور جس کا ڈیرہ دوزخ ہو۔ یعنی پیغمبر جو ہر حال میں خدا کی مرضی کا تابع بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ کیا ان لوگوں کے ایسے کام کر سکتا ہے جو خدا کے غضب کے نیچے اور دوزخ کے مستحق ہیں ممکن نہیں[1] گویا بتا دیا کہ دنیا میں سچے انسان کی زندگی جھوٹے انسان سے اپنی ہر بات میں اس درجہ مختلف ہوتی ہے کہ ممکن نہیں کہ کسی طرح دھوکا ہو سکے۔ ایک بدکار آدمی بناوٹ سے اپنے آپ کو کتنا ہی نیک ظاہر کرے لیکن بناوٹ پھر بناوٹ ہے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کر بیٹھے گا کہ اصلیت آشکارا ہو جائے۔

---

[1] افادات شیخ القرآن

قرآن نے سعادت و شقاوت کا اس آیت میں تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور پیش بھی عام انداز میں کیا ہے اور اسلوب بھی سوالیہ اپنایا ہے۔ قرآن کی نظر میں رضائے الٰہی کا پیروکار وہ ہے جو اس مجموعہ آئین پر عمل کرتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی زندگی کے لیے لے کر آئے۔ یہ صرف زبانی قول کا نام نہیں ہے اس لیے جو شخص اس مجموعہ پر جتنا زیادہ عمل پیرا ہوگا اس کو رضائے الٰہی کی پیروی میں اتنا ہی زیادہ مکمل شمار کیا جائے گا اور جو عمل میں جتنا پیچھے رہ جاتے گا وہ اتنا ہی اللہ کی ناراضگی کا حقدار ہوگا۔ اس لیے یہاں یہ بات کھول کر بتا دی کہ ایک شخص جو رضائے الٰہی کا ہمہ وقت جویاں اور رضائے حق کا بالکل تابع ہوگیا وہ اس شخص جیسا اللہ کی نظر میں کب ہوسکتا ہے جو غضب الٰہی کا مستحق ہو۔ اسی لیے علماء نے اس آیت میں رضائے الٰہی اور ناراضگی کا مصداق مقرر فرمانے میں مختلف خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کی پیروی یہ ہے کہ عملی زندگی میں دامان طاعت تھام کر رکھے اور ناراضگی یہ ہے کہ اپنی عملی زندگی میں معاصی سے دوچار ہو۔ امام حسن اور ضحاک کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کی پیروی یہ ہے کہ مال غنیمت میں غلول سے بچ کر رہے اور ناراضگی یہ ہے کہ مال غنیمت میں چوری کرے۔ امام جبائی کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کی پیروی یہ ہے کہ مومنانہ زندگی بسر کرتے ہوئے راہ خدا میں محنتوں اور قربانیوں کو اپنائے اور ناراضگی یہ ہے کہ راہ خدا میں قربانیوں سے گریز پائی کرے۔

اعمال کے مطابق درجات

۱۰۳۔ اللہ کے یہاں لوگوں کے الگ الگ درجات ہیں اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔ یعنی نبی اور سب خلقت برابر نہیں۔ طمع وغیرہ کے پست و ذلیل کام نبیوں سے نہیں ہو سکتے" حق تعالیٰ سب کو جانتا ہے کہ کون کس درجہ کا ہے اور سب کے کام دیکھتا ہے۔ کیا وہ ایسی پست طبیعت والوں کو منصب نبوت پر سرفراز فرمائے گا[1] مطلب یہ ہے کہ رضائے الٰہی کا تابع اور اللہ کی ناراضگی کا سامان کرنے والا یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے اللہ کے یہاں مختلف درجات ہیں۔ گویا ہر فرد اور ہر گروہ کے لیے اس کے اعمال کے مطابق مختلف درجے ہیں۔ اگر اچھے اعمال ہیں تو اچھائی کے درجے ہیں۔ اگر برے اعمال ہیں تو برائی کے درجے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اور انہی کے مطابق عواقب و نتائج پیش آتے ہیں۔ یعنی جو لوگ اللہ کی رضا پر چلنے والے ہیں ان کے لیے انعام واکرام اور درجاتِ محبوبیت ہوں گے اور جو راہِ حق کی مخالفت کر کے غضبِ خداوندی کے خریدار ہوتے ان کے لیے ذلت و رسوائی اور درجاتِ مبغوضیت ہوں گے۔

شیخ الاسلام نے جو مطلب بتایا ہے کہ نبی اور سب خلقت برابر نہیں ہے۔ اس میں حضرت شاہ عبد القادر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی اور سب خلق برابر نہیں۔ یہ مطلب اس وقت ہے جب کہ من اتبع سے حضور انور کی ذات گرامی اور من باء سے بددیانت اور خائن مراد ہو یعنی نبی اور غیر نبی کا تقابل کر رہا ہے لیکن اگر یہاں قرآن نبی و غیر نبی کا نہیں بلکہ عام قاعدے کے مطابق اچھے اور بُرے کا مقابلہ پیش کر رہا ہے تو پھر حضرت شاہ صاحب اور شیخ الاسلام کی پیش فرمودہ تحقیق کے مطابق خلاصہ مطلب یہ ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جُرم سرزد ہو سکے کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

بلا شبہ فی الواقع اللہ کا اہلِ ایمان پر بڑا ہی احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان خود ان میں سے ایک ایسا عظیم المرتبت پیغمبر بھیجا[۳۰۲] جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کی زندگیوں میں بناؤ سنوار کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے[۳۰۳]، حالانکہ یہی لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے[۳۰۴]۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ

یہ آیت دراصل پہلے مضمون کا تتمہ ہے۔ اس سے پہلی آیات میں اگرچہ ہر نبی سے غلول (خیانت) کی نفی کی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کی مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ ان سے ایسا جرم سرزد ہو سکے کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے خود

اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہ گار اور ناپاک نہیں ہو سکتا ۔

اس آیت میں اس عظیم احسان کا اظہار کیا گیا ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ احسان یہاں تین مختلف پہلوؤں سے ظاہر کیا گیا ہے ۔

ایک اس پہلو سے کہ آپ انسان ہونے کے ساتھ عربی ہیں تاکہ زبان کی اجنبیت، نسل و نسب کی غیریت، رجحانات اور میلانات کی بیگانگی اور ماضی و حاضر سے بے خبری کسی تعصب اور بدگمانی کا باعث نہ بنے اور لوگ آپ پر اپنے ہی باپ اور بھائی کی حیثیت سے اعتماد کر سکیں اور آپ کی آواز کو خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچان اور سن سکیں ۔ اس حقیقت کا اظہار من انفسکم سے ہو رہا ہے ۔

دوسرے آپ کے مقصد اور مشن کے پہلو سے کہ آپ اللہ کی آیتیں سناتے ہیں، تمہیں تمام عقلی، اخلاقی اور عملی گمراہیوں سے پاک کرتے ہیں اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بھلا جس کے فیوض و برکات سے تمہارا اجتماعی و انفرادی اور ظاہری و باطنی زندگی کا ہر گوشہ یوں منور ہو رہا ہے اس سے زیادہ نیکوکار و دیانتدار بھی کوئی ہو سکتا ہے ؟

تیسرے مخاطبوں کی ضرورت کے پہلو سے اہل عرب دین و شریعت سے بیگانے اور نبوت و رسالت سے ناآشنا لوگ تھے ۔ ایک زمانہ دراز سے کفر و جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے ، اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کو گمراہی کی وادیوں سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر کھڑا کر دیا ۔

۲۰۲ ۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ کا اہل ایمان پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان خود ان میں سے ایک ایسا عظیم المرتبت پیغمبر بھیجا جس کے پاس بیٹھنا ، بات چیت کرنا ، زبان سمجھنا اور ہر قسم کے انوار و برکات کا استفادہ کرنا آسان ہے ۔ اس کے احوال، اخلاق، سوانح زندگی، امانت و دیانت، خدا ترسی، پاکبازی سے وہ اچھی طرح واقف ہیں، اپنی ہی قوم اور کنبے کے آدمی سے جب معجزات ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو یقین لانے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے ۔ فرض کرو کہ کوئی جن یا فرشتہ رسول بنا کر بھیجا جاتا تو معجزات دیکھ کر یہ خیال کر لینا ممکن تھا کہ چونکہ جنس بشر سے جداگانہ مخلوق ہے ۔ شاید یہ خوارق اس کی خاص صورت نوعیہ اور طبیعت ملکیہ وجنیہ کا نتیجہ ہوں ۔ ہمارا اس سے عاجز رہ جانا دلیل نبوت نہیں ہو سکتا ۔ بہرحال مومنین کو خدا کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے ایسا رسول روانہ کیا جس

سے بے تکلف فیض حاصل کر سکتے ہیں اور وہ باوجود معزز ترین اور بلند ترین منصب پر فائز ہونے کے ان ہی کے مجمع میں نہایت نرم خوئی اور ملاطفت کے ساتھ گھلا ملا رہتا ہے صلی اللہ علیہ وسلم[1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو قسم کے کمالات بیان فرماتے ہیں کمالاتِ ظاہری، کمالاتِ معنوی۔

سراپائے نبوت

کمالاتِ ظاہری یعنی آپ کا انسان ہونا، آپ کا عربی ہونا اور آپ کا ظاہری حسن وجمال جسے اربابِ سیرۃ کی زبان میں خلق رسُول اللہ لکھا جاتا ہے۔ ظاہری حسن وجمال کے موضوع پر سب سے زیادہ جامع چہرہ وہ ہے جو امام ترمذی نے بحوالہ الحسن بن علی ان کے ماموں ہند بن ابی ہالہ کی زبانی پیش فرمایا ہے کہ :

آپ کا چہرۂ مبارک ماہِ بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ کا قد مبارک بالکل متوسط قد والے آدمی کے قد سے کسی قدر زیادہ لیکن زیادہ لانبے قد والے آدمی سے پست تھا۔ سر مبارک اعتدال کے ساتھ بڑا تھا، بال مبارک کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے اگر سر کے بالوں میں اتفاقاً مانگ نکل آتی تو رہنے دیتے ورنہ آپ خود مانگ نکالنے کا اہتمام نہ فرماتے۔ جس زمانے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک زیادہ ہوتے تو کان کی لو سے متجاوز ہوتے۔ آپ کا رنگ نہایت چمکدار تھا اور پیشانی مبارک کشادہ، آپ کے ابرو خمدار باریک اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جُدا جُدا تھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت اُبھر جاتی تھی۔ آپ کی ناک مبارک بلندی مائل تھی اور اس پر ایک نور چمکتا تھا۔ آپ کی داڑھی مبارک بھر پور اور گنجان تھی۔ آنکھ مبارک کی پتلی نہایت سیاہ تھی، رُخسار مبارک ہموار اور ہلکے تھے۔ آپ کا دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا، آپ کے دندان مبارک باریک آبدار تھے اور ان میں سامنے کے دانتوں میں ذرا سی ریخ تھی۔ سینے سے ناف تک بالوں کی باریک دھاری تھی۔ آپ کی گردن مبارک ایسی خوبصورت اور باریک

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تھی جیسا کہ مورتی کی گردن صاف تراشی ہوئی ہوتی ہے اور رنگ میں چاندی جیسی صاف اور خوبصورت تھی، آپ کے سب اعضا نہایت معتدل اور پُرگوشت تھے اور بدن گٹھا ہوا تھا۔ پیٹ اور سینہ مبارک ہموار تھا لیکن سینہ فراخ اور چوڑا تھا۔ آپ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان قدرے زیادہ فصل تھا۔ جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور کلاں تھیں کپڑا اتارنے کی حالت میں آپ کا بدن روشن و چمکدار نظر آتا تھا۔ ناف اور سینہ کے درمیان ایک لکیر کی طرح سے بالوں کی باریک دھاری تھی۔ اس لکیر کے علاوہ دونوں چھاتیاں اور پیٹ بالوں سے خالی تھا۔ البتہ دونوں بازو کندھوں اور سینے کے بالائی حصہ پر بال تھے۔ آپ کی کلائیاں دراز تھیں اور ہتھیلیاں فراخ، نیز ہتھیلیاں اور دونوں قدم گداز پُرگوشت تھے۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تناسب کے ساتھ لانبی تھیں۔ آپ کے تلوے قدرے گہرے تھے اور قدم ہموار تھے کہ پانی ان کے صاف ستھرا اور ان کی ملائمت کی وجہ سے ان پر ٹھہرتا نہ تھا فوراً ڈھل جاتا تھا جب آپ چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور آگے کو جھک کر تشریف لے جاتے۔ قدم زمین پر آہستہ پڑتا زور سے نہیں پڑتا تھا۔ آپ تیز رفتار تھے اور ذرا کشادہ قدم رکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قدم نہیں رکھتے تھے۔ جب آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں جب کسی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے پھر کر توجہ فرماتے۔ آپ کی نظر نیچی رہتی تھی آپ کی نظر بہ نسبت آسمان کے زمین کی طرف زیادہ رہتی۔ چلنے میں آپ صحابہ کو آگے کرتے اور جس سے ملتے سلام کرنے میں پہل کرتے [1]

شخصیت آئینہ ایام میں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

یہ وہ سلسلہ نسب ہے جس کو خود زبانِ وحی ترجمان نے صحیح اور درست فرمایا ہے اور اس

[1] شمائل ترمذی

یہ کی ہے کہ ،

نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ تبلیغ احکام کی خاطر روانہ فرماتا ہے ۔

(شرح عقائد جلالی)

محقق احناف شیخ ابن الہمام لکھتے ہیں ،

نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے نازل کیے ہوئے احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث کرتا ہے اور اسی کو رسُول کہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں نہیں ۔

(المسایرہ مع المسامرہ)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں ،

اے بھائی حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس بلند شان اور مرتبہ کے بشر تھے اور حدوث و امکان کے داغ سے موصوف تھے ۔

(مکتوب ۳۱ ، دفتر اوّل)

یعنی نہ تو آپ قدیم اور واجب تھے اور نہ ازلی و ابدی تھے بلکہ بشر حادث اور ممکن تھے ۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں ۔

تو نہیں دیکھتا کہ حضرات انبیاء عام لوگوں کے ساتھ نفس انسانیت میں برابر ہیں اور حقیقت و ذات کے لحاظ سے سب کے برابر ہیں ۔

(دفتر اوّل حصہ چہارم ص ۱۲۹)

بہرحال مطلب یہ ہے کہ ان ہی کی جنس اور قوم میں کا ایک آدمی رسُول بنا کر روانہ کیا حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت تاریکی میں گم ہو گئی تھی اور قرآن کے فیضان سے وہ روشن ہوئی ۔ اس نے بتایا کہ رسُول ایک طرف مخلوق محض صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ خدا کا برگزیدہ ، معصوم ، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں ، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب اُمور صادر کرنے والا ہوتا ہے ۔

حضور کے عربی ہونے کا احسان

یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اللہ سبحانہ نے قرآن کے اوّلین مخاطبوں پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

کے عربی ہونے کا احسان جتایا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اس کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ منشاء الٰہی یہ ہوتا ہے کہ اس نبی کے ذریعے سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعے سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

هوالذی بعث فی الامیین رسولا منهم

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے

کنتم خیر امة اخرجت للناس

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی اُمت کے لیے ہوئی ویسے ہی ان کی اُمت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی۔ چونکہ عربی ہونے کی حیثیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے اولین طور پر اہل عرب مستفید ہوتے اور باقی دُنیا ان کی وساطت سے ہوئی گویا کہ منصب قیادت اور شہادت علی الناس کا فرض انجام دینے کی خاطر حضور انور سے فیض حاصل کرنے کا ان کو شرف حاصل ہوا۔ اس لیے قرآن نے ان پر حضور کے عربی ہونے کا احسان جتایا ہے۔

نبوت کے کمالات معنوی

۳۰۳۔ جو اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کی زندگیوں میں بناؤ سنوار کرتا ہے اور ان کی کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس مضمون کی آیت سورۂ بقرہ میں دو جگہ گزر چکی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار شانیں ہیں۔ اول تلاوت آیات اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا جن کے ظاہری معنے وہ لوگ اہل زبان ہونے کی وجہ سے سمجھ لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے دوم تزکیہ نفوس انسانی الائشوں اور تمام مراتب شرک ومعصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل کرنا یہ چیز آیات اللہ کے عام مضامین پر عمل کرنے حضور کی صحبت اور قلبی توجہ وتصرف سے باذن اللہ حاصل ہوتی تھی۔ سوم تعلیم کتاب کتاب کی مراد بتلانا اس کی ضرورت خاص خاص مواقع میں پیش آتی تھی مثلاً ایک لفظ کے کچھ معنے عام تبادر اور

محاورہ عام کے لحاظ سے سمجھ کر صحابہ کو کوئی اشکال پیش آیا۔ اس وقت آپ کتاب اللہ کی اصلی مراد جو قرائن سے متعین ہوتی تھی بیان فرما کر شبہات کا ازالہ فرما دیتے تھے جیسے الذین آمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم اور دوسرے مقامات میں ہوا۔ چہارم تعلیم حکمت (حکمت کی گہری باتیں سکھانا) اور قرآن حکیم کے غامض اسرار و لطائف اور شریعت کے دقیق و عمیق علل پر مطلع کرنا خواہ تصریحاً ہو یا اشارۃً۔ آپ نے خدا کی توفیق و اعانت سے علم و عمل کے ان اعلیٰ مراتب پر اس درماندہ قوم کو فائز کیا جو صدیوں سے انتہائی جہل و حیرت اور صریح گمراہی میں غرق تھی آپ کی چند روزہ تعلیم و صحبت سے وہ ساری دنیا کے لیے ہادی و معلم بن گئی۔ لہذا انہیں چاہیے کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر پہچانیں اور کبھی بھولے سے ایسی حرکت نہ کریں جس سے آپ کا دل متالم ہو۔ له

درحقیقت بعثت نبوی ان چاروں شعبوں پر مشتمل، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح دنیا کو نیا آسمانی صحیفہ عطا کیا، نیا علم و حکمت عطا کیا۔ اسی طرح نئے اخلاق، نئے جذبات و کیفیات، نیا یقین و ایمان، نیا ذوق و شوق، نئی بلند نظری، نیا جذبہ ایثار، نیا شوق آخرت، نیا جذبہ زہد و قناعت دنیا کی متاع حقیر اور دولت فانی کی تحقیر، نئی صحبت و الفت، حسن سلوک و ہمدردی بر و مواسات مکارم اخلاق، اسی طرح سے نیا ذوق عبادت، خوف و خشیت، توبہ و انابت، دعا و تضرع کی دولت عطا فرمائی اور ان ہی خصوصیتوں کی بنیاد پر وہ نیا اسلامی معاشرہ اور دینی ماحول قائم ہوا جس کو عہد رسالت اور عہد صحابہ کے لفظ سے عام طور پر تعبیر کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام ان چاروں شعبوں کے کامل ترین نمائندے اور بہترین نمونہ تھے۔ اگر ان شعبہائے نبوت کو عام زندگی میں جلوہ گر دیکھنا ہو تو صحابہ کو دیکھ لیا جائے۔

یوں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت و تعلیم ان تمام سعادتوں کا سرچشمہ تھی اور اسی سے یہ پوری زندگی اور قرن اول کا اسلامی معاشرہ وجود میں آیا۔ لیکن اگر اس کے طریق عمل کی تفصیل اور اس کے ذرائع و وسائل کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس محیر العقول انقلاب کا ذریعہ اور اس نئے معاشرہ اور نئی امت کی تشکیل کے عناصر و ارکان یہ چار چیزیں ہیں

۱۔ قرآن حکیم
۲۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، آپ کی زندگی اور تزکیہ۔

له افادات شیخ الاسلام

۳۔ آپ کی تعلیم و تلقین

۴۔ آپ کے حکیمانہ ارشادات، مواعظ و نصائح۔

اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ بعثتِ نبوی کے مقاصد و نتائج کے کامل ظہور میں اور جدید امت کی تعمیر و تشکیل میں ان چاروں عناصر و ارکان کا دخل ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان چاروں کے بغیر ایک مکمل معاشرہ، مکمل زندگی اور ایک ایسی ہیئتِ اجتماعی جس میں عقائد، اعمال، اخلاق، جذبات، اذواق، رجحانات، تعلقات سب ہی ہوں وجود میں نہیں آ سکتی۔ زندگی کے لیے زندگی شرط ہے دیے سے دیا جلتا ہے۔ صحابہ اور ان کے صحیح جانشینوں کی زندگی میں ہمیں عقائد و اعمال کے ساتھ جو خالص اسلامی اخلاق اور اس کے ساتھ اعلیٰ اذواق اور گہرے دینی جذبات اور دینی کیفیات ملتی ہیں وہ صرف تلاوتِ کتاب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کامل ترین، موثر ترین، محبوب ترین زندگی کا بھی اثر ہے جو شب و روز ان کے ساتھ رہتی تھی۔ اس سیرت و اخلاق کا یہی نتیجہ ہے جو ان کے آنکھوں کے سامنے تھی اور ان مجالس اور صحبتوں کا بھی فیض ہے اور ان ارشادات و نصائح و تلقین کا بھی جس سے وہ حیاتِ طیبہ میں برابر مستفید ہوتے تھے ان سب کے مجموعہ سے اسلام کا وہ خاص مزاج وجود میں آیا جس میں صرف قواعد و ضوابط اور ان کی قانونی پابندی نہ تھی بلکہ ان پر عمل کرنے کے محرکات و ترغیبات، اور عمل کی صحیح کیفیات اور روح بھی تھی۔ حدود کی پابندی اور حقوق کی ادائیگی کے ساتھ لطیف احساسات اور مکارمِ اخلاق کے وقائع بھی تھے۔ ان چاروں میں قرآن کی تلاوت اور قرآن کی تعلیم کے ساتھ اس آیت میں تزکیہ اور حکمت کے دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں۔

تزکیہ کے لفظی معنے پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں۔ خود قرآن نے اس لفظ کو اس معنے میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کیا جائے۔ مثلاً قد افلح من زکٰھا اور قد افلح من تزکّی اور ما یدریک لعلہ یزکّی ان آیتوں سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن حکیم میں اس تزکیہ کا مفہوم کیا ہے جس کو قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں۔ ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں۔

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت ہے۔ اگرچہ اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے دوسرے اور

تیسرے پارے میں ہو چکی ہے مگر یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن میں اس علم و عرفان کے معنے میں آیا ہے جو نورِ الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسُول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہاں کتاب کے ساتھ حکمت کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے زائد چیز ہے اس بنا پر جو لوگ حکمت سے سنت مراد لیتے ہیں ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔

دراصل حضورِ انور کی ذاتِ گرامی آپ کا تزکیہ اور آپ کی حکمت اسلام کے لیے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں اسلام کا پودا سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ اسلام کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ وہ جذبات، واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان جذبات و واقعات اور عملی مثالوں کا سب سے بہتر اور مستند مجموعہ وہ ہے جو خود حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق اور آپ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہو۔ یہودی، عیسائی اور ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لیے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس ان کے پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان افروز کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں تھا اور ان کو نبوت کے تزکیہ و حکمت کی وہ ذہنی فضا میسر نہیں تھی جس میں پیروان مذاہب دینی نشوونما اور ترقی حاصل کرتے ہیں اور مادیت و الحاد کے حملوں سے محفوظ رہتے ہیں ان مذاہب اور اقوام کی اپنے پیغمبروں کی سیرۃ اور مستند واقعاتِ زندگی کے بارے میں تہی دامنی اور بے بضاعتی اب ایک تاریخی مسلمہ حقیقت بن گئی ہے۔

اسلام کے آخری اور دائمی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ حادثہ اس کو پیش نہیں آیا جس دینی و روحانی ماحول میں اور جن ذہنی کیفیات کے ساتھ صحابہ نے زندگی گزاری اس پورے ماحول کو تزکیہ اور حکمت کے ذریعے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا[1] غالباً یہی وجہ ہے۔ یہاں اس آیت کی پیشانی پر لقد من اللہ کا عنوان لگایا ہے۔

بعثت سے پہلے عرب کی حالت

۴۳۰۔ حالانکہ یہی لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔ اس فقرے کے ذریعے قبل از نبوت عرب کی پوری تاریخ کا چہرہ پیش کر دیا ہے۔ انبیاء اور ان کی تعلیمات سے بُعد ایک جزیرہ نما

---

[1] معارف کا جیتی لفظ

میں صدیوں سے مستبد رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے، چھٹی صدی میں وہ تنزل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے۔ کمل ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس دُنیا کے امام تھے۔ اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے ہوئے تھے۔ غرض مذاہب کے اکثر محاسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور مصائب میں مبتلا تھے۔

دورِ جاہلیت کے بُت

جہالت وجاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول وعام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بتوں اور مورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکزِ توجہ بنانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے (جس کا خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا) عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ قربانی، حلف، دعا و استعانت) انہی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور ملک میں کھلی بُت پرستی خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا دور دورہ تھا عرب میں ہر ہر قبیلہ ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بُت تھا بلکہ ہر گھر کا بُت جدا تھا۔ کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بُت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بُت کو حصول برکت کے لیے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بُت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا۔ بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا۔ کسی نے تو ایک بُت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بُت تیار کر لیا تھا جو بُت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بُت تیار نہیں کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے اردگرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے۔ خود خانہ کعبہ کے اندر (وہ خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا) اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بُت تھے۔ بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اس کو پوجتے۔ بخاری میں ابو رجاء العطاردی سے روایت ہے کہ ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے۔ اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا

پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لاکر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے۔ کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھرے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے، جن، ستارے سب شامل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لیے ان سے شفاعت کے طلبگار ہوتے ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے۔ ان کی قدرت اور اثر اندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی۔ صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا۔ کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا۔ بنو تمیم دبران کی لخم وجذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعری کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔

اخلاقی واجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کیے ہوئے تھے اور اس کے اسباب واضح ہیں۔ شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ عربی زبان میں اس کے نام جس کثرت سے ہیں اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے اس سے اس کی مقبولیت وعمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شراب کی دکانیں بر سر راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا، جُوا جاہلی زندگی میں بڑی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی دلیل تھی۔ "تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر رکھ دیتا۔ پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا اس سے نفرت وعداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی۔

حجاز کے عرب اور یہودی سُودی لین دین اور سُود در سُود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے، زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے۔ زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی۔ اس کے حقوق پامال کیے جاتے اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق لینے کے بعد اس کو اجازت نہ تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں۔ لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انہیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا۔ ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک اسلام نہیں آیا۔ بعض ننگ و عار کی بنا پر بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ عرب کے بعض شرفاء و رؤساء ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے۔ صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا۔ بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی تو جاہل باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا۔ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے المناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں۔

قبائلی و خاندانی عصبیت و امتیاز

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما

یعنی اپنے بھائی کی امداد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل! عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے۔ وہ عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے۔ اُسنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے۔ ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت

عرب فطرتاً جنگجو واقع ہوتے تھے اور ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا جنگ ان کے لیے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل بستگی کا سامان بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا۔ ایک شاعر فخر یہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لیے ہم اپنے برادر حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ایک عرب شاعر دعا کرتا ہے کہ میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے اور اپنی تلوار سے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لیے معمولی کام تھا۔ جنگ کو بھڑکانے کے لیے معمولی واقعات کافی تھے۔ وائل کی اولاد بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہا۔ ایک سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ دونوں خاندان مٹ گئے۔ ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی، بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے لاشیں دفن نہیں کی جاتیں۔ پورا جزیرہ عرب گویا شکاری کا جال تھا۔ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکہ سے قتل کر دیا جائے گا۔ لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اچک لیے جاتے تھے یہاں تک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لیے چوکی پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی۔[1]

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

الغرض حضور انور کی تشریف آوری سے پہلے عرب دُنیا پر عقائد، معاملات، عبادات اور اخلاق ہر اعتبار سے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور آبادی صحیح معنوں میں فی ضلال مبین کی تصویر تھی ۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ
قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝
وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ
الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ
بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ۝
الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا
عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ جنگ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں فریقِ مخالف پر پڑ چکی ہے[۳۰۵]۔ اے پیغمبر ان سے

کہہ دو کہ یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے اللہ ہر چیز پر قادر
ہے[306]۔ اور دیکھو دو گروہوں میں مقابلہ کے دن جو افتاد تم پر
آئی تھی وہ اللہ ہی کے حکم سے آئی اور اس لیے آئی کہ اللہ
ان لوگوں کو نمایاں اور ممتاز کر دے جو منافق ہیں[307] اور جن سے
کہا گیا تھا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا مدافعت کرو
یعنی دشمن کا حملہ روکو[308] تو کہنے لگے کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ جنگ
ہوگی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے[309]۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے
تھے وہ ایمان کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے[310]۔ وہ اپنی
زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی
ہیں۔ اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہوئے ہیں اللہ ان
کو خوب جانتا ہے[311]۔ جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو
بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے کہہ رہے ہیں کہ اگر وہ

ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر ان سے
کہہ دو اچھا اگر تم واقعی سچے ہو تو اپنی موت کو ٹال کر دکھانا۔ [۳۱۲]

ایک غلط فہمی کا ازالہ

صحابہ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے مگر عام لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جو شخص خدا کا رسول ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہونا چاہیے۔ جب وہ کسی مہم پر نکلیں تو ان کے ساتھ خدا کے فرشتوں کی مدد ہونی چاہیے۔ جب انہیں کوئی جنگ پیش آئے تو ضروری ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں۔ اس خیال کے لوگوں کو اُحد کی شکست سے طبعی طور پر بڑا دھکا لگا۔ وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اگر اسلام ایک سچا دین ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع اللہ کے رسول ہیں تو یہ شکست کہاں سے آئی؟ کمزوروں کی اس نفسیاتی کیفیت سے منافقین نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس شکست کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک دلیل کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ قرآن نے اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں تفصیل کے ساتھ اس غلط فہمی کو دُور کیا ہے اور اہل ایمان کو جو آزمائشیں آتی ہیں ان کی حکمت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ کا معاملہ منافقوں کے لیے جو مخلص مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے زندگی بسر کر رہے تھے ایک فیصلہ کُن آزمائش تھی۔ اس موقعہ پر ان کا نفاق پوری طرح کھل کر سامنے آگیا۔ جنگ کے ابتدائی مشورے سے لے کر جنگ کے بعد تک کوئی موقعہ ایسا نہیں آیا کہ فتنہ پردازی سے باز رہے ہوں۔ جب کثرت رائے سے یہ رائے قرار پائی کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے تو لوگوں کو بہکانے لگے کہ باہر نکل کر لڑنا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اچھا شہر کی مدافعت کرو تو طرح طرح کے حیلے بہانے تراشنے لگے کہتے تھے کہ ہمیں اُمید نہیں کہ لڑائی کی نوبت آئے اگر اُمید ہوتی تو ضرور تیاری کرتے۔ پھر جب لوگوں کی کمزوری اور نافرمانی سے فتح ہوتے ہوتے شکست ہو گئی تو انہیں فتنہ و شرارت کا نیا موقعہ ہاتھ آگیا۔ کبھی کہتے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہماری بات نہیں مانی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں میں

بزدلی، مایوسی اور ہراس پیدا کریں اور ان کی کوئی بات بھی ٹھیک طور پر نہ بن سکے۔

جواب کی تمہید

۳۰۵ ۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی، حالانکہ جنگ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں فریق مخالف پر پڑ چکی ہے۔ پہلے سے اُحد کا قصہ چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں جو کوتاہی ہوئی تھی اس کے عفو کا ذکر ہوا اور اسی کی مناسبت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و حقوق یاد دلاتے گئے۔ اب پھر اُحد کے قصہ کی طرف عود کیا جاتا ہے یعنی جنگ اُحد میں جو تکلیف اور نقصان اٹھانا پڑا کیا اس پر تم تعجب سے کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی ہم تو مسلمان مجاہد تھے جو خدا کے راستہ میں اس کے دُشمنوں سے لڑنے کے لیے نکلے تھے اللہ تعالیٰ پیغمبر کی زبانی نصرت و امداد کا وعدہ فرما چکا تھا۔ پھر یہ مصیبت ہم پر کیوں آئی اور کدھر سے نازل ہو گئی۔ ایسا کہتے وقت سوچنا چاہیے کہ جس قدر تکلیف تم پر پہنچی اس سے دو چند تکلیف ان کو تم سے پہنچی ہے۔ اُحد میں تمہارے تقریباً ستر آدمی شہید ہوئے، بدر میں ان کے ستر مارے گئے اور ستر تمہارے ہاتھ قید ہوئے جن پر تم کو پورا قابو حاصل تھا چاہتے تو قتل کر ڈالتے۔ پھر اُحد میں بھی ابتداً ان کے بیس سے زائد قتل ہو چکے تھے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے تم کو ہزیمت ہوئی تو بدر میں ان کو تباہ کن ہزیمت مل چکی تھی۔ اور اُحد میں جب تم جم کر لڑے وہ منہزم ہوتے پھر آخر میں میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسی صورت میں انصافاً تم کو اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے اور زیادہ بزدل ہونے کا حق نہیں ہے [1]

اس فقرے میں قرآن نے اس شبہ کے بارے میں کہ جب اللہ کا رسول ہمارے اندر موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے تو ہمیں شکست کیوں ہوئی۔ پہلے یہ سمجھایا ہے کہ قد اصبتم مثلیھا یعنی جو اُفتاد تم پر آئی ہے تو تم یہ دریافت کر رہے ہو کہ یہ کیوں آئی، حالانکہ اس سے پہلے تمہاری جانب سے تمہارے دُشمن پر ایسی دو چند اُفتاد آ چکی ہے۔ اس دو چند میں بدر کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے اور ۷۰ قید ہوئے اس لیے جب تم ان کو پہلے ڈبل تکلیف پہنچا چکے ہو تو اب اگر اسی کی سنگل اُفتاد تم پر آگئی ہے تو

[1] افادات شیخ الاسلام

گھبراتے کیوں ہو؟ ایک چھوٹے سے گروہ سے ایک عظیم الشان اور طاقتور فوج کو دوچند مصیبت پہنچ جانا صاف بتاتا ہے کہ اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔

شبہ کا صحیح اور واقعی جواب

۳۰۶ ۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی اگر غور کرو تو تم خود ہی اس مصیبت کا سبب بنے ہو۔ تم نے جوش میں اگر پیغمبر کی اور بہت سے تجربہ کاروں کی رائے قبول نہ کی۔ اپنی پسند اور اختیار سے مدینہ کے باہر محاذ جنگ قائم کیا۔ پھر باوجود نہی شدید کے تیر اندازوں نے اہم مورچہ چھوڑ کر مرکز خالی کر دیا۔ اور ایک سال پہلے جب اساری بدر کے متعلق تمہیں اختیار دیا گیا تھا کہ انہیں قتل کر دو اور یا انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو اس شرط پر کہ آئندہ اتنے ہی آدمی تم سے لیے جائیں گے تو تم نے فدیہ کی صورت اختیار کی اور شرط کو قبول کر لیا۔ اب وہی شرط پوری کرائی گئی تو تعجب وانکار کا کیا موقعہ ہے۔ یہ چیز تو خود اپنی جانب سے قبول کر چکے تھے اساری بدر کا پورا قصہ سورۂ انفال میں آ رہا ہے [1]

یہاں حقیقی جواب دیا گیا ہے کہ یہ تمہاری اپنی جانب سے ہے یعنی تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے اور آئی ہوئی اللہ کی مدد رک گئی۔ تم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی تھی جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ عصیتم من بعد ما ارٰکم ما تحبون بس قصور تمہارا ہے اگر تم درہ چھوڑ کر نہ جاتے اور اس طرح اللہ کے رسول کی نافرمانی نہ کرتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا۔ یعنی یہ تمہاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کے لالچ میں پڑ گئے۔ اس کے نتیجہ میں وہ کچھ ہوا جو تم دیکھ رہے ہو۔

آخر میں ان اللہ علی کل شیء قدیر کہہ کر اشارہ کر دیا کہ یوں تو اللہ نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسا قادر ہے کہ جب اس کی نصرت شامل حال ہو تو کمزوری بھی قوت بن جاتی ہے اور یا یہ مراد ہے کہ جب مومن اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کی قدرت نمائی کا نظارہ دکھاتا ہے اور جب اس سے نافرمانی وقوع میں آتی ہے تو اپنی نصرت کو روک دیتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نفاق کا کھلا چہرہ

۳۰۷ ۔ اور دیکھو دو گروہوں میں مقابلے کے دن جو نقصان تم پر آئی تھی وہ اللہ ہی کے حکم سے آئی اور اس لیے آئی کہ اللہ ان لوگوں کو نمایاں اور ممتاز کر دے جو منافق ہیں ۔ یعنی جب چاہے جس کو چاہے غالب اور جب چاہے مغلوب کر دے ۔ مغلوب کرنا اس لیے نہیں کہ وہ اس وقت غالب کرنے پر قادر نہ تھا بلکہ اس لیے ہے کہ تمہارے کسب و اختیار سے صورت حال ایسی پیدا ہو گئی کہ کلی غلبہ عطا کرنے میں مصلحت نہ تھی ۔ بہرحال جو کچھ ہوا اس کے حکم و مشیت سے ہوا جس کا سبب تم تھے اور حکمت یہ تھی کہ ایک طرف ہر مومن و مخلص کے ایمان و اخلاص کا اور دوسری جانب ہر منافق کے نفاق کا درجہ ظاہر ہو جائے ۔ کھرے کھوٹے اور پکے پکے میں کسی کو کوئی التباس نہ رہے [1]

اب یہاں اس ابتلا کی حکمت واضح کی ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سچے مسلمانوں اور منافقوں کو اچھی طرح نمایاں کر دے تاکہ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کون لوگ جماعت کے اندر قابل اعتماد ہیں کون لوگ نہیں ۔ مقصد یہ ہے کہ یہ آزمائش جماعتی تطہیر کے لیے ضروری تھی ۔ اگر مخلصین اور منافقین دونوں اسی طرح ملے جلے رہتے تو معلوم نہیں مفسد عناصر کس وقت پوری جماعت کو لے ڈوبتے [2]

منافق کی لغوی حقیقت اور وجہ تسمیہ

اصل ارشاد میں ولیعلم الذین نافقوا آیا ہے ۔ نافقوا کا مصدر منافقت ہے منافقت نفق سے بنا ہے جس کے معنے گزرنے اور ختم ہونے کے آتے ہیں ۔ اسی لیے خرچ کرنے کو انفاق کہتے ہیں اور اسی سے نفق اس راستہ کو کہتے ہیں جو دوسری طرف نکل جاتے اور زمین میں وہ سرنگ جو دوسری طرف نکل جاتے ۔ ابن الانباری کی رائے میں منافق اسی نفق بمعنے سرنگ سے بنا ہے منافق بھی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسی طرح چھپ جاتا ہے جیسے آدمی سرنگ میں چھپ جاتا ہے اور کچھ کی رائے میں منافق نافقاء سے بنا ہے جس کے معنی گوہ کے بھٹ کے آتے ہیں ۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ گوہ اپنے بھٹ کے دو راستے رکھتی ہے ایک کا نام قاصعاء اور دوسرے کا نام نافقاء ہے ۔ اسے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

جب ایک راستہ سے تلاش کیا جاتا ہے تو دوسرے راستہ سے نکل جاتی ہے۔ ایسے ہی منافق کا حال ہوتا ہے اہل ایمان کے سامنے وہ ایمان کے دروازے سے اور کفار کے سامنے وہ کفر کے دروازے سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور جب ایک راہ میں وہ تکلیفوں کا شکار ہوتا ہے تو فوراً دوسری راہ میں پناہ لیتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ گوہ جب اپنا بھٹ بناتی ہے تو اس کے دہانے کو بہت چوڑا اور مختصر رکھتی ہے جب اسے کسی خطرہ کا اندیشہ ہوتا ہے تو دہانے پر سے مٹی ہٹا کر باہر ہو جاتی ہے۔ منافق اپنے قلب و ضمیر میں کفر کی آلائش کو چھپا کر رکھتا ہے اور جب اس کو اس کے کفر پر ملامت کرتے ہو تو کفر کی مٹی جھاڑ کر اسلام کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ ان میں ابو عبیدہ کی رائے زیادہ وزنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے منافقانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ غزوۂ احد کی شکست نے ان کو شاہراہ عام پر بے نقاب کر دیا۔

تعبیر میں یہ لطافت پیدا کی ہے کہ اہل ایمان کے لیے مومنین کا لفظ لائے ہیں لیکن اہل نفاق کے لیے منافقین نہیں فرمایا بلکہ نافقوا فرمایا ہے۔ صفت کا صیغہ دوام اور ثبوت بتاتا ہے جب کہ فعل تجدد اور حدوث ظاہر کرتا ہے۔ اہل ایمان میں ایمان صفت راسخہ ہے لیکن منافقین میں نفاق صفت نہیں بلکہ وقت کے تقاضوں کے تحت ہنگامی طور پر نمایاں ہو جاتی ہے ان میں بہتوں کو اللہ نے بعد میں توبہ کی توفیق دی ہے۔

اللہ کا کلمہ بلند کرو یا قوم کو بچالو

۳۰۸۔ اور جن سے کہا گیا تھا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا مدافعت کرو۔ یعنی دشمن کا حملہ روکو۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ عین موقع پر کہاں بھاگتے ہو۔ آؤ اگر اسلام کے دعوے میں سچے ہو تو اللہ کی راہ میں لڑو ورنہ کم از کم دشمن کی مدافعت میں حصہ لو۔ یعنی مجمع میں شریک رہو تاکہ کثرت تعداد کا اثر دشمن پر پڑے یا یہ کہ خدا کی راہ میں دین کی خاطر نہیں لڑتے تو حمیت وطنی و قومی یا اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کے لیے دشمن کی مدافعت کرو۔ کیونکہ دشمن اگر کامیاب ہوا تو انتقام لینے میں مومنین و منافقین کی تمیز نہ کرے گا۔ عام مسلمانوں کی طرح تم بھی نقصان اٹھاؤ گے غرض ان پر طرح طرح سے ان کے مذاق کے موافق اتمام حجت کیا گیا تاکہ جو کچھ دلوں میں ہے علانیہ ظاہر ہو جائے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا آیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کے معنے تو یہی ہیں کہ اللہ کی راہ میں اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑو۔ اور دفع کے معنے کسی چیز کو قوت کے ساتھ ہٹا دینے کے ہیں جب اس کے ساتھ عن ہو تو اس کے معنے حمایت کرنے کے ہیں مگر یہاں چونکہ بغیر صلہ کے اور قتال کے مقابلہ میں آیا ہے اس لیے شارحین قرآن نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ کم از کم شریک رہو تاکہ تمہاری وجہ سے ہماری تعداد زیادہ نظر آئے اور کافر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح تم لڑائی میں نہ سہی مدافعت میں تو شریک ہو۔ اگر خدا نخواستہ مسلمان اس جنگ میں مغلوب ہو گئے اور مدینہ پر حملہ ہو گیا تو کافر سب کو بلا امتیاز قتل کریں گے اور سب کو لوٹیں گے۔ اس لیے اگر لڑتے نہیں تو دشمن کی مدافعت کرو۔ اور کچھ شارحین قرآن نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اگر تم اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑنا نہیں چاہتے تو آؤ اپنے بال بچوں، اپنی قوم اور اپنے وطن ہی کے لیے لڑو۔ علامہ قرطبیؒ نے یہی مطلب اپنایا ہے۔ بہرحال مطلب دونوں ہیں اب یہ آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ جو مطلب چاہیں قبول کرلیں۔

خوئے بدرا بہانہ بسیار

۳۰۹۔ تو کہنے لگے کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ یعنی لڑائی ہوتی نظر نہیں آتی خواہ مخواہ کا ڈھونگ ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ واقعی لڑائی ہونے والی ہے تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ جب لڑائی دیکھیں گے شامل ہو جائیں گے۔ یا یہ مطلب تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مقابلہ ہوتا تو ہم ساتھ دیتے بھلا یہ کوئی مقابلہ ہے کہ ایک طرف تین ہزار کا لشکر اور دوسری طرف ایک ہزار بے سروسامان آدمی۔ یہ لڑائی کیا ہے محض اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یا لو نعلم قتالا سے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ صاحب ہم فنون جنگ اور لڑائی کے قاعدوں سے واقف ہونے تو آپ کے ساتھ رہتے یا دل میں طعن دیا کہ ہمارے مشورے پر نہ چلے اوروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑائی کے قاعدوں سے ناواقف سمجھے اور آپ واقف بنے۔ پھر ہمیں ساتھ کیوں لیتے ہو بہرحال جھوٹے حیلے کر کے چلے گئے۔

دراصل عبداللہ بن ابی جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستہ سے پلٹنے لگا تو بعض

لہ افادات شیخ الاسلام

مسلمانوں نے جاکر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ آج جنگ نہ ہوگی اس لیے ہم جا رہے ہیں۔ ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔[1] گویا ان کے خیال میں جنگ نہیں صریح خودکشی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ دشمن اوّل تو تعداد میں تم سے چوگنا پھر ساز و سامان میں کہیں زائد ایسی حالت میں شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا سارے اصول جنگ کے خلاف صریح دیوانگی ہے۔

وہ ایمان کے نہیں بلکہ کفر کے قریب ہیں

۳۱۰ - یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے وہ ایمان کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے یعنی منافقین دل سے کافر اور زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے اور اسی زبانی اسلام کی بنا پر مسلمانوں سے ملے جلے رہتے تھے اس وقت اور عین موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو چھوڑ کر چلے جانے اور جھوٹے حیلے تراشنے سے اچھی طرح نفاق کی قلعی کھل گئی۔ اب ظاہر میں بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب ہو گئے اور اپنے فعل سے مسلمانوں کو نقصان اور کافروں کو تقویت پہنچائی۔[2]

اُحد کے دن ان کی عملی زندگی کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں ان کے کردار کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اس کی اصل علت یہ ہے کہ اس روز بہ نسبت ایمان کے یہ کفر کے زیادہ قریب تھے اور کفر ہی ان کے اس کردار کی علت ہے۔ یہ گویا حق سبحانہٗ کی جانب سے ان پر کفر کا فتویٰ ان کی عملی زندگی کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لگایا گیا ہے۔ ان کے سرحدِ ایمان سے دُور اور سرحدِ کفر سے قریب ہونے کی بنیادی وجہ قرآن کے نزدیک یہی ہے کہ اسلام کے برخلاف ان کے منصوبے ان کا نصب العین تھے۔ خدا اور رسُول کے ساتھ استہزاء ان کے ساتھ عداوت اور مسلمانوں میں باہم تفریق ان کا پروگرام ہے۔ ہر نازک مرحلہ پر مسلمانوں کے قدم اکھاڑنا ان کی سکیم میں داخل ہے دشمنوں سے ساز باز کرنا راہِ حق میں قربانی سے گریز، دینِ حق کے بارے میں زبانوں میں آوارگی ان کا دن رات کا مشغلہ ہے۔

ظاہر و باطن میں اختلاف

۳۱۱ - اور وہ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور جو کچھ وہ دلوں

---

[1] تفسیر القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

میں چھپاتے ہوتے ہیں اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ یعنی زبان سے لو نعلم قتالا لاتبعنا کہ کہتے ہیں اور جو کچھ دل میں ہے صاف نہیں کہتے۔ دل میں یہ تھا کہ اچھا ہے مسلمان مغلوب ہوں اور ہم خوشی سے بغلیں بجائیں لیے اور یا مطلب یہ ہے کہ زبانوں سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر قلوب ایمان سے خالی ہیں و لما یدخل الایمان فی قلوبکم منہ اور دل کا ذکر کر کے دراصل ان کے نفاق کی عکاسی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا ظاہر ان کے باطن سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جس کا قلوب میں کوئی وجود نہیں ہے۔ مثلاً ابھی جو دو باتیں انہوں نے کہی ہیں ایک یہ کہ ہمیں لڑائی کا علم نہ تھا دوسرے یہ کہ اگر ہمیں علم ہوتا تو لڑائی میں تمہارا ساتھ دیتے یہ ان دونوں باتوں میں جھوٹے ہیں۔ ان کو پتہ تھا اور پتہ ہونے کے باوجود انہوں نے جنگ سے گریز پائی اختیار کی ہے۔

موت سے بے پروا ہو کر فرض ادا کرو

۳۱۲۔ جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو اچھا اگر تم واقعی سچے ہو تو اپنی موت کو ٹال کر دکھاؤ۔ یعنی خود تو نامرد بن کر بیٹھے رہے اور اپنی برادری کے بھائیوں انصار مدینہ سے کہتے ہیں کہ ہماری بات مان کر گھر میں بیٹھے رہتے تو مارے نہ جاتے۔ اچھا اگر گھر میں بیٹھ رہنے سے جان بچتی ہے تو دیکھیں موت کو گھر میں کیسے نہ آنے دیں گے۔ اگر یہاں رہ کر بھی موت پیچھا نہیں چھوڑتی تو پھر بہادروں کی طرح میدان میں عزت کی موت کیوں نہ مریں لے

یہ بھی ان دوغلے لوگوں کا ذکر ہے۔ یعنی کہنے والے وہ لوگ ہیں جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے وہ ان لوگوں کے بارے میں جو شریک جنگ ہوتے اور جنہوں نے ایمان کا تقاضا پورا کیا ہے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے اور جنگ میں شریک نہ ہوتے تو قتل نہ ہوتے قرآن نے جواب دیا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو تم گھر میں بیٹھے اپنی موت ٹال سکتے ہو تو ٹال کر دکھاؤ۔ گویا سمجھا دیا کہ جنگ زندگی کی ضرورت ہے۔ ایمان کی فطری مانگ اور اس پر دین کا بقا موقوف ہے۔ اس کا مقام کوئی معمولی مقام نہیں ہے۔ صرف اتنا نہیں کہ اللہ کے

لے افادات شیخ الاسلام

کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑنا اللہ کی محبت اور مغفرت اور رحمت کا حقدار بنا دیتا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں تو وہ لوگ بھی اونچا مقام رکھتے ہیں جو لڑنے والوں کی صرف بالواسطہ مدد کرتے ہیں۔ جب دین کا مطالبہ سامنے ہو اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو چاہیے کہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جاتے وہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ یہ کوئی اصول نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں موت کا خطرہ ہو تو وہ کام نہ کیا جائے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ
يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ
وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کی نسبت یہ خیال نہ کرنا کہ وہ مرے ہیں نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے حضور ان کو روزی ملتی ہے[۳۱۳]۔ اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ان کو جو کچھ عطا کیا ہے اس سے وہ خوش حال ہیں[۳۱۴]، اور جو لوگ ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی ان سے نہیں ملے ہیں ان کے لیے خوش ہو رہے ہیں کہ نہ تو ان کے لیے کسی قسم کا اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے[۳۱۵]۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے

عطیوں سے مسرور رہیں اور اس بات سے کہ اللہ اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے۔[۳۱۶]

مرتبہ شہادت

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت اور بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دُنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم و ستم اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے لیکن قرآن کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا کہ قوت بذاتہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے بلکہ اس کے استعمال کا موقعہ بُرا ہوتا ہے اس لیے قرآن نے بہادری اور شجاعت کو سراہا اور اس کے مواقع کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم و ستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہو سکے۔ اسلام شجاعت کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتائج ہیں۔ اسی صورت میں بتایا گیا ہے کہ

۱۔ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں۔ صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہیے۔

۲۔ ہر آدمی کی موت کا وقت مقرر ہے جب وہ آجاتے تو کسی طرح ٹالے ٹل نہیں سکتی اور جب تک نہ آتے اس کو مار نہیں سکتا۔

۳۔ خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے اس کے خون کے پانی سے گناہوں کا سارا دفتر دُھل جاتا ہے۔

انسان کی کمزوری اور بُزدلی کا اصلی راز موت کا ڈر ہے۔ قرآن نے پہلے اس زہر کا تریاق یہ کہہ کر مہیا کیا کہ موت کا وقت مقرر ہے اس لیے کسی خطرہ سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن نے

بار بار اس کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا یہ خیال کرنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوتے اس لیے مارے گئے غلط ہے کیونکہ مارنا جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جس کو چاہے موت دے اور جسے چاہے زندہ رکھے۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا یہ عقیدہ نہ رکھو۔ یہ کہنا کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا سراسر غلط ہے کیونکہ کوئی شخص موت سے بچ نہیں سکتا۔

انسان کو بزدل بنانے والی چیز خود زندگی کی محبت ہے۔ قرآن نے اس کے لیے یہ تریاق مہیا کیا ہے کہ میدان جنگ میں مرنے والوں سے یہ کہا کہ تم سب سے بڑی دولت نثار کر رہے ہو وہ زندگی ہے۔ یہ زندگی ان کو از سر نو اسی وقت دے دی جائے گی۔ اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کر شہید مر جاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ خیال نہ کرو خدا کے پاس زندہ ہیں۔ ان کی زندگی کو اگرچہ اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے۔ پھر بھی ان کو زبان سے بھی مُردہ نہ کہنا چاہیے۔

موت کی جگہ حیاتِ جاودانی

۳۱۳۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے ان کی نسبت یہ خیال نہ کرنا کہ وہ مُردے ہیں نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے حضور ان کو روزی ملتی ہے۔ یعنی گھر میں بیٹھے رہنے سے موت ٹل نہیں سکتی ہاں آدمی اس موت سے محروم رہتا ہے جس کو موت کے بجائے حیاتِ جاودانی کہنا چاہیے شہیدوں کو مرنے کے بعد ایک خاص طرح کی زندگی ملتی ہے جو اور مُردوں کو نہیں ملتی ہے۔ ان کو حق تعالیٰ کا ممتاز قرب حاصل ہوتا ہے بڑے عالی درجات اور مقامات پر فائز ہوتے ہیں۔ جنت کا رزق ان کو آزادی سے پہنچتا ہے جس طرح ہم اعلیٰ درجہ کے ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر ذرا سی دیر میں جہاں چاہیں اڑ کر چلے جاتے ہیں۔ شہداء کی ارواح حواصل طیورِ خضر میں داخل ہو کر جنت کی سیر کرتی رہتی ہیں۔ ان طیورِ خضر کی کیفیت و کلانی کو اللہ ہی جانے وہاں کی چیزیں ہمارے احاطہ خیال میں کہاں آ سکتی ہیں[1]

حیاتِ شہداء کے بارے میں قرآن حکیم کی دو آیتیں ہیں ایک تو یہی زیرِ تفسیر آیت اور دوسری

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت البقرہ ۱۵۴ گزر چکی ہے یہاں فرمایا کہ شہداء کو مُردے مت سمجھو اور وہاں فرمایا کہ شہداء کو مُردے نہ کہو۔
عالم تین ہیں دُنیا، برزخ اور آخرت۔ ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ اس موجودہ دُنیا میں جسم زیادہ نمایاں اور رُوح پوشیدہ ہے اور رُوح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے وہ صرف اس مادی جسم کے واسطہ سے پہنچتی ہے۔ ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت و لذت کا اس مادی دُنیا میں کوئی امکان نہیں دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے رُوح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو کچھ راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل رُوح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا۔ لیکن اس تیسرے عالم میں جسے آخرت یا جنت و دوزخ کہتے ہیں رُوح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی تکلیف و راحت کے مظاہر بالکل الگ ہوں گے۔
بتانے والے بتاتے ہیں کہ قتل کے بعد شہداء کو جو زندگی ملتی ہے وہ برزخی ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر فی الواقع شہداء کو برزخ میں حیات ملتی ہے تو اس میں ان کی تخصیص کیا ہے وہ تو ہر مرنے والے کو ملتی ہے یعنی مرنے کے بعد اس کی رُوح زندہ رہتی ہے۔ راحت و تکلیف سے سب ہی اس عالم میں دوچار ہوتے ہیں۔ راحت و تکلیف کا یہ احساس اصلاً رُوح کو ہوتا ہے اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً متاثر ہوتا ہے۔ اگر شہداء کی زندگی بھی برزخ میں سب کی طرح ہے تو پھر یہ کیوں کہا گیا ہے کہ عملاً یہ خیال بھی نہ کرنا کہ وہ مُردہ ہیں اور قولاً زبان سے بھی نہ کہنا کہ وہ مُردہ ہیں۔ جب ان کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان کی روحیں عنصری بدنوں سے پرواز کر چکی ہیں اور اس طرح جدا ہو چکی ہیں کہ روحوں کا جسموں سے کوئی تعلق نہیں رہا تو پھر مُردہ نہیں تو اور کیا ہیں؟ ہماری زبان میں موت اسی کا نام ہے اگر آپ کہتے ہیں کہ وہ عالمِ برزخ میں زندہ ہیں تو وہاں تو سب ہی زندہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کہتے ہیں کہ ان کی زندگی برزخی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب بہت کم نے دیا ہے۔ صاحبِ معارف القرآن نے قرطبی کے حوالہ سے صرف اتنا بتایا ہے کہ شہداء کو اللہ کی طرف سے رزق ملتا ہے اور رزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دُنیا سے رخصت ہوتے ہی شہداء کے لیے رزقِ جنت جاری ہو جاتا ہے اور ایک خاص قسم کی زندگی مل جاتی ہے جو عام مُردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے[1] اور صاحب جواہر القرآن لکھتے ہیں کہ "شہادت کے بعد ان کو جو زندگی ملتی ہے وہ دنیوی نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف ہوتی ہے جب وہ دُنیا میں زندہ تھے ان کی زندگی بھی دُنیوی تھی یعنی رُوح اور

[1] معارف قرآن ص ۳۸۳

بدن دونوں کے ملاپ سے زندہ تھے لیکن موت سے دُنیوی زندگی ختم ہوگئی اور برزخ کا زمانہ شروع ہوگیا اب اس زندگی کو برزخی کہا جائے گا اور یہ زندگی بلا مشارکت بدنِ عنصری صرف رُوح کے لیے ہوگی[1]

دراصل عالمِ برزخ ارواح و نفوس کی دُنیا ہے۔ اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے جسمِ خاکی کا مثنیٰ ہوتا ہے۔ رُوحِ انسانی اسی جسمِ مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ اعمال کی اصل ذمہ دار رُوح ہے جسمِ خاکی نہیں کل نفس بما کسبت رھینۃ، اس لیے اصل مکلف رُوح ہے جسم نہیں جسم بمنزلہ آلہ ہے۔ دُنیا میں اس کا ایک جسمِ خاکی تھا۔ برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا تاہم اس کو اپنے جسمِ خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو قبر میں جاتا دیکھتے ہیں۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس عالمِ برزخ میں جسمِ خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مثالی جسم عطا کر دیتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی رُوح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے[2] اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ گویا وہ پاکباز رُوحیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں کی فانی زندگیوں کو مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو اللہ کی طرف سے ایک مثالی جسم غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے۔

بہرحال یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ شہداء کو عالمِ برزخ میں حیات ملتی ہے۔ اس میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں لیکن کیفیتِ حیات میں اختلاف ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اسے معنوی مانتے ہیں چنانچہ مدارج النبوت میں حیات النبی پر بحث کرتے ہوتے رقمطراز ہیں :

حیات شہداء مقاتلین فی سبیل اللہ است کہ آں معنوی اخروی است عند اللہ

مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں یہ نہیں کہ مثل شہداء ان ابدان کو چھوڑ کر اور ابدان سے تعلق ہو جاتا ہے چنانچہ وہ نیل الاوطار میں لکھتے ہیں :

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشہداء انہم احیاء یرزقون وان الحیاۃ

---

[1] جواہر القرآن [2] سنن ابن ماجہ۔

فيه متعلقة بالجسد

شہداء کی پُر مسرت زندگی

۳۱۴ ۔ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو جو کچھ عطا کیا ہے اس سے وہ خوش حال ہیں یعنی اس وقت شہداء بے حد مسرور اور مُبتہج نظر آتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے دولت شہادت عنایت فرمائی، اپنی عظیم نعمتوں سے نوازا اور اپنے فضل سے ہر آن مزید انعامات کا سلسلہ قائم کر دیا ۔ جو وعدے شہیدوں کے لیے پیغمبروں کی زبانی کیے گئے تھے انہیں آنکھوں سے مشاہدہ کر کے بے حد و بے انتہا خوش ہوتے ہیں [1]

یہ اس پُر مسرت زندگی کی تفصیل ہے جس کا مقام قرآن نے خدا کے پاس بتایا ہے ۔ یہ ان کو محض اللہ کے فضل سے بلا واسطہ اور بلا محنت اور بلا مشقت اور بغیر حساب و کتاب اللہ نے دی ہے دُنیا کے رزق میں اوّل تو محنت و مشقت سے اور آخر میں ملنے کے بعد یہ غم ہوتا ہے کہ کہیں چھن نہ جائے ۔ شہداء کو اللہ کے پاس سے جو رزق ملتا ہے اوّل تو اس میں اسباب و وسائل کا واسطہ نہیں ہوتا اور پھر یہ کہ اس میں کسی قسم کی محنت و مشقت نہیں ہوتی ۔ مزید براں کہ اس کے زوال کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اور یہ بے مثال فرحت و مسرت بھی ان کی بے مثال حیات کی دلیل ہے فرحت کا تعلق زندگی سے ہے ۔ شہداء ان انعامات کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں ۔

کاش پیچھے رہنے والے بھی قربانیاں کریں

۳۱۵ ۔ اور جو لوگ ان کے پیچھے دُنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی ان سے نہیں ملے ہیں ان کے لیے خوش ہو رہے ہیں کہ نہ تو ان کے لیے کسی قسم کا اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔ یعنی نہ صرف یہ کہ اپنی حالت پر شاداں و فرحاں ہوتے ہیں بلکہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کا تصور کر کے بھی انہیں ایک خاص خوشی حاصل ہوتی ہے جن کو اپنے پیچھے جہاد فی سبیل اللہ اور دوسرے امورِ خیر میں مشغول چھوڑ آئے ہیں کہ وہ بھی اگر ہماری طرح اللہ کی راہ میں مارے گئے یا کم از کم ایمان پر مرے تو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ایسی ہی پُر لطف اور بے خوف زندگی کے مزے لوٹیں گے

---

[1] ، [2] افادات شیخ الاسلام

نہ ان کو اپنے آگے کا ڈر ہوگا اور نہ پیچھے کا غم مامون و مطمئن سیدھے خدا کی رحمت میں داخل ہو جائیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ شہداءِ احد یا شہداءِ بیرِ معونہ نے خدا کے ہاں پہنچ کر تمنا کی تھی کہ کاش ہمارے اس عیش و تنعم کی خبر کوئی ہمارے بھائیوں کو پہنچا دے تاکہ وہ بھی اس زندگی کی طرف جھپٹیں اور جہاد سے جان نہ چرائیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا میں پہنچاتا ہوں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور ان کو مطلع کیا گیا کہ ہم نے تمہاری تمنا تمہارے بھائیوں تک پہنچادی۔ اس پر وہ اور زیادہ خوش ہوئے[1]

اس آیت میں اہلِ ایمان کو بتایا ہے کہ حصولِ مقصد کے لیے جو لوگ اپنی جان دیتے ہیں وہ اور جو ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں وہ یہ دونوں گروہ خوش قسمت ہیں۔ گروہ اوّل یعنی شہداء تو ان خوشیوں اور راحتوں کو پالیتا ہے جو اہلِ ایمان و عمل کو بعد الموت ملنے والی ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کے لیے یہ بشارت ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ ان کو دشمنوں کا خوف نہ رہے گا اور نہ ان کو رنج اور غم ہوگا کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں قربانی کیوں کی اور جس طرح اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو خبر دیتا ہے کہ شہداء اللہ کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں اسی طرح وہ شہداء کو بتاتا ہے کہ بعد میں رہنے والے کامیاب ہو گئے ہیں یا یوں کہہ دیجئے کہ شہداء اپنے ان مخلص ساتھیوں کی طرف سے بھی مطمئن ہوتے ہیں جو ابھی تک شہید ہو کر ان تک نہیں پہنچے اور یہ اطمینان اس بنا پر ہوتا ہے کہ جو بشارتیں سُنا کرتے تھے ان سے خود سود مند ہو رہے ہیں اس لیے پُر امید ہیں کہ ساتھی بھی شہید ہوں گے تو وہ بھی ہر قسم کے خوف اور ہر قسم کے غم سے مامون ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لم یلحقوا بھم سے شہید اور غیر شہید سب اہلِ ایمان مراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ جو مسلمان ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی نہیں آئے اگر وہ شہید ہو کر آئیں گے تب تو ہمارے ساتھ مل ہی جائیں گے اور اگر اپنی موت سے بھی مر کر آئے اور ایمان و خلوص لے کر آئے تب بھی ہر قسم کے خوف و حزن سے مامون ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ وہ ان دونوں قسم کی خوشیوں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں ایک تو یہ کہ خود عیش اور مزے میں ہیں اور آزادی کے ساتھ سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہر جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں دوسرے یہ کہ پیچھے رہنے والوں کی طرف سے مطمئن ہیں کہ وہ آجائیں گے تو ان کو بھی ایک خاص اور پُر لطف زندگی میسر آئے گی۔ اگر شہید ہو کر آتے تو سبحان اللہ اور اگر شہید نہ ہوتے اور ایمان و اخلاص کی نعمت لے کر آتے پھر بھی مامون زندگی کے وارث ہوں گے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بعض عُلمائے نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ عالی مقام اہل ایمان کے ساتھ ان کی ذریت اور ان کے اخلاف میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جن کا خاتمہ ایمان پر ہو گا اگرچہ اپنے عمل کے لحاظ سے یہ ان کے درجہ کے نہ ہوں یہ شہید اور صدیقین پر اللہ کا خاص فضل ہو گا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کی باایمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اور اس مقصد کی خاطر اسلاف کا درجہ نیچا نہیں کیا جائے گا اخلاف کا درجہ بلند کر دیا جائے گا [1]

حافظ ابن کثیر نے کچھ عُلماء سے اس آیت کی تشریح اس طرح بھی نقل کی ہے کہ شہید کے پاس ایک رجسٹر لایا جائے گا جس میں ان لوگوں کے نام ہوں گے جو اہل ایمان برادری میں سے اس کے پاس آنے والے ہیں وہ اس بشارت سے ایسا شاداں و فرحاں ہو گا جیسا کہ دُنیا میں لوگ اپنے کسی غائب عزیز کی آمد کی بشارت سُن کر خوش ہوتے ہیں [2]

اہل ایمان کے لیے محرومی نہیں ہے

۳۱۶ ۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے عطیوں سے مسرور ہیں اور اس بات سے کہ اللہ اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے یعنی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے اس پر بے انتہا خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی محنت ضائع نہیں کرتا ہے بلکہ خیال و گمان سے بڑھ کر بدلہ دیتا ہے [3]

مطلب یہ ہے کہ ان کو مشاہدہ ہو جائے گا کہ اللہ سبحانہ اہل ایمان کے اجر کو رائیگاں نہیں کرتے ۔ غرض شہداء اپنی نعمتوں کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسروں کے متعلق یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتے ۔ ان دونوں خوشیوں کا سبب صراحۃً ذکر فرمایا کہ وہ خوش ہیں ۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ خود اچھی حالت میں ہیں اور دوسرے اس لیے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا بلکہ جو مسلمان جس مرتبہ کا عمل لے کر آتا ہے اس کو اس کے مرتبہ کے موافق درجہ اور ثواب دیتا ہے اس مسرت و شادمانی سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو گی کہ کوئی شخص خود اپنی جانب سے اور اپنے متعلقین کی جانب سے مطمئن اور پُر امید ہو ۔

---

[1] تدبر قرآن [2] معارف قرآن ص م ا [3] افادات شیخ الاسلام

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ
الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝
الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ
لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ
عَظِيمٍ ۝ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ
وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

جن لوگوں نے زخم کھانے کے باوجود اللہ اور رسول کی پکار کو اپنایا۔ ان میں نیکوکاروں اور اہل تقویٰ کے لیے بہت بڑا اجر[۳۱۷] ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن سے کچھ آدمی کہتے تھے کہ دشمنوں نے تمہاری خاطر بہت بڑی جمعیت اکٹھی کی ہے لہٰذا ان سے ڈرتے رہو لیکن یہ سن کر

اُن کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ بول پڑے ہمارے لیے اللہ کافی ہے
اور وہی بہترین کارساز ہے[318]۔ آخر کار وہ اللہ کی نعمت اور فضل سے
شادکام واپس آگئے ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی وہ اللہ کی
خوشنودی پر گامزن ہو گئے اور اللہ بڑے ہی فضل والا ہے[319]۔ اس
کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مخبر ایک شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے
ڈراتا ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ان سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو[320]۔

تکلیف کے باوجود فداکاری کے مظاہرے

ابوسفیان جب اُحد سے مکہ واپس گیا تو راستہ میں خیال آیا کہ ہم نے بڑی غلطی کی، ہزیمت یافتہ اور زخم خوردہ مسلمانوں کو یوں ہی چھوڑ کر چلے آئے۔ مشورے ہونے لگے کہ پھر مدینہ واپس چل کر ان کا قصہ تمام کریں۔ حضور انور کو خبر ہوئی تو اعلان فرما دیا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ لڑائی میں شریک تھے رُخ دشمن کا تعاقب کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مسلمان مجاہدین باوجودیکہ تازہ زخم کھائے ہوئے تھے اللہ اور رسول کی پکار پر نکل پڑے۔ آپ ان مجاہدین کی جمعیت لے کر مقام "حمراء الاسد" تک پہنچے۔ ابوسفیان کے دل میں یہ سُن کر کہ مسلمان اس کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں سخت رُعب و دہشت طاری ہوئی دوبارہ حملہ کا ارادہ فسخ کر کے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالقیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ آرہا تھا — ابوسفیان نے ان لوگوں کو کچھ دے کر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر ایسی خبریں شائع کریں جن کو سن کر مسلمان ہماری طرف سے مرعوب و خوفزدہ ہو جائیں۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر کہنا شروع کیا کہ مکہ والوں نے بڑا بھاری لشکر اور سامان مسلمانوں کے دلوں میں استیصال کی غرض سے تیار کیا ہے۔ یہ سُن کر مسلمانوں کے دلوں

خوف کی جگہ جوش ایمان بڑھ گیا اور کفار کی جمعیت کا حال سن کر کہنے لگے حسبنا اللہ و نعم الوکیل ساری دنیا کے مقابلے میں اکیلا خدا ہی ہم کو کافی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جنگ احد کے تمام ہونے پر ابوسفیان نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ سال بدر پر پھر لڑائی ہے حضور انور نے ابوسفیان کا یہ چیلنج قبول کیا۔ جب اگلا سال آیا حضرت نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے چلو۔ اگر کوئی نہ جائے گا پھر بھی اللہ کا رسول تنہا جائے گا۔ ادھر ابوسفیان مکہ سے فوج لے کر نکلا تھوڑی دور چل کر کمر ہمت ٹوٹ گئی، رعب چھا گیا، قحط سالی کا عذر کر کے چاہا کہ مکہ واپس چلا جائے مگر صورت ایسی ہو کہ الزام مسلمانوں پر رہے۔ ایک شخص مدینہ جاتا تھا۔ اس کو کچھ دینا کیا کہ وہاں پہنچ کر اس طرف کی ایسی خبریں مشہور کرنا جن کو سن کر مسلمان ڈر جائیں اور جنگ کو نہ نکلیں۔ وہ مدینہ پہنچ کر کہنے لگا کہ مکہ والوں نے بڑی بھاری جمعیت اکٹھی کی ہے تم کو لڑنا مناسب نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے استقلال دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو اللہ کافی ہے۔ آخر مسلمان حسب وعدہ بدر پہنچے۔ وہاں بڑا بازار لگتا تھا تین روز رہ کر تجارت کر کے خوب نفع کما کر مدینہ واپس آتے۔ اس غزوہ کو بدر صغریٰ کہتے ہیں۔ اس وقت جن لوگوں نے رفاقت کی اور تیار ہوئے ان کو یہ بشارت ہے کہ احد میں زخم کھا کر اور نقصان اٹھا کر پھر ایسی جرأت کی مسلمان کی اس جرأت و مستعدی کی خبر سن کر مشرکین راستہ سے لوٹ گئے۔ چنانچہ مکہ والوں نے اس مہم کا نام "جیش السویق" رکھ دیا یعنی وہ لشکر جو محض ستو پینے گیا تھا پی کر واپس آ گیا۔[1]

ان آیات کے پس منظر میں حمراء الاسد کا واقعہ ہو یا بدر صغریٰ دونوں میں صحابہ کرام خوش اور کامیاب واپس آئے لیکن اس موقعہ پر بھی منافقوں نے دشمنوں سے مل کر ہر طرح کی شرارتیں کیں۔ دشمن چاہتے تھے کہ ڈر جانے کی حالت ان کے حصے میں نہ آئے مسلمانوں کے حصے میں آتے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مخبر روانہ کیے گئے۔ اور بہت سی جھوٹی افواہیں اڑائی گئیں۔ منافق انہیں پھیلاتے اور مسلمانوں کو سرگرمی سے باز رکھنا چاہتے یہاں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہے اور منافقوں کو آخری مہلت دی گئی ہے کہ اپنی منافقانہ روش سے باز آ جائیں ورنہ وقت آ گیا ہے کہ اللہ ان کے چہروں سے نفاق کا پردہ اٹھا دے گا۔

ان آیات میں منافقوں کی جو نفسیاتی حالت دکھائی گئی ہے وہ کوئی مخصوص صورت حال نہیں ہے اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کے کمزور اور مذبذب افراد ہمیشہ ایسی ہی صورت حال

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پیدا کر دیا کرتے ہیں ؎۱

غزوۂ حمراء الاسد میں صحابہ کی فداکاری

۱۷۲۔ جن لوگوں نے زخم کھانے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کی پکار کو اپنایا۔ ان میں نیکوکاروں اور اہل تقویٰ کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ جنگ احد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دور چلے گئے تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے باہم کہا کہ ہم نے یہ کیا حرکت کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت ختم کر دینے کا جو موقعہ ملا تھا اسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے مشورہ کیا کہ دوبارہ حملہ کیا جائے لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس ہو گئے۔ ادھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں اس لیے جنگ احد کے دوسرے روز آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقعہ تھا مگر پھر بھی سچے مومن جاں نثاری کے لیے تیار ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس آیت میں ان ہی فداکاروں کی طرف اشارہ ہے ؎۲ غزوۂ احد ۱۵ شوال ۳ھ مطابق ۳۱ مارچ ۶۲۵ء کو ہوا تھا۔ یہ ہفتہ کا دن تھا۔ اگرچہ قریش کا لشکر میدان جنگ سے روانہ ہو گیا تھا لیکن خطرہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔ اس لیے رات کو مدینہ منورہ میں پہرے کا زبردست انتظام کیا گیا۔ ۱۶ شوال ۳ھ مطابق یکم اپریل ۶۲۵ء کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے تعاقب کا حکم دیا یہ بھی صراحت کر دی کہ صرف وہی لوگ اس مہم میں شریک ہوں جو غزوۂ احد میں شریک تھے۔ چنانچہ مجروحین پٹیاں باندھے ہوئے تعاقب کی مہم میں شریک ہوئے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمراہ تھے۔ آپ نے حمراء الاسد میں قیام فرمایا۔ اس رات مقام نزول میں جگہ جگہ آگ روشن کی گئی تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ بہت بڑا لشکر ٹھہرا ہوا ہے۔ اگرچہ قبیلہ بنو خزاعہ مسلمان نہ ہوا تھا مگر وہ لوگ کچھ مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ معبد خزاعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا واپس ہوا تو دیکھا کہ قریش الروحا میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور فیصلہ کن حملے کے مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔ معبد نے ان سے کہا کہ میں نے ایسا ہیبت انگیز لشکر کبھی نہیں دیکھا جیسا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور وہ حمراء الاسد

؎۱ ترجمان القرآن ؎۲ تفہیم القرآن

میں ہیں۔ یہ سن کر قریش مکہ روانہ ہو گئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پیر، منگل ۱۸، ۱۹ شوال کو حمراء الاسد میں قیام پذیر رہے اور بدھ ۲۰ شوال کو مراجعت فرمائی۔

عام شارحین قرآن کی رائے یہی ہے کہ یہ آیت قرآنی اور اگلی آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں لیکن امام مجاہد اور عکرمہ کی رائے میں ان آیات میں غزوہ بدر کبریٰ کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ عبدالقادر اور مولانا آزاد کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ کچھ ہو اس آیت میں صحابہ کی جاں نثاری اور اسلام کی خاطر فداکاری کی مدح کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہدا کے وہ بھائی جو ان کے پیچھے رہ گئے ان کے کیا کہنے ہیں انھوں نے ایسے سنگین حالات میں اللہ و رسول کے حکم کو شرف پذیرائی بخشا اور خدا کے رسول کی آواز پر لبیک کہی جب کہ وہ زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اصل ارشاد میں الذین استجابوا آیا ہے۔ استجابت کے معنے قبول کرنے کے آتے ہیں۔ ان معنے میں یہ لفظ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ درمیان میں مدح میں اور زور پیدا کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ ان میں احسان و تقویٰ علیٰ وجہ الکمال موجود ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان میں کچھ محسن اور کچھ غیر محسن تھے اور کچھ متقی اور کچھ غیر متقی تھے بلکہ یہ اعلان ہے جو ایسے موقعہ پر ہوتا ہے کہ جو وفادار رہے اس کو انعام ملے گا خواہ سب کے سب وفادار ثابت ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ جنہوں نے باوجود زخمی ہونے کے فداکاری کا یہ مظاہرہ کیا کہ اللہ کے رسول کی دعوت جہاد قبول کی بلاشبہ وہ سب ہی محسن اور سب ہی متقی تھے اور سب ہی اجر عظیم کے مستحق تھے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ :

> یہ جو فرمایا للذین احسنوا منھم واتقوا محض ان کی مدح سرائی اور تنویہ شان کے لیے ہے ورنہ سب کے سب ایسے ہی تھے۔

ہاں اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ کوئی کام خواہ کیسا ہی اچھا ہو اور کرنے والا اس کے لیے کیسی ہی جاں نثاری کرے اللہ کے یہاں اس کی قدر و قیمت اسی وقت پڑے گی جب اس میں احسان و تقویٰ ہو گا۔

نبوت کی اصطلاحی زبان میں احسان

احسان کی حقیقت مختصر سے مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے بارے میں بندے کے قلب کو ایسا یقین و اطمینان نصیب ہو جائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدے سے ہو جایا کرتا ہے جس کے بعد اس کے خلاف کسی وہم اور وسوسہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر اس کے نتیجہ میں

اللہ کے ساتھ عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے قلب ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت و محبت سے معمور رہے۔ اور پھر اس بندہ کی عبادت، اس کے اخلاق، اس کی معاشرت اور اس کے سارے معاملات یعنی اس کی پوری زندگی کی رُوح بھی ایمان و یقین اور یہی رابطہ عبدیت بن جائے پھر وہ جو کچھ کرے اسی ایمان اور رابطہ عبدیت کے داعیہ سے اور اسی کے تقاضے کے مطابق کرے اور اس طرح اس کی قالبی اور ظاہری زندگی بھی اسی قلبی و باطنی رنگ سے رنگین ہو جائے۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔

احسان کی یہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد ہر شخص آپ سے آپ سمجھ لے سکتا ہے کہ یہ دین و ایمان کا کمال ہے اور جس کو جتنی یہ دولت نصیب ہو اتنا ہی اس کا دین کمال والا ہے اور جس میں اس لحاظ سے جتنی کمی ہو اتنی ہی اس کے دین کے کمال میں کمی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے اس میں آپ نے احسان کی یہ تعریف کی ہے الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ تم اسے فی الواقع نہیں دیکھتے مگر وہ تو تمہیں حقیقتہ دیکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کی یہ حالت ہو جائے کہ عابدانہ زندگی اس طرح گزارے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب ملحوظ رکھے کہ گویا اللہ سبحانہ اس کے سامنے ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے ظاہر ہے یہ کیفیت جب ہی پیدا ہوتی ہے جب کہ بندہ کو حقیقت یقین حاصل ہو جائے اور وہ اس کے قلب پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اس کے سامنے رہے۔

پھر اس نور یقین، اس حضوری نسبت اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلے میں سارے تعلقات فنا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے تمام ظاہری و باطنی اعمال مثلاً دشمنی دوستی، کسی سے ملنا، نہ ملنا، لینا اور دینا سب اللہ کے لیے ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرام کو یہی دولت حاصل تھی اور ان کا خاص سرمایہ یہی نعمت تھی۔ یعنی یہ نور یقین اور اس سے پیدا ہونے والا رابطہ عبدیت اور کیفیت خشیت و محبت ان میں درجہ کمال میں موجود تھی۔

ہمارے اس صدی کے ربانی عالم اور محقق صوفی حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔

یہ انتہا سب طرق کی ہے ۔۔۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنا تمام

خاں وہاں اور آبروجان کیوں دی تھی کیا دیکھا تھا۔ یہی کہ فیضِ صحبت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نورِ یقین حاصل ہو گیا تھا۔ بس اسی پر سب کام کا مدار تھا۔ حضرت سیدی عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اور سید الطائفہ بہاؤ الدین بخاری کیوں بڑے ہو گئے اسی وجہ سے بڑے ہوئے تھے چند سطر کے بعد فرماتے ہیں کہ،

اس نسبت کا نام احسان ہے کہ بعثتِ جناب فخرِ رسل علیہ السلام کی اس کے ہی واسطے تھی اور جملہ صحابہ اس نسبت کے حامل تھے علی حسب مراتبھم۔

(مکاتیب رشیدیہ ص ۱۸)

اسی کے لیے تصوف کی زبان میں حضور، یادداشت، نسبت، احسانی کیفیت کی تعبیرات ہیں۔ بہرحال بتایا جا رہا ہے کہ للذین احسنوا منھم کا فقرہ مقامِ مدح میں آیا ہے اور اس کے ذریعے نسبتِ احسانی میں صحابہ کا چہرہ پیش کیا ہے۔

غور کیجیے کہ یہ مدح کن لوگوں کی کی جا رہی ہے ان کی جن کی نمازیں یکسر خلوص و للہیت سے معمور تھیں جن کے اعمالِ صالحہ اور فضائلِ اخلاق کی دُنیا کی ساری تاریخ میں نظیر نہیں ہے جن کے درجات اور علوِ مرتبت پر خود قرآن گواہ ہے۔ اس کے باوجود ان کی مدح احسان و تقویٰ کو بنیاد بنا کر وہاں کی گئی جہاں زندگی کی محبتوں اور اُلفتوں نے ستم رسیدہ ہونے، زخمی ہونے کے باوجود دینِ حق کی اقامت کی خاطر اللہ کے رسُول کی دعوت پر لبیک کہنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنی۔

آج جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دُعائیں، ہمارے اوراد و وظائف نسبتِ احسانی کے لیے کافی ہیں انہیں غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں اور عبادتوں اور اعمالِ صالحہ کے باوجود نسبتِ احسانی کا علمبردار دینِ حق کی نصرت کرنے پر بتایا جا رہا ہے تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار و قطار میں ہوں گی جب کہ ہم خدا کے دین کو غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اس تمنا اور آرزو سے خالی ہو چکے ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانونِ سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو۔

ایک اور لطیف نکتہ

اس واقعہ میں مشرکین کے تعاقب میں جانے کا حکم اللہ کے رسُول نے دیا تھا۔ قرآن میں اس کا

حکم کسی آیت میں مذکور نہیں ہے اس کے باوجود جب اللہ سبحانہ نے صحابہ کی جاں نثاری اور اطاعت شعاری کو سراہا تو فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانا الذین استجابوا للّٰہ و الرسول اس میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو حدیث کا انکار کرتے ہیں اور رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد کی بتلاتے ہیں۔ ان کے سمجھنے کے لیے یہ جملہ کافی ہے کہ رسول کے حکم کو اللہ نے اپنا حکم قرار دیا ہے۔

غزوۂ بدر صغریٰ میں صحابہ کی فداکاری

۳۱۸ ۔ یہ وہی لوگ ہیں جن سے کچھ آدمی کہتے تھے کہ دشمنوں نے تمہاری خاطر بہت بڑی جمعیت اکٹھی کی ہے لہٰذا ان سے ڈرتے رہو لیکن یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ بول پڑے ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلی آیت یعنی الذین استجابوا غزوۂ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی اور اس آیت میں غزوۂ بدر صغریٰ میں صحابہ کی فداکاری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

غزوۂ احد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان مسلمانوں کو چیلنج دے گیا تھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمہارا پھر مقابلہ ہوگا مگر جب وعدے کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا کیونکہ اس سال مکہ میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو روانہ کیا جس نے مدینے پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کر دیں کہ اس سال مشرکین نے زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلہ پر نہ آنے کی ذمہ داری انہی پر رہے ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخر کار اللہ کے رسول نے بھرے مجمع میں اعلان کیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا اس پر پندرہ سو فداکار آپ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپ انہی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ ادھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا۔ دو روز کی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا آئندہ سال آئیں گے [1]

---

[1] تفہیم القرآن

ذی قعدہ ۴ھ مطابق اوائل اپریل ۶۲۶ء قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے آپ کے ساتھ ۱۵۰۰ غازی اور دس گھوڑے تھے ۔ ذی قعدہ کا چاند طلوع ہوتے ہی بدر میں میلہ شروع ہوتا تھا اور وہاں خوب تجارت ہوتی تھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں ۸ ذی قعدہ مطابق ۱۲ اپریل ۶۲۶ء تک قیام پذیر رہے ۔ ۱۸ ذی قعدہ کے بعد واپس آ گئے ۔

آیت میں دو جگہ الناس آیا ہے ۔ پہلے الناس سے نعیم بن مسعود مراد ہے ۔ نعیم اگرچہ تنہا تھا لیکن بہت کی ترجمانی کر رہا تھا اس لیے اس کو الناس کہہ دیا اور دوسرے الناس سے کفار مکہ مراد ہیں ۔

ابو سفیان لشکر لے کر مرالظہران تک پہنچا تھا یکایک دل چھوڑ بیٹھا اور واپسی کا ارادہ کر لیا ۔ اتفاق سے اسے نعیم بن مسعود اشجعی مل گیا ۔ ابو سفیان نے اس سے کہا کہ میں محمد اور ان کے ساتھیوں سے وعدہ کر آیا ہوں کہ بدر کے میلے کے ایام میں آئندہ سال جنگ ہو گی لیکن اب میری رائے ہے کہ لڑنا مناسب نہیں اس لیے اے نعیم اچھا یہ ہے کہ تم مدینہ جا کر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور کر دو کہ قریش نے تمہارے لیے ایک عظیم لشکر تیار کیا ہے تاکہ مسلمان خوفزدہ ہو جائیں اور ان کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور ڈر کر میدان میں نہ آئیں ۔ ابو سفیان نے نعیم بن مسعود سے کہا کہ اس کام کی اجرت میں تم کو میں دس اونٹ دوں گا ۔ نعیم انعام کا لالچ پا کر مدینہ پہنچا اور یہ پروپیگنڈہ کیا ۔ صحابہ نے نعیم کے اس پروپیگنڈے کا جو جواب دیا ہے قرآن نے اس کو یہاں نقل کیا ہے کہ یہ پروپیگنڈا بجائے اس کے کہ ان کے اندر خوف و ہراس پیدا کرتا ان کے عزم و ایمان کی بڑھوتری کا سبب ہو گیا ۔ اصحاب عزم و ایمان کو یہ پروپیگنڈہ بجائے ضعیف کرنے کے اور زیادہ پرعزم اور پرحوصلہ بنا دیتا ہے ۔ ہر آزمائش ان کی خفیہ صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتح مندی کا ایک نیا میدان کھولتا ہے ۔ انہوں نے اس پروپیگنڈے کے جواب میں کہا کہ حسبنا اللہ و نعم الوکیل یہ ان کے اضافہ ایمان کا مظہر ہے اہل ایمان کی تمام قوت و طاقت کا خزانہ درحقیقت یہی حسبنا اللہ کا عقیدہ ہے ۔ اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا ہے ۔ ان کے دلوں کا اطمینان اور خود اعتمادی اسی عقیدہ کا نتیجہ تھی ۔ اس عقیدے کی بدولت صحابہ میں عجیب و غریب بے خوفی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے تھے اور ایسے ایسے کام کر گزرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں ۔ یہ واقعہ بھی کچھ کم عجیب غریب نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے گھوڑے دریائے دجلہ میں ڈال دیے اور اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے چلتے رہے گویا وہ دریا میں نہیں خشکی پر چل رہے تھے ۔ ایرانی یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے "دیو آ گئے" دیو آ گئے اور دیوانے دیوانے پکار اٹھے ۔ اس موقع پر سلمان فارسی حضرت سعد بن

ابی وقاص کے ہمراہ تھے۔ حضرت سعد نے فرمایا حسبنا اللہ ونعم الوکیل اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ خدا کی قسم اللہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا اپنے دشمنوں کو شکست دے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا۔ اگر فوج میں سرکشی اور ایسے گناہ نہ ہوتے جو نیکیوں پر غالب آجائیں۔

اس عقیدہ نے مسلمانوں کے دلوں میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی۔ کیسے ہی ناخوشگوار اور ناموافق حالات پیش آتے ان کے عزم وارادے میں کوئی ضعف نہ آتا۔ ان کے سکون واطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ تعداد اور ساز وسامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے۔ مادہ اور اسباب کی پرستش سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کی قوت سے لڑتے ہیں اور اسلام کی برکت سے فتح پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اسی دینی جذبہ کا بڑا احترام تھا اور اسی کو اپنی عزیز ترین اور اصل قوت یقین کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمیں جو کچھ عزت نصیب ہوتی ہے اسی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔

رضائے الٰہی کی طلبگاری

۳۱۹۔ آخر کار وہ اللہ کی نعمت اور فضل سے شادکام واپس آگئے ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی وہ اللہ کی خوشنودی پر گامزن ہو گئے اور اللہ بڑے ہی فضل والا ہے۔ یعنی اللہ کا فضل دیکھو نہ کچھ لڑائی کرنی پڑی، نہ کانٹا چبھا، مفت میں ثواب کمایا، تجارت میں نفع حاصل کر کے اور دشمنوں پر دھاک بٹھا کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی لیے ہوئے صحیح وسلامت گھر واپس آگئے[1]

نعمت سے مراد عزت، سلامتی، عافیت، ثواب دشمن پر دھاک وغیرہ اور فضل سے مراد مال تجارت کا نفع ہے لم یمسسہم سوء کا مطلب یہ ہے کہ جب مقابلہ نہیں ہوا تو مسلمانوں کو کوئی گزند ہی نہیں پہنچا۔ رضائے الٰہی کی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ باوجود حالات کے ناسازگار ہونے کے پھر نکل کھڑے ہوئے اور زخموں کی پروا کیے بغیر خدا کے حکم کی تعمیل کرنے کو چل کھڑے ہوئے اور رضائے الٰہی پر ہی دراصل تمام مہربانیوں کا دارومدار ہے۔ گویا سب سے بڑی چیز ان کو اس سفر میں جو ملی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔ یہی فلاح دارین کی کنجی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب دواعی قلب اور حرکات جوارح سب رضائے الٰہی کے تابع ہو گئے تو یہ اس بات کی علامت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوگئی کہ اب ایمان ان کے ظاہر و باطن میں رچ گیا ہے قلب و زبان میں پوری یک رنگی اور پوری صداقت رونما ہو چکی ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہوا کہ نفس انسانی جب ترقی کے اس مقام یعنی رضوان اللہ پر جا پہنچتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے خاص فضل سے اس کو نوازے۔ شاید صوفیائے کرام اسی کو فنا و بقا کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہی نسبت احسانی کا حاصل ہے۔

اللہ سے ڈرنا ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے

۳۲۰۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مجز ایک شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈراتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ان سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو یعنی جو ادھر سے آکر مرعوب کن خبر پھیلاتا ہے وہ شیطان ہے۔ شیطان کے اغوا سے ایسا کر رہا ہے جس کی غرض یہ ہے کہ اپنے چیلے چانٹوں اور بھائی بندوں کا رعب تم پر ڈال کر خوفزدہ کر دے۔ سو تم اگر ایمان رکھتے ہو اور ضرور رکھتے ہو جس کا ثبوت عملاً دے چکے ہو تو ان شیطانوں سے اصلاً نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرتے رہو۔[1]

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد ازوے جن و انس و ہر کہ دید

مطلب یہ ہے کہ ڈرا وے سب شیطان کی طرف سے تھے اور اس طرح وہ تم پر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا رعب جمانا چاہتا تھا تو تم شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو اگر تم سچے مومن ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں شیطان اور اس کے اولیا سے اشارہ قریش اور ان کے ساتھیوں کی طرف ہے اور ان سے جس ڈر کی ممانعت کی گئی ہے یہ وہ ڈر ہے جس کا ہوا منافقین دکھا رہے تھے کہ ان کے ڈر سے خدا کے دین کے احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے۔[2]

اسلام میں خوف خدا کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت کے ساتھ اس کے خوف کو بھی جگہ دی ہے۔ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی۔ ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز، نخرہ اور کبھی بے ادبی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبے سے ہوسکتا ہے اس لیے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ قرآن نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش کیا ہے وہ نہ تو اللہ کو محض جبار سمجھتا ہے اور نہ صرف رحم وکرم اور محبت وشفقت کی صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان وکریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور ورحیم بھی۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے اخفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔ الغرض قرآن کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف ومحبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے خوف ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الرجاء والخوف ایمان خوف وامید کے درمیان ہے کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔ ایمان کے بعد انسان کی زندگی کو سنوارنے اور فلاح تک پہنچنے میں سب سے بڑا دخل اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت اور اللہ کی محبت کو ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا
اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ
لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ
لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ
الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ
رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا
فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

اور اے پیغمبر جو لوگ آج راہ کفر میں دوڑ دھوپ مچا رہے ہیں
ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ خاطر نہ کریں۔ بلاشبہ یہ لوگ

اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔[۳۲۲] اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے
آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی
ہے۔[۳۲۳] بلاشبہ جنہوں نے مایہ ایمان دے کر کفر کا سودا کیا ہے
وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کے لیے پاداشِ
عمل میں دردناک عذاب تیار ہے۔[۳۲۴] اور یہ جو ہم ان لوگوں
کو جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے ڈھیل دے رہے ہیں تو اس سے
وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ڈھیل ان کے حق میں بہتر ہے ہم ان کو
اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ اپنے گناہ میں اور ترقی کر جائیں
اور بالآخر ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔[۳۲۵] ایسا نہیں ہو سکتا
کہ اللہ اہلِ ایمان کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں تم
آج کل اپنے آپ کو پاتے ہو، وہ ضرور پاک لوگوں کو ناپاک
لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔[۳۲۶] مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے،

کہ وہ اس بارے میں تم کو غیب کی خبریں دے دے۔ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے، منتخب کر لیتا ہے[۳۲۷]۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان لے آؤ گے اور برائیوں سے بچو گے تو تم کو بہت بڑا اجر ملے گا[۳۲۸]۔

بقائے حق اور فنائے باطل کے لیے قانون

جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے پیمانے مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کے نشو و نما پانے کے بعد ظہور میں آتے۔

مدینہ کی زندگی میں یہودیوں کو جو چیز اسلام سے روک رہی تھی اور منافقین زیادہ تر ان ہی میں سے تھے ان میں سب سے اہم ان کی سیاسی اور معاشی ضرورتیں تھیں۔ یہ لوگ سیاسی طور پر مسلمان ہو گئے تھے لیکن اس میں مخلص نہ تھے۔ یہ لوگ اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے کہ قریش کی حمایت کر کے اسلام کے سیاسی مکان کو ڈھایا جا سکتا ہے چنانچہ ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر و اہل کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس صورتِ حال سے نبوت کو طبعًا پریشانی ہوتی، قرآن نے نبوت کو یہ کہہ کر یہاں تسلی دی ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ان کی یہ سرگرمیاں اللہ کے دین کو نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ جو لوگ کفر کو ایمان پر ترجیح دے رہے ہیں اللہ نے ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ان کو جو ڈھیل دے رکھی ہے یہ اللہ کا قانونِ امہال ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں دونوں

کے نتائج کے ظہور کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوں گے۔ اپنے وقتِ مقررہ پر ظاہر ہوں گے۔ اس قانونِ اہمال کو برا اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ ان کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور ان کے گناہوں کا پیمانہ چھلک جائے تاکہ جب ان کی کشتیٔ حیات ڈوبے تو پھر اسے اُبھرنے کا موقعہ نہ ملے۔

حکمتِ الٰہی نے دُنیا کا کارخانہ کچھ اس طرح چلایا ہے کہ یہاں نیکی و بدی، حق اور باطل، عدل و ظلم، دونوں کو مہلت ملتی ہے اور خدا کا قانون یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہلت اور ڈھیل دے۔ اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ یہ بات دیکھنی چاہیے کہ آخر کی کامیابی کس کے حصہ میں آتی ہے عملِ حق کے لیے بالآخر بقا اور عمل باطل کے لیے بالآخر نیست و نابود ہو جانا ہے۔

منافقوں کو قانونِ اہمال کے مطابق بہت مہلت دی جا چکی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اللہ سچے مومنوں میں اور ان میں امتیاز کر دے۔ باقی رہی یہ بات کہ اللہ اپنے کلام میں منافقوں کو نام بنام کیوں ذکر نہیں کرتا تو یہ اس کی سنت کے خلاف ہے۔ اس کی سنت اس بارے میں یہی ہے کہ جو شخص اپنے فساد سے باز نہ آئے گا خود اس کا فساد ہی اس کی بروقت تشہیر کر دے گا۔

۳۲۱ ۔ اور اے پیغمبر جو لوگ راہِ کفر میں دوڑ دھوپ مچا رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ خاطر نہ کریں۔ یعنی ان لوگوں کے لیے آپ غم اور فکر نہ کریں۔ اور ان کی حرکتوں سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ جو کفر کی حمایت اور اعانت میں دوڑ دھوپ مچا رہے ہیں اور آپ سے لڑنے کے لیے ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں اور اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ آپ ان کی پروا نہ کیجئے اور نہ ان کی کارروائیوں سے غمگین ہو جیئے۔ بلاشبہ اس وقت ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کفر اور اہلِ کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئی ہیں۔ اصل ارشاد میں ان کا چہرہ یسارعون فی الکفر کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اس سے لطیف اشارہ ہے کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں اس وقت اسلام کو بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ دین کے بارے میں ان کی زبانیں جھوٹ اور بے لگام ہیں۔ وہ راہِ نفاق میں ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں۔ راہِ حق میں کام کرنے والوں کے خلاف آوازے کستے ہیں اور اسلام کے سیاسی نظام کے خلاف ہر سازش میں پیش پیش ہیں۔ اسلام کے اجتماعی مسائل میں طرح طرح کی فتنہ اندازیاں کرتے ہیں۔ اس تمام صورتِ حال کے لیے یُسارعون فی الکفر کی تعبیر کیسی بلیغ ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ ان کی یہ حالت دیکھ کر اسلام کے بارے میں آزردہ خاطر نہ ہوں۔

آزردہ کیوں نہ ہوں

۲۲۲۔ بلاشبہ یہ لوگ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے کیونکہ یہ لوگ اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے اللہ کے دین کا کچھ نقصان نہ کر سکیں گے۔ نظام حق بہرحال غالب ہو کر رہے گا مقصود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ کو بڑی فکر اس کی ہے کہ منافقین کی چالوں سے کہیں اسلام کے نظام کو نقصان نہ پہنچے سو اطمینان رکھئے ان کی چالیں ذرا بھی کامیاب نہ ہوں گی۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ آپ غمگین کیوں ہوتے ہیں ان کا مقابلہ آپ سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے اور اللہ کے مقابلہ میں ان کی زور آزمائی اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی منافق لوگ جہاں مسلمانوں کی گردنیں نیچی دیکھتے ہیں کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ منافقوں کے اس کھل جانے سے جس کو یہاں قرآن نے یسارعون فی الکفر سے تعبیر کیا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلق ہوا اور آپ کا قلق اور ملال صرف اس لیے تھا کہ ان کے طرز عمل سے اللہ کے دین کو نقصان پہنچے گا اور اہل ایمان پر برا اثر پڑے گا۔ قرآن نے اس سے آپ کو مطمئن کر دیا کہ اللہ کے دین کو یہ لوگ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور جب دین کی طرف سے اللہ سبحانہ ضمانت لے رہے ہیں تو آپ کو رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور خدا کو نقصان نہ پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

جنت سے محرومی

۲۲۳۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ یعنی شیطان کی دھمکیوں سے مومن نہیں ڈرتے۔ ہاں منافق اس کی باتیں سن کر کفر کی طرف دوڑتے ہیں۔ آپ ان منافقوں کی حرکات سے کچھ غمگین اور فکر مند نہ ہوں۔ یہ اللہ کے دین اور اس کے پیغمبر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کا حد سے زیادہ نفاق پتہ دے رہا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں انجام کار حقیقی کامیابی اور فوائد سے محروم رکھے گا اور بہت سخت سزا دے گا۔ جو لوگ ایسے معاند اور شریر ہوں اللہ کی عادت ان کے ساتھ یہی ہے۔ ایسوں کے غم میں اپنے کو زیادہ گھلانے کی ضرورت نہیں ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

واقعہ یہ ہے کہ انہم لن یضروا اللہ میں غم نہ کرنے کی علت بتائی گئی تھی اور یرید اللہ میں اللہ کو نقصان نہ پہنچانے کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ آخرت میں حصہ نہ ہونے سے مراد جنت اور اس کی نعمتوں سے محروم ہونا ہے۔ ان لوگوں کی بے فکری کی یہ زندگی آخرت میں ان کی محرومیوں کا باعث ہوگی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

> جو شخص ڈرتا ہے وہ شروع رات میں چل دیتا ہے اور جو شروع رات میں چل دیتا ہے وہ عافیت کے ساتھ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ یاد رکھو اللہ کا سودا سستا نہیں بہت مہنگا اور بہت قیمتی ہے۔ یاد رکھو اللہ کا وہ سودا جنت ہے۔
>
> (ترمذی عن ابی ہریرہ)

عرب کا عام دستور تھا کہ مسافروں کے قافلے رات کے آخری حصہ میں چلتے تھے اور رہزنوں کے حملے بھی عموماً سحری کے وقت میں ہوتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ جس مسافر یا جس قافلے کو رہزنوں کے حملے کا خوف ہوتا وہ بجائے آخری رات کے شروع رات میں چل دیتا اور اس تدبیر سے وہ بحفاظت وعافیت منزل پہ پہنچ جاتا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال سے سمجھایا ہے کہ جس طرح رہزنوں کے حملے سے ڈرنے والے مسافر اپنے آرام اور اپنی نیند کو قربان کرکے چل دیتے ہیں۔ اسی طرح انجام کا فکر رکھنے والے اور دوزخ سے ڈرنے والے مسافر آخرت کو چاہیے کہ جنت تک پہنچنے کے لیے اپنی راحتوں، لذتوں اور خواہشوں کو قربان کرے اور منزل مقصود کی طرف تیز گامی سے چلے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ بندہ اللہ سے جو کچھ لینا چاہتا ہے وہ کوئی سستی اور کم قیمت چیز نہیں ہے کہ یوں ہی مفت مل جائے گی بلکہ وہ نہایت گراں قدر اور بیش قیمت چیز ہے جو جان ومال اور خواہشات نفس کی قربانی سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور منافق ایمان کے سارے دعووں کے باوجود ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس لیے آیت گرامی میں اس کی اسی ارادی حالت کو تکوینی طور پر پیش کیا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا ہے کہ ان کو آخرت میں جنت ملے۔ یہاں ارادہ اور چاہنا اس معنے میں نہیں کہ اللہ کو یہ بات پسند ہے یا اس کی مرضی کے موافق ہے بلکہ یہ تکوینی بات ہے یعنی مریض کی بدپرہیزی کا یہ تکوینی اثر ہے کہ حکیم اس سے دست کش ہوجاتے اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بیمار ابدی طور پر روحانی زندگی سے محروم ہوجاتے اور کفر کی موت مرجاتے۔ یہ بات بارہا کہی جاچکی ہے کہ ہر بری بات کا ایک اثر ہوتا ہے بعینہٖ جیسے ہر بدپرہیزی کا ایک اثر ہوتا ہے۔ بدپرہیزی کا انتہائی اثر

موت ہے اور روحانی بدپرہیزی کا اثر آخرت میں اجر و ثواب سے محرومی ہے۔ یہ اصل حقیقت بے گناہ اور اس کے انجام کی اور اسی کے لیے قرآن نے یہ بلیغ اور مؤثر تعبیر اختیار کی ہے۔ یرید اللہ ان لا یجعل لھم حظا فی الاخرۃ اسی کو اللہ سبحانہٗ اضلال کہتے ہیں۔ اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جب نافرمانی کے خوگر ہو گئے اور بدپرہیزی سے باز نہ آؤ گے تو نتیجہ یہی ہوگا اور روحانی لذتوں، راحتوں اور نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے۔

ایمان کے بدلے کفر کا سودا

۳۲۴۔ بلاشبہ جنہوں نے مایہ ایمان دے کر کفر کا سودا کیا وہ اللہ کو ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ ان کے لیے پاداش عمل میں دردناک عذاب تیار ہے۔ یعنی جنہوں نے ایمانی فطرت کو بدل کر کفر اختیار کیا خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ، مشرکین ہوں یا منافقین یا کوئی اور وہ سب مل کر بھی اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں اپنے پاؤں پر خود اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مار رہے ہیں جس کا نتیجہ ان کو دردناک صورت میں بھگتنا پڑے گا۔[1]

اگرچہ آیت قرآنی کے الفاظ عام ہیں لیکن جس سیاق میں یہاں یہ آیت آئی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا مصداق منافقین ہوں اور معلوم ہے کہ منافقین کا زیادہ تر تعلق یہود سے ہے اس سے پہلے مختلف اندازوں میں یہ مضمون قرآن میں تین بار آچکا ہے اولاً مدعیان ایمان کے بارے میں آیا ہے جنہوں نے ایمان کے دعوے کے باوجود ایمان کا کوئی تقاضا اپنی زندگی میں پورا نہیں کیا

اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا

یہ بھی دراصل یہودی تھے۔ پھر خاص ان یہود کے ذکر میں اسی آیت کا تذکرہ آیا جہاں قرآن نے ان پر یہ سنگین الزام لگایا کہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض اور پھر فرمایا کہ:

اولئک الذین اشتروا الحیٰوۃ الدنیا بالاخرۃ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا مول لی ہے

پھر یہودیوں پر کتمان حق کا الزام عائد کیا اور اس کا نتیجہ یہ قرار دیا کہ:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ

اب یہاں بھی مدینہ کی زندگی میں بھی یہودی اسلام کا لباس پہن کر مسلمانوں میں موجود ہیں۔ اور ایمان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ایمان کی راہ میں قربانی سے گریزاں ہیں۔ ان کا آخرت پر ایمان کمزور رہے اس کے نتیجہ میں وہ اصُول وصداقت کے مقابلے میں منافع اور مصالح کو ترجیح دیتے ہیں اور ان میں آجل کے مقابلہ میں عاجل سے پیار کی بیماری پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح وہ بے اصُول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت، مصلحت کیش اور منفعت کوش بن کر رہ گئے۔ قرآن نے اسی صورتِ حال کے لیے اشتراء کفر بالایمان کا استعارہ استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو بھی اس صلاحیت اور استعداد کو چھوڑ کر جس سے ایک شخص ایمان قبول کرتا ہے اس استعداد اور صلاحیت سے کام لے گا جو کفر قبول کرنے میں ممد ومعاون ہوتی ہے تو ایسے لوگ سُن لیں کہ وہ اللہ کے دین کا کوئی نقصان نہیں کر سکیں گے اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

قانونِ املاء وتمہیل

۳۲۵ ۔ اور یہ جو ہم ان لوگوں کو جنہوں نے راہ کفر اختیار کر رکھی ہے ڈھیل دے رہے ہیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ڈھیل ان کے حق میں بہتر ہے ہم ان کو اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں میں اور ترقی کر جائیں اور بالآخر ان کے لیے رسُواکن عذاب ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ کافروں کو اپنی لمبی عمریں خوشحالی اور دولت وثروت وغیرہ کی فراوانی دیکھ کر خیال ہو کہ ایسے مغضوب ومطرود ہوتے تو ہم کو اتنی فراخی اور مہلت کیوں دی جاتی اور ایسی اچھی حالت میں کیوں رکھے جاتے سو واضح رہے کہ یہ مہلت دینا ان کے حق میں کچھ بھلی بات نہیں۔ مہلت دینے کا نتیجہ تو یہی ہو گا کہ جن کو گناہ سمیٹ کر کفر پر مرنا ہے وہ اپنے اختیار اور آزادی سے خوب جی بھر کر ارمان نکال لیں اور گناہوں کا ذخیرہ فراہم کر لیں وہ سمجھتے رہیں کہ ہم بڑی عزت سے ہیں حالانکہ ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ان کے لیے تیار ہے۔ اب سوچ لیں کہ مہلت دینا ان جیسوں کے حق میں بھلا ہوا یا بُرا نعوذ باللہ [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس آیت میں قانونِ امہال کی طرف اشارہ ہے اور منافقین و یہود کی نسبت خبر دی ہے کہ جزاءِ عمل کا قانون ان کی طرف سے غافل نہیں ہے وہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچ کر رہیں گے جو کفر و نفاق کا لازمی نتیجہ ہے چنانچہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ چند برسوں کے اندر یہودِ مدینہ کی ساری طاقت نابود ہو گئی۔ قرآن اس قانون کو ڈھیل دینے، عفو و درگزر کرنے اور ایک خاص مدت تک زندگی دینے سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ ہر غلطی کو درست کرنے کے لیے، ہر نقصان کی تلافی کرنے کے لیے ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت مل جائے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔

دولت و عزت مقبولیت کی علامت نہیں

گویا اس آیت میں کافروں کے ظاہری عیش و عشرت اور عزت و غلبہ کی وجہ بیان فرمائی اور یہ بتایا کہ دنیا میں مجرم کو فوری عذاب نہ آنا اور اس کی گرفت میں جلدی نہ ہونا کچھ اس کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ ان کا یہ خیال کرنا کہ دُنیوی عیش و عشرت اور کثرتِ مال و جاہ اور عارضی فتح و کامرانی ان کی مقبولیت کی دلیل ہے بالکل غلط اور خلافِ واقع ہے۔ یہ مقبولیت نہیں بلکہ اللہ کا قانون املاء، امہال تاجیل اور تمتیع ہے۔ اور امہال و تاجیل کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دُنیا میں ایک وجود بھی فرصتِ حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان اور ہر فساد اچانک بیک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔ لوگ اس مہلتِ اصلاح سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اسے ازدیادِ اثم کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اور جتنا اسے موقعہ ملتا ہے وہ گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے۔ امہال اصل میں تو سبب تھا اصلاح کا لیکن لوگوں نے اسے سبب بنا لیا ازدیادِ اثم کا اور اس کو زندگی میں اپنا لیا۔ لوگوں کے اس اختیار کو بتانے کے لیے لیزدادوا اثما کی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے

مصائب و حوادث مغضوبیت کی دلیل نہیں ہیں

۱۷۹۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ اہل ایمان کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں تم آج کل اپنے آپ کو پاتے ہو وہ ضرور پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ یعنی جس طرح خوشحالی اور مہلت دینا کفار کے حق میں مقبولیت کی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مخلص اہل ایمان کو مصائب اور ناخوشگوار حوادث پیش آئیں جیسے جنگِ اُحد میں آئے یہ اس کی

دلیل نہیں کہ وہ اللہ کے نزدیک مغضوب ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس گول مول حالت پر چھوڑنا نہیں چاہتا جس پر اب تک رہے ہیں یعنی بہت سے کافر ازراہِ نفاق کلمہ پڑھ کر دھوکہ دینے کے لیے ان میں ملے جلے رہتے ہیں جن کے ظاہر حال پر منافق کا لفظ کہنا مشکل تھا لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ سبحانہٗ ایسے واقعات و حالات رونما کرے جو کھرے کو کھوٹے سے اور پاک کو ناپاک سے کھلے طور پر جُدا کر دیں۔[1]

اس آیت میں اللہ نے اپنا یہ قانون بتایا ہے کہ جنہوں نے اسلام کا گھونٹ تو پی لیا ہے لیکن حلق سے نیچے نہیں اترا ہے۔ کسی تعلیم کو اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو رُوح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم ہیں، اخلاص و صداقت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے موافق ہیں ان پر خوش خوش عمل کرتے جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا ہے تو وہ دعویٰ اسلام میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں لیکن قربانیوں کے موقعہ پر آخری صفوں میں بھی نظر نہ آتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں کہ ایمان قبول کر لینے کے بعد ان کی ایمانی محبت کا یہ حال ہے کہ انہوں نے راہِ حق کی صرف مصیبتیں جھیلی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور رُوح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں اُن میں بسر کر ڈالیں۔ ان میں سے جو لوگ اوّل دعوت میں ایمان لائے تھے ان پر شب و روز کی جان کاہیوں اور قربانیوں کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی کھلی ہو۔ جان کی قربانیوں کے وقت انہوں نے اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوا دیں۔ گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی۔

اب تک یہ دونوں ملے جلے تھے۔ خام پختہ، خبیث و طیب اور مخلص و منافق ہر قسم کے افراد پر مشتمل اسلامی جماعت تھی۔ یہ بات اللہ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت تمام دُنیا کی قیادت کے لیے مبعوث ہوئی ہے وہ اس طرح اچھے بُرے، فاسد و صالح کا مکسچر بنی رہے۔ چنانچہ دونوں میں امتیاز پیدا کرنا چاہا۔ اس کی صورت اللہ سبحانہٗ نے اپنی سنت کے مطابق یہ اختیار کی کہ جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان باللہ کے لیے حقیقی کسوٹی بنا کر سب کے سامنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رکھ دیا۔ کیونکہ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشاتِ نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ کار فرما ہو سکتا ہے۔ غریب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو سکتا ہے جس میں اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

ایمان باللہ کے اسی حقیقی امتحان کا موقعہ جنگِ اُحد نے فراہم کیا یہی وہ کسوٹی بن گئی جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ اُحد میں مصائب کے ہجوم نے خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیا ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ اچھوں کو بُروں سے ممتاز کرنے کے لیے وہ دونوں کو مصائب میں ڈالتا ہے تاکہ خام اور پختہ مخلص اور منافق دونوں الگ الگ ہو جائیں۔

غیب کی خبریں بتانا اللہ کی سنت نہیں

۳۲۷۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ اس بارے میں تم کو غیب کی خبریں دے دے۔ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسُولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ یعنی بے شک خدا کو آسان تھا کہ تمام مسلمانوں کو بدون امتحان میں ڈالے منافقوں کے ناموں اور کاموں سے مطلع کر دیتا۔ لیکن اس کی حکمت و مصلحت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے غیوب سے آگاہ کر دیا کرے۔ ہاں اس کام کے لیے اپنے رسُولوں کا انتخاب کر کے جس قدر غیوب یقینی کی اطلاع دینا چاہے دے دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ کسی غیب کی یقینی اطلاع نہیں دی جاتی، انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے مگر جس قدر اللہ چاہے[1]

یعنی اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو منافقوں کے نام بتا دیے جاتے اور ان کو غیبی معاملات کی اطلاع دے دیتا اس طرح ان کو معلوم ہو جاتا کہ کون مخلص ہے اور کون منافق لیکن یہ بات اللہ کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ اپنے غیوب پر ہر شخص کو مطلع کرے۔ غیب کی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

باتوں کی خبر وہ صرف اپنے رسولوں کو دیتا ہے اور وہ بھی جسے چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے۔ اسلام کے عقیدے میں غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ قرآن میں یہ بات کھول کر بیان کی گئی ہے۔

غیب کی حقیقت

قرآن حکیم میں اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان کو دلائل، ذرائع و وسائل اور قرآن کے ذریعے حاصل نہ ہو۔ فراست، کشف، الہام اور وحی کے ذریعے اہلِ ایمان، اربابِ ولایت اور انبیاء کو یہ علم حاصل ہوتا ہے لیکن ان ذرائع میں وحی کا ذریعہ سب سے زیادہ طاقتور اور یقینی ہوتا ہے اس راہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہے اور اس کے سوا جن راہوں سے علم آتا ہے وہ ظنی ہے۔ اسی بنا پر شریعت میں وحی حجت و دلیل ہے لیکن الہام و کشف حجت و دلیل نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ غیبی علم وہ ہے جو خود بخود ہو اور اس میں واسطہ اور ذریعہ نہ ہو۔ ایسا علم صرف اس ذات کا ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات خود بخود ہے اس لیے اس کا علم بھی خود بخود ہے یعنی اپنے علم میں کسی ذریعہ اور واسطہ کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بلا واسطہ واقعہ کا علم ہوتا ہے اور اتنا قطعی ہوتا ہے کہ اس سے تخلف محال ہے۔ یہاں تک کہ موجودات اپنے وجود میں اس کے علم کے تابع ہیں وہ موجودات کا تابع نہیں ہے۔ علم الٰہی کا کمال یہ ہے کہ خود موجودات اپنے لباسِ وجود میں علمِ الٰہی کے تابع رہیں۔ زمخشری نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ غیب سے مراد وہ مخفی اور پوشیدہ چیزیں ہیں جن تک بلا واسطہ اللہ کے سوا کسی کے علم کی رسائی نہیں ہے وہ فرماتے ہیں:

الخفی الذی لا ینفذ ابتداء الا علم اللطیف الخبیر

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ انبیاء کو غیب کا علم بذریعہ وحی ہوتا ہے چنانچہ شارحینِ قرآن نے یہ بات صراحۃً لکھی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

فیوحی الیہ فیخبرہ ببعض المغیبات ج ۱ ص ۵۶

اللہ سبحانہٗ انبیاء کو وحی کے ذریعے کچھ مغیبات کی خبر دیتا ہے۔

اس لیے کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ غیب دان ہے کیونکہ ایسا کہنا درحقیقت اس بات کا دعویٰ ہے کہ اس کا علم ذاتی اور خود بخود ہے اور نبی کے بارے میں ایسا کہنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ وحی کے ذریعے کا انکار کر رہے ہیں جب آپ کہتے ہیں

نبی وہ انسان ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔
اور پھر آپ کہتے ہیں کہ نبی غیب دان ہے تو درحقیقت آپ ذریعہ وحی کا انکار کرتے ہیں۔ یہ سید شریف کے لفظوں میں یہ صریح تناقض ہے کیونکہ نبی کے لیے وحی کو علمی ذریعہ مان کر نبی کو غیب دان کہنا اس ذریعہ کی نفی ہے۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں یتبادر منہ تعلق علمہ بہ ابتداء فیکون تناقضاً۔ آپ نے یہ بات بارہا سنی ہوگی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں جب سب سے پہلی وحی آئی۔ اور آپ نے غار حرا کی ساری کہانی گھر آکر خدیجہ کو سنائی تو خدیجۃ الکبریٰ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے، عبرانی کتابت جانتے تھے اس لیے انجیل لکھا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ورقہ سے کہا، ذرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا حال سنیئے۔ ورقہ نے حضور انور سے غار حرا کی ساری کہانی سُنی اور سُن کر اپنا یہ تاثر ظاہر کیا کہ ھذا ھو الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ، یہ وہی ناموس فرشتہ ہے جو اللہ نے موسیٰ پر اتارا تھا۔ یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ورقہ نے عیسائی ہونے کے باوجود حضرت موسیٰ کا کیوں ذکر کیا۔ ابوالقاسم السہیلی کے حوالہ سے شارحین بخاری نے جو وجہ بتائی ہے وہی گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ورقہ نے حضرت عیسیٰ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کی غیب دانی کے قائل ہیں۔ بذریعہ وحی ان کے علم کو نہیں مانتے۔ برخلاف یہودیوں کے کہ وہ حضرت موسیٰ کی غیب دانی کے مدعی نہیں بلکہ ان پر سلسلہ وحی کے قائل ہیں چونکہ حضور نے اپنے علم کے لیے وحی کو ذریعہ بتایا تھا اس لیے ورقہ نے حضرت موسیٰ کا ذکر کیا۔

بہرحال نبوت کے علم کے لیے وحی کو ذریعہ مان کر یہ کہنا کہ نبی غیب دان ہے نبی کے علم کے خود بخود ہونے کا دعویٰ ہے۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی سامنے آگئی جو لوگوں کی ذاتی اور عطائی کے الفاظ بول کر رہنمائی کرتے رہتے ہیں جس ذات اور ہستی کا خود اپنا وجود ہی ذاتی نہ ہو اس کے بارے میں یہ سوال کہاں سے اور کیسے پیدا ہو گیا کہ اس کا علم یا کوئی صفت ذاتی ہو سکتی ہے جب موصوف کا وجود عطائی ہے تو اس کی صفت بھی عطائی ہوگی۔ اور عطائی ہونے کی صورت یہی ہے کہ آپ پر اللہ کی وحی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ وحی ان ہی امور غیبیہ کی ہوتی تھی جن کا تعلق فریضہ رسالت سے ہے اس پر انشاء اللہ تفصیلی بحث پارہ ۳۰ میں آئے گی۔

اہل نفاق کو ایمان و تقویٰ کی دعوت

۳۲۸۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لے آؤ گے اور برائیوں سے

ہوگئے تو تم کو بہت بڑا اجر ملے گا۔ یعنی خدا کا جو خاص معاملہ پیغمبروں سے ہے اور پاک وناپاک کرنے کی نسبت جو عام عادت حق تعالیٰ کی رہی ہے اس میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ ورسول کی باتوں پر یقین رکھو اور تقویٰ و پرہیزگاری پر قائم رہو یہ کر لیا تو سب کچھ کما لیا۔[1]

اس آیت میں اہل ایمان سے خطاب ہے یا اہل نفاق سے۔ شیخ الاسلام کا رجحان پہلی بات کی طرف ہے جبکہ کچھ مفسرین نے اسے نفاق کی طرف التفات قرار دیا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہاں ایمان سے اخلاص مراد ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی صفت اخلاص سے تفسیر فرمائی ہے۔ امام رازی نے بھی منافقین کو مخاطب قرار دیا ہے۔ اگر التفات منافقین کی جانب ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص سے ایمان لاؤ اور بے چون وچرا ان کی باتوں کو مانو۔ اور اگر تم اخلاص سے ایمان لے آؤ گے اور حضور انور پر نکتہ چینی اور ان کی نافرمانی سے بچ کر رہو گے تو تم کو بجائے عذاب عظیم کے اجر عظیم ملے گا۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اگر اب بھی تم ایمان لے آئے اور برائیوں سے بچے تو تمہارے لیے اجر عظیم ہے۔

اور جو صورت شیخ الاسلام نے اختیار کی ہے کہ آمنوا کے مخاطب خود اہل ایمان ہیں یہی ابوحیان اندلسی، قرطبی، زمخشری نے اختیار کی ہے۔ اس صورت میں معنے یہ ہیں۔ ابوحیان فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کو قادر مانو اور صرف اسے عالم الغیب سمجھو اور رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ تمہارا کام تو باور کرانا ہے غیب پر مطلع ہونے کا اشتیاق تمہارا کام نہیں۔ یہ اور اسی قسم کی تشریحات شارحین نے پیش کی ہیں لیکن صاف بات وہی ہے جو ہم نے عرض کر دی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ
خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ۞ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ
اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ
نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۞ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ
وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۞

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ مال خرچ
کرنے میں بُخل سے کام لیتے ہیں یہ ہرگز نہ خیال کریں کہ یہ ان
کے حق میں اچھا ہے (نہیں) وہ تو ان کے لیے بہت بڑی بُرائی ہے،
جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں عنقریب قیامت کے
دن اس کو ان کے گلوں کا ہار بنا دیا جائے گا۔ زمین و آسمان

کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے
باخبر ہے[۳۳۰]۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے
ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں[۳۳۱]۔ ان کی یہ باتیں اور ان کا
انبیاء کو ناحق قتل کرنا ہم ضرور لکھ لیں گے اور فیصلہ کے وقت
ہم ان سے کہیں گے عذاب جہنم کا مزہ چکھو[۳۳۲] یہ تمہاری اپنے
ہاتھوں کی آگے روانہ کی ہوئی بلا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم
کرنے والا نہیں ہے[۳۳۳]۔

راہِ خدا میں مال کی قربانی

منافقوں پر جنہوں نے مصلحتِ وقت دیکھ کر دعوتِ اسلام کا ساتھ دیا تھا راہ حق میں مال و دولت کا خرچ کرنا بہت شاق گزرتا تھا وہ خود بھی بخل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کرتے تھے۔ بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بے رحمی، بدسلوکی اور رذائل اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ قرآن نے جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر ضرب کاری لگائی اور انفاق مال کو مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا۔ اسی فرض کا نام اسلام کی اصطلاحی زبان میں زکوٰۃ ہے اور صرف زکوٰۃ ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مال دار آدمی پر مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ رہا یہ

سوال کہ اس مزید ذمہ داری کے حدود کیا ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدود اہلِ حاجت کی ضروریات اور اجتماعی کاموں کے مالی تقاضوں سے متعین ہوتے ہیں۔ مالدار لوگوں پر بحیثیت مجموعی اس حد تک مزید انفاق کی ذمہ داری ہے جس حد تک اہلِ حاجت کی حاجت روائی اور وقت کے ایمانی تقاضوں کی انجام دہی کے لیے درکار ہو گی۔ آپ البقرہ میں یہ اصول پڑھ چکے ہیں کہ ہر شخص اپنی ضروریات سے فاضل سرمایہ کو راہِ خدا میں صرف کرنے کا مکلف ہے یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو؎ البقرہ ۲۱۹۔ یعنی جو کچھ اپنی ضروریات سے زیادہ ہو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے منافقین پر اللہ کی راہ میں خرچ کی ذمہ داری بہت بڑی سرگرانی تھی۔

ان آیات میں منافقین کی جو نفسیاتی حالت پیش کی گئی ہے وہ کوئی مخصوص صورتِ حال نہیں ہے بلکہ جماعت کے کمزور اور مذبذب افراد میں ہمیشہ ایسی ہی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

۳۲۹ - جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے اور وہ مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے نہیں وہ تو ان کے لیے بہت بڑی برائی ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں عنقریب روزِ قیامت اس کو ان کے گلوں کا ہار بنا دیا جائے گا۔

ابتدائے سورت کا بڑا حصہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ سے متعلق تھا۔ درمیان میں خاص مناسبات وجوہ کی بنا پر غزوۂ احد کی تفصیلات آگئیں۔ انہیں بقدرِ کفایت تمام کرکے یہاں سے پھر اہلِ کتاب کی شنائع بیان کی جاتی ہیں۔ چونکہ ان میں سے یہود کا معاملہ بہت مضرت رساں اور تکلیف دہ تھا۔ منافقین بھی اکثر ان میں ہی سے تھے۔ اور اوپر کی آیت میں آگاہ کیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ اب خبیث کو طیب سے جدا کرکے رہے گا سو یہ جدائی جس طرح جانی و بدنی جہاد کے وقت ظاہر ہوتی تھی اسی طرح مالی جہاد کے وقت بھی کھرا کھوٹا اور کچا پکا صاف طور پر الگ ہو جاتا تھا۔ اس لیے بتلا دیا کہ یہود و منافقین جیسے جہاد کے موقعہ سے بھاگتے ہیں مال خرچ کرنے سے بھی جی چراتے ہیں۔ لیکن جس طرح جہاد سے بچ کر دنیا میں چند روز کی مہلت حاصل کر لینا ان کے حق میں بہتر نہیں ایسے ہی بخل کرکے بہت مال اکٹھا کر لینا بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر دنیا میں فرض کرو کوئی مصیبت پیش نہ بھی آئی تو قیامت کے دن یقیناً یہ جمع کیا ہوا مال عذاب کی صورت میں ان کے گلے کا ہار بن جائے گا۔ اس میں مسلمانوں کو بھی آگاہ کر دیا کہ زکوٰۃ دینے اور ضروری مصارف میں خرچ کرنے سے کبھی جی نہ چرائیں ورنہ جو شخص بخل و حرص وغیرہ رذیل خصلتوں میں یہود

منافقین کی روش اختیار کرے اسے اپنے درجے کے موافق اسی طرح کی سزا کا منتظر رہنا چاہیے۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مانعین زکوٰۃ کا مال سخت زہریلے سانپ کی صورت میں منتقل ہو کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔[1]

اہل نفاق جس طرح اپنی جان کے معاملے میں چور رہتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی اس کمزوری پر بھی تنبیہ فرمائی تاکہ مسلمان اس بیماری سے بھی ہوشیار رہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ کرتے ہیں دراں حالیکہ وہ خدا ہی کا بخشا ہوا ہے اور خدا نے ان کو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے فضل سے بخشا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اپنے مستقبل کی مصلحت کے لیے وہ کوئی بڑا کام کر رہے ہیں۔ خدا کے حقوق و فرائض سے چرا چرا کر جو مال جمع کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے دن ان کی گردن کا بوجھل طوق بنے گا اور سونے کے جو طوق آج زینت و فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں یہ سانپوں اور اژدہوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے وہ قیامت کے عالم میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ:

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو اللہ نے مال دیا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے دن یہ مال ایک زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا اور اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (نسائی)

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلق خدا اور خدا کے کاموں سے کوئی محبت نہیں ہوتی۔ اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتے ہیں یقیناً ایسے لوگ خدا کی محبت سے محروم ہوتے ہیں

قرآن میں بخیل کا واقعی چہرہ

قرآن نے ایک موقعہ پر بخیل کا بڑا ہی عجیب و غریب چہرہ پیش کیا ہے، ارشاد ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

واما من بخل واستغنی وکذب بالحسنیٰ

جو بخیل بنا اور بے پروا ہوا اور اچھی باتوں کی تکذیب کی

یعنی جو لوگ داد و دہش کی جگہ بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ مال و دولت، روپے پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ یہ دوسروں سے آدمی کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور بظاہر دولت میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے۔ ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کے پورا ہونے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا اپنی ضرورتوں کے لیے کس کس کے پاس جانا پڑے گا کس کس سے کہنا ہوگا لیکن اسی کے مقابلے میں جس کا سرمایہ کسی بنک میں جمع ہے اس کو کوئی غم نہیں ہے۔ ہر ضرورت کے بارے میں مطمئن رہتا ہے کہ دولت موجود ہے جس کھانے کی خواہش ہوگی اسے کھا سکتا ہے جس لباس کو جی چاہے گا پہن سکتا ہے جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جا سکتا ہے۔ دولت کے بارے میں استغنا کا یہی نظریہ ارباب بخل پر مسلط ہوتا ہے۔ دولت کے متعلق یہی احساس بخیلوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ نہ صرف انسانوں بلکہ بتدریج قلب میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کو خدا سے بھی بے تعلق بنا دیتی ہے اور خدا کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو اور سرمایہ دار خواہ واقع میں کتنا بے سہارا ہو لیکن دولت کا اس کو ایسا نشہ ہوتا ہے جو اس کے اندر بے سہارا ہونے کا احساس ہی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہ اس کے اندر کی ایک کیفیت ہے۔ اس کیفیت کا چور اسے بس جو چیز بجا نڈا پھوڑتی ہے وہ ہے وکذب بالحسنیٰ جھٹلاتا ہے وہ اچھی بات کو۔ یہی چیز اس کے باطن کا راز افشا کرتی ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنیٰ ہر اچھی بات کو بخیل جھٹلاتا ہے اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے صلہ رحمی، غربا پروری، حسن سلوک غرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب رکھتا ہے کہ کوئی میرا کیا کرے گا اس کے نتیجہ میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دوچار ہونا پڑے۔

پوری کائنات کا مالک اللہ ہے

۳۳۰۔ زمین و آسمان کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے

باخبر ہے یعنی آخر تم مرجاؤ گے اور سب مال اسی کا ہو رہے گا جس کا حقیقت میں پہلے سے تھا۔ انسان اپنے اختیار سے دے تو ثواب پائے، بخل وسخاوت جو کچھ بھی کرو گے اور جیسی نیت سے کرو گے خدا تعالیٰ سب کی خبر رکھتا ہے اسی کے موافق دے گا [1]

مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے وہ اصل اللہ کی ملک ہے اور اس پر مخلوق کا قبضہ و تصرف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہرحال بے دخل ہونا ہے اور آخر کار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانا ہے۔ لہٰذا عقلمند وہ ہے جو اس عارضی قبضہ کے دوران اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے اور سخت بیوقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے [2]

کچھ لوگوں نے اس آیت گرامی کا مصداق زکوٰۃ نہ دینے والوں کو بتایا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ہر قسم کے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں بخل کرنے والے مراد ہیں خواہ وہ اپنا نفس ہو یا اپنے اہل وعیال ہوں یا حاجت مند اعزیز و اقارب ہوں یا جہاد غرض جن حقوق کا پورا کرنا ضروری ہے ان سب میں کوتاہی اور بخل کرنے والے شامل ہیں۔ اسی طرح علم کے بخیل اور کتمان حق کرنے والے مال کے بخلاء سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔ آیت کے آخر میں بخلاء کی حماقت کو ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ اتنی بات نہیں سمجھتے کہ سب کی موت کے بعد اس کائنات کا وارث اللہ ہی ہے۔ یہ سب کچھ اسی کی ملک ہے اور آخر میں وہی رہے گا وہی سب کا مالک ہوگا۔ پھر بھی تو جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اسی کا ہوگا اور اگر اپنی زندگی میں راہ خدا میں خرچ کر دو اور حقوق واجبہ ادا کر دو تو اللہ کے یہاں اجر کے مستحق ہو گے۔ گویا یہ سب کچھ خدا نے تمہیں بطور امانت دیا ہوا ہے۔ اور اس کا مقصد تمہارا امتحان ہے وہ اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ ہم نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کس طرح کا تصرف کیا ہے اور اپنے اس علم کے مطابق وہ جزا یا سزا دے گا۔

جناب الٰہی میں بے ادبی اور گستاخی

۱۸۱۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ یہود انتہائی بخل کی وجہ سے پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتے بلکہ جب خدا کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

راہ میں خرچ کرنے کا حکم سنتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخانہ کلمات بکنے بھی نہیں شرماتے چنانچہ جب آیت من ذاالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً نازل ہوئی کہنے لگے کہ اللہ ہم سے قرض مانگتا ہے تو اللہ فقیر و محتاج اور ہم غنی و مالدار ہیں۔ حالانکہ ایک غبی اور کوڑ مغز بھی سمجھ سکتا ہے کہ انفاق فی وجوہ الخیر کو قرض سے تعبیر فرمانے میں انتہائی رحمت وشفقت کا اظہار تھا۔ ظاہر ہے کہ خدا اپنا دیا ہوا مال ہم سے ہماری مصالح میں ہمارے ہی دنیوی واخروی فائدے کے لیے خرچ کراتا ہے۔ اس کو ہمارے خرچ سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا اور بفرض محال پہنچے بھی تو مال اور ہر چیز اسی کی مملوک ہے۔ پھر حقیقی معنے میں اس کو قرض کیسے کہہ سکتے ہیں یہ اس کا کمال کرم و احسان ہے کہ اس خرچ کا بہترین معاوضہ دینا بھی اپنے ذمہ کر لیا اور اس کو لفظ قرض سے ادا کر کے اس لزوم کو بے حد مؤکد و مسجل کر دیا۔ مگر یہود اپنی کورچشمی اور خبث باطن سے احسان ماننے کے بجائے ان لفظوں کی ہنسی اڑانے لگے اور اللہ تعالیٰ کی جناب رفیع میں تمسخر اپنی کرنے سے باز نہ رہے اس کو فرمایا کہ اللہ نے تمہاری باتیں سن لیں۔ اس پر جو کارروائی ہوگی اس کے منتظر رہو۔[1]

دراصل یہاں سلسلہ بیان کا وہ حصہ جو جنگ اُحد سے شروع ہوا تھا ختم ہوتا ہے اور وہی بیان پھر چھڑتا ہے جو اس ذکر سے پہلے تھا یعنی اہل کتاب سے مخاطبت اور دعوت حق کی فتح مندی کا اعلان' چونکہ اُحد کے بیان میں منافقوں کا ذکر درمیان میں آگیا تھا اور منافقوں کا گروہ بالعموم یہودیوں سے تعلق رکھتا تھا اس لیے سلسلۂ بیان خود بخود یہودیوں کی طرف مڑ گیا ہے۔

ہر دعوت کے ابتدائی دور کی طرح اسلام کا ابتدائی زمانہ بھی تنگی اور سختی کا زمانہ تھا، اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے مال کی ضرورت برابر پیش آتی رہتی تھی۔ منافقوں پر یہ بات شاق گزرتی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وہ کہتے کہ یہ جو بار بار خدا کے نام پر مال طلب کیا جا رہا ہے تو کیا خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے اسی زمانہ کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر ایک روز یہود کے بیت المدراس میں تشریف لے گئے وہاں بہت سے یہودی اپنے بہت بڑے عالم فنحاص کے گرد جمع تھے۔ فنحاص کے ساتھ ان کا ایک اور بہت بڑا عالم بھی موجود تھا جس کا

[1] افادات شیخ الاسلام

نام اشیع تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اے فنحاص تو اللہ سے ڈر اور اسلام قبول کرلے۔ تو خوب جانتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تمہارے پاس اللہ کی جانب سے حق لے کر آئے ہیں اور آپ کی صفات تم تورات اور انجیل میں پاتے ہو۔ اس پر فنحاص نے کہا کہ ہم کو اللہ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہمارا محتاج ہے ہم اس سے غنی ہیں۔ اگر وہ غنی ہوتا تو ہمارے آگے عاجزی کیوں کرتا اور ہم سے قرض کیوں مانگتا۔ اور تمہارے نبی تو ہم کو سود کھانے سے منع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اگر غنی ہوتا تو وہ سود کیوں دیتا اور سود پر قرض کیوں لیتا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فنحاص کے منہ پر ایک طمانچہ کس دیا اور فرمایا کہ اگر تمہارے اور ہمارے مابین معاہدہ نہ ہوتا تو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تجھ کو قتل کر دیتا۔ تم ہماری تکذیب کر سکتے ہو تو کرو لیکن اللہ سبحانہٗ کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ اس واقعہ کے بعد فنحاص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ گرامی میں حاضر ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کی شکایت کی۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو طلب کیا اور واقعہ دریافت کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تمام واقعہ عرض کر دیا اور یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کے طمانچہ مارا۔ فنحاص نے اپنے الفاظ سے انکار کیا۔ قرآن میں ان ہی پیش پا افتادہ حالات کی عکاسی کی گئی ہے اور لقد سمع اللہ کے ارشاد میں ان کے لیے دھمکی ہے۔ تعبیر کا یہ انداز جیسے یہاں تہدید اور وعید ہے ایسے ہی سمع اللہ لمن حمدہ میں بشارت اور وعدہ ہے۔

اصل میں یہ بات منافقین نے کہی تھی مگر چونکہ وہ بالعموم یہودی تھے جو اسلام کا لبادہ پہن کر مصلحت کی خاطر اپنے مسلمان ہونے کی نمائش کر رہے تھے اس لیے ان کے اس کہنے کو اصل ہی کی طرف منسوب کر دیا اور پھر یہود اور منافقین کا ذکر یہاں ایک جا کرنا اور دونوں کے لیے ضمیر بھی ایک ہی لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سنگین بات کہہ کر منافقین بھی یہود کی اسی برادری میں شامل ہو گئے ہیں، جس سے نکل کر انہوں نے اسلام میں داخل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔

بے ادبی اور گستاخی کی سزا

۳۳۲۔ ان کی یہ باتیں اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا ہم ضرور لکھ لیں گے اور فیصلہ کے وقت ہم ان سے کہیں گے کہ عذاب جہنم کا مزہ چکھو۔ یعنی عام ضابطہ کے مطابق یہ ملعون اور ناپاک اقوال تمہارے دفترِ سیئات میں درج کرائے دیتے ہیں۔ جہاں تمہاری قوم کے دوسرے ملعون اور

ناپاک افعال درج ہیں مثلاً معصوم نبیوں کا ناحق خون بہانا۔ کیونکہ جیسے یہ نالائق جملہ ایک نمونہ ہے تمہاری خدا شناسی کا ایسے ہی وہ نالائق کام نمونہ ہے تمہاری تعظیم انبیا کا جب یہ پوری مسل پیش ہوگی اس وقت کہا جائے گا کر لو اپنی شرارتوں کے مزے چکھ لو۔ اور جس طرح تم نے طعن و تمسخر سے اولیاء اللہ کے دل جلائے تھے اب عذاب الٰہی کی بھٹی میں جلتے رہو [1]

فن بلاغت کے اداشناس اندازہ کر سکتے ہیں منکتب ما قالوا کے دو لفظوں کے اندر جو قہر و غضب چھپا ہوا ہے اس کی تعبیر ہم عاجزوں کے قلم سے صفحوں میں بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اس سے زیادہ بلیغ بات یہ ہے کہ اسی پر عطف کر دیا ہے وقتلہم الانبیاء بغیر حق کا۔ اس سے اس جرم کی سنگینی اور زیادہ کر دی۔ گویا جناب الٰہی میں گستاخی اور بے ادبی قتل انبیاء جیسا سنگین فوجداری جرم ہے۔ یہ قتل انبیاء کا جرم بلاشبہ یہود کا ہے۔ اس کو یہاں صرف اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ منافق زیادہ تر وہی لوگ تھے جو یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوتے تھے۔

اگرچہ انبیاء کو ان کے بڑوں نے قتل کیا تھا لیکن یہ لوگ اپنے بڑوں کی مذمت نہ کرتے تھے بلکہ ان کے اس فعل پر راضی تھے اس لیے ان کی طرف بھی قتل انبیاء کی نسبت کر دی۔ اس کے بعد صراحۃً وعید کا ذکر کیا ہے کہ ہم جس وقت ان کو سزا دیں گے تو یوں فرمائیں گے خواہ یہ وقت قبر میں ہو یا میدان حشر میں ہو یا جہنم میں ڈالتے وقت۔

اصل ارشاد میں ذوقوا عذاب الحریق آیا ہے۔ ذوق کے معنے اصل میں تھوڑی سی چیز چیز کو منہ میں رکھ کر چکھنے کے ہیں۔ لیکن اب استعمال میں وسعت ہو گئی ہے اور ہر قسم کے محسوسات کے ادراک پر بولا جاتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال اکثر کھانے پینے کے کام میں آتا ہے اور یہ لوگ بخیل تھے۔ اس کی مناسبت سے ذوقوا کہا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ یہود نے ان اقوال سے انبیاء کے متبعین کو تکلیف دی ہے اور مسلمانوں کے قلوب کو جلایا ہے اس لیے اس کے عوض اسی جیسا عذاب ان کے لیے مقرر کر دیا۔

جرم کی سزا عدل و انصاف کا تقاضا ہے

۲۲۳۔ یہ تمہاری اپنے ہاتھوں کی آگے روانہ کی گئی بلا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر

[1] افادات شیخ الاسلام

ظلم کرنے والا نہیں ہے یعنی جو کیا تھا سامنے آیا۔ خدا کے یہاں ذرہ برابر ظلم نہیں ہے۔ ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ۔ اگر بفرض محال ظلم کرنا خدا کی صفت ہوتی تو اس کی دوسری صفات کی طرح وہ بھی کامل ہی ہوتی اس لیے اگر معاذ اللہ خدا کو ظالم فرض کیا جاتے تو پھر ظالم کیا ظلام ہی کہنا پڑے گا۔ اس کا ایک رتی ظلم بھی پہاڑوں سے کم نہیں ہو سکتا۔ گویا ظلام کا صیغہ لا کر متنبہ کر دیا کہ اس کی بارگاہ میں ادنی سے ادنی ظلم تجویز کرنا انتہائی ظالم قرار دینے کے مترادف ہے تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔[1]

گویا دو باتیں سمجھا دی گئی ہیں

ایک یہ کہ جنت و دوزخ انسان کے اپنے کردار کا نتیجہ ہے۔ جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے۔ مثلاً کھانے کا شکم سیری پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، اگرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس غرض ہر اچھے برے فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک لازمی نتیجہ آخرت میں ملنے والا ہے، جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی ہم نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرمادیا ہے۔ ہم کو اس کے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا پھر انبیاء روانہ کیے۔ اس پر اگر انسان باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کرے تو انسان کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ عادل ہے۔ مجرمین کو سزا دینا اس کی عدالت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا یہ سزا تمہارے ہی اعمال کی صورت ہے۔ اصل ارشاد میں ظلم کی نفی کے لیے ظلام آیا ہے۔ لیس بظلام للعبید میں مبالغہ کی نفی مراد نہیں بلکہ نفی میں مبالغہ مراد ہے جیسا کہ بخاری کی روایت میں بار بار آیا ہے حدثنی البراء و ھو غیر کذوب۔ کذوب مبالغہ کا صیغہ ہے اور غیر کذوب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔۔۔ وہ نہیں کہ زیادہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ مطلق نفی میں مبالغہ مستفاد ہو رہا ہے یعنی بالکل جھوٹ نہیں بولتا۔ اسی طرح کلام سے نفی میں مبالغہ مقصود ہے یعنی ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ ظلام اسم نسبت ہے جیسے صباغ، تمار، عطار اور حداد تو معنی یہ ہیں کہ اللہ کو ظلم سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا
بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِي
بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنتُمْ
صَادِقِينَ ۝ فَإِن كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ
جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝

جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو حکم دے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول کی بات اس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا لیتی ہو[۳۳۴]۔ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے بہت رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے اور وہ بات بھی لے کر آئے جو تم کہہ رہے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا[۳۳۵]۔ اے پیغمبر یہ لوگ اس کے باوجود بھی تمہاری

تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے بہت سے ایسے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو واضح دلائل، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آتے تھے[۳۳۶]۔

سوختنی قربانی کا مطالبہ

مدینہ کے علمائے یہود جب دعوتِ اسلام کے خلاف تمام دلیلوں میں ہار گئے تو آخر ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ بات نکالی کہ ہمیں تورات میں سوختنی قربانی کا حکم دیا گیا ہے اس لیے ہم اس نبی کو سچا مانیں گے جو سوختنی قربانی کے عمل کے ساتھ آیا ہو۔ سوختنی قربانی سے مقصود یہ ہے کہ یہودی جانوروں کی قربانی کر کے ان کا گوشت آگ میں جلا دیا کرتے تھے[۱]۔ بائیبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی۔ (قضاۃ ۶: ۲۰، ۲۱، ۱۳: ۱۹، ۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائیبل میں آتا ہے کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آ کر اسے کھا لیتی (احبار ۹: ۲۴، ۲- تواریخ ۷: ۱، ۲)، لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی کوئی ضرور علامت ہے یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کیا تھا لیکن اس سے بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیائے بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے آتشیں قربانی کا معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ رہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاس کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بعل کے پجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم

---

[۱] ترجمان القرآن

کرو اور ایک کی میں قربانی کرتا ہوں۔ جس کی قربانی کو غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے چنانچہ ایک خلق کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاس کی قربانی کھائی لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بعل پرست ملکہ حضرت الیاس کی دشمن ہوگئی اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر ان کے قتل کے درپے ہوگیا اور ان کو مجبوراً ملک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی (سلاطین باب ۱۸، ۱۹)[1]

۴۳۴۔ جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کی بات اس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی نہ لائے جسے آگ کھا لیتی ہو کچھ پیغمبروں سے یہ معجزہ ظاہر ہوا تھا کہ قربانی یا کوئی چیز اللہ نام یا نیاز کی تو آسمان سے آگ اسے آکر کھا گئی یہ علامت تھی اس کے قبول ہونے کی چنانچہ موجودہ بائبل میں بھی سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایسا واقعہ مذکور ہے۔ اب یہود کو بہانہ ہاتھ آگیا کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ جس سے یہ معجزہ نہ دیکھیں اس پر یقین نہ لاویں اور یہ محض جھوٹا بہانہ تھا۔ اس قسم کا کوئی حکم ان کی کتابوں میں موجود نہ تھا نہ آج موجود ہے اور نہ ہر ایک نبی کی نسبت یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کو یہ معجزہ ملا تھا۔ ہر پیغمبر کو حق تعالیٰ نے اوقات و احوال کے مطابق معجزات دیئے ہیں ضروری نہیں کہ ہر نبی ایک ہی معجزہ دکھلائے تو سچا ثابت ہو۔[2]

اس آیت میں یہود کی جس شرارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چپ کرنے کے لیے یہ کہتے تھے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعوائے رسالت کی اس وقت تک تصدیق ہی نہ کریں جب تک اس سے یہ معجزہ نہ صادر ہو کہ وہ ایسی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے قبولیت کے طور پر آسمان سے آگ اترے۔ یہ بات یہود شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات میں کچھ انبیاء بنی اسرائیل سے اس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے لیکن یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ یہ معجزہ لوازم و شرائط نبوت ہے۔ جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھاتے اس کا دعوائے نبوت ہی قابل غور نہیں ہے۔[3]

مطلب یہ ہے کہ ان کی دو باتیں تھیں ایک تو یہ ان اللہ عہد الینا اور دوسری وہ جو اس کو لازم ہے یعنی یہ کہ اگر آپ یہ بات کر دکھائیں تو ہم آپ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔ پہلی بات تو ان کی بلا دلیل تھی صرف ان کی اپنی تراشیدہ تھی اسی لیے انہوں نے اس کو

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام [3] تدبر قرآن

بلادلیل پیش نہیں کیا اور یہ بات بھی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص معجزے کے ساتھ ایک ایسے نبی کی نبوت پر ایمان لانے کو موقوف کر دے جس کی نبوت کتب سماویہ سے ثابت ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات کا ظہور ہوتا ہے اور ان معجزات کو ان کے دعویٰ نبوت کی تقویت میں دخل بھی ہوتا ہے لیکن کسی خاص معجزے کے ساتھ ان کو مقید کر دینا یہ تو بالکل ہی مہمل بات ہے بلکہ اگر کسی قوم نے اپنے نبی سے کوئی خاص معجزہ طلب ہی کیا ہے تو اس میں احتیاط برتی گئی ہے اور ہمیشہ منہ مانگا معجزہ دکھانے سے انکار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر منہ مانگا معجزہ دیکھنے کے بعد کوئی قوم ایمان نہ لائے گی تو اس کو عذاب سے بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ لہٰذا جب عام طور پر قوموں کے منہ مانگے معجزات دکھانے سے انکار ہی کیا گیا ہے اور ایمان نہ لانے کی حالت میں ان معجزات کو عذاب اور استیصال کا سبب قرار دیا گیا ہے تو کسی نبی کی نبوت کو کسی مخصوص معجزے کے ساتھ وابستہ کر دینا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

قرآن کا یہودیوں کو جواب

۲۲۵ ۔ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے بہت رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے اور وہ بات بھی لے کر آئے جو تم کہہ رہے ہو اگر تم سچے ہو تو پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا۔ یعنی اگر واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو اور اسی خاص معجزے کے دکھلانے پر تمہارا ایمان لانا موقوف ہے تو پہلے ایسے نبیوں کو تم نے کیوں قتل کیا ہے جو اپنی صداقت کی کھلی نشانیوں کے ساتھ خاص یہ معجزہ بھی لے کر آئے تھے۔ تمہارے اسلاف کا یہ فعل جس پر آج تک تم بھی راضی ہو کیا اس کی دلیل نہیں ہے کہ یہ سب تمہاری حیلہ سازی اور ہٹ دھرمی ہے کہ کوئی پیغمبر جب تک خاص یہی معجزہ نہ دکھلائے گا، ہم نہ مانیں گے۔[1]

چونکہ یہود نے حضور کی نبوت پر ایمان نہ لانے کا یہ عذر محض شرارت سے تراشا تھا اس لیے قرآن نے ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر جواب دے دیا کہ ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے ایسے رسول آ چکے ہیں جو نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی انہوں نے دکھایا جس کا تم نے ذکر کیا تو تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟ تمہارا یہ فعل بتا رہا ہے کہ تم اپنی اس بات میں بھی جھوٹے ہو۔ اگر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمہیں یہ معجزہ بھی دکھا دیا جاتے پھر بھی تم اپنی ضد ہی پر اڑے رہو گے۔ اور ایمان نہ لانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کر لو گے [1]

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھا اگر کسی نبی کی نبوت کا یہی معیار ہے جو تم کہتے ہو تو تم نے ان انبیاء کو کیوں قتل کیا جو علاوہ اور معجزات کے یہ معجزہ بھی لے کر آتے تھے۔ گویا ان کی نبوت فریقین کے نزدیک مسلم تھی۔ ہمارے نزدیک تو اس لیے کہ وہ صاحب معجزات تھے اور صاحب معجزات ہونا ان کی نبوت کے لیے کافی ہے اور تمہارے نزدیک اس لیے کہ وہ آگ کا معجزہ لے کر آتے تھے اس کے باوجود تم نے ان کو قتل کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ تمہارے نزدیک نہ تو کسی مدعی نبوت کی نبوت کا یہ معیار ہے اور نہ خدا کا یہ حکم ہے۔ اور اگر میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر بھی ہو جائے پھر بھی تم مجھے نبی تسلیم نہ کرو گے کیونکہ اس خاص معجزے کے ظاہر کرنے والوں کو تم قتل کر چکے ہو پھر تم سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟

ایک شبہ کا جواب

شاید آپ کے ذہن میں یہاں خلش ہو کہ ان کا مطالبہ پورا کر کے دیکھ لیا جاتا اس میں کیا حرج تھا۔ جواب یہ ہے کہ ان کا یہ مطالبہ بر بنائے عناد تھا صدق دل سے نہ تھا۔ نیز اس کے بعد اگر یہ لوگ ایمان نہ لاتے تو بلاشبہ یہ عذاب استیصال کے مستحق ہو جاتے اور اس امت پر عذاب استیصال مقصود نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ نبوت دور علمی ہے، اس میں عقلی مباحث اور علمی دلائل کو اہمیت حاصل ہے۔ قانونی ترقیاں چاہتی ہیں کہ قانون سے بحث کی جائے اور علمی طور پر اپنی صداقت کا دنیا سے اعتراف کرایا جائے۔ اسی بنا پر دلیل نبوت کے طور پر آپ کو معجزہ علمی دیا گیا ہے یعنی قرآن شریف، یہ معجزہ قیامت تک رہنے والا ہے اس لیے جس رسول کی رسالت پر شواہد عقلیہ اور نقلیہ موجود ہوں اور جس کا کمال اور بنی نوع انسان کے لیے ہدایت ہونا ظاہر ہو اس پیغمبر کو ہر منہ مانگے معجزے کی تعمیل ضروری نہیں ہے۔

تکذیب سے آزردہ خاطر نہ ہوں

۳۳۶ ۔ اے پیغمبر یہ لوگ اگر اس کے باوجود بھی تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے

---

[1] تدبر قرآن

بہت سے ایسے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو واضح دلائل، صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ان ملعونوں کی کج بحثی اور ہٹ دھرمی سے ملول اور دل گیر نہ ہوں اور نہ دوسرے مکذبین کی پرواکریں۔ آپ سے پہلے کتنے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو صاف نشانیاں، معجزے چھوٹے صحیفے اور بڑی روشن کتابیں لے کر آئے تھے۔ انبیاء صادقین کی تکذیب معاندین کی قدیم عادت رہی ہے آپ کو کچھ انوکھی بات پیش نہیں آئی ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں۔ اگر یہ تکذیب کرتے ہیں تو یہ تکذیب آپ کی کسی کوتاہی کی بنا پر نہیں ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ تم ان کے حسبِ منشا ان کو معجزہ نہیں دکھائے ہو بلکہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر ایمان لانا نہیں چاہتے۔ یہ معاملہ خاص تم ہی کو نہیں پیش آیا ہے تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے۔ حالانکہ وہ معجزے، صحیفے اور روشن کتاب سب کچھ لے کر آتے تھے۔ یہاں تین لفظ استعمال ہوئے بینات، زبر اور کتاب منیر۔

بینات کے معنے واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے دو معنے میں آیا ہے واضح اور مسکت دلائل کے معنے میں یا حسی معجزات کے معنے میں۔

زُبر، زبور کی جمع ہے۔ اس کے معنے ٹکڑے، قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیر داؤد کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔ یہاں اس سے مراد انبیاء کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔ کتاب منیر سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جو اس لفظ کا اصلی مصداق ہو سکتی ہے۔[2]

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ معاندین ایک قسم کے عادی مجرم اور تکذیب پیشہ لوگ ہیں۔ ان کا دستور ہمیشہ یہی رہا ہے اور اپنے اپنے زمانے میں ہر پیغمبر کے ساتھ ان کا یہی سلوک رہا ہے خواہ وہ پیغمبر بڑے بڑے معجزات لے کر آیا خواہ چھوٹے چھوٹے صحائف لے کر آیا یا کوئی بڑی کتاب جیسے تورات، انجیل اور زبور لے کر آیا۔ بڑی کتاب کو نشان اور مضامین کے اعتبار سے منیر اور روشن فرمایا ہے جب ان کی عادت ہی یہ ہے اور ہر پیغمبر صاحب کتاب اور صاحب معجزات کے ساتھ ان کا سلوک یہ رہا ہے تو مرگ انبوہ جشن دارد آپ کیوں ملول خاطر ہوں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۖ
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝ لَتُبْلَوُنَّ فِىٓ أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَ
لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ
أَشْرَكُوٓا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِكَ
مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝

ہر جان کو موت سے دوچار ہونا ہے اور روزِ قیامت تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا[٣٢٧]۔ لہٰذا جو شخص دوزخ سے دُور رکھا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا، فی الواقع وہی کامیاب ہے اور دیکھو دُنیا کی زندگی سامانِ فریب کے سوا کچھ نہیں ہے[٣٢٨]۔ حتماً اور یقیناً تمہیں جان و مال کی آزمائشوں سے ہو کر گزرنا ہے اور اہلِ کتاب اور مشرکین سے تمہیں

تکلیف دہ باتیں ضرور سننی ہیں، اور اگر تم صبر کا دامن تھامے رکھو گے اور تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ گے تو یہ بڑے ہی عزم اور ہمت کی بات ہو گی۔[۳۳۹]

اُمت کی ذمہ داری اور اس کے لیے قربانی

جیسے شروع پارے میں آیت ۹۸، ۹۹ اور ۱۰۰ میں یہود کا کردار ذکر کرنے کے بعد اُمتِ مسلمہ کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا تھا اور آیت ۱۰۱ سے لے کر آیت ۱۱۰ تک واضح کیا تھا کہ تمہارا کام پچھلی اُمتوں کی طرح صرف یہ نہیں ہے کہ اس دین کی مخلصانہ پیروی کرتے رہو۔ اس عام ذمہ داری کے ساتھ یہ خاص ذمہ داری بھی تمہاری ہے کہ جو پیغام اللہ کے نبی نے تم تک پہنچایا ہے تم اسے پوری انسانیت تک پہنچاؤ۔ اُمت کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا حقیقی مقصد ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا یہ فرمانا کہ کنتم خیر اُمۃ اس اُمت کی حیثیت کو صاف طور پر مقرر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ اُمت صرف اسی طرح کی اُمت نہیں ہے جس طرح کی اُمتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں بلکہ ایسی اُمت ہے جو ساری نوعِ انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے۔ یہاں پھر یہودیوں کا کردار پیش کرنے کے بعد اُمتِ مسلمہ کو مخاطب کیا ہے کہ قیامِ حق کی عظیم خدمت کی ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں اس راہ کی تمام آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑے۔ یہ کام دعووں، نعروں، جلسوں، نسبتوں اور نجات کے انفرادی تصور سے نہ ہو گا، اس کے لیے جان و مال کی قربانی کرنی ہو گی، سخت کلامیوں، دل آزاریوں اور ایذا رسانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب دونوں تمہاری مخالفت میں کمربستہ ہو گئے ہیں وہ طرح طرح کی تمہیں اذیتیں پہنچائیں گے اور تمہیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ تمہاری کامیابی کے لیے اصل چیز صبر و تقویٰ ہے۔ اگر تم نے صبر کیا اور تقویٰ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ دیا تو یقین کرو کہ بالآخر کامیابی تمہاری ہے۔

۱۸۷ - ہر جان کو موت سے دوچار ہونا ہے اور روزِ قیامت تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا یعنی موت کا مزہ سب کو چکھنا ہے اس کے بعد قیامت کے روز ہر جھوٹے سچے اور مصدق و مکذب کو اپنے اپنے کیے کا پورا بدلہ مل کر رہے گا۔ پورے کا یہ مطلب ہے کہ کچھ تھوڑا سا ممکن ہے قیامت سے پہلے ہی مل جائے مثلاً دنیا میں یا قبر میں[1]

کچھ کی رائے میں یہ آیت تتمہ ہے پہلے مضمون کا جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی تھی اور مطلب یہ ہے کہ رہی یہ بات کہ ایسے عادی مجرموں کو اور تحمل و برداشت کرنے والے اہل ایمان کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتے تو یہ بات نہیں ہے بلکہ تم سب کو مرنا اور موت کا مزہ چکھنا ہے اور روزِ قیامت ہر ایک کو اپنے کیے کا اجر حاصل کرنا اور پھل بھگتنا ہے[2]

اور کچھ کا خیال ہے کہ پہلے اس حقیقت کو واضح کیا گیا تھا کہ اگر کبھی کسی جگہ کافروں کو غلبہ ہو جائے اور مسلمان مصائب میں مبتلا ہو جائیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں اور نہ غمگین ہونے کی کیونکہ دُنیا کی رنج و راحت چند روزہ ہے۔ کوئی جاندار موت سے نہیں بچ سکتا۔ اور دُنیا کی راحت و تکلیف اکثر دُنیا ہی میں حالات بدل کر ختم ہو جاتی ہے اور بالفرض اگر دنیا میں نہ بدلی تو موت ہر سب کا خاتمہ ہو جانا یقینی ہے۔ عقل مند کا کام اس چند روزہ راحت و رنج کے صرر میں پڑا رہنا نہیں بلکہ مابعد الموت کی فکر کرنا ہے اسی لیے اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا[3]

اور کچھ کہتے ہیں کہ اس میں تہدید اور تسلین دونوں پہلو ہیں منافقین و معاندین کے لیے یہ تہدید ہے اور اہل ایمان کے لیے پیام تسکین ہے[4]

لیکن ہماری رائے میں علامہ سید رضا کی رائے زیادہ پسندیدہ ہے کہ اُمت دعوت کو اس کی عظیم ذمہ داری کے پیش نظر آئندہ آیت میں جو بات کہی جا رہی ہے کہ تمہیں اس ذمہ داری کی بجاآوری میں جانی اور مالی قربانیوں کی راہ سے گزرنا پڑے گا۔ یہ آیت گرامی اسی کی تمہید ہے کیونکہ طبیعت کی کمزوری یہ ہے کہ ہر شخص موت کے اندیشہ سے قربانیوں سے گزرتا ہے۔ قرآن نے پہلے ہی اس کا تریاق یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ کل نفس ذائقۃ الموت ہر شخص کو موت سے دوچار ہونا ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آسکتا ہے اس لیے قربانی کے کسی کام اور جان و مال

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] کشف الرحمٰن [3] معارف م ش [4] تدبر قرآن

ے کسی ابتلاء سے گھبرانا نہ چاہیے بلکہ اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہیے۔ صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر شخص کو موت سے دوچار ہونا ہے بلکہ پیچھے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے اور یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا ہے۔

موت زندگی کا طبعی تتمہ ہے

اور یہ قرآن کا بہت ہی بلیغ انداز ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ تم سب کو ایک روز موت کی آغوش میں جانا ہے۔ یہ فرمایا کہ ہر جان کو موت سے دوچار ہونا ہے۔ اس انداز بیان کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کر دی کہ خواہ کوئی اور کیسا ہو سب کو مرنا ہے۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ موت ایک طبعی تتمہ و تکملہ ہے حیات کا، اسے نیکوکاری اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ انسان کے لیے بطور سزا مقرر ہوئی ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ دونوں کی تردید ہو گئی ہے جن کے عقیدے میں موت نام ہے گناہ کی سزا یا نتیجے کا۔ انجیل کے صحیفوں میں ہے جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب موت دنیا میں آئی اور موت سب میں پھیل گئی۔ (رومیوں ۵: ۱۲) گناہ کی مزدوری موت ہے (رومیوں ۶: ۲۳) خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے (یعقوب ۱: ۱۵) یہود کا عقیدہ کہ موت نتیجہ ہوتی ہے شخصی گناہ کا، ان کی معتبر و مستند کتاب جیوز انسائیکلو پیڈیا ج ۴ ص ۴۸۳ میں درج ہے۔ بہرحال دنیا میں ہر شخص کے لیے مرنا ہے یہاں کسی کے لیے دائمی زندگی نہیں۔ اصلی سوال مرنے کا نہیں سوال تو یہ ہے انما توفون اجورکم یوم القیامۃ کہ گو یہاں جزئی نیکیوں کی جزا وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت تعریف، ہر دل عزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا جب ملے گی اس وقت کیا بنے گا؟ آج کوئی شخص یہاں قانون مکافات کی گرفت سے بچ بھی گیا تو اس کی یہ محفوظیت عارضی ہے کہ یہ دنیوی زندگی سلسلۂ حیات کا ایک بہت ہی ناقص اور ناتمام حصہ ہے۔

زندگی کے اصلی اور آخری نتائج

۲۳۸۔ لہٰذا جو شخص دوزخ سے دور رکھا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا فی الواقع وہی کامیاب ہے اور دنیا کی زندگی سامان فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یعنی دنیا کی عارضی بہار

اور ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت دھوکہ میں ڈالنے والی چیز ہے جس پر مفتون ہو کر اکثر بے وقوف آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصلی کامیابی یہ ہے کہ یہاں رہ کر انجام کو سوچے اور وہ کام کرے جو عذاب الٰہی سے بچانے والا اور جنت تک پہنچانے والا ہو[1] مطلب یہ ہے کہ اس دُنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں ان ہی کو اگر کوئی اصلی اور آخری نتائج سمجھ بیٹھے اور ان ہی پر حق و باطل اور فلاح و خسران کے فیصلے کا مدار رکھے تو درحقیقت وہ سخت دھوکہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت بھی حاصل ہے اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنے نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردود بارگاہ الٰہی ہے اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلہ کے نتائج آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیات ابدی کے مرحلے میں پیش آنے والے ہیں اور اصل اعتبار انہی نتائج کا ہے[2]

دُنیا سرمایہ فریب ہے۔

وما الحیاۃ الدنیا الامتاع الغرور میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے مقصد کو سمجھنے میں غلطی نہ کرنا چاہیے۔ مراد وہی پائے گا اور کامیابی سے فی الواقع وہی ہمدوش ہو گا جو جہنم کی لپیٹوں سے بچ کر جنت میں پہنچ جائے گا۔ اس زندگی کا اصل مقصد تو یہ ہے لیکن کچھ لوگ دُنیا ہی کو مقصود سمجھ لیتے ہیں اور اسی حیوانی زندگی کو انسانی زندگی کی غرض و غایت بنا لیتے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ اس کی حیثیت مقصد کی نہیں ہے جو اسے مقصد بنا کر زندگی گزار رہا ہے وہ دھوکہ کھا رہا ہے اور دھوکہ دینے والا دھوکہ دے رہا ہے وما یعدھم الشیطان الا غرورًا جن اعمال و افعال کا کوئی نتیجہ نہیں، وہ باور کراتا ہے کہ یہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ سکھاتا ہے کہ سب کچھ اسی میں ملتا ہے۔

لوگ یہاں بھی دوراہے پر کھڑے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسلام کو دُنیا کا ایک معاشی نظام قرار دینا چاہتے ہیں وہ اس قسم کی آیتوں کے ذکر سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن پر معاش گریز نظریات کا غلبہ ہے وہ ان ہی آیتوں سے پہلے خیال والوں کی تردید کرتے ہیں حالانکہ نہ وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

غلط ہے اور بر غلط ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد کے ذریعے قرآن کے نقطۂ نظر کو سمجھایا ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ؛

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہم لوگ آپ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا بلاشبہ میں اپنے بعد جس چیز کا اندیشہ محسوس کر رہا ہوں یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تم پر دنیا کی رونق اور بہار کھول دے گا۔ ایک شخص بول پڑا اے اللہ کے رسول کیا خیر اور بھلائی ہی برائی کو جنم دے گی ؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، لوگوں نے چہ میگوئیاں کرنی شروع کر دیں کہ حضور انور تو ایک بات فرما رہے تھے تیرے سے تو کوئی بات نہیں کر رہے تھے کہ خواہ مخواہ سوال کر دیا۔ اسی حال میں دیکھا گیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی۔ فرمایا کہ سوال کرنے والا کہاں ہے۔ پھر بتایا کہ اچھی چیز اور خیر سے اچھے ہی نتائج نکلتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ دیکھو یہ سرمایہ اور دولت سرسبز شیریں چیز ہے لیکن برساتی نالوں کے کنارے جو ہریالی اور سبزی اگتی ہے وہی مہلک ہوتی ہے مگر ایسے مویشی جو صرف ہری ہری دوب کو چرتے ہیں پھر جب ان کے دونوں پہلو برابر ہو جاتے ہیں تو دھوپ میں جا بیٹھتے ہیں، گوبر اور پیشاب کرتے ہیں۔ پھر جا کر چرنے لگتے ہیں۔ یہی حال دنیا اور اس کی دولت کا ہے۔ بڑا میٹھا ہے جب لینے والا اس کو حق کے ساتھ لے اور راہِ حق میں اسے خرچ کرے تو یہ بہترین امداد ہے اور ایسا سرمایہ دار بہت اچھا ہے۔ (بخاری)

دھوکے کا سامان اور دھوکے کا سرمایہ دنیوی زندگی کو اس لیے فرمایا ہے کہ اس کی ظاہری رونق کو دیکھ کر آدمی اس میں پھنس جاتا ہے اور چند دن کے بعد کھوٹے مال کی حقیقت اور اس کی قلعی کھل جاتی ہے اور چونکہ عارضی چیز ہے اس لیے اس میں انہماک کی اور اس کو مقصود بالذات بنانے کی ممانعت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس زندگی کو مطلوب اور مقصود بالذات نہ سمجھو اور اس سے محبت نہ کرو بلکہ اس کو حصولِ آخرت کا ذریعہ بناؤ۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا ایسا سامان ہے جو چھوڑ دیا جائے گا اور لوگوں کو مضمحل کر کے رہے گا۔ تم اس سامان سے جس قدر ہو سکے اللہ تعالیٰ کی طاعت حاصل کرو۔ حضرت علی نے فرمایا ہے کہ یہ ہاتھ لگانے میں بڑی نرم ہے مگر اس کا زہر قاتل اور جان لیوا ہے۔ بعض حضرات فرماتے

ہیں کہ تشبیہ آخرت کے مقابلہ میں ہے اور اس شخص کی تشبیہ ہے جو آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کو ترجیح دے ورنہ اگر کوئی دُنیا کو آخرت کے حصول کا ذریعہ بنائے تو اس کے لیے نعم المال الصالح للرجل الصالح آیا ہے گویا منشا یہ ہے کہ مقصود بالذات خیال کرو تو بُری چیز ہے اور اگر نیکیاں کماؤ اور مال دے کر جنت خرید لو تو اچھی چیز ہے ۔

مصائب کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ

۳۳۹ ۔ حتماً اور یقیناً تمہیں جان و مال کی آزمائشوں سے ہو کر گزرنا ہے اور اہل کتاب و مشرکین سے تمہیں تکلیف دہ باتیں ضرور سننی ہیں۔ اور اگر تم صبر کا دامن تھامے رکھو گے اور تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ گے تو بڑے ہی عزم اور ہمت کی بات ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے کہ آئندہ بھی جان و مال میں تمہاری آزمائش ہو گی اور ہر قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ قتل کیا جانا، زخمی ہونا، قید و بند کی تکلیف ہونا، بیمار پڑنا، اموال کا تلف ہونا، اقارب کا چھوٹنا اس طرح کی سختیاں پیش آئیں گی۔ نیز اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے بہت جگر خراش اور دل آزار باتیں سننا پڑیں گی ان سب کا علاج صبر و تقویٰ ہے ۔ اگر صبر و استقلال اور پرہیزگاری سے ان سختیوں کا مقابلہ کرو گے تو یہ بڑی ہمت اور اولوالعزمی کا کام ہو گا جس کی تاکید حق تعالیٰ نے فرمائی ہے [1]

اس آیت میں اہل ایمان کو سمجھایا ہے کہ دین حق کو قائم کرنے کی جو ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے اور یہ کام جو تمہارے سپرد کیا گیا ہے تو اس کی خاطر تمہیں قربانیاں کرنی ہوں گی۔ اس کے لیے تمہیں وطن سے بے وطن ہونا اپنے کاروبار کو نقصان پہنچانا اپنی عمر بھر کا اندوختہ لٹانا، اپنی جمی ہوئی تجارتوں پر پانی پھیرنا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کرنا۔ اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہنا، دُنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کر لینا پانی کی طرح اپنا خون بہانا اور اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کرنا ہو گا ۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اس فرض کی انجام دہی کا بجائے خود مصائب کی بدلیاں بن جانا یقینی ہے اور یہ بدلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر برستی ہیں یعنی ایسا ہو کر رہتا ہے کہ اس میدان میں قدم رکھتے ہی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خیر خواہی کا جواب جاہلی حمیت سے ملے، میٹھے بول کا جواب گالیوں سے اور دلیلوں کا جواب پتھر دل سے دیا جاتے۔ لیکن اس عظیم ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ ان مطالبوں اور حکموں کو ٹھکرا دیا جائے اور ساری مخالفتوں کے باوجود اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی جائے، بلاکسی خوف ملامت کے دی جاتے اور حالات کا دباؤ خواہ کیسا ہی سخت ہو کسی مصالحت کا خیال تک ذہن میں نہ لایا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ دعوتی سرگرمیوں پر جہاد کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوتا ہی اس وقت ہے جب وہ مخالفتوں کے طوفان میں انجام دی جائیں۔

منشا یہ ہے کہ ابھی کیا ہے اور غزوہ اُحد میں تم نے کیا دیکھا ہے ابھی نہ معلوم اور کیا کیا امتحان تم پر آئیں گے۔ اگر دُنیا میں اسلام کا پیغام پہنچانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی غرض سے زندہ رہنا ہے تو قدم قدم پر بد معاشوں، اوباشوں اور شرارت پسندوں کی رکاوٹ کو دُور کرنا پڑے گا اور روزمرہ جارحانہ کارروائیوں کی مدافعت کرنی ہوگی اور جب تک اقتدار پر اسلام کا قبضہ نہ ہوگا یہ سلسلہ جاری رہے گا، لہٰذا تمہیں صبر و استقلال کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے اور تقوی کا پابند رہنا چاہیے۔ اگر ایسا کرو گے تو انجام کے اعتبار سے تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہ کام معزز اُمور سے ہیں یا یہ کام ان کاموں میں سے ہیں جن کے کرنے کی اللہ نے تاکید فرمائی ہے۔ عزم کے معنے ہیں کسی رائے پر اس طرح قائم رہنا کہ اس کو کر گزرنا عزیمت اور رخصت اُردو میں بھی بولتے ہیں۔ اور قانون کی زبان میں تو یہ اصطلاحات عام طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ ایسا کام جسے کرنے کی ہر شخص کو رغبت کرنی چاہیے اور ہمت سے کر گزرنا چاہیے اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے تاکیدی احکام ہیں۔ جن کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ شرط کی جزا یا تو محذوف ہے یعنی اگر صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا اس صورت میں فان ذالك من عزم الامور دلیل اور علت ہے۔

بارگاہِ نبوت کا گستاخ کعب بن اشرف

کچھ شارحین قرآن کا خیال ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اکثر ہجو کے اشعار کہتا تھا۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور کچھ روایات سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے چنانچہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بدر سے پہلے نازل

ہوئی۔ قتال کا حکم اس کے بعد ہوا۔ تاہم صبر و تقویٰ کے حکم کی مشروعیت قتال کے باوجود فی الجملہ باقی ہے جس پر آخر تک عمل ہوتا۔ ہاں صبر و عفو اور تغلیظ و تشدید کے مواقع کا پہچاننا ضروری ہے جو نصوص شرعیہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس آیت کو یہاں رکھنے سے شاید غرض یہ ہے کہ تم ان کفار و منافقین کی گستاخیوں اور شرارتوں پر حد سے زیادہ طیش مت کھاؤ۔ ابھی بہت کچھ سننا پڑے گا اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ صبر و استقلال سے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو۔

لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو اس پر اصرار ہے کہ کعب بن اشرف کی زبان درازیوں اور گستاخیوں ہی کی طرف اس میں اشارہ ہے۔

کعب بن اشرف کون ہے؟ مورخین لکھتے ہیں کہ کعب بن اشرف ابتدائی اسلامی دور میں مدینہ کا ایک بہت بڑا فتنہ تھا۔ جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے سے تھا جس نے بنو نضیر کے رئیس ابو رافع سلام بن الحقیق کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اسی نضر یہودی عورت کا بیٹا کعب تھا جس نے بنو نضیر کی آبادی سے جنوبی جانب ایک ٹیلے پر قلعہ بنالیا تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ باپ کی وجہ سے عربوں میں اور ماں کی وجہ سے یہودیوں میں اسے بڑا رسوخ حاصل تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ مشہور شاعر تھا اور اس زمانے میں شاعروں کو لوگ عموماً قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ زندگی کے ظاہری اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بد اخلاق، خود پسند، متکبر اور اور اسلام دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے کہہ دیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کے آنے کی خبر یہودی صحیفوں میں ہے۔ کعب نے ان کے وظیفے بند کر دیے جب ان علماء نے اپنی غلطی کا اقرار کیا تو وظیفے جاری کر دیے۔ اگرچہ وہ بھی مدینہ منورہ کے ابتدائی عہد نامہ صلح و امن میں شریک تھا مگر شروع ہی سے اس نے قریش مکہ اور دوسرے اسلام دشمن عناصر سے خاص روابط پیدا کر لیے تھے۔ قریش کے جو سردار جنگ میں مارے گئے تھے، ان کے مرثیے لکھ کر چالیس آدمیوں کے ساتھ مکہ گیا۔ مرثیہ پڑھ کر خود بھی رویا اور قریش کو بھی رلایا۔ ساتھ ہی قریش سے عہد لیا کہ جنگ بدر کا بدلہ لیں گے۔ واپس آکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہے۔ شعر کہہ کہہ کر حضور انور کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا۔ اپنے قصیدوں کی تشبیب میں مسلم خواتین کا ذکر نہایت نازیبا طریق پر کرتا۔ دولت مند اور با اقتدار شخص کی حسن اخلاق مرجائے اور خوف خدا اس کے دل میں نہ رہے تو وہ سب کے لیے آفت کا پرکالا بن جاتا ہے۔

اس فتنہ عظیمہ کی سرکوبی ناگزیر ہو گئی تو محمد بن مسلمہ نے اس کے ختم کرنے کی ذمہ داری لی۔ ابونائلہ سلکان بن سلامہ، عباد بن بشیر، حارث بن اوس اور ابوعبس بن جبر ساتھ ہو گئے۔ ابونائلہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلے دن کے وقت وہی ملے اور کہا کہ حضور انور ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ دست ہیں مہربانی فرما کر ہمیں خوراک کے لیے دسق دو دسق غلہ دیجئے۔ کعب یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور بولا ابھی کیا ہوا ہے وہ دن دور نہیں جب تم بیزار ہو کر اسے چھوڑ دو گے۔

ابونائلہ۔ خیر اب تو ان کی اتباع اختیار کر چکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوتا ہے تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے یا نہیں۔

کعب۔ دے دوں گا البتہ کچھ رہن رکھو۔

ابونائلہ۔ کیا چیز؟

کعب۔ اپنی عورتیں رکھ دو۔

ابونائلہ۔ تمہارے حسن وجمال کی وجہ سے ہمیں اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

کعب۔ پھر بچے رکھ دو۔

ابونائلہ۔ اس سے ہم عرب میں بدنام ہو جائیں گے البتہ ہم ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں حالانکہ ہمیں ان کی آج کل بہت ضرورت ہے۔

کعب اس پر راضی ہو گیا اور ابونائلہ نے واپس جا کر ساتھیوں کو سب کچھ بتا دیا۔ چاندنی رات میں یہ سب نکل کر کعب کے قلعہ کے نیچے پہنچے۔ اسے آواز دی۔ اندر سے آیا۔ قلعہ سے نکل کر تمام رفیق کعب کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ کعب نے عطر لگا رکھا تھا۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تمہارے سر سے لپٹیں اٹھ رہی ہیں اجازت ہو تو ذرا سونگھ لوں، کعب نے کہا کہ ضرور۔ بس اس کا سر پکڑتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ اب اسے ختم کر دو۔ چنانچہ وہ چند لمحات میں ختم کر دیا گیا، سر کاٹ لیا گیا۔ اسی وقت سارے ساتھی مدینہ پہنچے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مہم کے کامیاب انجام کی کیفیت پیش کر دی۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا
قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿١٨٧﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ
بِمَا أَتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ
بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٨٨﴾

اور یاد رکھو اس وقت کو جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی یہ عہد[۲۴۰] لیا تھا کہ تمہیں اس کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا[۲۴۱] ہوگا، اور ان کو پوشیدہ رکھنا[۲۴۲] نہ ہوگا۔ لیکن انہوں نے کتابِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی قیمت پر فروخت کر ڈالا، کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں[۲۴۳]۔ تم ان لوگوں کو عذاب سے ہرگز محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کردار پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ان کاموں پر سراہا جائے جو انہوں نے

کبھی نہیں کیے، فی الواقع ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اُمت کی تعلیم و تربیت اصلاح و ارشاد

اللہ نے اہلِ کتاب کو کتاب عطا فرمائی تھی اور ان سے عہد لیا تھا کہ اس کے احکام کی تعلیم و تلقین کرنا اپنا فرض سمجھیں، لیکن وہ طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوگئے اور عہدِ الٰہی فراموش کر دیا۔ اس کے باوجود ان کو اہلِ کتاب ہونے کا گھمنڈ ہے وہ چاہتے ہیں کہ دُنیا اس بات پر ان کی تعریف کرے جو نہ انہوں نے کی ہے اور نہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اہلِ کتاب کے تذکرہ میں مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ صرف اللہ کی کتاب کو ماننے سے وہ ہرگز مقصود ہاتھ میں نہ آئے گا جس کے لیے تم پیدا کیے گئے ہو۔ یعنی اقامتِ دین کی عظیم خدمت، جب تک کتاب کے ماننے والوں میں کتاب کے جاننے والوں کی عددی طاقت نہ ہوگی۔ کوئی آئین، کوئی دستور، کوئی نظامِ حیات صرف ماننے کی قوت سے برسرِ اقتدار نہیں آسکتا جب تک اس کے ماننے والوں میں اس کے جاننے والے نہ ہوں اگر کسی آئین و دستور کی پشت پر کوئی علمی طاقت نہیں ہے تو اس کا مطلب کھلے لفظوں میں یہ ہے کہ اس پر ایمان اس کے ماننے والوں میں شعور و ادراک کی منزل تک نہیں پہنچا ہے اور اس کی وجہ سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس ان میں بیدار نہیں ہوا ہے۔

اہلِ کتاب کی دینی زندگی کی تباہی کا باعث صرف یہ تھا کہ ان کے عوام کا علم میں کتاب الٰہی سے رابطہ ٹوٹ کر صرف چند مخصوص افراد میں سمٹ گیا تھا اس کے نتیجہ میں علمِ دین کے لیے ایک مستقل طبقہ نے جنم لے لیا تھا اور قوم کی پوری دینی زندگی پیشہ وروں کا روبار ہو کر رہ گئی تھی۔ قرآن سمجھاتا ہے کہ اللہ نے تم کو اسلامی قیادت اور بالواسطہ دُنیا کی رہنمائی کی زمام دی ہے تمہیں اپنی اس ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے اور ان اہلِ کتاب کی کاپی کر کے تاریخ کو نہ دہرانا چاہیے۔

ضرورت ہے کہ تمہارے ہر فرد کا انفرادی طور پر اللہ کی کتاب سے براہِ راست تعلق ہو، عقیدہ، اعمال و اخلاق، تربیت و تہذیب، نفس کی آراستگی، سیرت کی بلندی و کمال، غرض ہر شعبہ میں قرآن اور رسول کا کردار بولتا ہو۔ تمہارے میلانات و رجحانات، ذہنیت و طرزِ فکر، قرآن و سنت کے عکاس ہوں۔ گویا پہلے یہ بتایا تھا کہ اس عظیم کام کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیش آئیں گی اور دوسرے

کے لیے بڑی قربانیاں دینی ہوں گی اور اب بتایا جارہا ہے کہ اس عظیم کام کے لیے علم و عمل کے ذریعے ہر فرد کو اللہ کی کتاب سے تعلقات منضبط کرنے ہوں گے۔

بنی اسرائیل سے عہد کی تاریخ

۴۰ ۳ - اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی یہ عہد لیا تھا۔ یعنی انہیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کو سپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمت عظیمہ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔ یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ذکر جگہ جگہ بائیبل میں آتا ہے۔ بخصوصاً کتاب استثنا میں حضرت موسیٰ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں۔ انہیں اپنے دل میں نقش کرنا، اپنی آیندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے راہ چلتے لیٹتے اور اٹھتے ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر ان کو لکھ دینا (۶: ۴-۹) پھر انہوں نے اپنی آخری وصیت میں تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے تورات کے احکام ان پر کندہ کر دینا (۲۷: ۲-۴) نیز بنی لاوی کو تورات کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عید خیام کے موقعہ پر قوم کے مردوں، عورتوں، بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا، لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰ کے سات سو برس بعد ہیکل سلیمانی کے سجادہ نشین اور یروشلم کے یہودی فرمانروا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں تورات نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲ سلاطین ۲۲، ۸، ۱۳)[1]

اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ اس حکم کی شہادت موجودہ محرف تورات و انجیل دے رہی ہیں۔ تم اس کلام میں جو میں تمہیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو (استثنا ۴، ۲) اس نے .... بنی اسرائیل میں ایک شریعت کی بنا رکھی جس کی بابت اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلا دیں تاکہ آنے والی پشت میں وہ فرزند پیدا ہوں جو دین سیکھیں

[1] تفہیم القرآن

اور وہ انہیں اپنی اولاد کو سکھلا دیں (زبور ۷۸ : ۵-۶) جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو اس کی کوٹھوں پر منادی کرو (متی ۱۰ : ۲۷)

اگرچہ تورات، زبور، انجیل سب ہی میں اس عہد کے اشارات موجود ہیں لیکن ہم حتماً پورے وثوق و اعتماد سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کی مراد بھی مواثیق و عہود ہیں۔ قرآن نے بلاقید اس میثاق کا ذکر کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس اور ابن جبیر کے خیال میں الذین اوتوا الکتاب سے یہود کے علماء و احبار مراد ہیں۔ اور حضرت علقمہ کی رائے میں علماء یہود اور احبار نصاریٰ مراد ہیں۔

اُمت کی علمی تربیت

۱۴۳۔ تمہیں اس کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہے۔ اصل ارشاد میں لتبیننہ لفظ آیا ہے۔ تبیین کے معنے خوب کھول کر بیان کرنے کے ہیں اس وزن پر جو الفاظ عربی میں آتے ہیں ان میں دو باتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک بہتات اور دوسرے تدریج۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام بہت کرنا ہے اور دیر تک آہستہ آہستہ کرنا ہے خود تعلیم و تربیت کا مزاج بھی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہو دیر تک ہو اور بتدریج ہو علمی کمالات جس قدر ہیں ان میں یہ تینوں باتیں بمنزلہ شرط کے ہیں۔ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس کتاب کے تعلیم و تعلم کا ایک مسلسل منظم، دیرپا نظام قائم کیا جائے اور اس طرح عام افرادِ اُمت کا علمی رشتہ کتابِ الٰہی سے جوڑ دیا جائے تاکہ کتاب الٰہی کا علم زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے۔ یہاں بیان اور للناس کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بات علماء سے متعلق ہو رہی ہے اور ان کو ان کے فرائض بتلائے جا رہے ہیں۔ کتابِ الٰہی کو کھول کر بیان کرنا علماء کے فرائض میں ہے اور بات کے لیے اندازِ تعبیر بھی قسمیہ اختیار کیا ہے۔ یعنی بخدا انہیں ضرور بالضرور یہ کام کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے علماء کے فرائض میں کتابِ الٰہی کا سکھانا ہے۔ ایسے ہی عام لوگوں کے فرائض میں کتابِ الٰہی کا سیکھنا داخل ہے۔ اسی سلسلے کا ایک ارشادِ نبوت سن لیجیے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ دین کی تعلیم و تربیت کا نبوت کی نظر میں کیا مقام ہے۔ عبدالرحمان بن ابزیٰ بیان کرتے ہیں :

> ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں مسلمانوں کے بعض گروہوں اور قبیلوں کی تعریف کی، اس کے بعد فرمایا بعض دوسرے گروہوں اور قبیلوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی

سمجھ اور اس کا شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ان کو تعلیم دیتے ہیں نہ نصیحت کرتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بھی ادا نہیں کرتے۔ اس کے بعد آپ نے رُوئے سخن بدلتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے علمِ دین اور اس کا فہم و شعور حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ وہ ان سے نصیحت لینے کے لیے جاتے ہیں خدا کی قسم دین کا علم اور دین کی سمجھ رکھنے والے ہر گروہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی تعلیم کا اہتمام کرے اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کو وعظ و نصیحت کیا کرے اور بری باتوں سے ان کو روکا کرے اور اچھی باتوں کے لیے ان سے کہا کرے اور اسی طرح ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم رکھنے والے پڑوسیوں سے علم حاصل کیا کریں اور نصیحت لیا کریں اور دین کو سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔ بہرحال جاننے والوں کے لیے نہ جاننے والوں کو بتانا اور نہ جاننے والوں کے لیے جاننے والوں سے سیکھنا ان کے دینی فرائض میں سے ہے اور ہر گروہ کو چاہیے کہ وہ اپنا یہ فرض ادا کیا کرے اور اگر کسی گروہ نے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کی تو میں ان کو سخت جلدی سزا دلواؤں گا۔

اس حدیث سے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ دین کی تعلیم اور ناواقفوں کی تعلیم و تربیت اور فلاح و ارشاد کے بارے میں اس اُمت کی ذمہ داری کیا ہے؟ اور اگر وہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو اللہ اور رسول کے نزدیک وہ کتنے بڑے جرم کی مرتکب ہے؟ مفتی محمد عبدہ نے یہ بات بڑی دردانگیز فرمائی ہے۔

اس میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت ہے ہماری کتاب قرآن حکیم ہے۔ دُنیا میں کوئی کتاب اتنی زبانی یاد نہیں کی گئی جتنی یہ کتاب، اتنی کوئی کتاب دُنیا میں نشر نہیں ہوئی جتنی قرآن حکیم۔ قرنِ اوّل سے اب تک مسلمان ہر جگہ اس کے حافظ ہیں اور اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ تلاوت کا عالم یہ ہے کہ سڑکوں، بازاروں، شادی اور غمی کی رسموں میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اس کے بیان کرنے کا فریضہ اور لوگوں تک خدا کے پیغام کو پہنچانے کا کام چھوڑ دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان اس کی رہنمائی سے محروم ہو چکے ہیں۔

کتمانِ علمِ حق سنگین جرم ہے

۲۴۲ - اور ان کو پوشیدہ رکھنا نہ ہوگا - بیان کے بعد کتمان کی ممانعت خود بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے - یہاں دو باتیں ہیں اور دونوں روح کے اعتبار سے جُدا جُدا ہیں ایک یہ کہ کتاب اللہ سے واقفیت ہو مگر غیر قانونی یعنی تاویل و تحریف کی اوٹ میں اور یہ نتیجہ ہے کتاب اللہ کے بیان نہ کرنے کا اور دوسری یہ کہ کتاب اللہ سے بالکل عام لوگوں میں بے خبری ہو اور یہ نتیجہ ہے کتاب اللہ کے کتمان کا -

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ظاہر کا تقاضا تو یہ تھا کہ اندازِ بیان یہ ہونا چاہیے کہ اوّلاً کتمان سے ممانعت ہو اور پھر بیان کی تلقین ہو - کیونکہ بیان کہتے ہیں کسی چیز کے اظہار کو - ترتیب یوں ہونی چاہیے کہ چھپاؤ مت ظاہر کر دو اور کہا یوں گیا کہ ظاہر کرو اور چھپاؤ مت - اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے اہم کو مقدم کیا اور غیر اہم کو بعد میں ذکر کیا ہے - کتمان جہل بسیط کی تلقین ہے یعنی دین سے بے خبری کی اور بیان جہل مرکب کا شاہکار ہے یعنی کسی ایسی چیز کو دین سمجھ لینا جو دین نہیں - جہل بسیط جہل مرکب کے مقابلہ میں کمتر ہے کیونکہ ایسے شخص کے راہ پر آجانے کا امکان ہے اگر کتاب تک اس کی رسائی ہو جائے برخلاف جہل مرکب کے اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے کتاب ہونے کے باوجود جہل مرکب والا گمراہ ہی رہتا ہے -

قرآن کی نظر میں علم کا کتمان بھی سنگین جرم ہے - حافظ ابن کثیر نے اس آیتِ قرآنی سے خود اُمتِ محمدیہ کے علماء کے لیے یہ بات سمجھی ہے کہ :

> اس میں علماء کو تنبیہہ ہے کہ خبردار ان کی راہ نہ چلنا، اگر ایسا کرو گے تو ان ہی نتائج سے تمہیں بھی دوچار ہونا پڑے گا جن سے وہ ہوئے - علماء کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہے کہ وہ علم نافع لوگوں تک پہنچائیں - حدیث میں کتمانِ علم پر سخت وعید آئی ہے - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، علم کے بارے میں جس سے دریافت کیا گیا اور اس نے اس کو چھپا لیا تو روزِ قیامت اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا - اللھم اعذنا آمین آمین آمین -

مطلب یہ ہے کہ یہ آیتِ گرامی صرف یہودیوں کی داستانِ تاریخ سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اُمتِ مسلمہ کو اس سنگین جرم سے بچانے کے لیے آئی ہے - علامہ آلوسی لکھتے ہیں حکمِ آیت

عام ہے، اعتبار عموم لفظ کا ہے کسی خاص سبب کا نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں یہ آیت ان تمام لوگوں کے خلاف احتجاج ہے جو کتمان علم کے مجرم ہوں۔ چونکہ عموم کی وجہ سے اس آیت کی گرفت سخت ہے اس لیے کچھ لوگوں نے آیت کی گرفت سے بچنے کے لیے مختلف راہیں تلاش کی ہیں مثلاً یہ کہ یہ اس عالم کے بارے ہے ہیں جس سے اللہ کا حکم دریافت کیا جائے اور وہ اسے چھپائے اور یا یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص وہاں مسئلہ بتانے والا نہ ہو لیکن اہل علم نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں صرف کتمان علم کا ذکر نہیں ہے بلکہ تبیان علم کو بھی اس آیت میں امت کا ایک مقدس اجتماعی فرض قرار دیا ہے اور اس فرض کی پابجائی نہ کرنے پر دوسرے موقع پر وعید بھی آئی ہے، بلکہ بتانے والوں نے یہاں تک بتا دیا کہ بیان اور تبیین کی دونوں صورتیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی دعوت غیر مسلموں کو دی جائے دوسرے یہ کہ قرآنی تعلیمات سے خود مسلمانوں کو آشنا کیا جائے یعنی تبلیغ و ارشاد دونوں اس آیت کی رو سے ضروری ہیں اور یہ آیت گرامی اس موضوع پر قرآن کی دوسری آیت سے زیادہ بلیغ ہے مثلاً و لتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر اور اس میں میثاق اور قسم کی وجہ سے زیادہ زور ہے۔

ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ

اوّلاً اس فرض کی ادائیگی یعنی بیان کی حد تک سب کا عمل مطلوب نہیں ہے۔ کچھ کے کرنے سے سب ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں لیکن کچھ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پورے ضلع میں صرف انفرادی ذمہ داری اس کی پابجائی کے لیے کافی ہے نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں میں ایک جماعت یہ کام کرنے والی ہو۔

ثانیاً یہ کتمان کی حد تک اگر کسی دقیق مسئلہ کو کسی دینی مصلحت سے کسی بدفہم کے روبرو ذکر نہ کیا جائے تاکہ اس کے لیے فتنہ کا ذریعہ نہ ہو تو یہ کتمان نہیں ہے اور اس کتمان پر قرآن کی وہ وعید نہیں ہے جو آپ دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں۔

کتاب الٰہی کا کاروبار

۳۴۳۔ لیکن انہوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی قیمت پر فروخت کر ڈالا، کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یعنی علماء اہل کتاب سے عہد لیا گیا تھا

کہ جو احکام بشارات کتاب اللہ میں ہیں ان کو صاف صاف لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور کوئی بات نہیں چھپائیں گے نہ ہیر پھیر کر کے ان کے معنے بدلیں گے۔ مگر انہوں نے ذرہ برابر پروا نہیں کی اور دنیا کے تھوڑے نفع کی خاطر سب عہد و پیمان توڑ کر احکام شریعت بدل ڈالے۔ آیات اللہ میں لفظی اور معنوی تحریفات کیں۔ جس چیز کا ظاہر کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ یعنی پیغمبر آخر الزمان کی بشارت اسی کو سب سے زیادہ چھپایا۔ جس قدر مال خرچ کرنے میں بخل کرتے اس سے زیادہ علم خرچ کرنے میں کنجوسی دکھائی اور اس کنجوسی کا منشا بھی مال و جاہ اور دنیا کی منفعت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں ضمناً مسلمان اہل علم کو متنبہ کر دیا کہ تم دنیا کی محبت میں پھنس کر ایسا نہ کرنا لہ

قرآن نے اس آیت میں علمائے یہود پر دو سنگین الزام عائد کیے ہیں ایک یہ کہ انہوں نے کتاب اللہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ان کا معاملہ کتاب اللہ کا نہیں ہے۔ پیٹھ پیچھے پھینک دینا استعارہ ہے پروا نہ کرنے اور توجہ نہ کرنے سے۔ یعنی ان کی توجہات کا مرکز کتاب اللہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے اس کے عوض حقیر قیمت حاصل کی ہے۔ حقیر اس لیے کہ یہ دین فروشی محض اغراض دنیوی کی خاطر کرتے تھے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فائدہ بھی اگر دین کو فروخت کر کے حاصل کیا جائے تو بہرحال وہ ثمن قلیل ہی ہے۔

اصل ارشاد میں فنبذوہ وراء ظھورھم واشتروا بہ ثمنا قلیلا کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں ضمیر منصوب اور مجرور کا مرجع مقرر کرنے میں شارحین قرآن نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کا مرجع میثاق ہے اور کچھ کی رائے میں ضمیر کا مرجع کتاب اللہ ہے۔ ہماری رائے میں جو کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع کتاب ہے ان کی بات قرین صواب ہے۔ قرآن کی دوسری آیات اس کی تائید کرتی ہیں۔

پہلے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ

و لما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون

اور جب ان کے پاس اللہ کی جانب سے ایک ایسا رسول آیا جو اس کتاب کی

لہ افادات شیخ الاسلام

تصدیق کرتا تھا جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب کے ایک فریق نے کتاب اللہ کو
اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔

دیکھ لیجئے اس آیت میں نبذ کا مفعول کتاب اللہ لفظوں میں موجود ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

دوسرے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنا قلیلا

بلاشبہ جو لوگ اللہ کی نازل کردہ چیز یعنی کتاب کو چھپاتے ہیں اور حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعہ حقیر معاوضے کو۔

یہاں بھی بہ کا مرجع کتاب ہے۔ الغرض اس آیت میں ضمیر منصوب اور ضمیر کا مرجع کتاب اللہ ہے میثاق نہیں ہے۔

کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینا

آیت میں کتاب اللہ سے مراد تورات ہے اور پس پشت ڈالنے سے مراد اس سے بے التفاتی اور بے توجہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تورات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی علامتیں اور پیشین گوئیاں اور ان پر ایمان لانے کی تاکید جو درج ہے سب کو نظر انداز کر دیا، سب سے بے توجہ ہو گئے۔ گویا پس پشت ڈالنا یہ ہے کہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ مان کر اس پر عمل چھوڑ دیا جاتے، اپنی زندگی میں اس کے مطالبات کو شرف پذیرائی نہ دیا جاتے اور اس کی زد سے بچنے کے لیے اس میں تاویل کی جاتے بلکہ اس میں تحریف سے بھی گریز نہ کیا جاتے۔ یہ گویا کتمان کتاب اللہ کی تشریح ہوئی ہے۔ یہاں کتاب اللہ کو تھوڑی قیمت پر فروخت کرنے کو بطور عطف پیش کیا ہے اور سمجھایا کہ یہ درحقیقت کتمان کی علت ہے۔ اب تین باتیں ہیں ایک کتمان کتاب اللہ دوسرے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنا تیسرے کتاب اللہ کے ذریعے حقیر مایہ حاصل کرنا۔ ان میں باہم منطقی ربط ہے۔

قرآن نے یہاں ثمن قلیل کو کھول کر بیان نہیں کیا کیونکہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنے کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس پر عمل نہ کیا جائے دوسرے

یہ کہ اس میں تاویل کر دی جاتی تیسرے یہ کہ اس میں تحریف کر دی جاتی۔ انسانی طبیعت کی یہ عام کمزوری ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلے میں وہ اپنے ہوائے نفس کی بالاتری چاہتی ہے اور وحی کے ذریعے آتے ہوئے جو احکام اسے اپنی خواہشوں، اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان کا انکار کر دیتا ہے اور اگر مانتا ہے تو تاویل و تحریف کے زور سے ان کی زد سے بچنے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ یہودیوں کی ان ہی تاویلات، تحریفات اور ترک عمل کو قرآن نے نبذ وراء ظھورھم کہا ہے اور تاویل و تحریف کے ذریعے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنے کا یہ سارا عمل محض اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کیا جاتا۔ اسی کو قرآن نے یہاں اشتراء کہا ہے اور دوسرے موقعہ پر اکل اموال الناس بالباطل فرمایا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآریوں کے لیے حلال کو حرام، حرام کو حلال بنا دیتے اور اس کے فتوے دے کر انعام و اکرام لیتے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت کے کسی حکم کا انکار کر دیتے تھے بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو اپنی تاویلات و تصرفات کے ذریعے ایسا کر لیتے کہ امیروں کی ہوائے نفس پوری ہو جائے۔

مدینہ کے رؤسائے یہود نے اسی مقصد کی خاطر علمائے یہود کے وظائف مقرر کر رکھے تھے کہ وہ حضور انور کی تشریف آوری کے متعلق تورات میں آمدہ بشارات کی تاویل کریں اور ان میں تحریف کریں۔

نکمے پن پر تحسین کی خواہش

۴۴۳ ۔ تم ان لوگوں کو ہرگز عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کردار پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ان کاموں پر سراہا جائے جو انہوں نے کبھی نہیں کیے ہیں۔ فی الواقع ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہود مسئلے غلط بتاتے، رشوتیں کھاتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات و بشارات جان بوجھ کر چھپاتے تھے۔ پھر خوش ہوتے کہ ہماری چالاکیوں کو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ اور امید رکھتے کہ لوگ ہماری تعریف کریں کہ بڑے عالم اور دیندار و حق پرست ہیں۔ دوسری طرف منافقین کا بھی یہی حال تھا جب جہاد کا وقت آتا گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے کہ دیکھو کیسے جان بچائی ہے۔ جب حضور انور جہاد سے تشریف لاتے

تو غیر حاضری کے جھوٹے بہانے پیش کر کے چاہتے کہ آپ سے اپنی تعریف کرائیں۔ ان سب کو بتلادیا گیا کہ یہ باتیں دُنیا و آخرت میں خدا کے عذاب سے بچا نہیں سکتی ہیں۔ اوّل تو ایسے لوگ دُنیا ہی میں رُسوا ہوتے ہیں اور کسی وجہ سے یہاں بچ گئے تو وہاں کسی تدبیر سے چھوٹ نہیں سکتے۔ اگرچہ آیت میں تذکرہ یہود و منافقین کا ہے لیکن مسلمانوں کو بھی سنانا ہے کہ بُرے کام کر کے خوش نہ ہوں۔ بھلا کر کے اترائیں نہیں اور جو اچھا کام نہیں کیا ہے اس پر تعریف کے اُمیدوار نہ رہیں بلکہ کرنے کے بعد بھی مدح سرائی کی ہوس نہ رکھیں [1]

یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے۔ مثلاً وہ تقویٰ سے کوسوں دور رہ کر یہ سننا چاہتے ہیں کہ بڑے متقی ہیں پوری زندگی دین کے نام پر کاروباری ہونے کے باوجود وہ دیندار اور پارسا کا لیبل لگانے کے ضرور خواہاں ہیں۔ دین کے خلاف ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرنے کے باوجود وہ اپنے تئیں خادمِ دین کا نعرہ ضرور لگوانا چاہتے ہیں۔ اللہ کے قانون سے علم و عمل میں بیگانے ہیں مگر حامیٔ شریعت کہلوانا چاہتے ہیں۔ اعمال میں فساد اور اخلاق میں گندگی کا گہوارہ ہیں مگر مصلح اور مزکّی کہلوانے کے خواہش مند ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں ہیں یا یوں کہہ دیجیے کہ اپنے حق میں یہ ڈھنڈورہ پٹوانا چاہتے ہیں کہ بڑے ایثار پیشہ، مخلص اور دیانتدار ہیں اور ملت کے بڑے خیر خواہ ہیں حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب پر اللہ تعالیٰ نے کتاب کی جو ذمہ داری ڈالی ہے اور اس کے اظہار و اعلان، اس کی تعلیم و تبیین اور اس کے اجراء و نفاذ سے متعلق جو عہد اُن سے لیا اس کا کوئی جُز بھی انہوں نے پورا نہیں کیا بلکہ اُلٹا کتمان، نبذ کتاب اللہ وراء ظہورہم، تاویل، تحریف اور تصرفات جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا اور کتاب اللہ کو اپنی دنیوی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنایا لیکن اس کے باوجود ان کی خواہش یہ ہے کہ انہیں حامل کتاب سمجھا جائے۔ انہیں خدا کی برگزیدہ اُمت قرار دیا جائے اور ان کو دُنیا و آخرت دونوں میں اللہ کے تمام فضل و انعام اور تمام لُطف و احسان کا حق دار مانا جائے [2]

اس ارشاد میں مسلمانوں کے لیے بھی بڑی عبرت ہے کہ با اُصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

اُمت کے مقام بلند سے گر کر ایک بے اُصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت کیش قوم کی سطح پر جانے کے باوجود اور انسان کی عبدیت اس کے خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی اور وحی و تعلیمات پیغمبر کی دعوت کے علمبردار ہونے کے باوجود اس سے بیگانہ ہو کر ان قوموں کی اطاعت میں لذت محسوس کرنا جو دُنیا میں پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری چاہتی ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو خیر اُمۃ کہنا اور اللہ کے جملہ انعامات و احسانات کا اپنے کو مستحق سمجھنا بلاشبہ اس آیت گرامی کا مصداق ہے۔ غرض اگر کنتم خیر اُمۃ نے یہ بتایا ہے کہ اُمت مسلمہ کا مقام کیا ہے اس آیت نے ساری دُنیا کو یہ حقیقت بھی سمجھا دی ہے کہ اس مقام کی وجہ سے اس کا وہ کام ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً خیر اُمت ہے اور اگر انجام نہیں دیتی ہے تو اگرچہ وہ خود اپنے کو خیر اُمت کہے مگر فی الواقع یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا کی واقعی تفسیر ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ع

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ

لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي

جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا

خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ

تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ

الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ

الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

زمین و آسمان کا مالک اللہ ہے اور اللہ کی قدرت کے احاطہ
سے کوئی چیز باہر نہیں ہے[۳۴۵]۔ بلاشبہ آسمان وزمین کی پیدائش

میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اربابِ
دانش کے لیے بڑی نشانیاں ہیں[۳۴۶]۔ وہ اربابِ دانش جو اُٹھتے،
بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں[۳۴۷] اور آسمان و
زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں[۳۴۸] (اس ذکر اور فکر کا نتیجہ
یہ ہے کہ وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) خدایا یہ سب کچھ تو نے
فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے
کہ عبث کام کرے خدایا ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لیجیو[۳۴۹]،
خدایا جسے تو نے دوزخ میں ڈالا درحقیقت تو نے اسے بڑی
ہی خواری میں ڈالا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا[۳۵۰]۔ خدایا
ہم نے ایک منادی کرنے والے کی پکار سُنی جو ایمان کی طرف
آواز دے رہا ہے اور کہتا ہے کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان
لاؤ ہم نے اس کی دعوتِ ایمان قبول کر لی[۳۵۱]، خدایا بس تو ہمارے

قصوروں کو بخش دے، ہماری برائیاں مٹا دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ فرما۔[352] خدایا جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کی زبانی کیے ہیں وہ سب ہمیں عطا فرما اور روزِ قیامت ہمیں رسوا نہ کر بے شک تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔[353]

اللہ کا ذکر اور کائنات میں فکر کلیدِ کامیابی ہے

اصل مخاطب اہلِ ایمان ہیں پہلے ان سے کہا تھا کہ اقامتِ حق کی عظیم خدمت جو تم نے اپنے سر لی ہے۔ اس کے لیے تمہیں سردھڑ کی بازی لگانی ہوگی اور اس راہ کی تمام آزمائشوں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ مخالفین کی جانب سے حالات کیسے ہی ناخوشگوار ہوں آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے زیرِ فرمان ہے اگر وہ تمہیں کامیابی عطا کرنا چاہے تو اس کی راہ کون روک سکتا ہے لیکن کامیابی کی شرط یہ ہے کہ راہِ حق میں استوار رہو۔ استواری اور استقامت کا سرچشمہ اللہ کا ذکر اور کائنات میں تفکر ہے۔ ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے تمہارا دل خالی نہ ہو اور فکر سے مقصود یہ ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت اور کائنات فطرت کے حوادث و مظاہر میں غور و فکر کرتے رہو۔ ذکر سے تمہارے دل کی غفلت دُور ہوگی فکر سے تم پر حقائق کی معرفت کے دروازے کھلتے جائیں گے۔ جن لوگوں کے دل غفلت سے پاک ہوتے اور کائنات میں تفکر کرتے ہیں ان پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ تمام کارخانۂ ہستی اور اس کا عجیب و غریب نظام بغیر کسی اصلی مقصد اور نتیجہ کے نہیں ہو سکتا اور ضروری ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی کے بعد بھی کوئی دوسری زندگی ہو اور جو کچھ اس زندگی میں کیا جاتا ہے اس کے نتائج اس زندگی میں پیش آئیں۔

۲۴۵ - زمین و آسمان کا مالک اللہ ہے اور اللہ کی قدرت کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے یعنی جب زمین و آسمان میں اسی کی سلطنت ہے تو مجرم بھاگ کر پناہ کہاں لے سکتا ہے اور جو ہر چیز پر قادر ہے اس کے نفوذ و اختیار سے کون باہر ہو سکتا ہے [1] یہ اوپر والی دھمکی کی تصدیق و تزئین ہے مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے اس میں کسی اور کے زور و اثر کا کوئی دخل نہیں ہے جو لوگ خدا سے سرکشی کر رہے ہیں وہ ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہیں اور خدا ہر چیز پر قادر ہے [2] لہذا ایسے قادر مطلق کے عذاب سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں اور خصوصاً جو گستاخ آسمان و زمین کے مالک کو فقیر کہتا ہو۔ ایسے گستاخ کی تو عذاب سے رہائی نہیں ہو سکتی کیونکہ جس کی سلطنت آسمان و زمین کو محیط ہو اس کا مجرم بھاگ کر آخر کہاں جائے گا [3]

اگرچہ سارے شارحین قرآن نے اس آیت کو قریب ترین فقرے و لہم عذاب الیم کے ساتھ مربوط کر کے یہی مطلب بتایا ہے جو آپ نے پڑھا ہے لیکن دراصل اس کا تعلق سیاق میں اصل موضوع سے ہے اور سیاق میں ان فی خلق السماوات کے لیے بمنزلہ دعویٰ ہے۔ سیاق میں اصل موضوع یہ ہے کہ اہل ایمان کو طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں ان کی بے بسی اور بے کسی کے پیش نظر تسلی دی جا رہی ہے اور اسی تسلی کے سلسلے میں یہودیوں کی تاریخ سے ان خاص اطوار کا ذکر کیا ہے جن سے اُمت کو بچانا مقصود ہے۔ یہ آیت اپنے موضوع سے متعلق ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ اے اہل ایمان غمگین نہ ہو، کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو۔ صبر کا دامن تھامے رکھو، متقیانہ سیرت اختیار کرو۔ اپنے عزائم میں پختگی پیدا کرو۔ نگاہ کو بلند تر رکھو۔ حق کو ڈنکے کی چوٹ کہو اور کسی کی وجہ سے کچھ مت چھپاؤ اور نہ حق کا کسی سے کوئی سودا کرو نہ اپنے اعمال پر اتراؤ اور نہ ان کاموں پر جو تم نہیں کرتے ستائش کے خواہاں ہو۔ تمہاری مہمات میں اللہ تمہیں کافی ہے۔ کیونکہ آسمان و زمین میں فرمانروائی اس کی ہے وہ جسے چاہتا ہے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ جو لوگ تمہیں دبیں گے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین ان کے مقابلہ پر وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ سارے معاملات کا مرجع اللہ کی ذات ہے۔ اس طرح اس آیت کے ذریعے حضور انور اور اہل ایمان کو تسلی دی اور مدد کا وعدہ ہے اور نبوت کے مخالفین پر تعریض ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] معارف م ا

یہ سورت کا خاتمہ ہے اور اس آیت کی حیثیت وہی ہے جو البقرہ میں و للہ ما فی السماوات و ما فی الارض کی ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز کتاب اللہ کے تعارف سے اور دونوں کا انجام اللہ سبحانہٗ کی ثناء و تمجید اور اہل ایمان کی دعا پر ہے۔ یہ آیت گرامی بھی یہاں اسی کی تمہید ہے اس لیے خاتمہ کی آیات کا ربط قریب نہیں بلکہ پوری سورت کے موضوع میں تلاش کرنا چاہیے۔

توحیدِ خالقیت سے حاکمیت پر استدلال

۳۴۶ - بلاشبہ آسمان و زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب دانش کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی عقل مند آدمی جب زمین و آسمان کی پیدائش اور ان کے عجیب و غریب احوال و روابط اور دن رات کے مضبوط و محکم نظام میں غور کرتا ہے تو اس کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا مرتب و منظم سلسلہ ضرور کسی مختار کل اور قادر مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے، جس نے اپنے عظیم ارادہ و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حدبندی کر رکھی ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے محدود دائرہ عمل سے باہر قدم نکال سکے۔ اگر اس عظیم الشان مشین کا ایک پرزہ یا اس کارخانہ کا ایک مزدور بھی مالک علی الاطلاق کی قدرت و اختیار سے باہر ہوتا تو مجموعہ عالم کا یہ مکمل و محکم نظام ہرگز قائم نہ رہ سکتا۔[1]

یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو اور آثار کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔[2]

آسمان و زمین کی خلقت اور رات دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں ان کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے ان کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گوناگوں پہلوؤں سے آفاق کی ان نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے۔ صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے بلکہ بے پایاں رافت و رحمت بھی ہے، صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے بلکہ اس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق اور توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے نہ کھیل ہے بلکہ ایک قدیر حکیم عزیز و غفور اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن۔

سمیع و بصیر کی بنائی ہوئی دُنیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے[1]

اللہ سبحانہ کے مالک و ملک ہونے کی پہلی دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ اس کائنات علوی اور سفلی کی تخلیق میں چونکہ اللہ کے سوا کسی کو دخل نہیں ہے نہ سوائے خدا کے یہ کسی نے بنایا ہے اس لیے اللہ کے سوا کوئی مالک اور ملک نہیں ہے۔

اور اللہ کے مالک و ملک ہونے کی دوسری دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ اللہ کی ذات صرف اس کائنات کی خالق ہی نہیں بلکہ اس کو چلانے والا بھی وہی ہے۔ یہ اسی کی ذات ہے جس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا ہے۔ کبھی رات بڑی ہے دن چھوٹا ہے اور کبھی دن بڑا رات چھوٹی ہے۔ گویا تاریکی اور روشنی ہی کا اختلاف نہیں بلکہ تاریکی اور روشنی کی کمیت کا اختلاف اور اس اختلاف کے نتیجے میں موسمیاتی اختلاف بھی اسی کا قائم کردہ ہے۔ اس اختلاف میں حکمت الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے زندگی کے لیے بڑی تسکین وہ و دل بستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک حالت پر رہتا تو دُنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ الغرض رات دن کا یہ اختلاف ایک بہت بڑی شہادت ہے اس بات کی کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا مالک اور ملک کوئی نہیں ہے۔

ارباب دانش ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں

۱۹۱۔ وہ ارباب دانش جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یعنی کسی حال میں خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ اس کی یاد ہمہ وقت ان کے دل میں اور زبان پر جاری رہتی ہے جیسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا کہ کان یذکر اللہ علی کل احیانہ۔ نماز بھی خدا کی بہت بڑی یاد ہے اسی لیے آپ نے فرمایا کہ جو نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھ کر پڑھ لے اور جو بیٹھ کر نہ پڑھ سکے لیٹ کر پڑھ لے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس رات یہ آیات قرآنی نازل ہوئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے بیٹھے لیٹے،

---

[1] تدبر قرآن

ہر حال میں اللہ کو یاد کرکے رہتے تھے لے

جہاں تک ذکر الٰہی کا تعلق ہے وہ ہر حال میں مطلوب ہے اس کے لیے قیام و قعود، نرمی و گرمی اور صبح و شام کی کوئی قید نہیں ہے انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لیے جس طرح سانس کی آمد و رفت ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے بقا کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے اور قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اولوالالباب کی خاص اور اولین صفت یہی ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ ذکر ہی قرآن میں ان عبادات میں سے ایک عبادت ہے جس کی کثرت کا قرآن نے جگہ جگہ مطالبہ کیا ہے ظاہر ہے ذکر صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیے۔

قوانین طبعی اور قواعد تکوینی پر غور و فکر

۳۴۸۔ اور آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ ان کو کسی بڑے علیم و حکیم اور قدرت والے نے بنایا ہے۔ آسمان و زمین میں غور و فکر کرنے سے ان کا مقصد اللہ سبحانہ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اور جب مصنوعات میں غور و فکر کرنے سے خالق کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے، اس کی عظمت اور اس کی عظیم قدرت اور علم و حکمت اسے معلوم ہوتی ہے اور اس کے عجائب قدرت کو دیکھ کر دل اس کی محبت اور عظمت سے لبریز ہو جاتا ہے تو اللہ سبحانہ کی تسبیح و تقدیس میں محو ہو جاتے ہیں۔ کائنات طبعی کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانین طبعی اور قواعد تکوینی سے صانع اعظم و خالق عالم کی قدرت حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہے۔ قاضی بیضاوی نے اسے افضل العبادات بتایا ہے اور امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ فقرہ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ صدیقین کا بزرگ ترین مرتبہ اللہ کی ذات اور صفات کے دلائل پر غور و فکر کرنا ہے کاش آج ہمارے مفکرین، ماہر فن، فن ہیئت فلکیات ارضیات وغیرہ علوم طبعی پر قرآنی نقطۂ نظر سے قلم اٹھاتے۔

قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و تفکر کی راہ ہے۔ اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ جہل و کورہی اور حواس و تفکر کو بیکار کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی

لے افادات شیخ الاسلام

ہوتی عقل سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے تفکر کی جگہ جگہ دعوت دی ہے یہاں آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کا تذکرہ ہے۔ دوسرے موقعہ پر خود اپنے اندر تفکر کرنے کی تلقین ہے اولم یتفکروا فی انفسھم کہیں آیاتِ تکوینی میں تفکر کی دعوت ہے ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون اور کبھی آیاتِ تشریعی میں تفکر کا مطالبہ ہے۔ کذالک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون کہیں احوال و ظروف پر تفکر کا حکم ہے اولم یتفکروا ما بصاحبھم من جنۃ اور کہیں فرمایا ہے کہ اغراض و خواہشات سے پاک ہو کر تفکر کرو۔ الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ اور دو دو چار چار آدمی بھی سر جوڑ کر تفکر کریں ان تقوموا للہ مثنیٰ و فرادیٰ ثم تتفکروا۔

یہاں قرآن نے تفکر سے پہلے ذکر لا کر اشارہ کر دیا کہ جس عقل میں ذکر کی نورانیت نہ ہو اور وہ یادِ الٰہی سے بیگانی ہو اس کا تفکر مقصودِ قرآن نہیں اور نہ قرآن کی نظر میں وہ اولوالالباب یعنی اربابِ دانش ہیں قرآن کے اولوالالباب وہ ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہوئے تفکر سے کام لیتے ہوں۔ مناطقہ تو فکر کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ جانی ہوئی باتوں کو اس انداز سے ترتیب دینا کہ انجان بات کا پتہ لگ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس معنے کے اعتبار سے تفکر کی وسعتوں میں صرف وہ ہی چیزیں آسکتی ہیں جن کی قلب میں تصویر آسکے۔ اسی لیے ارشاد ہے کہ اللہ کے انعامات میں تفکر کرو خود اللہ میں تفکر نہ کرو۔ کیونکہ فکرِ انسانی میں اللہ کی ذات کا کوئی تصور نہیں لیکن عرفا کی اصطلاح میں تفکر نام ہے مطلوب کی تلاش کی خاطر قلب کو مطلوب کی طرف متوجہ کر دینے کا۔ اور شیخ اسمٰعیل بردی نے تفکر کی بڑی دو لفظی تعریف کی ہے کہ فکرِ انسانی کا مقصود کی تلاش میں لگ جانا۔ اللہ سبحانہٗ کی خلقت میں تفکر، اللہ سبحانہٗ کی توحید میں تفکر، اعمال و احوال کے معانی میں تفکر، علم و معرفت میں تفکر، طلب و ارادہ میں تفکر، منافع اور مضار کے معلوم کرنے کی راہ میں تفکر، تفکر کی بھی چھ قسمیں ہیں اور ابن القیم لکھتے ہیں یہی مجال افکار العقلا اہلِ دانش کی فکری جولانگاہ اسی میں ہوتی ہے۔

اہلِ ذکر و فکر کا تاثر

۳۴۹ - اس ذکر و فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں خدایا یہ سب کچھ تو نے

فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ یعنی ذکر و فکر کے بعد کہتے ہیں کہ خداوندا یہ عظیم الشان کارخانہ آپ نے بیکار پیدا نہیں کیا جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یقیناً ان عجیب و غریب حکیمانہ انتظامات کا سلسلہ کسی عظیم و جلیل نتیجہ پر منتہی ہونا چاہیے گویا یہاں سے ان کا ذہن تصورِ آخرت کی طرف منتقل ہو گیا جو فی الحقیقت دُنیا کی موجودہ زندگی کا آخری نتیجہ ہے۔ اسی لیے آگے دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی دُعا کی اور درمیان میں خدا کی تسبیح و تنزیہہ بیان کر کے اشارہ کر دیا کہ جو احمق قدرت کے ایسے اوصاف و صریح نشان دیکھتے ہوئے تجھ کو نہ پہچانیں یا تیری شان کو گھٹائیں یا کارخانۂ عالم کو محض عبث و لعب سمجھیں۔ تیری بارگاہ ان سب کی خرافات سے پاک ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین اور دیگر مصنوعاتِ الٰہیہ میں غور و فکر کرنا وہ ہی محمود ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ اللہ کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو۔ باقی جو مادہ پرست ان مصنوعات کے تاروں میں الجھ کر رہ جائیں اور خالق کی صحیح معرفت تک نہ پہنچ سکیں خواہ دُنیا انہیں بڑا محقق اور سائنس داں کہے مگر قرآن کی زبان میں وہ اولوالالباب نہیں ہیں بلکہ پرلے درجے کے جاہل اور احمق ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ جب وہ نظامِ کائنات کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کھل جاتی ہے کہ یہ سراسر حکیمانہ نظام ہے اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حس پیدا کی ہو جسے تصرف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو اس سے اس کی حیاتِ دُنیا کے اعمال پر باز پرس نہ ہو اور اسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح نظامِ کائنات پر غور کرنے سے انہیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں[2]

شاہراہِ اعتدال

اس آیت نے افراط و تفریط کے درمیان دُنیا کے سامنے شاہراہِ اعتدال پیش کر دی ہے اب تک ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ جب کسی قوم نے خدا کے ذکر کی طرف توجہ کی تو علوم و فنون سے غافل ہو گئی اور جب علوم و فنون کی طرف جھکے تو یادِ الٰہی سے بے رُخ ہو گئے چنانچہ مسیحیت اور یہودیت کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اوّل الذکر صرف یادِ الٰہی کے ہو کر رہ گئے جبکہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

آخر الذکر اللہ کو فراموش کر کے علوم و فنون کے ہو گئے اور اب دونوں میں خدا گریز رجحانات اور دونوں خدا ناشناس اور خدا کے کھلم کھلا باغیوں کی حیثیت میں دُنیا کے سامنے ہیں۔ اس خدا فراموشی کا نتیجہ ہے کہ ان کی وساطت سے دُنیا میں وطنیت، قومیت، مادیت اور لامذہبیت کی بیماریاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ تفکر کا رشتہ ذکر سے وابستہ نہیں رہا۔ اس اساس پر جو نظامِ حکومت قائم ہو رہا ہے اس کی حیثیت ایک محفوظ منظم ترقی یافتہ تجارتی ادارے کی ہوتی ہے۔ یہ حکومت بنیادی طور پر لوگوں کی نفع رسانی کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے استحصال کے لیے قائم ہوتی ہے۔ وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اصلاحی مقصد نہیں رکھتی ہے۔ نہ اس کے پیشِ نظر ملک یا قوم کی اخلاقی، روحانی ترقی، انسانوں کی ہدایت، انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر اس کی اصلی توجہ آمدنی کے ایسا بیں نفع اٹھانے کی تدابیر اور سرکاری محاصل و مطالبات کی طرف ہوتی ہے۔ اس غرض کے لیے وہ بے تکلف اخلاق و شرافت کے اصول کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ اور اخلاقی تعلیمات و مصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ جہاں کہیں اخلاقیات و مالیات کا تصادم ہوتا ہے وہاں وہ ہمیشہ مالیات کو ترجیح دیتی ہے۔ ہر مسئلہ میں اس کا نقطہ نظر معاشی و اقتصادی ہوتا ہے۔ اس طرز کی حکومت جو ذکر سے بیگانہ ہو کر صرف تفکر کی زمین پر بنتی۔ پلتی اور جوان ہوتی ہے۔ بداخلاقی و بےحیائی کی بہت سی قسموں کو کچھ قانونی قیود کے ساتھ جائز قرار دیتی ہے۔ عصمت فروشی کا پیشہ اس حکومت میں جائز ہوتا ہے۔ وہ خود وسیع پیمانے پر سُودی کاروبار کرتی ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت ہوتی ہے جب قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو ذکر سے بیگانہ ہو کر صرف فکر و فن کی تخلیق ہوتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو تفکر سے بیگانہ ہو کر ذکر سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہیں اس کے نتیجے میں خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ دلوں سے اعزہ کا احترام کافور ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ شقاوتِ قلبی اور اعزہ و اقارب کے ساتھ احسان فراموشی کی جس کثرت سے ان راہوں میں نظیریں ملتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ زہدانِ صحرا اور عابدانِ مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے ہیں، بیویوں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ ان کا مقصودِ زندگی صرف یہ ہوتا ہے کہ خود ان کو نجاتِ اُخروی حاصل ہو جائے ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ انسانیت جیئے یا مرے۔ تاریخ میں جو واقعات لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر

آج بھی انسو نکل آتے ہیں۔ عورتوں کے سائے سے وہ بھاگتے ہیں۔ ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی عبادت اور خدا کی یاد خاک میں مل جاتی ہے۔ اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں سے بات کرنا بھی وہ گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔

وہ ارباب تفکر تھے اور یہ اصحاب ذکر۔ قرآن نے اس افراط و تفریط کے درمیان شاہراہ اعتدال پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ ارباب دانش نہ یہ ہیں اور نہ وہ۔ بلکہ ارباب دانش قرآن کے نقطہ نظر سے وہ ہیں جو ذکر اور فکر دونوں میں ہم آہنگی رکھیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا قرآن نے البقرہ میں خدا کے یاد کرنے والوں کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار اور ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں آتنا فی الدنیا۔ یہاں قرآن نے اپوزیشن کا ذکر نہیں کیا بلکہ مطلوب مقصود کی تصریح کر دی ہے یعنی ان ارباب دانش کا جو ذکر اور فکر دونوں کو تھام کر چلیں۔ اور قرآن نے اسی پر مبنی متوازن انسانی مجموعہ کو اُمت وسط اور خیر اُمت کہا ہے۔ یہ ذکر اور فکر کی ہم آہنگی ہے کہ اس خیر اُمت نے اپنی تہذیب کی خود بنیاد ڈالی تھی حکومت کی نیو اٹھائی حالانکہ اس کو اس سے پہلے کبھی تجربہ نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کو ذرا ضرورت پیش نہ آئی کہ کسی قوم سے کوئی آدمی مستعار لے یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے ان ارباب ذکر و فکر نے ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جس کا سکہ دو بر اعظموں کے وسیع رقبے میں چلتا تھا۔ اس کے ہر شعبے اور ہر ضرورت کے لیے متعدد آدمی ایسے ملے جو اپنی لیاقت کارکردگی امانت و دیانت قوت و احساس ذمہ داری بے نظیر تھے۔ یہ عالمگیر سلطنت قائم ہوئی تو اسی خیر اُمت نے اس کو پورے فکر و فن کے آدمی فراہم کیے جن میں کوئی عادل حاکم تھا۔ کوئی امانت دار، خازن، کوئی منصف قاضی تھا اور کوئی عبادت گزار قائد اور کوئی متقی فوجی تھا۔ ذکر و فکر پر مبنی اس تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی تھی۔ اس اسلامی حکومت کو اہل ترین خدا ترس، فرض شناس و مستعد کارکن ملتے تھے۔ حکومت کی ذمہ داری ان ہی اشخاص کے سپرد کی جاتی جو ذکر و فکر کے جامع ہوتے جو اپنے کو بجائے تحصیلدار کے داعی سمجھتے جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح اور ذکر و فکر کا صحیح امتزاج ہوتا۔

دوزخ کا عذاب سرتاسر رسوائی ہے

۳۵۰۔ خدایا جسے تو نے دوزخ میں ڈالا در حقیقت تو نے اسے بڑی خواری میں ڈالا اور

ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ جو شخص جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اسی قدر رسوائی ہوگی۔ اس قاعدے سے دائمی عذاب صرف کفار کے لیے ہے جن آیات میں عام مومنین سے خزی و رسوائی کی نفی کی گئی ہے وہاں یہی معنے سمجھنے چاہئیں[1]۔ اور جس کو خدا دوزخ میں ڈالنا چاہے کوئی حمایت کر کے بچا نہیں سکتا۔ ہاں جن کو ابتدا میں یا آخر میں چھوڑ دینا اور معاف کر دینا ہی منظور ہوگا جیسے عصاۃ مومنین کہ ان کے لیے شفعاء کو اجازت ہوگی کہ شفاعت کر کے بخشوائیں وہ اس کے مخالف نہیں ہے بلکہ آیات و احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ گویا دعا کے اس مرحلے پر پہنچ کر دعا مانگنے والا رب جلیل کی شاہانہ ہیبت و جلال کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور مشاہدے کی اس کیفیت میں اسے اس قدر استغراق ہو جاتا ہے کہ اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس ذات کے خلاف کہیں استغاثہ نہیں ہو سکتا۔ جس سے وہ ناراض ہو اس کا بس اس کے علاوہ کہیں ٹھکانا نہیں۔ مشاہدے کی اسی کیفیت کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے کہ بات ربنا سے شروع کرتا اور کمال یقین کو ان لگا کر ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جسے تو جہنم میں داخل کردے گا اس کے لیے رسوائی ہی رسوائی ہے۔ حکماء اسلام نے آیت سے یہ لطیف استنباط کیا ہے کہ عذاب روحانی عذاب جسمانی سے بھی بڑھ کر زبردست و شدید ہے۔ کیونکہ قرآن نے رسوائی کا ذکر عذاب دوزخ کے بعد کیا ہے اور دوزخ میں داخل ہونے والوں کو ظالم کہہ کر ایک طرف ان کے اعمال کی شناعت پر تعریض کی ہے اور دوسری طرف ان کے جہنم میں جانے کی علت بتا دی ہے۔ ظالم ہر وہ شخص ہے جو جادۂ اعتدال سے ہٹ جائے اور صراط مستقیم کو چھوڑ دے۔ لہٰذا ہر ظالم کو سزا اس کے ظلم کے مطابق دی جائے گی۔ یہاں اس کہنے میں شاید کوئی معنویت نہیں ہے کہ ظالم سے مراد کافر ہے جیسا کہ نسفی اور قرطبی نے نکتہ آفرینی کی۔ جیسے یہ کہنا معقول ہے کہ جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اتنی ہی رسوائی ہوگی ایسے ہی یہ بھی معقول ہے کہ جس قدر ظلم کی مقدار ہوگی۔ اسی کے مطابق دوزخ میں رہے گا اور ظلم ہی کی مقدار کے پیش نظر شفاعت بھی ہوگی۔ قرآن میں گنہ گاروں کو بھی ظالم کہا ہے فمنھم ظالم لنفسہ اور دوسرے مواقع پر بھی ظالم کا اطلاق عاصی پر ہوا ہے۔

ایمان کی منادی

۱۵۳۔ خدایا ہم نے ایک منادی کرنے والے کی پکار سنی جو ایمان کی طرف آواز دے رہا تھا اور کہہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رہا تھا کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ ہم نے اس کی دعوتِ ایمان قبول کر لی۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے بڑی اونچی آواز سے دنیا کو پکارا یا قرآن حکیم جس کی آواز گھر گھر میں پہنچ گئی۔ پہلے ایمان عقلی کا ذکر تھا۔ یہ ایمان سمعی ہوا جس میں ایمان بالرسول اور ایمان بالقرآن بھی داخل ہو گیا[1] مطلب یہ ہے کہ یہی مشاہدہ ان کو اس بات پر مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطہ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں وہ سراسر حق ہے[2]

آیت میں منادی سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ کی ذات کے لیے یہاں یہ تعبیر آپ کی دعوت کی عظمت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اگر منادی سے آپ کی ذات ہی مراد ہے تو پھر آیت میں اہلِ دانش اور اولوالالباب کا حضرات صحابہ اولین مصداق ہیں جنہوں نے آپ کی دعوت کو بلاواسطہ سُنا اور سننے کے بعد شرف پذیرائی عطا فرمایا اور صحابہ ہی کا ایمانی مقام ظاہر کرنے کے لیے فآمنا کی پیشانی پر حرف فا لگایا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ صحابہ کرام نے ذکر و فکر کے بعد ایمان کی دعوت کو اپنانے میں دیر نہیں کی بلکہ فوری طور پر نبوت کی دعوتِ ایمانی کا استقبال کیا۔ صحابہ نے حضور کی دعوتِ ایمانی کو مخاطب اول ہونے کی وجہ سے بلاواسطہ سُنا ہے اور صحابہ کے علاوہ تمام اُمت نے حضور کی دعوتِ ایمانی کو بالواسطہ سُنا ہے۔ امام رازی اور آلوسی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب کی ہے کہ منادی اور اس کے ساتھ اس کے فعل ینادی کا اجتماع حضورِ انور کی شانِ گرامی کو ظاہر کر رہا ہے کیونکہ صرف منادی سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ پکارنے والا کا ہے کو پکار رہا ہے۔ فعل لا کر بتا دیا کہ یہ جنگ کی منادی نہیں، قومیت اور وطنیت کی منادی نہیں، آگ بجھانے یا اور کسی کام کی منادی نہیں بلکہ ایمان کی منادی ہے۔ کمالاتِ انسانی کی منادی ہے۔ یہ منادی نبوت کی کنجی ہے جس سے محمد رسول اللہ نے انسانی فطرت کے بند تالے کھولے ہیں اور اس کے ذریعے آمنا کہنے والوں کو دنیا کی قوموں پر نگران اور اتالیق مقرر کیا ہے اور اب وہ اس پر مامور ہیں کہ قوموں کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں جو راہِ راست سے ہٹ جائے اس کو صراطِ مستقیم پہ لگائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دُور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں۔ مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں آمنوا بربکم فآمنا

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

سے امام منصور ماتریدی نے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ اپنے ایمان کو انشاء اللہ کے ساتھ مقید و مشروط کرنا درست نہیں ہے۔

بخشش کی طلبگاری

۲۵۲۔ خدایا بس تو ہمارے قصوروں کو بخش دے۔ ہماری برائیاں مٹا دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ فرما یعنی ہمارے بڑے بڑے گناہ بخش دے اور چھوٹی موٹی برائیوں پر پردہ ڈال دے اور جب اٹھانا ہو تو نیک بندوں کے زمرے میں شامل کر کے دنیا سے اٹھا لیجئے اس دعا کے آخری فقرے میں اللہ کے وفادار بندوں کے زمرے میں شامل کیے جانے کی تمنا کا اظہار ہے یعنی جب ہمارا خاتمہ ہو تو ہمیں ان کی معیت نصیب فرما جو آخر دم تک تیرے عہد و پیمان پر مضبوط رہے۔ لفظ بر پر ہم پارے کے آغاز میں بحث کر چکے ہیں کہ اس لفظ کی اصلی روح وفاداری پابندی عہد و میثاق اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو یہاں ان اہل کتاب پر لطیف تعریض ہے جن سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کا عہد لیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس عہد کے برخلاف سارا زور اس کی مخالفت میں صرف کر دیا[1]

ہمیں اپنے عدول کا مصداق بنا دے

۲۵۳۔ خدایا جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کی زبانی کیے ہیں وہ سب ہمیں عطا فرما اور روز قیامت ہمیں رسوا نہ کر بے شک تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔ یعنی اپنے پیغمبروں کی تصدیق کرنے پر جو وعدے آپ نے کیے ہیں مثلاً دنیا میں اللہ کے دشمنوں پر آخر کار منصور و غالب کرنا اور آخرت میں جنت و رضوان سے سرفراز فرمانا ان سے اس طرح بہرہ اندوز کیجئے کہ قیامت کے دن ہماری کسی قسم کی ادنیٰ سے ادنیٰ رسوائی بھی نہ ہو۔ اور آپ کے ہاں تو وعدہ خلافی کا احتمال نہیں، ہم میں احتمال ہے کہ مبادا ایسی غلطی کر بیٹھیں جو آپ کے وعدوں سے مستفید نہ ہو سکیں۔ اس لیے درخواست ہے کہ ہم کو ان اعمال پر مستقیم رہنے کی توفیق دیجئے جس کی آپ کے وعدوں سے متمتع ہونے کے لیے ضرورت ہے۔ گویا انہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر [3] افادات شیخ الاسلام

اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں۔ البتہ تردد اس میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں، اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا ہمیں مصداق بنادے اور ہمارے ساتھ انہیں پورا کر کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پہ ایمان لا کر کفار کی تضحیک اور طعن و تشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں - قیامت میں بھی ان کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو اور وہ ہم پر پھبتی کسیں کہ ایمان لا کر بھی ان کا بھلا نہ ہوا[1]

---

[1] تفہیم القرآن

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

ان کے رب نے ان کی دعاؤں کو یہ کہہ کر شرف قبولیت بخشا
کہ میں تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں
خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو[۳۵۴]۔
لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری
راہ میں اپنے گھر سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میری
خاطر لڑے اور مارے گئے[۳۵۵] ان کے سب قصور معاف کر دوں
گا اور ان کو ایسے باغات میں داخل کر دوں گا جن کے

نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کا ثواب ہوگا [356]
اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے ۔ [357]

راہ حق میں قربانیاں اور اللہ کے یہاں ان کا مقام

اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا ۔ عمل حق ایک ایسی حقیقت ہے جو ضائع ہو ہی نہیں سکتی جو لوگ حق پرستی کی راہ میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کررہے ہیں ۔ وہ یقین رکھیں کہ ان کے اعمال کے ثمرات کبھی ضائع ہونے والے نہیں ہیں اور جس طرح سچا ایمان اور اس کے مطابق قربانی آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دُنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے ۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے اہل ایمان پر اس وقت کھولے جاتے ہیں ۔ جب وہ ایمان وعمل کی شرط پوری کرتے ہیں یعنی جہاں اللہ سبحانہٗ کا یہ ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو اُخروی فلاح کے ساتھ دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے ۔ جیسا یہاں لادخلنھم جنات سے پہلے لاکفرن عنھم سیاتھم کا اشارہ بتارہا ہے وہاں اللہ کا یہ بھی ایک عمومی ضابطہ ہے کہ یہ ایمان وعمل کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ ہجرت ، ایذا ، مقاتلہ اور قتل کے الفاظ سے مترشح ہورہا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اس کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دُنیا کی بھی فلاح ہاتھ نہیں آسکتی ۔ دین کے بغیر صحیح معنے میں اہل ایمان کو دُنیا بھی نہیں مل سکتی ۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے ۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگیوں کی دنیوی فلاح مثلاً امن وسکون ، عزت و محبوبیت اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خداشناس ہوں اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد گرامی میں اسی حقیقت کی وضاحت فرمائی ہے :

جس نے اپنی کل کی فکر ایک ہی فکر یعنی آخرت کی فکر کو بنا لیا اللہ تعالیٰ اس کو کل دُنیا کا انتظام کردینے کے لیے کافی ہے اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار دُنیا نے

منتشر کر رکھا ہو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دُنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہوتا ہے۔
(ابن ماجہ)

ایک اور ارشادِ نبوی اس موضوع پر پوری صراحت سے ہماری رہنمائی کرتا ہے:

جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو درست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے اور دُنیا تابع فرمان بن کر اس کے حضور کھڑی ہوتی ہے۔ (ابن ماجہ)

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اسی وقت میسّر آسکتی ہے جب اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع وہ اُمّت ہو، جس کا چہرہ قرآن ان آیات میں پیش کر رہا ہے۔ اس معاملہ میں اس اُمت کو دوسری قوموں پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ دوسری قومیں اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا اقتدار حاصل کرسکتی ہیں لیکن اُمتِ مسلمہ کے لیے اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے لیے عزت واقتدار پانے کی بس ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے ایمان کی راہ، اللہ کی فرمانبرداری، قربانیوں کی راہ اور دُنیا میں شہادتِ حق کی صراطِ مستقیم۔

دُعاؤں کی قبولیت کی بشارت

۳۵۴۔ ان کے رب نے ان کی دُعاؤں کو یہ کہہ کر شرفِ قبولیت بخشا کہ میں تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو یعنی مرد ہو یا عورت ہمارے یہاں کسی کی محنت ضائع نہیں جاتی۔ جو کام کرے گا اس کا پھل پائے گا۔ یہاں عمل شرط ہے نیک عمل کرکے ایک عورت بھی اپنی استعداد کے مطابق آخرت کے وہ درجات حاصل کرسکتی ہے جو مرد حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تم مرد وعورت ایک نوعِ انسانی کے افراد ہو، ایک آدم سے پیدا ہوتے ہو ایک رشتہ ایمانی میں منسلک ہو، ایک اجتماعی زندگی اور امورِ معاشرت میں شریک رہتے ہو تو اعمال کے نتائج اور ان کے ثمرات میں بھی اپنے کو ایک ہی سمجھو۔ روایات میں ہے کہ ام سلمہؓ نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ قرآن میں کہیں ہم عورتوں کی ہجرت وغیرہ اعمالِ حسنہ کا بالتخصیص ذکر نہیں آتا۔ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

گویا تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو۔ میرے یہاں دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔ [1]

ایمان و عمل میں عورت کا مقام

لا اضیع لاکر بتا دیا ہے کہ عمل پر ثمرات و نتائج کا مرتب کرنا محض اللہ کے قبضے میں ہے بعضکم من بعض یہ تصریح ہے اس بات کی کہ انسانیت مرد و عورت میں مشترک ہے اس لیے حکم بھی دونوں کا مشترک ہے۔ دونوں جنسوں کے درمیان اشتراک انسانیت کی یہ تعلیم ساتویں صدی میں قرآن دے رہا ہے جبکہ انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ عورت ہونا خود ایک جرم تھا اور عورت کا وجود گندگی کے مرادف تھا۔ عورت غریب محض اس لیے کہ عورت تھی درجات سے اعمال کے ثوابوں سے محروم تھی اس گمراہی کو مٹانے کے لیے قرآن نے صراحۃً بتا دیا ہے مرد و عورت ہونے کا عمل اور اجر عمل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نماز اس کی بھی قبول اور اس کی بھی، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام اعمال کا یہی حال ہے۔ دراصل ساتویں صدی مسیحی میں جب قرآن نے یہ آواز بلند کی تو دنیا اس حقیقت سے یک قلم ناآشنا تھی کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے اعمال بھی قابل پذیرائی ہو سکتے ہیں۔ منو کے قانون نے عورت کی ہستی صرف اس شکل میں دیکھی تھی کہ وہ مرد کے لیے اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہے اور اس کی نجات اس پر موقوف ہے کہ مرد کی خدمت گزاری میں اپنی زندگی فنا کر دے۔ یہودی قانون عورت کو مرد کی جائداد تصور کرتا تھا اور خاندانی زندگی میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ مسیحی کلیسا کا فیصلہ یہ تھا کہ انسان ہونے کی حیثیت سے مرد و عورت یکساں نہیں ہیں انسان صرف مرد ہے اور عورت میں انسانی رُوح کی جگہ ایک دوسری رُوح بولتی ہے۔ رومی قانون نے بھی عورت کی جگہ مرد سے بدرجہا نیچی رکھی۔ لیکن قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ انسانیت دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور انسان ہونے میں دونوں برابر ہیں بعضکم من بعض مرد ہو یا عورت سب ایک دوسرے کی جنس ہیں اور عمل کے نتائج کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ قرآن نے یہ ایک فقرہ بول کر انسان کی معاشرتی زندگی میں سب سے بڑے انقلاب کا اعلان کر دیا۔

---

[1] تفہیم القرآن

البقرہ میں قرآن نے عورتوں اور مردوں کے حقوق میں مساوات کا اعلان کیا تھا اور اس آیت میں دونوں کے ایمان و عمل اور اجر و ثواب میں برابری کا۔

انفرادی زندگی کے اعمال

چونکہ قرآن انفرادی اور اجتماعی زندگی کی دنیوی اور اخروی فلاح کا منشور ہے اس لیے وہ فرد اور اجتماع دونوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس آیت گرامی نے پہلے فرد کی دُنیوی اور اخروی فلاح کی دستوری دفعہ بتائی ہے کہ ایمان و عمل کے میدان میں ہر فرد ایک ذمہ دار ہستی ہے سے دُنیا میں ایمان و عمل کا سرمایہ فراہم کرنا اور آخرت میں خدا کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کو اپنی عملی زندگی میں کچھ اختیارات ہوں جن سے کام لیتے ہوئے وہ اپنی دُنیا اور عاقبت سنوار سکے۔ ہر فرد کو وہ وسائل حاصل ہونے چاہئیں جو زندگی کو قائم رکھنے ترقی دینے اس کا تزکیہ کرنے میں اس کے مددگار ہوسکیں۔ اسی طرح ہر فرد اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی تشکیل اجتماعی اداروں کے قیام اور ان کی مصالح جیسے اہم امور میں دخل دے ان امور میں سارے افراد کی حیثیت مساوی ہے۔ مرد و عورت سب ان ابتدائی، تمدنی اور معاشرتی اعمال میں یکساں شریک ہیں۔ اس آیت میں اسی دستوری دفعہ کو واضح کیا گیا ہے۔

اجتماعی زندگی کے اعمال

۳۵۵ - لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو گھر سے بے گھر کیے گئے اور جن کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور میری خاطر لڑے اور میرے لیے مارے گئے۔ یعنی جب کسی عمل کرنے والے کا چھوٹا موٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا تو پھر ان مردان خدا کا پوچھنا ہی کیا ہے؟ جنہوں نے کفر و عصیان چھوڑنے کے ساتھ دار الکفر بھی چھوڑ دیا۔ وطن خویش اقارب، اہل و عیال اور مال و منال سب کو خیرباد کہہ دیا اور دارالاسلام کی طرف نکل کھڑے ہوتے، کفار نے ان پر وہ ظلم توڑے کہ گھروں میں ٹھہرنا محال ہو گیا۔ وطن چھوڑنے اور گھر بار ترک کرنے پر بھی دشمنوں نے چین نہ لینے دیا۔ طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے رہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ میرا نام لیتے تھے اور میرا کلمہ پڑھتے تھے۔ یخرجون الرسول و ایاکم ان تومنوا باللہ ربکم اور و ما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید آخر وہ میرے راستہ میں

لڑے اور لڑ کر جان دے دی[1]

اس آیت میں بتایا ہے کہ افراد اجتماع کا اصل سرمایہ ہیں انہی کے سدھار پر اجتماع کی صالحیت کا انحصار ہے اور ان ہی کی کامیابی اجتماع کا مقصود ہے۔ افراد جب مل جل کر کام کرتے ہیں تو اس سے ہیئتِ اجتماعی وجود میں آتی ہے اور قرآن کے نزدیک اجتماع ایک بامقصد ہیئت ہے۔ اس کے مقاصد اور مزاج کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرد و اجتماع کے مابین کسی ٹکراؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اجتماعیت افراد ہی کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ افراد اس کے ذریعے اپنے مشترکہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اجتماع فرد کے لیے رحمت ہے کہ یہ ہر فرد کی تمام مادی اور روحانی مفادات کا نگران و محافظ اور ان کی ترقی اور تزکیہ کا ذریعہ ہے اسی کے بطن سے ہجرت، جہاد، راہِ خدا میں مصائب جھیلنا اور مرنے مارنے کے اجتماعی اعمال جنم لیتے ہیں۔ اس اجتماعی عمل میں جو لوگ سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اترے تھے۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر قربانیاں کر رہے تھے اور ایمان و اسلام کے جرم میں معاندینِ اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بن رہے تھے۔ خاص طور پر کمزوروں یعنی عورتوں، غلاموں پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے ان کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ نبوت کا اعجازی کارنامہ ہے کہ ان کی یہ ستم رانیاں کسی ایک شخص کو بھی نبوت سے ہٹانے میں کامیاب ہو سکیں۔

اس آیت میں ان پانچ باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقا و قیام کی اصل بنیاد ہیں۔ یعنی جماعت، سمع وطاعت، ہجرت اور جہاد اجتماعیت کی طرف الذین اشارہ کر رہا ہے۔ سمع وطاعت کے لیے ان اعمال کی نسبت خود بول رہی ہے کہ یہ سننے والے اور طاعت کی سرشاری سے مالامال تھے۔ ہجرت کے لیے لفظ ہاجروا اور جہاد کے لیے قاتلوا آیا ہے۔ دنیا میں کوئی امت زندہ نہیں رہ سکتی جس کی اجتماعی ہستی ان پانچ عناصر سے مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو ان اصولِ خمسہ کے بغیر کامیابی نہیں مل سکتی۔ مٹھی بھر گیہوں کی تلاش میں ہو یا قطب شمالی یا چاند اور مریخ کی تحقیقات کرو کوئی چیز بھی جماعت سمع وطاعت اور ہجرت و جہاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے وہ سب ان پانچ سچائیوں میں پایا ہے۔

حارث اشعری کی اس حدیث میں جسے مسند میں امام احمد نے روایت کیا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی حیاتِ اجتماعی کے لیے ان پانچ باتوں کا صراحۃً ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے،

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لوگو! میں تم کو ان پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہو تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کو جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے گمان میں اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

قرآن کی اس آیت میں ان پانچ باتوں میں سے صراحۃً جن کو بیان کیا ہے وہ ہجرت اور جہاد ہیں، باقی تین باتیں تبعاً سمجھ میں آ رہی ہیں۔

ہجرت کا حاصل یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو ملک ہو وطن ہو اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا۔

جہاد کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اپنی جان و مال سے کمال درجہ کوشش و محنت کرنا۔ قرآن میں یہاں لفظ "قتال" لاکر جہاد ہی بتایا ہے۔

جہاد اور قتال میں نسبت

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں اس لیے جہاد فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا اور قتال فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں لڑنا ان دونوں لفظوں کے ایک معنے نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی قسموں میں سے ایک اعلیٰ ترقسم قتال ہے چنانچہ آپ آگے چل کر سورۂ نسا میں پڑھیں گے المجاهدون في سبيل الله باموالهم وانفسهم اس میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی ہیں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعے جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا، جان کے ذریعے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ہر قسم کی جانی تکلیف بے خطر اٹھاتی جائے یہاں تک کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے آگ میں جلایا جائے، سولی پر لٹکایا جائے۔ تیر اور نیزے سے چھد جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار رہے۔ مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور

سر بلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار ہے۔ جان اور مال کی باطل محبت فرد اور جماعت دونوں کی ترقی وسعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

بہرحال اس فقرے میں اُمت کے اجتماعی اعمال کی نشان دہی کی گئی ہے جن پر دُنیا و آخرت میں اجتماع کی کامیابی کا انحصار ہے۔ زندگی میں کامیابی کے لیے پہلے فقرے میں انفرادی اعمال کا اور اس آیت میں اجتماعی اعمال کا تذکرہ کر کے اب آگے آیت میں اجتماعی اعمال کے دُنیوی اور اخروی نتائج بتائے ہیں۔

دُنیوی اور اخروی جزا کا اعلان

۳۵۶ ۔ ان کے سب قصور معاف کر دوں گا۔ اور ان کو ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یعنی یہ بندے ہیں جن کی تمام تقصیرات معاف کر دی گئی ہیں اور جنت ان کا انتظار کر رہی ہے[1]

اصل ارشاد میں سیئات کا لفظ آیا ہے۔ یہ سام یسوء سے بنا ہے۔ اس کی مراد میں شارحین قرآن نے طول طویل بحثیں کی ہیں اور ان بحثوں سے مختلف گوشوں میں نکل گئے ہیں۔ مدارج السالکین میں حافظ ابن القیم نے سیئات کے موضوع پر ایک سے زیادہ اقوال نقل کر دیے ہیں۔

دراصل اس کی معنوی وسعت حالات وظروف کی وسعتوں اور پہنائیوں کی رہین منت ہے مشتے نمونہ از خروارے آپ بھی دیکھ لیجئے۔ مالک بن فعول کہتے ہیں کہ سیئات اہل سنۃ کے گناہ ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ خطا و نسیان سیئات ہیں سدی کے خیال میں کبائر کے مقدمات اور توابع کا نام سیئات ہے۔ اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

سیئۃ اور حسنۃ دو قسم پر ہیں ایک باعتبار عقل و شرع جیسے وہ کام جن کا ذکر اس آیت میں ہے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا و من جاء بالسیئۃ... الخ دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حسنہ اور سیئہ باعتبارِ طبع کہ طبیعت پسند کرے یا ناگوار سمجھے جیسے ارشاد ہے فاذا جاء تھم الحسنۃ قالوا لنا ھذہ وان تصبھم سیئۃ یطیروا بموسیٰ ومن معہ ۔

دراصل احوال دو قسم کے ہیں انفرادی اور اجتماعی۔ اسی اعتبار سے سیئات بھی دو قسم کی ہیں انفرادی اور اجتماعی۔ یہاں اجتماعی سیئات مراد ہیں۔ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اجتماعی خوش حالیوں کے لیے حسنہ اور اجتماعی بدحالیوں کے لیے سیئہ کہا گیا ہے ایک دعا تے قرآن میں دُنیا اور آخرت دونوں کی اجتماع خوشحالیوں کو حسنہ کہا ہے :

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

اسی بارے میں مدینہ کے یہود اور منافقین کا ذکر کرتے ہوئے ان کا یہ چہرہ پیش کیا ہے ۔

ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوابھا

اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچے تو ان کو غمگین بنا دیتی ہے اور تم کو کوئی بُرائی پہنچے تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں ۔

یہاں سارے شارحین قرآن نے حسنہ سے اہلِ ایمان کی اس دُنیا میں اجتماعی خوش حالی اور سیئہ سے اجتماعی بدحالی مراد لی ہے ۔ میرے خیال میں اس آیت میں سیئات سے اجتماعی بدحالیاں مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کے ان اعمال کے نتیجے میں ان کو یہ جزا عطا فرمائے گا کہ اوّلاً اس دُنیا میں ان کی بدحالیاں دور کر دے گا ۔ اور ثانیاً آخرت میں ان کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہاں اگرچہ اُحد کی شکست کا داغ تازہ تازہ ہے لیکن اہلِ ایمان کے حوصلے بلند ہیں اس لیے دُنیوی کامیابی کا پہلے ذکر کیا اور صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہلِ ایمان کمزور ہیں دُنیوی کامیابی کی منزل دُور ہے اس لیے دنیوی کامیابی کا ذکر بعد میں کیا ہے اور ارشاد ہے لیدخل المومنین والمومنات جنات تجری من تحتھا الانھار ویکفر عنھم سیاتھم

بہترین جزا آخرت میں ہے

۲۵۷ ۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کا ثواب ہوگا اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے ۔ یعنی اچھا بدلہ تو خدا ہی کے پاس ہے اور کہیں سے نہیں مل سکتا یا یہ مطلب ہو کہ اس بدلہ سے بھی اچھا خدا کے پاس ہے یعنی اس کا دیدارِ مبارک رزقنا اللہ وسائر المومنین [1]

[1] فوائد شیخ الاسلام

ثواب، ثاب یثوب ثوباً کے اصل معنے رجوع کرنے اور لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے ثواب ہے جس کے معنے اس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کرنے والے کے عمل کے ردِ عمل کے طور پر اس کو حاصل ہو۔ اگرچہ لفظ میں گنجائش خیر اور شر دونوں کی ہے لیکن اس کا غالب استعمال اچھے عمل کے اچھے ردِ عمل کے لیے ہے بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا ان کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کرکے رب کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے ورنہ ذرے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے؟ من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب سے اسی بعد کو رفع کیا ہے یعنی ہے تو تمہارے ہی عمل کا بدلہ لیکن ہے اللہ کے پاس سے جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں۔ وہ داتا جس کو چاہے دے اس کے پاس کیا کمی ہے![1]

آئیے اب ذرا اس پوری آیت پر ایک نظر ڈالیے اور سوچیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے علم و عمل کے ذریعے کس طرح جان بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور کیسے آپ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ ان میں اللہ کی مدد سے ایمان و عقیدے کی آبیاری کی۔ زندگی کی نئی روح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں اجاگر کر دیں۔ پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا اسی کے لیے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی۔ وہ بے جان پتھر تھے اب وہ انسان بن گئے، پہلے نابینا تھے جن کو خود راستہ کا پتہ نہ تھا اب وہ ساری دُنیا کے رہبر بن گئے۔ پہلے نادان تھے اب وہ دُنیا کے عظیم عالموں میں شمار ہونے لگے جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں۔ اور حکمت ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ قلب کے سچے، علم کے گہرے اور تکلف سے دُور بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے، خطاب کرتے ہیں تو دُنیا کے مورخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔ یہ لاکفرن عنھم سیئاتھم کی واقعاتی تفسیر ہے

---

[1] تدبر قرآن

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ
ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا
رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا
نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِينَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ
سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

اے پیغمبر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا ملکوں میں سیر و گردش کرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے یہ جو کچھ ہے محض تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے پھر بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ کیسا برا مقام ہے[۳۵۸]۔ لیکن جن لوگوں نے متقیانہ سیرت

اختیار کی ہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ یہ ان کے لیے اللہ کی جانب سے مہمانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیکو کاروں کے لیے بہتر ہے[۳۶]۔ بلاشبہ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس کتاب پر بھی جو ان پر نازل کی گئی ہے، اللہ کے آگے جھکے ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات کا تھوڑی قیمت پر سودا نہیں کرتے، یہی لوگ ہیں جن کا اجر اللہ کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا[۳۶۱]۔

سعادت و کامرانی کا شرارت و سرکشی سے مقابلہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے "تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اسلامی نظامِ حیات کا اولین مقصدِ حیات یہ ہے کہ شر و فساد اور کفر و جاہلیت کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کے بقا کا آرزومند اور کشمکشِ حیات میں مبتلا ہے۔ اور اس میدان میں اسلام اس کا تنہا حریف اور مدِمقابل ہے

کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے۔ اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلافصل قائم ہے یہ لڑائی دنیا کی دوسری تمام لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی نزاعیں اور لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور ملتا ہے۔ کفر کی طاقتیں اسلام کے سفرِ اقتدار میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق وصداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اس کی قوتوں کو صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کفر سے جنگ آزما ہو کر اپنے قویٰ کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تقابل اور ان دونوں کا تصادم اسلام کی قوتِ حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و شکست پر ختم ہوتی ہے۔ ان آیات میں کفر و اسلام کا یہی تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے کہ کفر کا عروج ایمان کے مقابلہ میں وقتی ہے۔ یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے۔ حقیقی اور ابدی کامیابی ایمان و تقویٰ کے لیے ہے اور ان کی کامیابی کا آخر کوئی نہیں ہے۔ سورت کی ابتدا اس بیان سے ہوئی تھی کہ اللہ نے روحانی سعادت کے لیے نبوت کے ذریعے نظامِ حیات روانہ کیا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اسے قبول کرتے ہیں سعادت و کامرانی پاتے ہیں جو شرارت و سرکشی سے مقابلہ کرتے ہیں نامراد رہتے ہیں۔ اب اس سورت کا انجام بھی اسی بیان پر ہوا ہے۔ گویا سورت کے تمام بیانوں کا خلاصہ یہ ہے کہ دعوتِ قرآن کے مخالف کتنی ہی سعی و تدبیر کریں اور بظاہر عارضی طور پہ کتنے ہی خوش حال نظر آئیں لیکن بالآخر ہونا یہی ہے کہ دعوتِ قرآن کامیاب ہو۔

۲۵۸۔ اے پیغمبر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا ملکوں میں سیر و گردش کرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے یہ جو کچھ ہے محض تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے پھر بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیسا برا مقام ہے یعنی کفار جو ادھر ادھر تجارت وغیرہ کر کے دولت کماتے اور اکڑتے پھرتے ہیں اہلِ ایمان کو چاہیے کہ ان سے دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ محض چند روز کی بہار ہے اگر ایک شخص کو چار روز پلاؤ قورمہ کھلانے کے بعد پھانسی یا حبسِ دوام کی سزا دی جائے تو وہ کیا خوش عیش ہوا خوش عیش وہ ہے جو تھوڑی سی محنت اور تکلیف اٹھا کر ہمیشہ کے لیے اعلیٰ درجہ کی راحت و آرائش کا سامان مہیا کرے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لا یغرنک خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے آپ کی اُمت کو ہے جیسا کہ عام طور پر حکم سردار اور حاکم کے نام ہوتا ہے مگر مقصود اس کے متبعین اور ماتحت ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علی سبیل التبادل ہر شخص مخاطب ہو۔ تقلب کے معنے لوٹ پوٹ چلت پرت آنا جانا خواہ وہ تجارت کی غرض سے ہو یا نفع کی غرض سے ہو۔ بہرحال شہر بشہر ان کا جانا اور دنیوی منافع اور مکاسب کا حاصل کرنا اور سیر و تفریح کے مزے اڑانا یہ باعث رشک نہ ہونا چاہیے اور اس سے کسی مغالطہ میں مبتلا نہ ہونا چاہیے جیسا کہ بعض لوگوں کو خیال ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دشمن تو دُنیا بھر کے مزے لوٹتے پھرتے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں پھر ہر قسم کے مصائب میں مبتلا ہیں تو کافروں کا یہ عیش اور یہ عارضی فائدہ قابلِ التفات نہ ہونا چاہیے۔ یہ مزے آخرت کے مقابلے میں اول تو حیثیت نہیں رکھتے۔ پھر یہ لوگ آخرت میں ہر قسم کے فائدے سے محروم ہیں، کیونکہ ان کا آخری ٹھکانا دوزخ ہے۔

اس آیت میں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے مراد اس وقت کفار کا ملک کے حالات و معاملات میں وہ آزادانہ و خود مختارانہ تصرف ہے۔ جو مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان کمزور تھے اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھرتے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے تھے ان ہی کمزور مظلوم مسلمانوں کی اس میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے اطمینان دلایا ہے کہ اس وقت کفار کو جو ملک میں غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔[1]

آیت میں کفار کی دُنیوی ترقیوں کو متاعِ قلیل کہا ہے۔ یہ بات اسی وقت کے کافروں کے لیے نہیں بلکہ ہر دور، ہر عہد اور ہر زمانہ کے کافروں کے بارے میں ہے۔ کفر نام ہے پیروی نفس، انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت کا۔ اس دعوت کی قیادت دُنیا کی مختلف جاہلی قومیں اور تہذیبیں کرتی رہی ہیں اور اب تقریباً دو صدیوں سے تقدیر الٰہی نے اس کی قیادت اور امامت کا فیصلہ یورپ کی قوموں کے حق میں کیا اس وقت یورپ کفر کی عالمگیر نمائندگی کر رہا ہے اور ایسی طاقت اور ایسے اسلحہ کے ساتھ کفر کی قیادت اس سے صدیوں پہلے ہمارے علم میں کسی قوم نے نہیں کی، آج بھی قرآن کی یہی پکار ہے کہ اہلِ ایمان ان کی طاقت کو اسی

---

[1] تدبر قرآن

نظر سے دیکھیں کہ یہ متاع قلیل ہے اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کی اس قلت کو سمجھنے کے لیے صحیح مسلم کی یہ روایت پڑھیے کہ مستورد بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے کہ دُنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں بس ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی ایک انگلی دریا میں ڈال کر نکالے اور پھر دیکھے کہ انگلی پر پانی کی کتنی مقدار ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دُنیا آخرت کے مقابلے میں اتنی ہی بے حقیقت اور بے حیثیت ہے جتنا دریا کے مقابلے میں انگلی پر لگا ہوا پانی۔ اور دراصل قلت دُنیا کے لیے یہ مثال بھی صرف سمجھانے کے لیے دی گئی ہے ورنہ فی الحقیقت دُنیا کو آخرت سے یہ نسبت بھی نہیں ہے۔ دُنیا اور جو کچھ دُنیا میں ہے سب محدود اور متناہی ہے اور آخرت لامحدود اور غیر متناہی ہے اور ریاضی کا مسلم مسئلہ ہے کہ محدود اور لامحدود کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ مسند احمد اور ترمذی میں اسی مسئلہ کو ایک اور انداز سے سمجھایا ہے ارشاد ہے:

اگر اللہ کے نزدیک دُنیا کی قدر و قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو وہ ایک گھونٹ پانی بھی نہ پینے دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسُول کے نہ ماننے والوں کو دُنیا سے جو کچھ مل رہا ہے اور جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے خوب مل رہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ کے نزدیک دُنیا نہایت ہی حقیر اور بے قیمت ہے۔ قرآن نے دُنیا کو ان کی نظروں میں اس درجہ حقیر بنا دیا تھا کہ وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہ گرتے تھے بلکہ وہ ان کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہوتے تھے ان میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا۔ اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائیکہ وہ اپنا نام حکومت کے لیے پیش کرے۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرے۔ پھر جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ قرآن نے ایک طویل عرصہ تک ان کی تربیت کی اور ان کو دنیا کے مقصود نہ بنانے کی تعلیم دی۔

اہلِ تقویٰ کا مقام اور ان کی کامیابی

۱۹۸ ۔ لیکن جن لوگوں نے متقیانہ سیرت اختیار کی ہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے یعنی اب اس عیش و کامرانی کا اس چند روزہ بہار سے مقابلہ کرو کہ یہ بہتر ہے یا وہ[1]

آیت میں صرف لفظ تقویٰ بول کر بشارت دی ہے ۔ قرآن میں تقویٰ اپنی معنوی وسعتوں کی وجہ سے اپنے اندر ایسی شان جامعیت رکھتا ہے کہ اگر ہم ساری قرآنی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں ۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنی ہر تعلیم میں اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح کو پیدا کرنا ہے ۔ قاضی بیضاوی نے تقویٰ کی اسی جامعیت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس شخص کو بھی متقی کہا جاتا ہے جو کفر و شرک سے بچتا ہے اور اس شخص پر بھی لفظ متقی کا اطلاق ہوتا ہے جو ہر قسم کے گناہوں سے بچتا ہے ۔ اور جو ماسوی اللہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کا ہو جاتا ہے ۔ اس کو بھی متقی کہتے ہیں اس لیے جس طرح ایک باخدا اور خدارسیدہ شخص متقی ہوتا ہے اسی طرح وہ گنہ گار مسلمان بھی متقی ہے جو صرف کفر و شرک اور بدعت سے بچتا ہے ۔ آیت میں تقویٰ کا اطلاق بتا رہا ہے کہ مراد یہاں تقویٰ کی فرد کامل ہے یعنی جو افکار و عقائد، معاملات، معاشرت، اخلاق و اعمال میں متقی ہو اسی کی رعایت سے ہم نے ترجمہ یہ کیا ہے جو متقیانہ سیرت رکھتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ گو بظاہر ابتدا میں اہلِ تقویٰ کو کتنی ہی بلائیں اور مصیبتیں آئیں یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے ۔ ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے اور اس سے یہ سمجھا جاتے کہ ان کو مال و دولت ، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی ۔ لیکن دُنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دُنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے اور بُرے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے ، حالانکہ جو جتنا دُور بین ہے اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نظر رکھتا ہے حقیقی دُور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں جو کام کی اچھائی بُرائی کا فیصلہ دُنیا کے ظاہری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چندروزہ اور فوری فائدے کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدے کی بنا پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دُنیا بھی ان کی بن جاتی ہے اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز ان ہی کی قسمت میں ہوتی ہے۔

خدا کے وفا شعار بندے

۳۶۰ - ہو ان کے لیے اللہ کی جانب سے مہمانی ہو گی اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ابرار کے لیے بہتر ہے۔ مہمانی اس لیے کہا کہ مہمان کو اپنے کھانے پینے کی کچھ فکر نہیں ہوتی۔ عزت و آرام سے بیٹھے بٹھائے ہر چیز تیار ملتی ہے[1]

یہاں ابرار استعمال ہوا ہے یہ بار کی جمع ہے۔ بار اور متقی میں فرق ہے۔ بار کا درجہ متقیوں سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو اللہ سبحانہٗ کی ناراضگی کے اسباب سے بچالے اور یہ بات صرف محرمات کے چھوڑ دینے اور واجبات کے بجالانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور ابرار بر بمقابلہ بحر سے مشتق ہے جس کے مفہوم میں وسعت داخل ہے لہٰذا ابرار کے مفہوم میں تمام نیکیوں کا بجالانا داخل ہے خواہ فرائض ہوں یا نوافل۔ مطلب یہ ہوا کہ جنات تجری من تحتھا الانھار متقین کی مہمانی ہے اور ابرار کے لیے اللہ کے پاس جو کچھ الطاف وعنایات ہوں گی۔ وہ اس سے کہیں بہتر ہوں گی لہٰذا تمہیں اس کی فکر کرنی چاہیے[2]

بَرّ یا بَارّ کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے عام اس سے کہ خدا کا حق ہو یا اللہ کے بندوں کا حق ہو ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف و ولا، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آ سکتی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حقوق واجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گویا اصل رُوح ایفائے عہد اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ عام اس سے کہ یہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے یہاں ایک طرف ما عند اللہ خیر للا برار کہہ کو ان اہل ایمان کو ابرار بننے کی دعوت دی ہے جنہوں نے دُعا مانگی تھی تو فنا مع الابرار دوسری طرف اہل کتاب پر تعریض

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف قرآن م ا

کی ہے کہ تم ایفائے عہد اور ادائے حقوق میں بالکل صفر ہو۔ محض چند رسوم کی ظاہرداری پیروی کرکے یہ سمجھتے ہو کہ خدا کی وفاداری میں جو مقام ان کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے ۔

اہلِ کتاب میں سے اہلِ تقویٰ

۲۶۱ ۔ بلاشبہ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری طرف روانہ کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو ان پر نازل کی گئی ۔ اللہ کے آگے جھکے ہوتے اور اللہ کی آیات کا تھوڑی قیمت پر سودا نہیں کرتے یہی لوگ ہیں جن کا اجر اللہ کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا ہے ۔ اوپر عام متقین کا ذکر ہوا، اب اہلِ کتاب میں سے جو متقی ہیں ان کا خصوصیت سے ذکر فرماتے ہیں یعنی جو اہلِ کتاب اللہ پر ٹھیک ٹھیک ایمان لاتے، قرآن کو مانا اور چونکہ خود قرآن تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے ان کو بھی مانا مگر اس طرح نہیں جس طرح دنیا پرست احبار مانتے تھے کہ تھوڑے سے دنیوی فائدے کی خاطر آیات اللہ کو چھپا لیا یا بدل ڈالا بلکہ خدا کے آگے عاجزی اور اخلاص سے گرے اور جس طرح اس نے کتابیں اتاری تھیں ٹھیک ٹھیک اسی اصل رنگ میں ان کو تسلیم کیا، نہ بشارات کو چھپایا نہ احکام کو بدلا ایسے پاکباز حق پرست اہلِ کتاب کے لیے اللہ کے ہاں مخصوص اجر ہے چنانچہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ ایسے اہلِ کتاب کو دوہرا اجر ملے گا۔[1]

قرآن میں ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے اولٓئک یؤتون اجرھم مرتین یہ وہ لوگ ہیں جن کو اجر دوبارہ دیا جائے گا۔ یعنی ایک اجر اس ایمان کا جو وہ پہلے حضرت عیسیٰ پر لائے تھے اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر لاتے ہیں۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے ابو موسیٰ اشعری کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثلثۃ لھم اجران رجل من اھل الکتاب آمن بنبیہ و آمن بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم تین شخص ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا ان میں سے ایک وہ ہے جو اہلِ کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

دراصل ہر شخص کی طبیعت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لیے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا فطرتاً شاق گزرتا ہے ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیانِ سماویہ میں کوئی رقابت نہیں ہے پارٹیاں نہیں ہیں۔ اس لیے ان مذاہب کے پیروؤں کو یہی جذبہ رکھنا چاہیے۔ یہ ایک ہی صداقت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے معتقد کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے اس لیے اگر کوئی اہلِ کتاب اسلام قبول کرتا ہے تو یہ اس کو ہرگز وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں ہو جائے گا بلکہ اگر وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر آپ پر ایمان نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی حبط ہو جائے گا کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر ہے۔ اس بشارت میں دراصل اہلِ کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی یہی صورت ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لائیں۔ اور کیوں ایمان نہ لائیں جبکہ ان نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت کا جزء ہے لہٰذا آپ پر ایمان لانا ان سب پر ایمان اور آپ کا انکار ان سب کا انکار ہے اس لیے اگر وہ خدا کے دین یا خدا کے رسولوں کے متعلق فرقہ پرستی کے جذبات رکھیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام اس کو برداشت نہ کرے گا۔ اور الٹا ان کا حاصل کردہ اجر بھی برباد ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب پر ضروری ہے لیکن منہاجِ طاعت صرف اسلام میں منحصر ہے۔

یہ کیسا لطیف اور حسین اندازِ بیان ہے کہ سورت کا آغاز و انجام قطعاً یکساں ہے۔ آغازِ سورت اہلِ کفر، اہلِ کتاب اور اہلِ ایمان سے کیا اور انجام بھی تینوں کے ذکر پر کیا۔ آلِ عمران کے آغاز میں اہلِ کتاب کو اپوزیشن بنا کر پیش کیا اور انجام میں اہلِ کتاب کی تحسین فرمائی جو اپنی سابقہ کتب پر قائم رہے اور دولتِ اسلام سے بھی مشرف ہوئے جیسے البقرہ کے شروع میں المتقین کا چہرہ پیش کرتے ہوئے دونوں کا ذکر کیا تھا ان کا بھی جو مشرکین میں سے ایمان لائے اور ان کا بھی جو اہلِ کتاب میں سے ایمان لائے۔ یہاں بھی دونوں کو متقین میں شمار کیا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱصْبِرُوا۟ وَصَابِرُوا۟ وَرَابِطُوا۟
وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

اے اہل ایمان! صبر کرو اور مقابلے کے لیے تیار رہو، اور ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ [۲۰۰]

اہل ایمان کے لیے فلاح و کامیابی کا منشور

یہ آیت قرآن سورت کے تمام بیانات کا خلاصہ ہے اس میں اللہ سبحانہٗ نے اہل ایمان کو فلاح و کامیابی کا منشور دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر مومنین صالحین کی جماعت خالصۃً اخلاقی و روحانی مقاصد کے لیے نظام حق کی جدوجہد کر رہی ہو تو اس کی کامیابی بالکل یقینی ہے اور محض طبعی اسباب و عوامل یا مادی سروسامان اس کی کامیابی یا ناکامی پر موثر نہ ہوں گے۔ اس آیت میں اہل ایمان سے اللہ کا وعدہ قطعی اور غیر مشتبہ ہے یعنی اگر اہل ایمان ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں اور اپنی طرف سے سعی و تدبیر میں کوئی کوتاہی نہ کریں تو ان کی کامیابی محض اس بنا پر مشتبہ نہ ہو گی کہ اسباب مادی یا کثرت تعداد کے لحاظ سے متقابل جماعتیں اس پر فوقیت رکھتی ہیں بلکہ مقابل قوتیں کتنے ہی زبردست آلات و اسباب سے مسلح ہوں۔ کامیابی انھی کی ہو گی جو صبر سے کام لیں۔ راہ عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جائیں، ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دیں اور اللہ سے ڈرتے رہیں۔ جو اپنے قومی، طبقاتی اور دنیوی مفادات کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم انسانی کی اخلاقی و روحانی فلاح کے لیے مصروف جدوجہد ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ دنیا میں ہر گروہ کے لیے ہر فرد کے لیے اور ہر عقیدے کے لیے خواہ وہ

حق ہو یا باطل کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں یہاں تک کہ جو شخص گمراہی اور فساد کی راہ اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے سعی و عمل کے مطابق کامیابی حاصل کرتا ہے اور کائنات کی کوئی قوت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی تخلیق کچھ ایسی فطرت پر عمل میں آئی ہے کہ اس کی وسیع گردمیں ہر سعی کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے غرض کہ دنیا میں کسی حرکت اور کسی عمل کے لیے مزاحمت نہیں ہے، عدم مزاحمت اس کا بنیادی قانون ہے۔ البتہ کسی فرد یا گروہ کو جو خود قدم نہ اٹھائے کائنات میں آپ ہی آپ کامیاب نہیں کرتی۔ محض خلوص نیت دعائیں اور آرزوئیں خواہ وہ مومن کی ہوں اسے کامیاب نہیں کرسکتی ہیں جب تک عمل کی طاقت اس کے پس پشت نہ ہو لیکن اہل ایمان کے لیے خالق کائنات نے یہ گنجائش رکھی ہے کہ اگر وہ سعی و عمل کے قانون کے مطابق کام کریں اور اپنے مقصد کے لیے ابتدائی قدم اٹھا دیں تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی مساعدت کرنے لگتی ہیں مگر یہ مساعدت حرکت و اقدام اور سعی و عمل کے ساتھ مشروط ہے ان تنصروا اللہ ینصرکم۔

۳۹۲۔ اے اہل ایمان صبر کرو اور مقابلے کے لیے تیار رہو، ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ خاتمہ پر اہل ایمان کو ایک نہایت جامع و مانع نصیحت فرمائی ہے جو گویا ساری سورت کا ماحصل ہے۔ یعنی اگر کامیاب ہونا اور دنیا و آخرت میں بامراد ہونا چاہتے ہو تو سختیاں اٹھا کر بھی طاعت کرو اور اس پر جمے رہو۔ معصیت سے رکو، دشمن کے مقابلے میں مضبوطی اور ثابت قدمی دکھلاؤ۔ اسلام اور حدود اسلام کی حفاظت میں لگے رہو جہاں سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو وہاں آہنی دیوار کی طرح سینہ سپر ہو کر ڈٹ جاؤ واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم اور ہر وقت ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو۔ یہ کرلیا تو سمجھو مراد کو پہنچ گئے اللهم اجعلنا مفلحين وفائزين بفضلك ورحمتك في الدنيا والاخرة۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر یہ دس آیتیں ان فی خلق السماوات سے ختم سورت تک تلاوت کرتے تھے [1]

یہ سورۂ آل عمران کی آخری آیت ہے۔ اس میں وہ تمام بنیادی ہدایات یکجا کر دی ہیں جن کی پیروی اہل ایمان کو اپنی اجتماعی زندگی میں کامیابی اور فلاح سے ہمدوش ہونے کے لیے ضروری ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اول صبر دوسرے مصابرہ تیسرے مرابطہ اور چوتھے تقویٰ۔

صبر کے لغوی معنے اور اس کی قسمیں

صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں یعنی اپنے کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے۔ اس کے معنے بے بسی کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں ہیں۔ بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ سے حافظ ابن القیم نے صبر کی حقیقت کو ایک لطیف مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔

حضرت یوسف پر دو ابتلا آئے اور دونوں میں انہوں نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ ایک یہ کہ بھائیوں نے ان پر جبر کیا اور ان کو چاہ کنعان میں ڈال دیا، دوسرے یہ کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان کو دعوت گناہ دی۔ دونوں میں حضرت یوسف نے صبر کیا لیکن صبر کامل وہ ہے جو دعوت گناہ پر کیا۔ چاہ کنعان میں تو صرف ایک مجبوری اور بے بسی ہے کیونکہ اس میں حضرت یوسف کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے لیکن دعوتِ گناہ پر جو آپ نے صبر کیا ہے وہ واقعی صبر ہے کیونکہ یہاں گناہ سے بچنے میں آپ کے ارادے اختیار اور رضامندی کو پورا پورا دخل ہے۔ اپنے نفس سے جنگ ہے۔ احوال وظروف سارے کے سارے گناہ کے موافق ہیں۔ آپ جوان ہیں اور جوانی کی بھرپور قوت موجود ہے، غیر شادی شدہ ہیں، مسافر ہیں، ہم چشموں کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آزاد نہیں ہیں۔ عورت حسن وجمال والی ہے اور صاحب منصب ہے اور خود گناہ کی داعی ہے اور پھر دعوت نہ قبول کرنے پر جیل کی دھمکی دے رہی ہے۔ ان حالات میں حضرت یوسف کا صبر واقعی صبر ہے۔

بہرحال صبر کے معنے ارادہ واختیار کے ساتھ کسی حق پر اپنے آپ کو مزاحمتوں کے مقابلے میں جمائے رکھنا ہیں اور اپنے آپ کو بے قرار نہ ہونے دینا اور زبان پر شکوہ نہ لانا اور اعضا میں اضطراب نہ ہونے دینا صبر ہے۔ حافظ ابن القیم نے صبر کی تین قسمیں لکھی ہیں اور یہ تینوں اس کے لغوی معنے روکنے سہارنے اور جمانے کے لحاظ سے ہیں۔ صبر علی الطاعات، صبر عن المعاصی صبر علی البلایا۔

صبر علی الطاعات

اس میں صبر کے معنے جمانے کے ہیں۔ دل کی ساری ناگواریوں اور حالات کی ساری ناسازگاریوں کے باوجود احکام خداوندی کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنا صبر ہے۔

ہر حال اور ہر کام میں اللہ کے حکم کی فرمانبرداری اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے اسی لیے حکم ہے ،

واصطبر لعبادتہ اس کی بندگی پر جما رہ

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلے میں ہے ،

وامر اھلک بالصلوٰۃ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو۔

واصطبر علیھا اور اس پر جمے رہو۔

نیک کاموں کو بار خاطر، خلاف طبع اور تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہنا۔ بُری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے بچتے رہنا، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر اللہ کے حضور میں سربسجود ہونا، صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہوکر تہجد پڑھنا، الوان نعمت کی لذتوں سے محروم رہ کر روزے رکھنا، تکلیف ومشقت کے باوجود خطرناک موقعوں پر سچائی سے باز نہ آنا قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام اور راحت جان کر جھیل لینا۔ غرض قرآن وسنت کے احکام کی بجاآوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری صبر علی الطاعات ہے اور یہ صبر کی بہت کڑی منزل ہے۔

صبر عن المعاصی

اپنے کو خدا کی نافرمانیوں سے روکنا اور جن چیزوں سے قرآن وسنت نے منع کر دیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ گناہوں کے سارے کام جو اس وقت دنیا میں بڑے پُر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں۔ اس عارضی وہنگامی خوشی وناخوشی کی پروا کیے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا اور محرمات سے بچنا، سود کی دولت سے دستکش ہونا حسن وجمال کی بے قید لذت سے فائدہ نہ اٹھانا نرے صبر اور برداشت کا کام ہے۔ کسی قارون کے خزانہ مال ودولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی بھر آتے اور اس وقت مال حرام کی کثرت سے اپنے آپ کو روکے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے۔

صبر علی المصائب

لڑائی پیش آجانے کے وقت میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ

صبر ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی عددی قلت کی پرواہ نہ کریں اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت کا یہ تینوں قسمیں منطوق ہیں۔ یعنی فلاح و کامیابی کی اوّلین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ پہلے دل ایمان تمہارے اندر طاعت کی سرشاریاں ہوں اور گناہوں سے تمہارا دامن آلودہ نہ ہو اور میدان جنگ میں ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ ہو۔ جنگ یرموک کے موقعہ پر جب امراء نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی مشکلات کا حال لکھا۔ رومیوں کی کثرت تعداد اور ان کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دی تو انہوں نے جواب دیا۔

> تم سب مجتمع رہو اور ایک فوج بن کر مقابلہ کرو تم اللہ کے مددگار ہو۔ اللہ اپنے مددگاروں کی مدد کرتا ہے کافروں کی مدد نہیں کرتا تم کو قلت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں اگر تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے تو اپنے گناہوں سے ان سے بچ کر رہو۔[1]

موطا امام مالک میں زید بن اسلم کے حوالہ سے حضرت ابو عبیدہ کے ایک اور جنگ میں ایک اور خط کا ذکر ہے کہ انہوں نے حضرت عمر کو لکھا ہے کہ دشمن کی فوجی قوت زیادہ ہے۔ حضرت عمر نے ان کو یہ جواب دیا؛

> بندہ مومن پر جب کوئی افتاد آتی ہے تو اللہ سبحانہ اس کے بعد راہ کھول دیتے ہیں اور یقین کرو کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
>
> یا ایھا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون۔

مصابرہ کے لغوی معنے اور اس کے تقاضے

مصابرہ کے معنے ہیں اپنے حریف کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا اور اس وصف میں دشمن پر بازی لے جانے کی کوشش کرنا اور من حیث الجماعۃ اس کا مظاہرہ کرنا، مطلب یہ ہے کہ میدان جہاد میں تمہارا صبر کافروں کے صبر پر غالب رہنا چاہیے اس چیز کی تاکید اس موقع پر اس لیے

---

[1] البدایہ

کی گئی کہ اس معاملے میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان عملاً مسلح کشمکش شروع ہو گئی تھی اور اس کشمکش میں آخری کامیابی اس گروہ کے لیے مقدر تھی جو اپنے حریف پر استقلال اور پامردی کے میدان میں بازی لے جا سکے۔ میدانِ جنگ میں فتح و شکست کا اصل انحصار تعداد اور اسلحہ پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار پر ہوتا ہے۔ اس لیے مصابرہ کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اہلِ حق کا اہلِ باطل اہلِ ایمان کا اہلِ کفر سے مقابلہ ہو جائے تو ایسی پامردی، استقامت کا مظاہرہ کیا جائے کہ دشمن کی پامردی اور استقامت پر اہلِ ایمان کی پامردی اور استقامت غالب رہے۔ یعنی جو مصیبتیں مخالفین اور معاندین کے ہاتھوں پیش آئیں ان کو برداشت کرو۔ بیضاوی، قرطبی اور الجصاص نے یہی معنے بتاتے ہیں۔ اصل معنے مقابلہ میں صبر کا مظاہرہ کرنے کے اور مضبوطی سے جمے رہنے کے ہیں۔ یہ مدِ مقابل خواہ میدانِ جنگ میں کافر ہوں یا میدانِ عبادت میں خواہشات ہوں۔ چنانچہ امام راغب نے اس کے یہ معنے لکھے ہیں کہ عبادت پر اپنے آپ کو جمائے رکھو اور اپنی خواہشات سے جنگ کرتے رہو۔

مرابطہ کے لغوی معنے اور اس کے تقاضے

مرابطہ کے لغت میں معنے محافظت، نگرانی کرنے اور چوکی و پہرہ دینے کے ہیں۔ اسی کا دوسرا مصدر رباط آتا ہے۔ قرآن میں رباط الخیل اسی سے آیا ہے اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل علامہ خازن فرماتے ہیں کہ مرابطہ کی اصل یہ ہے کہ ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لیے مستعد رہے۔ گھوڑے بندھے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقتِ ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو یہ نہ ہو کہ خطرے کے وقت گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار، اسلحہ اور سامانِ رسد جمع کرنے کی فکر کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو دشمن اپنا کام کر جائے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ مرابطہ ربط سے بنا ہے ربط کے معنے باندھنے کے آتے ہیں۔ مرابطہ کو مرابطہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ مرابطین خطرہ کے پیشِ نظر اپنے گھوڑے باندھے رکھتے ہیں، پھر ہر اس شخص کو کہنے لگے جو سرحد پر اقامت گزیں ہو اور اس کے ساتھ اس کو بھی مرابط کہنے لگے جو کسی طاعت کی انتظار میں اپنے کو باندھ کر رکھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کیا میں تم کو ایسا کام نہ بتا دوں جو خطاؤں کو مٹا دے اور درجوں کو اونچا کر دے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ناگواری کے وقت اچھی طرح وضو کرنا، مساجد کی طرف بکثرت جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا

یہی رباط ہے، یہی رباط ہے، یہی رباط ہے (مسلم نسائی) اسی معنے میں ہے۔

زمانہ کے احوال وظروف بدل جانے سے قوت وطاقت کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ زمانہ نبوت میں قوت تیراندازی تھی آج تیراندازی کو جگہ بندوق کی نشانہ بازی اور بمباری اور رباط الخیل کی جگہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے لی ہے۔

اس آیت کی معنویت کو صرف شارحین قرآن نے نہیں دوسرے بزرگوں نے بھی اپنے فکر ومطالعہ کا مرکز بتایا ہے۔ آئیے آپ بھی لطف اندوز ہو جائیے۔ اصبروا اللہ کی طاعت پر اپنے کو جمائے رکھو۔ صابروا اللہ کی راہ میں قلب کی پوری خوشنودی کے ساتھ ناخوشگواریوں کا استقبال کرو۔ رابطوا اللہ کی طرف اپنے مرکب شوق اسرار کے ساتھ باندھ لو۔ کچھ کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں صبر کرو، اللہ کی مدد سے مقابلہ کرو اور اپنے کو اللہ کے ساتھ باندھے رکھو، کچھ نے بتایا ہے کہ خوشحالی پر صبر کرو، تنگ حالی اور بدحالی کا مقابلہ کرو اور دشمن کے گھر میں مرابطہ ہو کر رہو اور ہر قدم پر اللہ کی نافرمانی سے بچو۔

تقویٰ اور اس کے تقاضے

زندگی کے مختلف حالات میں اللہ کی نافرمانی سے بچنا، اللہ کے غضب سے اور اس کی ناراضگی سے بچنا اور اجتماعی زندگی میں کہیں خدا کی نافرمانی کو نہ اپنانا تقویٰ ہے اور کوئی شخص صحیح معنے میں اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک اسے یہ پتہ نہ ہو کہ اللہ سبحانہ کن باتوں سے ناراض ہوتے اور کن سے راضی اور اس کا پتہ اس وقت تک نہیں لگتا جب تک قرآن وسنت کا مطالعہ نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ متقی ہونے کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے۔

البقرہ میں اہل تقویٰ کا پورا حلیہ پڑھ آئے۔ اس میں نہ صرف عام حلیہ بلکہ ایک ایک خط وخال نمایاں کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہی خدا کی نظر میں متقی ہیں۔

قرآن نے اس آیت میں اہل ایمان کی اجتماعی دنیوی فلاح کو ان باتوں کے ہونے پر موقوف کیا ہے ایمان، صبر، مصابرہ، مرابطہ اور تقویٰ یہ جیسے آخرت کی فلاح کی ناگزیر شرطیں ہیں ایسے ہی دنیوی فلاح کی بھی ان ہی کی ضمانت ہے یعنی دنیوی برکتوں اور کامیابی کے دروازے مسلمانوں پر اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ان شرطوں کو پورا کرتے ہیں۔

مَعَالِمُ الْقُرآن

النسـاء

(۴)

سُورت کا نام

اس سُورت میں عورتوں سے متعلق احکام ہیں اس لیے اس کا نام سورۃ النساء ہے یعنی وہ سُورت جس میں عورتوں کے احکام کا ذکر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سورت میں عورتوں کے علاوہ دوسرے احکام نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سُورت کے آغاز میں عورتوں کے احکام بیان کیے گئے ہیں، اس لیے دوسری سورتوں سے ممتاز کرنے کے لیے اس کا نام سورۃ النساء ہوا۔

سُورت کا موضوع

اس سورت کا موضوع بھی البقرہ، آل عمران کی طرح اجتماعی تقویٰ ہے۔ البقرہ میں منصب امامت کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے اُمت وسطاً کہا تھا۔ اور آل عمران میں خیر اُمت فرمایا۔ البقرہ میں شہادت علی الناس کو اُمت کا فریضہ بتایا، آل عمران میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کو اُمت کا فریضہ بتایا ہے اور اس سُورت میں اُمت کو اجتماعی زندگی میں امانت کی ذمہ داری کا حامل بتایا ہے یعنی حکومت کی ذمہ داری سپرد کی گئی اور حکومت کے مصادر قانون بتائے۔ البقرہ میں پوری انسانیت کو متقی بننے کا تیر بہدف نسخہ بتایا۔ آل عمران میں خاص طور اہل ایمان سے مطالبہ کیا ہے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ۔ اس سُورت میں معاشرتی اور خاندانی زندگی میں تقویٰ پہ زور دیا ہے۔ بیوہ عورتوں کا سوال، مرنے والوں کے نابالغ بچوں کا مسئلہ، تعدد ازواج کا مسئلہ، عورتوں کی حلت وحرمت کا مسئلہ، کون کون سی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے اور کن سے جائز ہے تعداد ازواج کی صورت میں عورتوں کے باہمی حقوق، بیوی سے سلوک، میاں بیوی کی باہم پوزیشن، مرد کی ذمہ داری اور عورت کی ذمہ داری، عورت اور مرد کے مابین جھگڑا اور اس کا تصفیہ، تصفیہ حقوق میں عدل وانصاف سے کام لینا اور کسی کی سفارش اور چکنی چپڑی باتوں میں نہ آجانا، بڑھتی ہوئی سوسائٹی کے پیش نظر اہل قرابت کے ساتھ سلوک، گود پیٹ کے رشتوں کی حفاظت اور باہم حسن سلوک پھر پڑوسیوں کے حقوق۔ یہ سب باتیں آپ کو اس سورت میں ملیں گی۔ پھر جماعت کی اخلاقی اصلاح کے سلسلے میں شراب بندی کی تحریک اور اس کی طرف تدریجی اقدام، سفر اور غزوات میں بعض سہولتوں کا اعلان، میدان جنگ میں نماز کا طریقہ۔ ان تمام باتوں کے ساتھ یہود کی توبیخ، نصاریٰ کو فہمائش کفار عرب کو تنبیہہ منافقوں کے لیے وعید، اہل ایمان کو لغو اور بیہودہ باتوں سے روکنے کے احکام۔ یہ سُورت اس لحاظ سے آل عمران کا تتمہ ہے کہ اس میں معاشرتی تقویٰ کو

واضح طور پر بیان کیا ہے گویا یوں سمجھو کہ اسلامی معاشرے کے لیے سورۃ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں سورۃ نساء
میں کھول کر بتایا گیا کہ اہل ایمان کو اجتماعی تقویٰ کیسے پیدا کرنا چاہیے۔ خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے
ازدواجی زندگی میں قانونی پابندیاں عائد کی گئیں۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق مقرر کیے گئے۔ یتیموں کے
حقوق کا اعلان کیا گیا۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر ہوا۔ معاشی معاملات اور خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا
طریقہ بتایا گیا۔ تعزیری قانون کی بنیاد رکھی گئی، طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ
کر چکا ہوں کہ جیسے البقرہ اور آل عمران میں امت پر پوری انسانی دنیا کی اصلاح کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی
اور امت کو شہداء علی الناس اور خیر امت کا منصب فائز کیا گیا تھا۔ اس سورت میں یہ بات کھول کر
بتائی گئی ہے کہ اس منصب پر کھڑے ہونے اور اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد جب
انسانی زندگی کی قیادت کی گاڑی اس امت کو لے کر چلنی پڑے گی تو اسے کیسے چلایا جائے اور حکومت
کیسے کی جائے۔ سب سے پہلے یہ واضح کیا کہ حکومت ایک امانت ہے اور اسے امانت ہی سمجھ کر
نہیں چلانا ہے۔ پھر نظم مملکت کے دستوری ماخذ بتائے۔ اسلامی دستور کی بنیادیں بتائیں۔ اسلام
میں قانون سازی کا دائرہ عمل اور اس میں اجتہاد کا مقام، قانون سازی، شوریٰ اور اجماع،
انسان کے بنیادی حقوق، غیر مسلموں کے حقوق، اسلام اور عدالت کے فرائض اور قضا کے آداب
اس میں واضح کیے گئے۔

زمانہ نزول اور مقام

مقام کے لحاظ سے تو اس سورت کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا۔ قرطبی کہتے ہیں کہ ایک آیت کو مستثنیٰ کر کے
تمام سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔ مستثنیٰ آیت سے ان کی مراد ان اللہ یامرکم ان تؤدوا
الامانات الی اھلھا ہے اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے
عثمان کو چابی دیتے وقت یہ آیت پڑھی۔ شاید بزرگوں نے حضور کے پڑھنے ہی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا
کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی۔

زمانہ نزول کی حد تک ہم حتماً کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن امام بخاری نے صحیح میں جو حضرت عائشہ
کا بیان درج کیا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سورۃ نساء اس وقت نازل ہوئی جب میں رسول اللہ
کی اہلیہ ہو چکی تھی اور اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ کی رخصتی ہجرت کے پہلے سال ہو چکی تھی،
اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ یہ پوری سورت ۳ھ کے اوائل سے ۴ھ کے

اواخر تک نازل ہو چکی تھی۔

شان نزول سورۃ نساء

پوری سورت یکبارگی نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف فصلوں کی صورت میں نازل ہوئی ہے لیکن جس دور میں نازل ہوئی ہے وہ وقت وہ ہے جبکہ اہل ایمان ایک قابل توجہ جماعت بن چکے تھے۔ بڑے بڑے درباروں میں ان کے تذکرے ہو رہے تھے، سوسائٹی بتدریج بڑھ رہی تھی اور سوسائٹی کی ضروریات بھی وسیع سے وسیع تر ہو رہی تھیں۔ کاروباری، تجارتی، تمدنی اور سیاسی تعلقات مختلف ممالک اور مختلف قوموں سے وسیع ہو رہے تھے۔ ان حالات کے تحت یہ سورت مختلف فصلوں، مختلف بابوں اور مختلف عنوانوں کے ساتھ ۳ھ سے شروع ہو کر ۵ھ کے اوائل تک نازل ہوتی رہی ہے۔ پوری فصلیں نازل ہونے کے بعد اسے سورۃ نساء کے نام سے پکارا گیا۔

---

(۴) سُوْرَةُ النِّسَاءِ مَدَنِيَّةٌ (۹۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا
وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱

اے انسانو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو (بگاڑنے سے) پرہیز کرو یقین مانو کہ اللہ تم پر نگران ہے۔

عائلی نظام

انسانی تمدن کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آئی ہے۔ انہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ گویا خاندان افرادِ انسانی کے فطری میلانات کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ فطری میلانات کے بغیر خاندان کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر انسان ان فطری جذبات سے خالی ہوتا تو کیا خاندانی نظام وجود میں آ سکتا تھا۔ ماں باپ بھائی بہن بیوی شوہر داماد اور خسر کے جو رشتے خاندان بناتے ہیں ان کا وجود نہ ہوتا بہرحال خاندانی زندگی جس شکل میں آج موجود ہے اور ہمیشہ سے موجود رہی ہے وہ صاف طور پر دو انسانوں کے فطری میلانات کی پیداوار ہے۔ خاندان کا وجود درحقیقت انسانی کوششوں کا رہینِ منت نہیں بلکہ فطری اسباب کا نتیجہ ہے۔ جو چیز خاندانی نظام کو استحکام بخشتی ہے اور اس کے وجود کو موثر بناتی ہے وہ باہمی الفت کی فطری کشش خاندانی روایات سے بستگی اور وہ خلقی خصوصیات ہیں جو ایک مورث کی اولاد ہونے کی وجہ سے افرادِ خاندان میں مشترک ہوتی ہیں۔ یہ تمام محرکات خاندان کو ایک منظم اجتماعی دائرہ بناتے ہیں۔ اللہ نے خاندانی نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ پہلے انسان کی تخلیق فردِ واحد سے ہوتی ہے۔ پھر اس کی نسل سے بے شمار افراد پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ہر فرد کی نسل سے الگ الگ سلسلے قائم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سلسلے پھیلتے ہیں اور رفتہ رفتہ خاندانوں، قبیلوں، گروہوں اور بستیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے افراد کے باہمی اجتماع و اتحاد کے لیے صلہ رحمی یعنی نسلی قرابت کا رشتہ پیدا کر دیا ہے اور سوسائٹی کا نظام اسی پر قائم ہے۔ اگر اس رشتے کے موثرات نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نہ پیدا ہوتی۔

یہ رشتہ باہمی الفت و مساعدت کے جذبات پیدا کرتا اور ایک فرد کو دوسرے فرد کے ساتھ ملائے رکھتا ہے۔ لہٰذا نظامِ معاشرت کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ صلہ رحمی کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔

۱۔ اے انسانو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلا دیے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اوّل تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا۔ پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا

کیا اور دنیا میں پھیلایا۔ تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے مطلب یہ ہے کہ جب تم سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور پھر تم کو باقی اور قائم رکھنے والا وہی ہے تو اس سے ڈرنا اور اس کی فرمانبرداری ضروری بات ہے۔ اس سے اشارہ ہو گیا دو مضمونوں کی طرف اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ تم سب کا خالق اور موجد ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام آدمیوں کے لیے سبب وجود کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا کیا ایک ہی جان یعنی ابوالبشر حضرت آدم ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ ہمارا اصلی تعلق اللہ سے ہے کیونکہ وہ علت تامہ ہے اور اس کے معلول میں جس قدر تعلق اور قرب اور علاقہ احتیاج ہوتا ہے وہ کسی میں ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ تعلق اور قرب ہے جو افراد انسانی میں باہم پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا سبب وجود اور مخلوق منہ بالکل شے واحد ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ اوّل تو ہمارے ذمہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت لازم ہونی چاہیے کہ وہ ہمارا خالق ہے اس کے بعد تمام مخلوقات میں خصوصاً اپنے نبی کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہم پر ضروری ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے لیے مخلوق منہ اور سبب وجود ایک چیز کو مقرر فرمایا تو جو قرب اور جو اتحاد افراد انسانی میں باہم موجود ہے وہ کسی دوسری چیز کے ساتھ حاصل نہیں اسی لیے شرعاً اور عقلاً آدمیوں میں باہم حسن سلوک ایسا ضروری اور بدسلوکی اس قدر مذموم ہے جو اوروں کے ساتھ نہیں جس کی تفصیل نصوص اور احکام شرعیہ موجود ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس مضمون کو بیان کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — چو بعضے از بعضے اگر کمتر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضو ہا را نماند قرار

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خالقیت ظاہر فرما کر اپنی طاعت کا حکم دیا اور بنی آدم کے اتحاد اصلی کو جتا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ باہم ایک ہو کر رہو۔ چنانچہ آیت کے آئندہ حصہ سے اس اشارے کو ظاہر کر دیا۔[1]

اس آیت میں اصل اور بالذات تو حکم یہ ہے کہ متقیانہ سیرت اختیار کرو۔ اور خدا کی نافرمانی سے بچو۔ اس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ مخلوق آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی، اس لیے کسی کے لیے روا نہیں ہے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

اس مخلوق کو ایک بے مالک اور بے راعی آوارہ گلہ سمجھ کر اس میں دھاندلی مچائے اور اس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بناتے بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں متقیانہ سیرت اختیار کر کے انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے[1]

آیت کے آغاز میں اس دعوے کے بعد کہ تمہیں اللہ کی فرمانبرداری کرنی چاہیے اس کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ تمہارا رب ہے یعنی نظامِ ربوبیت سے توحیدِ طاعت پر استدلال کیا ہے یعنی جو رب تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اقرار تم خود کرتے ہو۔ اس کے سوا کون بالذات اس کا مستحق ہے کہ اس کی طاعت کا قلادہ گردن میں ڈالا جائے۔ اس کے بعد اسی استدلال کی وضاحت کی گئی ہے اور اس وضاحت میں تین چیزیں پیش کی ہیں۔ ایک کہ تمام انسانیت نفس واحدہ سے اللہ نے پیدا فرمائی ہے دوسرے یہ کہ اسی سے اللہ نے اس کا جوڑا پیدا کیا اور تیسری یہ کہ ان دونوں سے مردوں اور عورتوں کی یہ کثرت ظاہر ہوتی ہے۔

نفسِ واحدہ سے انسانیت کی تخلیق

پہلی بات یعنی تمام انسانیت نفس واحدہ سے پیدا فرمائی ہے۔ اصل ارشاد کے الفاظ یہ ہیں۔ خلقکم من نفس واحدۃ عام شارحینِ قرآن نے یہاں نفس واحدہ سے مراد حضرت آدم کو لیا ہے اور علامہ آلوسی نے اسی کو فقہاء اور محدثین کی طرف منسوب کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی ایک ہی آدم کا گھرانہ ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسلِ آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی، عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں سب خدا کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں[2]

تم کو ایک جان سے پیدا کیا یعنی نوعِ انسان کی تخلیق ابتداءً ایک فرد سے ہوئی۔ دوسری جگہ قرآن نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی[3]
وحدت نوعِ انسانی کا یہ سبق اپنے عمل اور دُور رس نتائج کے اعتبار سے کتنا اہم ہے، آخری

لے[1] ۲[2] تدبر قرآن ۳[3] تفہیم القرآن۔

جدِ اعلیٰ ہر گورے اور ہر کالے کے ہر وحشی اور ہر مہذب کے ہر ہندی اور چینی کے ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اور وہ آدم ہیں یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورثِ اعلیٰ کوئی اور ہیں اور فلاں نسل کے کوئی اور، اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئے اور کھشتری نسل والے ان کے سینہ سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شودر ذات ان کی ٹانگوں سے اصلاً انسان سب ایک ہیں۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں نفس واحدہ کی تین توجیہیں نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر انسان کو مخاطب کیا ہے کہ ایک ہی انسان سے پیدا کیا یعنی باپ سے یہ قفال مروزی کا خیال ہے دوسرے یہ کہ اہلِ عرب سے خطاب ہے اور مراد ان کا مورثِ اعلیٰ ہے یعنی اللہ نے تمہیں قصی بن کلاب سے پیدا کیا اور تیسرے یہ کہ نفس واحدہ سے مراد آدم ہیں۔ آلوسی نے اہلِ تشیع میں سے اس موضوع پر امامیہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کیے ہر دو آدم کے درمیان ایک ہزار سال تھے اور ان کے بعد دُنیا پچاس ہزار سال ویران رہی۔ پھر پچاس ہزار سال آباد ہوئی۔ پھر ہمارے جدِ امجد آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور امام محمد بن علی الباقر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس آدم سے پہلے جو ہمارے باپ ہیں دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے۔ لیکن علامہ آلوسی نے یہ نقل کرنے کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک نہیں ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہاں نفس واحدہ سے حضرت آدم ہی مراد ہیں اور حضرت آدم کی پیدائش ایک تکوینی ارادے کے تحت ہوئی تھی۔ مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہو کر قرآن کی تاویل ظلم عظیم ہے اس موضوع پر قرآن کے تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مفاہمت کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ یہ سعی خام صرف ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے یا تو مسئلہ ارتقاء کے اطراف و جوانب کو ملحوظ نہیں رکھا یا قرآن حکیم میں بے جا تاویل کی اہمیت محسوس نہیں کی۔ مرکزِ حیات روح اور پروٹو پلازم کے مابین تطبیق کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں۔ پہلے فلسفہ قدیم سے دُنیا متاثر تھی اور اب فلسفہ جدید سے مرعوب ہے۔

مسئلہ ارتقاء کس حد تک کس معنے میں صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن حکیم کو اس سے مطلق سروکار نہیں انسان بہر صورت اور بہر حال خلق ضرور ہوا ہے۔ قرآن انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کر رہا ہے اور ہر اس نظریہ اور عقیدے کی تردید کر رہا ہے جو انسان کی تخلیق کے منافی ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو لوگ رُوحِ اسلامی اور پروٹو پلازم کے مابین مصالحت کی سعی کر رہے ہیں۔ ان میں مصر اور ہندوستان کے نئے مفسرین ہیں۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو لوگ

پروٹوپلازم کے قائل ہیں وہ اس حیات کو محض مادی حیات قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں انسانی حیات و موت کی حقیقت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کہ نباتات کی حیات و موت۔ ان میں نشوونما کی استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد کے نہ ہونے کا نام موت۔ اور قرآن حیات و موت کا تعلق تمام تر عالم غیب سے وابستہ کرتا ہے۔ رُوح ایک غیبی حقیقت ہے اس کے نفخ سے انسانی حیات وجود میں آتی ہے۔ پھر اس غیبی حقیقت کے نکل جانے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کے نزدیک موت و حیات وہ نہیں ہے جو اُردو کا شاعر پیش کرتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

امام رازی نے اپنے مذاق کے مطابق اس مسئلہ کو اپنی تفسیر میں دو جگہ پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت عقلی لحاظ سے کسی ایک انسان پر جا کر ختم ہونی چاہیے لابد من انتهاء الناس الى انسان۔

خلاصہ یہ کہ قرآن حکیم کی تعلیم کی بنا پر نسلِ انسانی کی ابتدا حضرت آدم سے ہوئی اور تمام انسانوں کے لیے ان کا وجود اساس ہے۔ اسی وجود کو قرآن نے نفسِ واحدہ کہا ہے اسی کو آدم اور اسی کو بشر بتایا ہے۔

خلق منها زوجها کی تشریح

یعنی اسی نفسِ واحدہ سے اللہ نے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ اس فقرے کی تشریح میں شارحینِ قرآن مختلف الخیال ہیں۔

کچھ بزرگوں کا خیال تو وہی ہے جسے شیخ الاسلام نے پیش کیا ہے کہ حضرت آدم سے اول حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا۔ اصل بات یہ ہے کہ تخلیق حوا کی تفصیلی کیفیت سے قرآن خاموش ہے، جس مشہور حدیث کی بنا پر حضرت حوا کا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں ذکر نہ حضرت آدم کا اور نہ حضرت حوا کا بلکہ اس میں محض عورت کی کج سرشتی کے لیے ایک بلیغ استعارہ ہے۔ حدیث بخاری و مسلم میں اس طرح ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں سے حسن سلوک کرو۔ کیونکہ یہ پسلی کی مخلوق ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ کج اونچی ہوتی ہے۔ اگر تم اسے

سیدھا کروگے تو توڑ دوگے اور اگر چھوڑ دوگے تو ٹیڑھی رہے گی۔

اور بخاری کی دوسری روایت میں بجائے استعارے کے کھلے لفظوں میں تشبیہ آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت پسلی کی طرح ہے اگر سیدھا کروگے تو توڑ دوگے۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح)

اور یہی حدیث امام مسلم نے بھی کتاب الرضاع میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اسی لیے کچھ شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ یہ فطرتِ انسانی کی کجی کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ صاحب مجمع البحار نے بخاری کے مشہور شارح کرمانی سے یہی معنے نقل کیے اور پھر زبان وادب کے لحاظ سے ضلع بمعنے پسلی ایک ثانوی مفہوم ہے۔ اصل معنے کجی اور انحراف کے ہیں۔ جیساکہ زمخشری نے فائق میں اور ابن الاثیر نہایہ میں تصریح کی ہے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر حوا کی تخلیق سے قرآن خاموش ہے اور کوئی صریح ارشادِ پیغمبر بھی موجود نہیں تو پھر حوا کی تخلیق کی یہ تفصیلی کیفیت کیسے معلوم ہوئی؟ دراصل اس موضوع پر توریت میں یہ بیان آیا ہے:

> خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بناکر آدم کے پاس بھیجی۔ (پیدائش ۲: ۲۲، ۲۳)

اور تلمود میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدم کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ ان بزرگوں کا خیال ہے جو کہ حوا کی تخلیق آدم کی پسلی سے نہیں مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور آیت کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ اللہ نے اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس معنے کی قرآن کی دوسری آیات سے تائید ہوتی ہے مثلاً جعل لکم من انفسکم ازواجاً ظاہر ہے کہ اس کے معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔ اس کے یہ معنے کوئی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں۔

یہ تو ان بزرگوں کے موقف کی ترجمانی ہے جن کا خیال ہے کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا نہیں

ہوتی ہیں۔ آئیے اب ذرا ان کی باتیں بھی سن لیجئے جن کو اس پر اصرار ہے کہ حضرت حوا آدم کی پسلی ہی سے پیدا ہوئی ہیں اور آیت قرآنی کا منطوق یہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا بدر عالم ان کی ترجمانی فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

حضرت حوا کی تخلیق کے متعلق قرآنی و حدیثی بیان ہمارے پاس صرف یہی ایک ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا بیان موجود نہیں ہے۔ حضرت حوا کی حضرت آدم کی پسلی سے گو پیدائش فہم سے بالاتر بات ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ پر ذرا غور کر لیا جائے تو راہ کی دشواری ختم ہو جاتی ہے۔ حدیث میں حضرت حوا کے بارے میں ولد کا لفظ نہیں بلکہ خلق آیا ہے یعنی ان کی ولادت کا ذکر نہیں بلکہ تخلیق کا بیان ہے۔ چونکہ اردو زبان میں دونوں کا ترجمہ یکساں ہے اس لیے یہاں خواہ مخواہ الجھن سی ہو گئی ہے۔ حدیث یہ نہیں کہتی کہ حضرت حوا کی ولادت پسلی سے ہوئی تھی بلکہ یہ کہتی ہے کہ ان کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے یعنی جس طرح حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے تھے حضرت حوا ضلع آدم یعنی ان کی پسلی سے بنائی گئیں۔ ہمارے نزدیک تو انسان کی انسان سے تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی کہ انسان کی مٹی سے بعید ہے۔ اس حدیث کے بیان کو اگر سورۃ نسآ کی اس آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت نہ تو براہ راست ابتداً پیدا کی گئی ہے اور نہ صرف ایک وحدت سے پیدا کی گئی ہے بلکہ ایک تدریجی عمل کے ذریعے یہ سب کچھ ہوا ہے اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ پہلے ایک نفس کی تخلیق ہوئی پھر اسی سے اس کے جوڑے کی تخلیق ہوئی، پھر ان دونوں سے انسانوں کی یہ کثرت پیدا کی گئی۔ اب اگر فرض کر دکہ حضرت حوا کی تخلیق بھی حضرت آدم کی طرح مستقل ہوتی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مادہ تخلیق کیا تھا۔ قرآن کریم اور حدیث میں مذکورہ بالا صورت کے علاوہ اس باب میں کوئی بیان نہیں۔ نیز اگر حضرت حوا کی تخلیق بھی مستقل مانی جائے تو پھر انسانوں کی کثرت کے ظہور کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ ہم نے اس کثرت کو آدم و حوا سے پیدا کیا ہے جیسا کہ حضرت حوا کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد بھی انداز اختیار کیا ہے وبث منهما رجالاً كثيرا ونساءً

سورۃ بقرہ میں امام قرطبی نے صرف اسی تفسیر کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ عربی زبان میں عورت کو امرأۃ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ المرء سے بنی ہے جس کے معنے مرد کے ہیں اور اس کا نام حوا بھی اس لیے رکھا گیا کہ وہ ایک حی یعنی زندہ ہستی سے بنائی گئی۔ گویا یہ حقیقت

حضرت حوا کی تخلیق سے لے کر ان کے نام تک میں سرایت کر گئی ہے بلکہ احکام میں بھی اس کا اثر یہاں تک ظاہر ہوا کہ امام شافعی کے مذہب میں شیرخوار لڑکے کا پیشاب بہ نسبت شیرخوار بچی کے نجاست میں خفیف سمجھا گیا۔ جب امام شافعی سے اس فرق کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے یہ نکتہ آفرینی فرمائی کہ نوع انسانی میں مرد کی پیدائش آب وگل سے ہوتی ہے اور وہ پاک ہے اور عورت کی تخلیق گوشت خون سے ہوتی ہے اور وہ ناپاک ہے اس لیے نوع انسانی میں بھی اپنی اصل کے احکام باقی رہ گئے۔ امام موصوف کا یہ بیان صرف ایک علمی نکتہ ہے ورنہ مسئلہ کی بنیاد صحیح حدیثوں پر ہے فروع کی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

نیز عقلی طور پر بھی تخلیق کی چار ہی صورتیں ہیں۔

اولاً ——— والدین کے بغیر پیدائش ہو جائے جیسے حضرت آدم کی تخلیق

ثانیاً ——— والدین کے ذریعے پیدائش ہو جیسے کہ عام معمول ہے۔

ثالثاً ——— صرف والدہ سے پیدائش ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اب صرف ایک صورت باقی رہتی ہے جس میں صرف مذکر سے تخلیق ہو۔ اگر حدیث مذکور میں تاویل نہ کی جائے اور خلق منہا زوجہا کے منہ میں کچھ اور مطلب نہ ڈالا جائے تو حضرت حوا کی تخلیق اسی چوتھی صورت کا مصداق ہوگی ورنہ دائرہ تخلیق میں صرف یہی ایک صورت ہوگی جس کی مثال نہ ہوگی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری صورت کے علاوہ سب صورتیں عقلاً ناقابل فہم ہیں۔ اسی لیے نصاریٰ نے اگرچہ حضرت مسیح کی پیدائش کا صرف والدہ سے اعتراف تو کر لیا لیکن پورے طور پر اسے سمجھ نہ سکے حتیٰ کہ مافوق الفہم ہونے کی وجہ سے اعتراف کے باوجود اسے ابنیت کی دلیل بنا لیا۔ اور دوسری طرف یہود نے اس خلقت کے غیر معقول ہونے کی وجہ سے حضرت مریم پر بہتان لگا دیا۔ حضرت حوا کی شخصیت حضرت آدم کے اہم واقعات میں اس طرح گم ہے کہ یہاں نئے نئے محققین صاف طور پر علانیہ تو کچھ نہیں کہتے مگر ان کے دلوں میں تخلیق کی اس نوع میں کچھ شبہات ضرور ہیں۔

ہماری رائے میں مذکورہ بالا حدیث خلق منہا زوجہا کے اجمال کا بیان ہے اور اس تخلیق کا نکتہ بھی قرآن نے دوسری جگہ خود بیان کر دیا ہے۔ ارشاد ہے جعل منہا زوجہا لیسکن الیہا سورۃ نساء میں خلق منہا زوجہا اور سورۃ اعراف میں جعل منہا ہے اور دونوں جگہ حضرت حوا کا ذکر ہے مگر سورۃ اعراف میں اس کی حکمت بیان کی گئی ہے اور یہ حکمت بھی یہی چاہتی ہے کہ حوا آدم ہی سے بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ انسان میں انس جتنی ہم جنس سے ہوتی ہے۔

اس سے زیادہ کشش اس کی طرف ہوتی ہے جو خود اسی سے پیدا شدہ ہو۔ اسی لیے جو محبت اپنی اولاد سے ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ اجنبی مرد و عورت کے درمیان عقد نکاح کے فوراً بعد جس محبت کا مشاہدہ ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ بعید نہیں کہ ان کے اصول میں ضرور کوئی ایسا رشتہ ہونا چاہیے۔ حضرت حوا کی حضرت آدم سے تخلیق نہ ہوتی تو نسل انسانی میں کسی مرد کو کسی عورت کی طرف کبھی رغبت نہ ہوتی۔

شاید آپ یہ سوچیں کہ آدم سے حوا کی تخلیق کیوں کر ہوئی۔ میں خود سائنس کا طالب علم نہیں مگر آپ کے ذہنی اور دماغی سکون کی خاطر مشہور ڈاکٹر مرحوم رفیع الدین کا وہ بیان پیش کرتا ہوں جو انہوں نے قرآن اور علم جدید کتاب میں حوالہ قلم کیا ہے فرماتے ہیں :

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے پہلو سے پیدا کیا ہے۔ یہ تصور بشر کی فوری تخلیق سے نہیں بلکہ تدریجی ارتقائی تخلیق سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر خدا نے آدم کا پتلا بنا کر اسے پھونک سے فی الفور زندہ کر دیا تھا تو وہ حوا کو بھی اس کے ساتھ ہی اسی طرح پیدا کر سکتا تھا۔ انسان جیسے ایک ترقی یافتہ جاندار کا کوئی ٹکڑا ایک مکمل جاندار نہیں ہو سکتا۔ مرد کے پہلو سے عورت کے پیدا ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ جسد انسانی کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے جاندار کے توالد کا طریق یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن میں ہر ایک حصہ ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ پھر بدنی ارتقاء کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ نر کے فرائض کے لیے موزوں ہوتا ہے اور پھر جسمانی ارتقاء کی انتہا پر جب انسان کا ظہور ہوتا ہے تو اپنے اجداد کی طرح وہ بھی ازدواج کی شکل میں ہوتا ہے۔

(قرآن اور علم جدید)

اصل یہ ہے کہ کیفیت کی تفصیل کا تعلق تو ایسے عالم سے ہے جس کے لیے ہماری تعبیرات کام نہیں دے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرے گی جو ہمیں پیش آتی رہتی ہے لیکن تکوین کے جو معاملات ہیں ان کی نوعیت ہی دوسری ہے وہ ہماری محسوسات و مفہومات کے دائرے سے باہر کے معاملات ہیں اس لیے صرف وہ ہی کچھ ماننا چاہیے جس کی قرآن و سنت رہنمائی کر رہے ہیں۔

مردوں اور عورتوں کی کثرت

اصل ارشاد میں وبث منھما رجالاً کثیراً و نساء کے الفاظ ہیں مطلب یہ ہے کہ جس طرح آدم تمام انسانوں کے باپ ہیں ایسے ہی حوا تمام انسانوں کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم ہی سے بنایا ہے اس لیے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گنہ گار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ اس کو حقیر و ذلیل سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے نہ کمزور خیال کر کے اس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ آلوسی نے ابوالبقاء سے یہ نکتہ خوب نقل کیا ہے کہ یہاں لفظ کثیر رجال کی صفت نہیں ہے بلکہ اس کا موصوف محذوف ہے یعنی بثاً کثیراً مطلب یہ ہے کہ ان دونوں ہی سے زمین میں مردوں اور عورتوں کا بہت پھیلاؤ ہوا ہے۔ آدم کے وقت سے لے کر اب تک جو آبادی ہر ملک اور ہر زمانہ میں رہی ہے اس کے مجموعہ پر بھی اگر کثیر کا اطلاق نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔

اہلِ قرابت کے حقوق

۲۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو، یقین مانو کہ اللہ تم پر نگران ہے۔ خالق اور رب یعنی موجد اور مُنعم ہونے کے علاوہ اللہ سے ڈرنے اور اس کی طاعت کے وجوب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم اس کا واسطہ دے کر باہم ایک دوسرے سے اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہو اور آپس میں اس کی قسمیں دیتے ہو اور ان پر اطمینان حاصل کرتے ہو۔ یعنی اپنے باہمی معاملات اور حاجاتِ عارضہ میں اسی کا ذریعہ پکڑتے ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ وجود اور بقا ہی میں احتیاج منحصر نہیں بلکہ تمام حاجتوں اور کاموں میں بھی اس کے محتاج ہو اس لیے اس کی اطاعت کا ضروری ہونا اور بھی محقق اور ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد تم کو حکم یہ ہے کہ قرابت سے بھی ڈرو یعنی اہلِ قرابت کے حقوق ادا کرتے رہو اور قطع رحم اور بدسلوکی سے بچو۔ بنی نوع یعنی تمام افرادِ انسانی کے ساتھ علی العموم سلوک کرنا تو آیت کے پہلے حصہ میں آ چکا تھا۔ اہلِ قرابت کے ساتھ چونکہ قرب و اتحاد مخصوص اور بڑھا ہوا ہے اس لیے ان کی بدسلوکی سے خاص طور پر ڈرایا گیا کیونکہ ان کے حقوق دیگر افرادِ انسانی سے زیادہ ہیں چنانچہ حدیثِ قدسی میں ہے۔

اللہ سبحانہ نے رحم سے خطاب کرکے فرمایا میں اللہ ہوں میں رحمان ہوں، رحم شکم مادر کا نام رحمان اپنے نام سے میں نے نکالا ہے جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا اور جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا۔[1]

ایک اور ارشاد میں حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا ہے:

جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا۔ اللہ نے فرمایا ٹھہر جا۔ یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں اور جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں[2]

ایک اور ارشاد ہے کہ:

رحم رحمان سے ہے اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے جو اسے قطع کرے گا میں اسے قطع کروں گا اور جو اسے ملائے گا میں اسے ملاؤں گا۔

ایک اور حدیث ہے کہ:

رحم عرش الٰہی کے نیچے لٹکا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ سن لو جو مجھ کو ملائے گا اللہ اس کو ملائے گا اور جو مجھے قطع کرے گا اللہ اسے قطع کرے گا۔

یہ ارشادات اس پر شاہد ہیں اور رحم کے اختصاص مذکور اور تعلق کی طرف مشیر ہیں تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ معدن وجود اور منشاء وجود کے اتحاد کے باعث تو تمام بنی آدم میں رعایت حقوق اور حسن سلوک ضروری ہے اس کے بعد اگر کسی موقعہ پر کسی خصوصیت کی وجہ سے اتحاد میں زیادتی ہو جائے جیسے اقارب میں یا کسی موقع پر شدت احتیاج پائی جائے گی جیسے یتامیٰ اور مساکین وغیرہ تو وہاں رعایت حقوق میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ ان کے علاوہ جب حکم خداوندی بھی صاف آگیا کہ ارحام کے حقوق کی رعایت اور حفاظت بھی رکھو تو اب یہ تاکید انتہا کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس سورت میں بیشتر احکام اسی تعلق عام اور دیگر تعلقات خاصہ کے بارے میں مذکور ہیں گویا سلسلے احکام اس قانون کلی کی جو یہاں ذکر ہوا ہے تفصیل ہیں۔[3]

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس ارشاد میں والارحام کو جمہور قراء نے میم کو زبر کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے اس کا عطف لفظ اللہ پر ہوگا یعنی جو واتقوا اللہ میں واقع ہے اور ترجمہ اس طرح

---

[1] [2] صحیح بخاری [3] افادات شیخ الاسلام

ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور قرابتوں سے ڈرو۔ یعنی نہ اللہ کی نافرمانی کرو اور نہ اہل قرابت سے قطع رحمی کرو، بلکہ ان سے صلہ رحمی کرو اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ شیخ الاسلام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور بعض قراء نے والارحام کو میم کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا عطف تساءلون بہ میں ضمیر مجرور پر کیا ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہو گا کہ اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو اور رحموں اور قرابتوں کے واسطے سے بھی تم سوال کرتے ہو۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ جب اپنے کسی رشتہ دار کے پاس حاجت لے کر جاتے تو یوں سوال کرتے اسئلک باللہ والرحم میں تجھ سے اللہ اور قرابت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں۔

اسی دستور کے مطابق اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور حقوق رحم و قرابت کو جانتے ہو اور اس کا واسطہ دے کر لوگوں سے سوال کرتے ہو تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ خدا سے ڈرو اور اعزاء و اقرباء کے حقوق شریعت کے موافق ادا کیا کرو[1]

علامہ آلوسی نے اس پر بڑی طویل بحث کی ہے بہر حال ہمارے نزدیک زبر والی قرآت راجح ہے۔ یہاں قرآن نے اللہ کے ساتھ ارحام کا ذکر کر کے اہل قرابت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی حق قرابت کو عربی زبان کے محاورے میں صلہ رحم کہتے ہیں۔ قرآن کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ قرآن حکیم کی کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ فرض قرار دیا ہے۔ آیت میں والارحام لا کر اشارہ کیا ہے کہ رحم مادری تعلقات قرابت کی جڑ ہے۔ کسی معاملہ میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی اور کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین کے حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے لیکن ان تمام بندھوں کے ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے

---

[1] معارف مولانا محمد ادریس

باہر ہے۔ اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ آگے چل کر چونکہ باہمی حقوق بیان کرنے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ خاندانی بہتری اور استواری کے لیے ضروری قوانین بتانے ہیں اس لیے تمہید اس طرح اٹھائی گئی ہے کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی بتکرار تاکید کی دوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ تمام انسان ایک ماں اور باپ سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت ہیں تیسری طرف ارحام کا ذکر کرکے حق شناسی اور رحم سے وفاداری مخاطبوں کے جملۂ دماغ میں اتار دی۔ یہ گویا مقدمہ اور تمہید ہے ان قوانین کے لیے جو معاشرہ کی اصلاح کے لیے آگے بیان ہو رہے ہیں۔

آخر میں فرمایا ہے کہ ان اللہ کان علیکم رقیباً یقین مانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے یعنی تمہارے تمام احوال و اعمال سے واقف ہے اس کے حکم کی متابعت کروگے تو ثواب پاؤ گے۔ ورنہ مستحق عذاب ہوگے اور تمہارے تعلقات ارحام اور ان کے مراتب اور ہر ایک کے مناسب اس کے حقوق کو بھی خوب جانتا ہے اس لیے اس کے متعلق جو تم کو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اس پر عمل کرو[1] رقیب کے معنے دیکھ بھال کرنے والا، نگہبان اطلاع رکھنے والا) اُردو اور فارسی کے شعراء اس لفظ کو بہت استعمال کرتے ہیں اور باوجود بکثرت مستعمل ہونے کے پھر اس لفظ نے اپنے حقیقی معنے کو ترک نہیں کیا۔ اس نگرانی میں انسان کے ذاتی، خانگی اجتماعی سارے معاملات آگئے۔ اگر اس کا استحضار رہے تو خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار ہو جائیں۔

خطبہ نکاح میں اس آیت کی تلاوت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو دوسری دو آیتوں کے ساتھ خطبۂ نکاح میں تلاوت کرتے تھے۔ اس آیت میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد عورت پیدا ہوتے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق کا اور ان رحموں اور رشتوں کا لحاظ کریں جو ہماری تخلیق کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ بھی نکاح ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دُنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا اس لیے دُنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطہ خیال سے بھی دُنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دُنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور اُلفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔

دراصل اس آیت میں انسانی اقدار کی طرف رہنمائی کی گئی اور ان ہی قدروں کو بتانے کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت خطبۂ نکاح میں تلاوت کرتے تھے تاکہ عورتوں کے بارے میں کمتری کا ذہن اوّل وہلہ میں ختم ہو جائے دوسری دو آیتیں آپ جو تلاوت کرتے تھے۔ ان میں ایک آل عمران کی آیت یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون اور دوسری سورہ احزاب کی آیت یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیداً الی اخر الآیۃ۔ پہلی آیت میں ایمانی قدروں اور دوسری آیت میں اخلاقی قدروں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا
اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ
ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ
فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَىْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ﴿۴﴾

اور یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دو اور اچھے مال کو برے مال سے نہ تبدیل کرو - اور ان کا مال اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر خورد برد نہ کرو بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۲ - اور اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچیوں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار - اور اگر تمہیں اندیشہ ہو

کہ تم ان میں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے
شادی کرو یا پھر ان عورتوں کو بیوی بنا کر رکھو جو تمہارے قبضے
میں آئی ہیں یہ بے انصافی سے بچنے کے لیے زیادہ قرین صواب
ہے۔ اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ فرض جانتے ہوئے
ادا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے مزے
سے کھا سکتے ہو۔

یتامیٰ کے حقوق

جس [illegible] یتیمی کا داغ لگ گیا ہو [illegible]
ہے اس کو ہر قدم پر محبت کا سہارا [illegible] بڑھ کر اور کون شخص [illegible] کا مستحق ہو
سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ [illegible] یتیموں کے ساتھ نہایت [illegible] شفقت اور مہربانی سے پیش
آنے کا حکم دیا ہے۔ اس کو ڈانٹ [illegible] اس پر سختی کرنے، اس کے ساتھ [illegible]
اور اس کا مال [illegible] کی سخت ممانعت کی گئی ہے بلکہ مسلمان کا تو [illegible]
ہے کہ اس کے ساتھ [illegible] شفقت و الفت سے پیش آئے [illegible] کے ساتھ
اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے [illegible]
[illegible]

قرآن کے [illegible] کے ساتھ [illegible]
[illegible]

لیے یتیم کی تربیت کتنی ضروری ہے یہ والد کی ذات ہے جو اپنی چھوٹی اولاد کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و فلاح کی کفیل ہوتی ہے۔ اس کو دین و دنیا میں ہر طرح بامراد بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے لیے معاشی فراوانی کے ذرائع سوچتی ہے اور اس کی زندگی کو ہر طرح خوش گوار بنانے اور اخلاقی و معاشی تباہیوں سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں اختیار کرتی ہے اور اس طرح اس کو صالح تمدن کا ایک لائق شہری بناتی ہے۔ اگر بچے اپنے باپ کی کفالت اور تربیت سے محروم ہو جائیں جیسا کہ احد میں ستر صحابہ کی شہادت سے ہوا اور ان کی تربیت کا کوئی قانونی نظم نہ ہو تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ ان کا نشوونما غلط ماحول میں ہوگا جس کی وجہ سے وہ ناشائستہ اطوار سے قریب اور اخلاق حسنہ اور کمالات انسانی سے دور ہوتے جائیں گے۔ ان آیات میں قرآن نے صرف اخلاقی نہیں بلکہ قانونی طور پر اسی کا انتظام کیا ہے اور احد کے بعد مسلمان جس نئی صورت حال سے دوچار ہوئے تھے اس کے تحت نئی ہدایات دی گئی ہیں۔ ان میں اولیت یتیموں کو دی گئی ہے۔ ان کے حقوق کا ذکر کیا گیا۔

یتیموں کے مال کی حفاظت

۲۔ اور یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دو اور اچھے مال کو برے مال سے نہ تبدیل کرو اور ان کا مال اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر خورد برد نہ کرو بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ یعنی یتیم بچے جن کا باپ مر گیا ہو ان کے ولی اور سرپرست کو یہ حکم ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دے اور زمانہ تولیت میں یتیموں کی کسی اچھی چیز کو لے کر اس کے معاوضہ میں بری اور گھٹیا چیز ان کے مال میں شامل نہ کرے اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاتے۔ مثلاً ولی کو اجازت ہے کہ اپنا اور یتیم کا نقصان نہ ہونے پاتے۔ یہ نہ ہو کہ اس شرکت کے بہانہ سے یتیم کا مال کھا جائے اور اپنا نفع کرے کیونکہ یتیم کا مال کھانا سخت گناہ کی بات ہے۔ احکام متعلقہ ارحام میں یتیموں کے حکم کو شاید اس لیے مقدم کیا کہ یتیم اپنی بے سروسامانی، مجبوری، بے چارگی اور بے کسی کے باعث رعایت و حفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے۔ اور اسی اہتمام کی وجہ سے تبدیل اور شرکت کے نقصان کی بھی کھول کر ممانعت فرما دی۔ اور آئندہ متعدد آیات میں یتیموں کے چند احکام ارشاد ہوئے ہیں جن سے اہتمام مذکور ظاہر و باہر معلوم ہوتا ہے اور یہ تمام احکام اور تاکیدات جملہ یتیموں کے حق میں ہیں۔ البتہ وہ یتیم جو قرابت دار ہیں ان

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے کہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیتے تھے۔ [illegible]

کثرت سے ہوتا تھا۔ قرآن پاک میں ان کی اس شکل کا ذکر کیا ہے۔

کلا بل لا تکرمون الیتیم یہی ہے کہ یتیم [illegible]

[illegible]

[illegible]

وتاکلون التراث اکلا لما [illegible]

یتامی کے متعلق اخلاقی ہدایات

[illegible]

[illegible]

ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے

او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ یتیما ذا مقربۃ

بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلا کر

نیک اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ یہ ہیں

و یطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً و یتیماً و اسیرا

اور اس کی محبت کے ساتھ غریب، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں

یتامیٰ کے بارے میں قانونی ہدایات

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کر لی۔ اس سورت میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص قانونی ہدایات آئی ہیں۔ اس آیت میں تین قانونی دفعات ہیں۔

اول جو لوگ یتیموں کے نگران اور محافظ ہوں انہیں چاہیے کہ ان کا مال ان کو دیانتداری کے ساتھ حوالے کر دیں۔

دوم ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی چیز کو ناکارہ چیز سے بدل ڈالو۔

سوم ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر خورد برد نہ کرو۔

سب سے پہلی دفعہ کے لیے اصل ارشاد یہ ہے کہ آتوا الیتامیٰ اموالھم اس میں روئے سخن یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں کی طرف ہے اور اس کا عطف اوپر واتقوا اللہ پر ہے۔ یعنی تقویٰ کا اس موقعہ پر اولین تقاضا یہ ہے کہ اے سرپرستو اور اے متولیو ان یتیموں کے مال ان کے بالغ ہونے پر ان کے حوالہ کر دو اور اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ تم ان کی جانب سے مطالبہ کا انتظار کرو۔ یہاں یہ عجیب نکتہ ہے کہ اب جبکہ وہ بالغ ہو چکے ہیں ان کو یتیم کہا جا رہا ہے اور ان کو جائداد اور سامان سپرد کیا جا رہا ہے۔ یہ استصحاب کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو یتیم تھے اور اب بالغ ہو کر اپنا زمانہ یتیمی ختم کر چکے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم ابی طالب کہتے ہیں۔ اور حضرت مولانا اشرف علی نے یہاں یتامیٰ کو اپنے معنے میں رکھ کر یعنی بن باپ کے نابالغ بچے مطلب یہ بتایا ہے کہ اودیا۔ کو حکم ہے کہ ان کی یتیمی کے زمانے میں ان کی تعلیم و تربیت ان کی رہائش خوراک پر خرچ کرتے رہو۔ اب دینے کے معنے حوالہ کرنے کے نہیں بلکہ ان پر خرچ کرنے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال ان پر خرچ کرو خود نہ کھاؤ اور اس معاملہ میں پھونک پھونک

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible] فرماتے ہیں کہ:

[illegible]

اس [illegible] کی دوسری وجہ یہ ہے کہ [illegible]

[illegible] ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب [illegible]

[illegible] اپنے [illegible] سے تبدیل نہ کرو [illegible]

[illegible]

اس [illegible] کی تیسری وجہ یہ ہے کہ [illegible]

[illegible] شامل کر لیا کرتے تھے [illegible]

ہیں اور یتیم کو بھی کھلاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم تو ان کی خدمت کر رہے ہیں اور کام چونکہ بے حساب ہوتا ہے اس لیے ظاہر میں گرفت بھی کوئی نہیں۔ قرآن نے یہاں اسی کمزوری کا ذکر کیا ہے اور تنبیہہ فرما دی ہے کہ یتامیٰ کے اموال کا حساب بالکل علیحدہ رکھو اور اگر ملانا ہی ناگزیر ہو تو حساب صاف رکھو جس میں نہیں یہ یقین ہو کہ یتیم کا مال تمہارے ذاتی خرچ میں نہیں آیا۔

اس اندازِ بیان سے ایک طرف یہ اشارہ فرما دیا کہ یتیموں کے مالوں میں خورد برد کرنے والے عموماً مالدار لوگ ہوتے ہیں دوسری طرف یہ جتا دیا کہ یتیموں کے کچھ سرپرست جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ اوّل تو یتیموں کا سارا حق ہی دبا بیٹھتے ہیں اور اگر دبا نہیں بیٹھتے تو اس میں خورد برد کرنے کی نیت سے انتظامی سہولت کی نمائش کر کے ان کے مال کو اپنے مال سے ملا لیتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے ہاتھ رنگنے کے مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو اس آیت میں بتایا ہے کہ یتیموں کا مال محفوظ رکھو خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر اس مقصد کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں ان کے متعلق واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ ان کے مال کی حفاظت کرو اور یہ حفاظت ایسی ہو کہ نہ اپنا ناقص مال ان کے اچھے مال سے بدلنے کی تدبیریں کرو اور نہ ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو خورد برد کرنے کی کوشش کرو۔ ہاں اگر ایک شخص انتظامی سہولت کی خاطر کسی یتیم کے مال یا اس کے کاروبار کو اپنے کاروبار میں شامل کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب آپ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں پڑھ چکے ہیں وان تخالطوھم فاخوانکم واللہ یعلم المفسد من المصلح اس میں اجازت بھی دے دی اور تنبیہہ بھی فرما دی کہ یہ بات ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس اشتراک سے کس کے پیشِ نظر یتیم کی بہبود ہے اور کون یتیم کا مال کھانا چاہتا ہے۔

صحابہ اس تعلیم کا نمونہ تھے

قرآن کی اس تعلیم کا واقعات کی دنیا میں اگر مشاہدہ کرنا ہو تو صحابہ کرام کو دیکھو۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت میں نگرانی برتنے لگے بلکہ ان کی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیرچشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم کا مقدمہ آگیا۔ یتیم نے ایک شخص پر نخلستان کے متعلق دعویٰ کیا مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔ وہ یتیم اس پر رو پڑا۔ آپ کو

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] قرآن [illegible]
[illegible] اس وقت [illegible] جب [illegible]
[illegible] اسلام کی حکومت دنیا [illegible]
مصر، شام، عراق، ہندوستان [illegible] مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
شادی کا انتظام کریں۔

چار تک شادی کی اجازت

۴۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جو تم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ چار تک نکاح کی تم کو اجازت ہے۔ قاعدہ شریعت کے مطابق ان سے نکاح کر لو تاکہ یتیم لڑکیوں کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ تم ان کے حقوق کے نگران رہو گے اور خود تم بھی کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو گے۔ جاننا چاہیے کہ مسلمان آزاد کے لیے زیادہ سے زیادہ چار کی اور غلام کے لیے زیادہ سے زیادہ دو عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے اور حدیثوں میں بھی اس کی تصریح ہے اور ائمہ دین کا بھی اس پر اتفاق ہے اور تمام اُمت کے لیے یہی حکم ہے۔ صرف رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ اس سے زائد کی اجازت ہے۔

یتیم لڑکیوں کی تیسری صورت یہ بھی حدیث میں آتی ہے کہ جس یتیم لڑکی کی طرف صورت اور مال دونوں وجہ سے بے رغبتی ہوتی تھی اس کا نکاح ولی دوسری جگہ کر دیتا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کا اس ارشاد سے کوئی تعلق نہیں ہے[1]

شیخ الاسلام کی پیش فرمودہ تشریح اختصار کے ساتھ بے حد جامع ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی اور تربیت میں ہوتی تھیں ان کے ولی ان کے سرمایہ میں حصہ دار ہونے اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ ان کی جانب سے آواز اٹھانے والا کوئی نہیں، ہم جس طرح چاہیں ان کو رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان سے ناروا سلوک کرتے تھے۔ اس پر یہ ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہے کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دُنیا میں موجود ہیں ان میں سے جو تمہیں پسند آئے اس سے نکاح کر لو۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ ہی کا بیان ہے کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے اور اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ حسن و جمال کی مالک بھی ہوتی تو لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے شادی کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فیض یاب ہوں اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے اور نہ کسی دوسری جگہ اس کی شادی ہونے دیتے تاکہ اس کی جانب سے اس کے سرمایہ کے بارے میں کوئی آواز بلند کرنے والا پیدا نہ ہو جاتے۔

اس تشریح کی بنیاد پر یتامیٰ سے یتیم لڑکیاں اور نساء سے عام عورتیں مراد ہیں اور آیت کا

---

[1] فوائد شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ تمہیں یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں بے انصافی کا خطرہ ہو تو ان سے نکاح نہ کرو بلکہ ان
کے علاوہ دوسری عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر لو۔

حافظ ابن جریر نے اس کے علاوہ حضرت ابن عباس کی یہ تشریح بھی نقل کی ہے کہ
جاہلیت میں نکاح کی کوئی قید نہ تھی۔ ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا۔ جب مصارف بڑھ جاتے تو
مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر
دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ
ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ
انصاف کر سکو۔

حافظ ابن جریر نے سعید بن جبیر اور قتادہ سے تشریح یہ نقل کی ہے کہ جہاں تک یتیموں کا
معاملہ ہے اہل جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنا اچھا نہ سمجھتے تھے لیکن عورتوں کے
معاملہ میں ان کے ذہن عدل و انصاف کے تصور سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے شادیاں کر لیتے
اور پھر ان کے ساتھ ظلم و جور کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی
کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اول تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ
کرو اور اس میں بھی شرط یہ ہے کہ عدل و انصاف کرو۔

ان تینوں صورتوں میں آیت [illegible] ہیں اور قرآن سے [illegible] ہیں۔ حافظ ابن
جریر نے اپنی تفسیر میں آخری صورت کو یہ کہہ کر ترجیح دی ہے کہ

> بعد والے فقرے میں بہتر یہی تفسیر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے یہ تشریح کرتا ہے کہ اگر تمہیں یتیموں
> کے معاملہ میں بے انصافی کا اندیشہ ہے تو عورتوں کے معاملہ میں بھی ڈرو اور دو، تین یا چار
> سے زیادہ نہ [illegible] اور اگر ان کے ساتھ بھی انصاف نہ کر سکو تو
> صرف ایک ہی سے نکاح کرو جس کے بارے میں تمہیں بے انصافی کا
> اندیشہ نہ ہو۔

ان تینوں [illegible] قرآن کی [illegible] حضرت عائشہ اور ابن عباس کی تشریح کی صحت
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ابن کثیر، قرطبی، آلوسی وغیرہ۔

بعض معاصر بزرگوں نے اس کی تشریح یہ بھی کی ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں یعنی ان یتیموں کی ماؤں کے ساتھ صاحب تفہیم القرآن تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ آیت قرآنی کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے مگر مولانا اصلاحی نے اسے قرآن کا منطوق قرار دیا ہے اور اس کے منطوق ہونے پر ان کو بے حد اصرار ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ان آیات کا جس ماحول میں نزول ہو رہا ہے وہاں کی شہری زندگی خاندان اور قبیلوں سے عبارت ہے۔ انصار میں تو وہ باہم نسبی قرابت رکھتے ہیں اور مہاجرین میں تو ان کی قرابت اظہر من الشمس ہے قرآن نے ایک مقام پر ان متولیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد کھا کر ہضم کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ اولیا ان یتامیٰ کے اہل قرابت ہوتے تھے۔ باپ مر گیا ہے اس کی اولاد یتیم ہے، داماد جنگ میں کام آگیا، اس کی اولاد والد کے سائے سے محروم ہے، بہنوئی حادثہ کا شکار ہو گیا اب اس کی اولاد بے کسی اور بے بسی کی تصویر ہے، پھوپھا مر گیا ہے اس کے بچے یتیم ہیں، خالو اللہ کو پیارا ہو گیا اس کے بچے بے سہارا ہیں۔ غور فرمائیے آپ ان یتامیٰ میں سے جو آپ کے اہل قرابت ہیں کن کی ماؤں سے شادی کریں گے۔ کیا آپ اپنے باپ کی بیوی، اپنی بیٹی، اپنی بہن، اپنی پھوپھی، اپنی خالہ سے شادی کر کے ان یتیم بچوں کا سہارا بنیں گے۔ اہل قرابت بھی ہیں اور ان ہی کی ولایت بھی آپ کو حاصل ہے ورنہ جہاں قرابت نہیں وہاں آپ کی ولایت بھی نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر آیت کا منطوق یہ ہو تو عملی زندگی میں اس کی تطبیق واقعات کی حد تک نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ یہ کہنا کہ یتامیٰ کا استعمال صرف نابالغ بچیوں کے لیے نہ عربی زبان میں معلوم ہے نہ قرآن مجید اور حدیث میں صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے ولا تنکحوا الیتامیٰ حتیٰ تستامر وھن فاذا سکتن فھو اذنھا اور پھر قرآن میں فانکحوا ما طاب لکم من النساء میں لفظ نساء کو خاص کرنا اور کہنا کہ یہاں یتیم بچوں کی مائیں مراد ہیں۔ کچھ اچھا نہیں ہے۔ بہرحال یہ تشریح ہماری رائے میں قرآن کی اس آیت کا منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم۔

ہمارے علم میں اس تشریح کا اولین سہرا لاہوری احمدی جماعت کے سربراہ کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ راہ ایک اور توجیہہ کے عنوان سے اختیار کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

ایک اور توجیہہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد ما طاب لکم من النساء

میں محبت بڑھاتی ہیں۔ چونکہ یتیم بچوں کی بیوہ ماؤں سے نکاح کی صورت میں ان یتیم بچوں کی کفالت کا مطلب یہاں یہ ہے کہ اگر تم کو خوف ہو کہ یتیم بچوں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہوں تاکہ ان کی سرپرستی اختیار کر لینے کے بعد ان کی ضروریات کے معاملے کی ذمہ داری ہو گی۔

لیکن یہ بات تو صحت کے صرف ایک پہلو کی وضاحت کی ہو گی۔ یتیم بچے، بیوائیں، بے سہارا بچے، مسکین، بہن بھائی، خالہ ماموں، رضاعی بہنوں، پھوپھی زادوں، بیوہ کی بہنوں وغیرہ کی طرف سے بھی ہو کی خاطر ان میں یہاں وہ انسانی کل ہو گی اور اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ ان سب یہاں جو عورت کے مطابق ان کی آیات کے مطابق کو ان کے حقوق کے رشتہ کی وجہ سے اٹھا سکتا ہے

اس آیت کے بعض پہلوؤں کی تشریح رہ گئی ہے جو ضروری ہے کہ ان پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

۱۔ مثلاً ثلاث اور رباع سے مراد کیا ہے۔ اس قسم کے متعدد الفاظ عربی میں ایک ہی وزن پر بولے جاتے ہیں، احاد، ثناء، ثلاث، رباع، خماس، سداس، سباع، ثمان، تساع، عشار، حساب موحد، مثنی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع اور معشر دونوں ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔ چونکہ ان الفاظ کے معنی تکرار کے ہیں اس لئے زبان کا اختلاف ہے۔ اس کے بعد ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ثابت نہیں ہے اور امام بخاری کا بھی یہی خیال ہے۔ مثلاً مثنیٰ اثنین اثنین، ثلاث ثلاثۃ ثلاثۃ، رباع اربعۃ اربعۃ وغیرہ یعنی دو دو، تین تین، چار چار کے ہیں۔ اس مطلب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ہی شخص دو دو یا تین تین یا چار چار کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک کی استطاعت ہو تو ایک، دو کی استطاعت ہو تو دو، اس کے بعد تین کی استطاعت ہو تو تین اور چار کی استطاعت ہو تو چار ایک ہی وقت کے مجموعہ ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً جس طرح کہا جائے کہ جماعت کے لوگ دو دو، تین تین، چار چار کر کے آئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ الگ دو دو یا تین تین یا چار چار کا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر ایک کے لئے اٹھارہ کا مطلب ہوتا ہے کہ ہر شخص نے جیسا کہ لوگوں نے سمجھا

ملا کر جمع کر کے نو بیویوں کا اس سے جواز تلاش کیا ہے۔ اور کچھ نے اسی کے سہارے ۱۸ تک کا راستہ ہموار کیا ہے۔ قرطبی نے درست لکھا ہے کہ ھذا کلہ جھل باللسان والسنۃ یعنی زبان سے بے خبری اور سنت سے ناواقفیت ہے۔ بہرحال اس آیت کی رو سے ہی تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے۔ اور اس میں دو رائیں نہیں ہیں کہ اس آیت کی رو سے چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ایک وقت میں منع کر دیا گیا ہے۔ علامہ شوکانی کا یہ کہنا کہ فالاولیٰ ان یستدل علی تحریم الزیادۃ علی الاربع بالسنۃ لا بالقرآن چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کے حرام ہونے پر قرآن سے نہیں بلکہ سنت سے استدلال کرنا زیادہ اچھا ہے اور نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کا فتح البیان میں ان کی ہمنوائی کرنا اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی یہ ترکیب خود بتا رہی ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور علامہ قرطبی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ایسی سوچ خود اجماع امت سے تصادم ہے۔ قرآن کے علاوہ روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ حارث بن قیس کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوا۔ اس سے پہلے میرے نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے حضور انور کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور انور نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو۔ طائف کا رئیس غیلان جب مسلمان ہوا تو اس کی دس بیویاں تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان میں سے چار بیویاں رکھ لو اور باقی سے علیحدگی اختیار کر لو۔ بہرحال اسلام نے چار کی حد بندی کی ہے اول اجازت دیتے ہوئے ہم کے عدد پر بس کر دینا خود اس اجازت کی حد بندی قرآن کر رہا ہے دوسرے صحابہ کا عمل اس پر گواہ ہے، تیسرے روایات سے تائید ہوتی ہے گویا قرآن سنۃ اور اجماع تینوں نے ازدواجی زندگی کے لیے چار کی حد بندی کی ہے۔

نکاح میں پسندیدگی

اس آیت میں من النساء سے پہلے ما طاب لکم ارشاد ہوا ہے۔ اگرچہ حسن بصری اور ابن جبیر نے اس کی تفسیر ما حل سے فرمائی ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ ان عورتوں سے نکاح کرو جن سے تمہارے لیے نکاح حلال ہے یعنی محرمات کو قید نکاح میں نہ لاؤ اور زنا سے بچ کر رہو لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو اس میں اجمال کی بو محسوس ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں طاب اپنے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ اہل ایمان کے لیے پسند کا معیار کیا ہے؟ اسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر سمجھایا ہے ارشاد ہے:

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور جو سے شادی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا نشانہ بنائے گا اور جو شخص مال کی وجہ سے شادی کرے گا اللہ سبحانہٗ اس کی غربت میں اضافہ کردے گا اور جو شخص حسب کو پیش نظر رکھ کر شادی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دناءت کا دروازہ کھول دے گا اور جو شخص کسی عورت سے صرف اس لیے شادی کرتا ہے کہ اس کی نگاہ میں پارسائی، اس کے اخلاق میں عفت اور اس میں صلہ رحمی رہے تو اللہ تعالیٰ مرد کے لیے عورت میں اور عورت کے لیے مرد میں برکت کرتا ہے۔
یہ حدیث شیخ ابن الہمام نے طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے اور علامہ شامی نے رد محتار میں پیش کی ہے۔

تعدد ازواج کے لیے عدل شرط ہے

۵- اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان سے انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے شادی کرو، یا پھر ان کو بیوی بنا کر رکھو جو تمہارے قبضے میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔ یعنی اگر تم کو اس کا ڈر ہو کہ کئی عورتوں میں انصاف اور مساوات کے مطابق معاملہ نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کر لو یا صرف لونڈیوں پر ایک ہو یا زیادہ بس کرو یا چاہو تو ایک منکوحہ کے ساتھ ایک یا چند لونڈیوں کو جمع کر لو۔ اور صرف ایک عورت سے نکاح کرنے میں یا فقط اپنی لونڈی یا لونڈیوں پر قناعت کرنے میں یا ایک نکاح کے ساتھ ایک لونڈی یا چند لونڈیوں کو جمع کرنے میں اس بات کی توقع ہے کہ تم بے انصافی اور خلاف عدل سے محفوظ رہو۔ کیونکہ زوجات کے جو حقوق ہیں وہ اپنی مملوکہ لونڈی کے نہیں ہیں کہ ان میں عدل نہ ہونے سے تم پر مواخذہ ہو نہ ان کے لیے مہر ہے نہ معاشرت کے لیے کوئی حد مقرر ہے۔ جس کی کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ کھانے پینے اور لینے دینے میں ان کو برابر رکھے اور رات کو ان کے پاس رہنے میں باری برابر باندھے۔ اگر برابری نہ کرے گا تو قیامت کو وہ مفلوج ہوگا ایک کروٹ گھستی چلی جائے گی اور کسی کے نکاح میں ایک حرہ اور ایک لونڈی ہو تو لونڈی کو حرہ سے نصف باری ملے گی اور جو لونڈی اپنے ملک میں ہو اس کا باری میں کوئی حق مقرر نہیں مالک کی خوشی پر ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے، یعنی تعدد ازواج کے اثرات [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی صورت میں نکاح میں یکساں [illegible] [illegible] کی [illegible]۔

چنانچہ یہ سلسلہ وار دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تعدد ازواج کی اجازت ہے [illegible]
کہ یہ تعداد چار تک محدود ہے۔ چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے اور اجازت [illegible] کا
[illegible] مطلب یہ ہے کہ اگر [illegible] چار کی حد [illegible] نکاح کرے تو [illegible] ہوگا۔
یہ مطلب نہیں کہ نکاح آپ ہی ہو جائے گا مگر نکاح کرنے والا اگر [illegible] اس [illegible] تک
کی اجازت کے ساتھ یہ شرط اور زیادہ کی ہے کہ اس تعدد کے لازمی یہ شرط ہے کہ ان میں عدل کا۔
یعنی اگر تم عدل قائم نہیں کر سکتے اور یہ شرط پوری نہیں کر سکتے تو پھر تمہیں صرف ایک عورت سے
نکاح کرنا چاہیے۔ ایک عورت سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں [illegible]
زیادہ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ اجازت [illegible] کا مطلب یہاں یہ ہے کہ ایسا کرنے [illegible]
گناہ ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نکاح ہی نہ ہوگا۔

آیت میں جس عدل کے قائم کرنے کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ نان و نفقہ، معاشرت [illegible]
[illegible] کے ساتھ یکساں ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل سے یہاں مراد [illegible]
[illegible] کے [illegible] کی [illegible] کی [illegible] کپڑے اور [illegible] کے
بغیر [illegible] [illegible] قلبی [illegible] کا سوال ہے [illegible] معاملہ [illegible]
ہے اور اس [illegible] شریعت نے کوئی گرفت نہیں کی ہے۔ [illegible]
[illegible] انصاف کرو، ہرگز [illegible] یہاں عدل سے [illegible]
[illegible] محبت [illegible] مراد ہے۔ محبت کے [illegible]
انسان [illegible] صرف [illegible]
عدل [illegible] کہ ہر [illegible] مساوات [illegible] کے ساتھ کی جائے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اسنہ فرض ان یعدل اعی ان لایجور۔ غالباً فقہائے یہ بات اسی آیت کے آخری فقرے سے معلوم کی ہے کہ ان لا تعولوا۔ تاکہ تم ظلم نہ کرو۔ اگرچہ امام شافعی نے معنے یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔ لغت میں عول کے معنے میل کے ہیں عال المیزان اس وقت بولا جاتا ہے جب ترازو کا پلڑا ایک طرف جھک جائے اور عال الحاکم اس وقت بولتے ہیں جب حاکم فیصلہ میں ظلم کی طرف جھک جائے اسی لیے عول کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جمہور نے ان تعدلوا کی تفسیر ان تجوروا سے کی ہے اور ابن ابی حاتم نے حضرت عائشہ کے حوالہ سے یہی تفسیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ اگرچہ خود ابن ابی حاتم نے اپنے والد کے حوالے سے اس کو حضرت عائشہ ہی کا ارشاد بتایا ہے۔ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی، عکرمہ اور قتادہ نے اس کی لاتمیلوا سے فرمائی ہے۔ لیکن حاصل دونوں کا ایک ہے۔ لہٰذا قرآن کی اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ جو شخص دو بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔ تعدّدِ ازواج کی اجازت سے اس کو فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قانون ایسی حالت میں اس کی بیوی کی دادرسی کرے گا اور عورت کو حق دے گا کہ وہ اس ظالم کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کرے۔ بہرحال آیت میں عدل کے معنے ظلم نہ کرنے کے ہیں۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

بعض ہوا پرستوں نے یہاں تحریف کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تعدّدِ ازواج کی نفی کر رہی ہے اور وجہ یہ بتاتی ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ اگر عدل نہ ہو سکے تو ایک شادی کرو اور دوسری آیت میں بتایا ہے کہ لن تستطیعوا ان تعدلوا عدل کرنا عورتوں کے درمیان ہرگز تمہارے بس میں نہیں ہے۔ دونوں آیتوں کے ملانے سے پتہ چل گیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادی جائز نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کیونکہ دونوں آیتوں میں عدل جُدا جُدا ہے۔ پہلی آیت میں عدل سے مراد عدل فی الحقوق الواجبہ ہے اور دوسری آیت میں عدل سے مراد عدل فی المحبّۃ ہے۔ پہلی بات اختیاری ہے اور دوسری غیر اختیاری ہے۔ اختیاری کا قرآن نے مطالبہ کیا ہے اور غیر اختیاری کے بارے میں فرما دیا کہ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔

تعدّدِ ازواج تمدّنی اور اخلاقی ضرورت ہے

نیز یہ آیت گرامی تعدّدِ ازواج کی اس شرط کے ساتھ اجازت دیتی ہے کہ عدل قائم کیا جائے۔ اس

نظام میں بہت بڑا نقص ہے کیونکہ [illegible] اسباب ضرورت کے لیے [illegible]
جو بشر [illegible] اور اس طرح [illegible] کو [illegible]
ضرورت [illegible] ساتھ ہے کیونکہ [illegible] اس پر کوئی قانون نہیں
ہو۔ مگر اس کی [illegible] میں کوئی مداخلت کرے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے [illegible] پر [illegible]
وہ یہ کہ [illegible] ضرورت کا احساس ہو سکتا ہے۔ قرآن نے اس کا [illegible] تعدد ازدواج کو [illegible]
کیا ہے [illegible] اس [illegible] کی ہیں۔ کہیں [illegible]
تسلیم کیا اور کہیں [illegible] سے منع کیا۔ قرآن [illegible]
[illegible] ہے [illegible] اس لیے وہ تعدد ازدواج کی صورت میں [illegible]
پر قائم رہا ہے۔ قرآن نے [illegible] احساس کو [illegible] تعدد کی اجازت [illegible]
کیونکہ اس کی [illegible] دنیا کے [illegible] پیش کیا ہے
اس معاملے میں [illegible] جاہلیت [illegible] ایک عورت سے [illegible]
نکاح کو [illegible] اگر ایک عورت [illegible] کی وجہ سے اس قابل نہیں
ہے کہ [illegible] نسل کا سلسلہ قائم کر سکے تو ایسی صورت میں عورت [illegible]
ہے۔

اسی طرح [illegible] احساس کی [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible]
[illegible] تعلق ہے [illegible]
[illegible] نہیں ہوتی [illegible]
[illegible] صورت [illegible]
[illegible] صورت [illegible] ایک [illegible] ایک
[illegible] نہیں [illegible]
[illegible] عورت [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] صورت [illegible]

کرتی وہ کچھ بھی ہو خلافِ اور مطابق فطرت نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے ساتھ دیتی ہے داعیانِ توحید نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اس کو اور زیادہ طاقتور بنایا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان ہیں سے کسی کے یہاں بھی ایک بیوی کی سند نہیں ملتی ہے بلکہ بعض کی حرم سرا تو کثرتِ تعداد کے لیے مشہور رہے۔ ہندو قدیم میں اکابر ہنود کی بابت بھی روایتیں وحدت کی نہیں تعدد ہی کی ہیں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی تسمیت زدہ رائے سے مغلوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد ازواج کے طریقے کو مٹا دینا تھا مگر چونکہ یہ طریقہ بہت رواج پا چکا تھا۔ اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعددِ ازدواج کا بجائے خود ایک برائی ہونا ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدنی اور اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے حصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں جس کے نقصانات تمدن و اخلاق کے لیے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعددِ ازدواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں لے

شاید آپ کا ذہن یہاں یہ خلش محسوس کرے کہ قرآن نے تعددِ ازدواج کے لیے ضرورتوں کی تفصیل کیوں نہیں بتائی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہے اور قوموں اور زمانوں اور حالات کے تغیر سے بدلتا رہتا ہے وہاں قرآن حکیم تفصیلات سے بالاصرف کلیات پیش کرتا ہے مثلاً طلاق کے موضوع پر قرآن نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضرورت کے تحت آدمی طلاق دے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ طلاق ضرورت ہی کے تحت دی جاتی ہے۔ یہی حال یہاں تعددِ ازدواج کا ہے۔

تعددِ ازدواج اور مخالفین

اب تو یہ چیز اتنی عیاں ہو چکی ہے کہ بحث و مباحثہ کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی۔ تعددِ ازدواج کے مخالفین کو بھی حالات کے پیشِ نظر اس بات کو ماننا ہی پڑا کہ اسلام کا قانون تعددِ ازدواج درست ہے۔

لے تفہیم القرآن

کسی مذہب اور دھرم کا ماننے والا بشرطیکہ وہ دُوراندیش اور تجربہ کار ہو، تعددِ ازواج ،، کے جواز سے انکار نہیں کرسکتا اور نہ کسی مذہب و دین میں اس کا انکار کیا گیا ہے بلکہ سب ہی میں اس کی اجازت دی گئی ہے خصوصاً اسلام نے جن قیود کے ساتھ تعدد کی اجازت دی ہے اس کی ضرورت کا تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یورپ نے اسلام کے تعدد ازدواج کے قانون کو اپنا نشانہ بنالیا ہے وہی یورپ جس کے ہاں نسوانی ناموس کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے بلکہ لٹ رہا ہے لٹایا جا رہا ہے، بر سرِ بازار سب کچھ ہو رہا ہے لیکن دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور صرف دیکھتے رہتے ہیں۔ یورپ میں مرد و عورت کے تعلقات میں بے باکیوں کی کیفیت جو حد سے گزر چکی ہے اسی کو دیکھ کر اور دوسرے حالات سے متاثر ہو کر یورپ ہی کے بعض اربابِ فکر نے تعددِ ازدواج کے جواز کو تسلیم کر لیا ہے بلکہ اس کے جواز کو ضروری قرار دیا ہے ۔

اہلِ یورپ کا اعترافِ حق

لندن کے ایک اسکول کی ایک اُستانی مس میری سمتھ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے :

یک زوجی کا جو قاعدہ برطانیہ میں چلا ہوا ہے وہ تمام تر غلط ہے ۔ مردوں کو دوسری شادی کی اجازت ملنی چاہیے ۔

میری سمتھ کی اس کتاب کے متعلق سنڈے ٹریبون دُوربن نٹال مورخہ ۴ نومبر ۱۸۶۱ء میں اس کے لندنی وقائع نگار لکھتے ہیں :

یقین ہے کہ ۲۵ سال سے اوپر عمر کی پچیس لاکھ بیوائیں جو اس وقت برطانیہ میں موجود ہیں دلچسپی اور قدر سے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گی ۔

ان اقتباسات سے اندازہ لگائیے کہ تعددِ ازدواج جس کی اسلام نے ناگزیر ضرورت کے وقت اجازت دی ہے قانونِ فطرت کے کتنا مطابق ہے اور حالات نے لوگوں کو اسلام کے اس قانون حقانیت کا کیسا یقین دلایا ہے ۔

یہی میری سمتھ اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتی ہے ،

،، چونکہ اس ملک برطانیہ میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے ہر عورت شوہر کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۔،،

اس کے بعد اس نے کہا ہے ۔ ایک بیوی کا رواج ناکام ہو چکا ہے اور یہ رواج بھی سائنٹیفک

نہیں ہے۔

انگلستان میں بے راہ روی کو روکنے کے لیے سترھویں صدی سے کثرتِ ازدواج کا چرچا شروع کیا گیا۔ چنانچہ ۱۶۵۸ء میں ایک شخص نے زناکاری اور لومولود حرامی بچوں کی اموات کو روکنے کے لیے کثرتِ ازدواج کی حمایت میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان کے ایک قابلِ اعتماد اور صاحبِ کردار پادری نے اس مسئلہ کی تائید میں ایک کتاب لکھی، مشہور ماہرِ جنسیات جیمس ہلٹن نے فحاشی اور زناکاری کو روکنے کے لیے کثرتِ ازدواج کے طریقہ کو اختیار کرنے کی رائے دی لے

شوپنہار نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا،

ایک بیوی پر اکتفا کرنے والے کہاں ہیں؟ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں ہم میں سے ہر شخص "کثرتِ ازدواج" کا قائل ہے چونکہ ہر آدمی کو متعدد عورتوں کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے مرد پر کسی قسم کی تحدید عائد نہ ہونی چاہیے۔

مشہور ماہرِ جنسیات کیلیجن اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

گو انگلستان میں کثرتِ ازدواج کے اصول پر بالعموم عمل ہوتا ہے لیکن سوسائٹی اور قانون نے ابھی اس چیز کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ سوسائٹی ان اشخاص کے اعمال پر خاموش رہتی ہے۔ جو ایک بیوی یا شوہر سے شادی کر کے دو یا تین در شتاؤں یا آشناؤں سے تعلقات رکھتے ہیں لیکن سوسائٹی چیخ اٹھتی ہے جب کوئی شخص یہ تحریک پیش کرتا ہے کہ مرد کو ایک سے زائد عورتوں سے شادی کی اجازت دی جانی چاہیے لے

علامہ عبدالعزیز شاویش مصری نے ایک واقعہ لکھا ہے پڑھنے کے لائق ہے۔ " لندن میں ایک ہسپانوی شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے بہت سے اسلامی مسائل پر تبادلہ خیالات کیا اور جیسے ہی تعددِ ازدواج پر بحث چھڑی تو اس شخص نے کہا کاش اگر میں بھی مسلمان ہوتا تو ایک اور بیوی کر لیتا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ میری بیوی کو جنون ہو گیا ہے اور اس پر کئی سال گزر چکے ہیں جس کی وجہ سے مجھے مجبوراً آشنائیاں کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ میں دوسری بیوی نہیں کر سکتا۔ اگر میرے پاس دوسری جائز بیوی ہوتی تو اس سے میری

لے اسلام اور جنسیات

جائز اولاد ہوتی جو میری کثیر دولت کی وارث بنتی - میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور بہتر رفیق ہوتی اور مجھے اس سے اطمینان اور سکون حاصل ہوتا۔

مسز برڈسل کال کینز صدر ینگ وومن کرسچن ایسوسی ایشن نے واشنگٹن میں بکنگ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے :

امریکہ میں چودہ سال سے اوپر کی جوان لڑکیوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے جو سب کی سب کنواری ہیں - ان کے مقابلے میں کنواروں کی تعداد نوّے لاکھ ہے۔ اس حساب سے تیس لاکھ کنواری لڑکیوں کے لیے شوہروں کا ملنا محال ہے۔ کیونکہ جنگ نے مردوں اور عورتوں کا عددی توازن بہت بڑی حد تک خراب کر دیا ہے [1]

بتایا جائے کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے گا۔ اگر تعدّدِ ازدواج کی اجازت نہیں دی جاتی ہے تو پھر عفت و عصمت کو دُنیا کی کون سی طاقت بچا سکتی ہے اور بفرضِ محال بچ بھی جائے تو اس ظلم عظیم کا وبال کس کے سر آئے گا اور ان تیس تیس لاکھ تعداد کی گریہ وزاری اور ان کے نالہ و شیون کیا کچھ نہ کریں گے جس نے یہ لکھا بالکل سچ لکھا :

لوگ سمجھتے ہیں تعدّدِ ازدواج اور وحدتِ ازدواج میں مقابلہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اصل میں مقابلہ ہے محدود ازدواج کا لامحدود حرامکاری سے۔ اسلام بعض سخت شرائط کے تحت محدود تعدّدِ ازدواج کی اجازت اس لیے دیتا ہے کہ لامحدود حرام کاری کا سدِباب ہو لیکن جو وحدتِ ازدواج کے قائل ہیں ان کے پاس لامحدود حرام کاری کے انسداد کا کوئی علاج نہیں۔ اسی لیے تو وہ تعدّدِ ازدواج کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں۔ مگر یہ آواز بلند نہیں کرتے کہ ایک عورت والے مرد کو دوسری جگہ شہوانی بھوک کی سیری کے لیے منہ کالا نہ کرنا چاہیے [2]

کینز سے بیوی کے تعلقات

اس آیت میں او ما ملکت ایمانکم کے الفاظ آئے ہیں اس کے معنے ہیں کہ وہ عورتیں جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہیں۔ محاورے میں اس سے مراد شرعی مملوک اور غلام اور

---

[1]، [2] زمزم ۱۹۵۲ء

کنیزیں ہوتی ہیں جن کا اب مدت دراز سے ہندوستان بلکہ دُنیا کے اکثر ملکوں میں کہیں وجود نہیں ہے۔

اسیرانِ جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم اور دشوار مسئلہ رہا ہے یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ لیشکر کے ہاں سے گرفتار ہو کر آئیں ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ انہیں کہاں اور کیسے رکھا جائے کسی نے اس کا حل جبری مزدوری یا بیگار کو نکالا، کسی نے کچھ اور۔ اسلام نے یہ حکم دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بوجھ حکومت پر ڈالا جائے۔ اس تعداد کو افراد میں تقسیم کر دیا اور ہر فرد اس نووارد کو اپنے خاندان کا جزو بنائے اس سے کام ہر طرح کا لے لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے اور ان میں جو عورتیں ہوں ان کو گرفتار کرنے والا ہر سپاہی ان سے مباشرت کا مجاز نہیں ہے بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان قیدیوں سے کرے جو دُشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اس عورت ہی سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہے۔ حکومت کی جانب سے یہ تملیک خود اعلان نکاح کے قائمقام ہے۔ اور اس تملیک کے بعد کوئی سپاہی اس وقت تک اس سے مباشرت نہ کرے گا جب تک ایک مرتبہ اس عورت کو ماہواری نہ آجائے اور یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ حکومت کی جانب سے یہ تملیک ایسا ہی قانونی فعل ہے جیسا نکاح۔ اس کے لیے کسی مزید ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں ہے اور یہ لوگ آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں بلکہ ان کے آزاد کرنے کی طرح طرح کی فضیلتیں خود قرآن نے بتائی ہیں اور احادیث میں عتاق کا اس کے لیے مستقل باب ہے۔

حیرت ہے کہ ایسے صاف سیدھے شریفانہ، حکیمانہ قانون سے لوگ خواہ مخواہ گھبراتے اور شرم محسوس کرتے ہیں اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آگے آرہی ہے۔

بہر حال ما ملکت ایمانکم سے مراد لونڈیاں ہیں یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بھی بار برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو جیسا کہ رکوع ۴ میں آرہا ہے یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمہیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان تمہارے لیے عدل رکھنا مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمہ داریوں کا بوجھ کم پڑے گا۔ اس کی تشریح میں شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ اصل ارشاد یہ ہے۔ فان

ـــه تفہیم القرآن

خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم چند عورتوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے یا اپنی مملوکہ سے۔ قرطبی، آلوسی، ابن جریر، ابن کثیر کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں چند عورتوں کے درمیان بے انصافی کا اندیشہ ہو تو بس ایک پر اکتفا کرنا یا ان باندیوں پر جو تمہاری مملوک ہیں۔ اور ہمارے مفسرین میں سے شیخ الاسلام، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا محمد ادریس، مولانا احمد سعید، مولانا حسین علی لوردو بعض دیگر کا میلان بھی یہی ہے۔ لیکن جہاں قرآن کا تعبیری انداز اس کی ہمنوائی نہیں کرتا۔ نفس مسئلہ کی صحت سے انکار نہیں ہے یعنی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ملک یمین میں آئی ہوئی عورتوں سے مالک تمتع کر سکتا ہے اور ایسی عورتوں سے مالک آزاد کر کے نکاح بھی کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس آیت قرآنی کا منطوق کیا ہے۔

ہمیں یہاں ابوبکر الجصاص رازی کی رائے پسند ہے۔ انہوں نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں :

> قرآن کی یہ آیت جیسے چار آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دے رہی ہے ایسے ہی چار کنیزوں سے بھی نکاح کرنے کی رخصت دے رہی ہے۔ اب یہ شادی کرنے والے کے اختیارِ تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ آزاد عورتوں سے کرے یا کنیزوں سے۔ اور یہ اس لیے کہ ما ملکت ایمانکم خود مستقل فقرہ نہیں ہے بلکہ اپنے پہلے فقرے کے ساتھ مربوط ہے۔ یہاں فعل محذوف ہے اور بلاشبہ محذوف وہ ہی فعل ہونا چاہیے جو پہلے آچکا ہے ایسے فعل کو ہم محذوف نہیں مان سکتے ہیں جس کا پہلے کوئی ذکر نہیں۔ آیت میں پہلے نکاح کا لفظ آیا ہے یعنی فانکحوا ما طاب اس لیے تقدیر عبارت یوں ہو گی فانکحوا ما ملکت ایمانکم ظاہر ہے کہ نکاح سے اگر پہلے عقد مراد ہے تو یہاں بھی عقد ہی مراد ہو گا۔ شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ اگر یہاں نکاح کو محذوف مان کر اس کو وطی کے معنے میں لیا جائے تو کیا حرج ہے جواب یہ ہے کہ ایک ہی فقرے میں ملفوظ میں ایک معنے اور محذوف میں دوسرے معنے مراد لینا درست نہیں ہے۔ اس صورت میں ایک فقرے کے ایک لفظ میں ملفوظ ہونے کی صورت میں معنے مجازی اور محذوف ہونے کی حالت میں معنے حقیقی مراد ہوں گے اور یہ جمع بین الحقیقت والمجاز درست نہیں۔ اور اگر آپ کے

ذہن میں یہ وسوسہ آئے کہ چونکہ ملک یمین کی نسبت قرآن نے مخاطبوں کی طرف کی ہے اور مالک ہونے کی صورت میں وطی ہو سکتی ہے مگر عقد نہیں ہو سکتا اس لیے ہمیں یہاں محذوف میں وطی ہی کے معنے لینے ہوں گے کیونکہ کوئی مالک اپنی مملوکہ سے نکاح نہیں کر سکتا جواب یہ ہے کہ ملک کی نسبت جماعت کی طرف ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم اوروں کی مملوکہ سے نکاح کر لو۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات المومنات فمن ما ملکت ایمانکم کا سب ہی یہ مطلب بتاتے ہیں کہ جو آزاد عورت سے نکاح نہیں کر سکتا تو ایسا شخص آپس میں کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کر لے۔ اس آیت میں بھی ملک یمین کی اضافت مالکوں ہی کی طرف ہے۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے اس لیے یہاں انکحوا محذوف ہے اور وہ بمعنے عقد ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت کا منطوق یہ نہیں ہے کہ قرآن کنیزوں سے مباشرت اور تمتع کی ملک یمین کی بنا پر اجازت دے رہا ہے اس کے لیے قرآن کی دوسری آیات ہیں۔ یہاں تو نکاح کا مسئلہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک سے نکاح کر لو اور اگر ایک بھی میسر نہ آئے تو ما ملکت ایمانکم سے نکاح کر لو۔ علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں نے انکحوا فعل مقدر مان کر نکاح کو بطریق ملک بمعنے وطی قرار دیا ہے۔

بہرحال آیت قرآنی کا وہ مطلب جو الجصاص نے پیش کیا ہے قرآن کے انداز تعبیر کے زیادہ قریب ہے اور جو مطلب شارحین قرآن نے لیا ہے انداز تعبیر اس کی ہمنوائی نہیں کرتا ہے۔

بیویوں کے مہر ادا کرو

۴۔ اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ فرض جانتے ہوئے ادا کرو ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم لے مزے سے کھا سکتے ہو۔ یعنی جن عورتوں سے نکاح کرو ان کے مہر خوشدلی اور رغبت کے ساتھ خود ادا کرو ان کا کوئی حامی اور تقاضا کر کے وصول کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ ایسا کرو تو پھر یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حرج تو جب ہے کہ مہر دینے میں یا ان کے کسی حق کے ادا کرنے میں گرانی ہو۔ اور اگر عورت اپنی خوشی سے مہر میں سے کوئی مقدار شوہر کو معاف کر دے یا لے کر پھر زوج کو ہبہ کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں شوہر اس کو خوشی سے کھالے۔ جو کھانا لذیذ ہو اور طبیعت اس کو رغبت کے ساتھ قبول کرے اس کو ہنیئا کہتے

ہیں اور جو کھانا ہضم ہو کر بالکل جزوِ بدن ہو جائے اور موجبِ صحت اور قوت ہو اس کو مریٔ کہتے ہیں[1]

پہلی آیت میں نکاح اور اس آیت میں نکاح کی بنیادی اہمیت والی چیز مہر کے احکام کا ذکر ہے سب سے پہلے مہر کی حیثیت کے بارے میں اس آیت سے قرآن کے نقطہ نگاہ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں دو لفظ ارشاد ہوتے ہیں نحلہ اور صدقات۔ نحلہ وہ عطیہ جو تبرع کے طور پر ہو یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ نحلہ سے مراد ہبہ اس لیے ہے کہ نحل شہد کی مکھی جب کسی جگہ بیٹھتی ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے بلکہ موجبِ نفع ہوتی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ نحلہ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو خوشی خوشی کسی معاوضہ کی اُس کے بغیر دیا جائے صدقات جمع ہے اس کا واحد صدقہ ہے اس کے معنے مہر کے ہیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ مہر کی حیثیت قیمت کی نہیں ہے بلکہ ایک نذرانہ اور تحفہ و سوغات کی ہے جو شوہر بغرضِ اکرام و اعزاز براہ راست بیوی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔ الجصاص نے مہر کو نحلہ کہنے کی یہ وجہ خوب بتاتی ہے کہ چونکہ شوہر اس کے عوض میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے یہ نحلہ ہے۔

مہر کے بارے میں خود عرب عورتوں پر کئی قسم کے ناروا کردار موجود تھے۔ ایک یہ کہ مہر لڑکی لینے کی حقدار نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ لڑکی کے اولیاء اسے اپنا حق سمجھ کر لے وصول کرتے تھے۔ قرآن نے آتوا النساء فرما کر یہ راستہ بند کر دیا کہ یہ مہر کی رقم بیویوں کو دو نہ کہ ان کے اولیاء و والدین کو۔ آتوا کا خطاب دونوں کو ہے شوہر کو بھی اور لڑکی کے ولی کو بھی۔ اگر شوہر مخاطب ہیں تو مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کا مہر خود اپنی اہلیہ کو دو اور کسی کو نہ دو اور اگر لڑکی کے اولیا مخاطب ہیں تو مطلب یہ ہے کہ اگر لڑکیوں کا مہر تمہیں وصول ہو جائے تو یہ لڑکیوں ہی کو دے دو ان کی اجازت کے بغیر اس میں کوئی تصرف نہ کرو۔

دوسرے یہ کہ وہ مہر کو ایک قسم کا تاوان سمجھتے تھے لفظ نحلہ لا کر بتا دیا کہ یہ تاوان نہیں ہے بلکہ وہ تحفہ ہے جو خوش دلی سے دیا جائے۔

تیسرے یہ کہ بہت سے شوہر یہ خیال کر کے کہ بیوی مجبور ہے دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیتے۔ قرآن نے فان طبن کہہ کر معاملہ بالکل واضح اور صاف کر دیا کہ بیوی کی طرف سے یہ ابراء بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اور شوہر کے کسی مکر و فریب کے ہونا چاہیے۔ یہ یاد رہے کہ اگر مہر کے کروالیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر دیا جائے تو یہ ہبہ ہے اور اگر بغیر وصول کیے معاف کر دیں تو ابراء ہے۔ دونوں جائز ہیں اور آیت دونوں کو شامل ہے۔ (بیان القرآن)

طیبِ نفس کی تشریح

آیت میں طیب نفس کی قید اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ کسی کا مال دوسرے کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک وہ طیبِ خاطر سے نہ دے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی بات بطور قاعدہ کلیہ بیان فرمائی ہے :-

اچھی طرح سمجھ لو کہ کسی دوسرے شخص کے لیے کسی کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک وہ جی کی خوشی سے نہ دے۔

(مشکوٰۃ شریف)

یہ ایک عظیم ضابطہ ہے اس کے تحت اگر آپ چاہیں بہت سے سوالات کا جواب تلاش کر سکتے ہیں۔ عورتوں کا مہر، کو معاف کر دینا، بہنوں کا بھائیوں کے حق میں میراث سے دست بردار ہونا، مساجد یا مدارس میں دباؤ کے تحت چندہ وصول کرنا سب کا حکم یہی ہے کہ اگر طیب خاطر سے نہ ہو تو کسی صورت میں حلال نہیں ہے[1]

حضرت عمر اور قاضی شریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پورا مہر معاف کر دیا یا اس کا کوئی حصہ معاف کر دیا اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے معاف کرنا نہیں چاہتی ہے[2]

بہرحال اس آیت میں یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ مہر عورت کا ایک حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے لہٰذا اس حق کو فریضہ سمجھ کر خوش دلی کے ساتھ عورت کو ادا کیا کرو۔ البتہ اگر عورتیں اپنے حق سے اور اس فریضہ میں سے جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اپنی خوشی سے تم کو معاف کر دیں اور چھوڑ دیں تو اس کا برتنا اور کھانا جائز ہے۔

آخر میں فرمایا ہے فکلوہ هنیأً مریأً کھاؤ تم اسے مزے دار اور خوشگوار سمجھ کر، کھانے

---

[1] معارف مفتی ملخصاً [2] تفہیم القرآن

سے تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ مال سے جو منافع حاصل کیے جاتے ہیں ان میں اہم نفع اور بڑی غرض کھانا ہے ورنہ یہ مقصد نہیں ہے کہ عورت جو مہر تم کو واپس کرے اس کو سوائے کھانے کے اور کسی کام میں نہ لاؤ یہ بھی مال ہے جس طرح اور اموال موہوبہ میں تصرف جائز ہے اسی طرح واپس شدہ مہر میں بھی ہر قسم کا تصرف جائز ہے ۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جبر و اکراہ سے جو مہر معاف کر دیا جائے وہ اللہ کے نزدیک معاف نہیں ہوتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مہر عورت کی ملک ہے اس میں بغیر اس کی مرضی کے کسی کو تصرف کا اختیار نہیں ہے ۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ
فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝۵ وَابْتَلُوا
الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا
إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ
وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ
بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝۶

اور اے سرپرستو! تم اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے لیے قیام کا
ذریعہ بنایا ہے بیوقوفوں کے سپرد نہ کرو ہاں ان کے مال میں سے
ان کے کھانے اور پہننے کا انتظام کرو اور ان کو معقول بات
کہتے رہو"۔ اور یتیموں کے عقل و شعور کا جائزہ لیتے رہو یہاں
تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں صلاحیت د

اہلیت دیکھو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو[۱۲]۔ اور اس خوف سے کہ
کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں ان کے مالوں کو فضول خرچی کر کے
جلدی جلدی نہ کھا پی ڈالو[۱۳]۔ اور یاد رکھو کہ یتیم کا جو سرپرست مالدار
ہو اسے چاہیے کہ یتیم کے مال سے بالکل پرہیز کرے اور جو حاجتمند
ہو وہ بقدرِ حاجت دستور کے موافق لے سکتا ہے[۱۴]۔ پھر جب تم
یتیموں کے مال ان کے سپرد کرو تو تمہیں ان پر گواہ بنا لینا چاہیے
اور دیکھو محاسبہ کے لیے اللہ کا محاسبہ کافی ہے[۱۵]۔

اسلام میں مال و دولت کی حیثیت

آیات بالا میں یہ حکم دیا تھا کہ یتیموں کے اموال ان کے سپرد کر دو اب ان میں ارشاد ہو رہا ہے کہ یتامیٰ کو ان کے اموال کب سپرد کیے جائیں۔ اور اس ضمن میں مال کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ اللہ نے اسے لوگوں کے قیام و بقا کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر انفرادی حق کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود و فلاح کا بھی ایک پہلو ہے اور یہ تصور پیدا کیا کہ ہر فرد کی ملکیت سے جماعت کے کچھ حقوق وابستہ ہیں۔ اس لیے نتیجۃً ہر انفرادی ملکیت اجتماعی ملکیت ہے۔ اس کے ضائع ہونے سے جماعت کی حق تلفی ہو سکتی ہے لہٰذا ہر وہ پیسہ جو ایک فرد بے محل صرف کرتا ہے یا ضائع کرتا ہے وہ جماعت کے بہت سے منافع اور بہت سے اجتماعی فوائد کو ضائع کرتا ہے اور جماعتی ملکیت میں ناجائز تصرف کرتا ہے۔

یہاں ناسمجھ یتیموں اور بے سلیقہ جوانوں کے ذاتی اموال واملاک کو جماعت کا مال قرار دیا ہے اور اس کو جماعت کی زندگی اور معیشت کا دارومدار بتایا گیا ہے اور اسی بنا پر ان کے حوالہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس پہلو سے اس کی بربادی میں ایک ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ پورے خاندان اور بالآخر پورے معاشرے کا نقصان ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ کوئی ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جو کسی مال کی بربادی کا باعث ہو۔ اور بقول حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ان آیات میں ایک طرف مال کی اہمیت اور انسانی معاش میں اس کا دخل ہونا بیان فرما کر اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا دوسری طرف حفاظت مال کے سلسلے میں ایک عام کوتاہی کی اصلاح فرمائی یعنی بعض لوگ مال کی محبت سے مغلوب ہو کر ناتجربہ کار نابالغ بچوں اور ناواقف عورتوں کے حوالہ کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ مال کی بربادی اور افلاس و تنگدستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان آیات میں اشارہ کر دیا ہے کہ مال کو ضائع کرنا، اسراف اور بے اعتدالی سے خرچ کرنا ممنوع ہے۔

مالکانہ تصرفات پر پابندی

۱۱۔ اور اے سرپرستو! تم اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے بیوقوفوں کے سپرد نہ کرو ہاں ان کے مال میں سے ان کے کھانے اور پہنے کا انتظام کرو اور ان کو معقول بات کہتے رہو۔ یعنی بے سمجھ لڑکوں کے ہاتھ میں ان کا، مال مت دو کہ جس کو اللہ نے آدمیوں کے لیے سامان معیشت بنایا ہے بلکہ اس کی پوری حفاظت کرو اور اندیشہ ہلاکت سے بچاؤ اور جب تک ان کو نفع و نقصان کا ہوش نہ آئے اس وقت تک ان کو اس میں سے کھلاؤ، پہناؤ اور تسلی کرتے رہو کہ یہ سب مال تمہارا ہی ہے۔ ہم تو تمہاری خیرخواہی کرتے ہیں جب سمجھدار ہو جاؤ گے تم کو ہی دے دیں گے۔[1]

مفسرین کا اختلاف ہے کہ سفہاء سے کون لوگ مراد ہیں؟ کچھ کہتے ہیں کہ اس سے یتیم اور عورتیں مراد ہیں۔ عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ بن مسعود کی رائے میں سفہا سے مخاطبین کے بچے اور عورتیں مراد ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ مال حق تعالیٰ کی نعمت ہے جو تمہارا ذریعہ معاش ہے ایسا مت کرو کہ اپنا مال بیوی اور بچوں کو دے کر خالی ہاتھ رہ جاؤ اور پھر ان کے دست نگر ہو جاؤ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ تخصیص کسی کی نہیں ہے۔ سفہاء سے ایسے تمام لوگ مراد ہیں جن کو اپنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مال کی حفاظت کا سلیقہ نہ آتا ہو اور جو اپنی بیوقوفی سے مال کو ضائع اور برباد کرتے ہوں خواہ وہ یتامیٰ ہوں اور خواہ اپنے بیوی اور بچے ہوں[1] ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے اور لکھا ہے کہ آیت کا خطاب پوری امت سے ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت وسیع معنے کی حامل ہے۔ اس میں امت کو یہ جامع ہدایت دی گئی ہے کہ مال جو ذریعہ قیامِ زندگی ہے بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرف میں نہ ہونا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظامِ تمدن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کر دیں۔ حقوقِ ملکیت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ اگر وہ ان کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور اس کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ ہوں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری ہونی چاہئیں لیکن جہاں تک حقوق مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ استعمال اخلاق و تمدن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحبِ مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور بڑے پیمانے پر حکومتِ اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں یا جو لوگ اپنی دولت کو برے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کر دے[2]

دراصل انسان کو مال اور مالکانہ حقوق ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور اعلیٰ مقاصدِ حیات کی تحصیل کے لیے ذریعہ کے طور پر دیے گئے ہیں تبذیر و اسراف اور اضاعت مال سے فرد کے اپنے مصالح بھی مجروح ہوتے ہیں اور اجتماع کا بھی نقصان ہوتا ہے اپنے مال میں اس طرح کے غلط اور غیر مفید تصرفات کرنے والا قانونِ اسلامی کی نظر میں سفیہ کہلاتا ہے اور اس کے خرید و فروخت اور انتقال ملکیت کے حقوق پر قانونی پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ اس اصول پر قانونِ اسلامی کے چاروں مدارس کا اتفاق ہے حنفی مدرسۂ فکر میں اگرچہ مختار قول یہی ہے لیکن امام ابوحنیفہ کسی عاقل و بالغ آزاد مالک پر تبذیر، اسراف یا اضاعت مال کی بنا پر قدغن قائم کرنے کے قائل نہیں ہیں مگر جمہور فقہاء اسلام تبذیر، اسراف اور مال کو ضائع کرنے کی بنا پر مالکانہ تصرف پر پابندی لگانے کے قائل ہیں اور اس کو فقہاء

---

[1] معارف م ا - [2] تفہیم

کی اصطلاح قانون میں حجر کہتے ہیں۔

احناف کے مسلک کو صاحب ہدایہ نے اس طرح پیش کیا ہے اس سے پہلے وہ یہ بتا چکے ہیں کہ خود امام ابوحنیفہ عاقل بالغ آزاد مرد پر حجر کرنا درست نہیں سمجھتے ۔

ابویوسف اور محمد نے کہا ہے اور یہی شافعی کا قول بھی ہے کہ سفیہ پر حجر کیا جائے گا اور اسے اپنے مال میں تصرف سے روکا جائے گا کیونکہ وہ اپنے مال کو تقاضائے عقل کے خلاف کاموں میں صرف کرکے تبذیر کا ارتکاب کرتا ہے اس کے مصالح کی نگرانی کے طور پر اس پر بھی اسی طرح حجر کیا جائے گا جیسے بچے پر کیا جاتا ہے بلکہ اس پر حجر کرنا زیادہ ضروری ہے کیونکہ بچے سے تو تبذیر کا صرف احتمال ہے اور اس عاقل و بالغ فرد سے تبذیر عملاً صادر ہو چکی ہے ۔ (ہدایہ جلد ۳)

ہدایہ کے ایک شارح سید جلال الدین الخوارزمی نے سفہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :

سفہ منشائے شریعت کے خلاف عمل، خواہشات نفس کی پیروی اور تقاضائے عقل کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ سفیہ کو اخراجات میں اسراف و تبذیر کی عادت ہوتی ہے وہ ایسے تصرفات کرتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا یا ایسا مقصد ہوتا ہے جسے دیندار اصحاب عقل معقول مقصد نہیں سمجھتے مثلاً مغنیوں کو مال دینا یا اڑنے والے کبوتروں کو بھاری قیمت ادا کرکے خریدنا، عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا، نیکی اور احسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہے، البتہ ان کاموں میں بھی اسراف حرام ہے جس طرح کھانے اور پہننے میں اسراف حرام ہے۔

(کفایہ شرح ہدایہ)

ہدایہ کے ایک دوسرے شارح قاضی زادہ کی وضاحت یہ ہے :

ہدایہ کی شرح عنایہ میں شارح نے لکھا ہے کہ یہاں فساد سے مراد سفہ ہے۔ یہ ایک عقل کا ہلکا پن ہے جو آدمی پر طاری ہو جاتا ہے تو اسے باوجود اس کے کہ اس کی عقل سلامت رہتی ہے، شریعت اور عقل کے منشا کے خلاف عمل پر آمادہ کر دیتا ہے ۔ فقہاء کے یہاں یہ اصطلاح صرف مال میں تبذیر اور اسے عقل و شریعت کے تقاضے کے خلاف ضائع کرنے کا مفہوم رکھتی ہے ۔

(تکملہ فتح القدیر جلد ۸)

امام شمس الدین نے بھی المبسوط میں اسی کا قدر مشترک لکھا ہے :
سفہ مقتضائے شریعت کے خلاف عمل کا نام ہے وہ خواہشات نفس کی پیروی اور عقل و خرد کے تقاضے کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا اور نیکی و احسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شرعاً پسندیدہ ہے لیکن ان کاموں میں تبذیر و اسراف سے کام لینا شریعت اور عرف عام دونوں میں برا ہے۔
(المبسوط ج ۲۴)

عبدالرحمان الجزیری نے الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں اس کی پوری توضیح کی ہے :
احناف کہتے ہیں کہ ہمارے مسلک میں مختار اور مفتیٰ کی رائے یہی ہے کہ سفیہ پر حجر کیا جائے گا۔ سفیہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ فرد جو اپنے مال کا بخوبی انتظام نہ کر سکتا ہو اور اسے حرام کاموں اور لغویات میں اور گناہ کے کاموں میں صرف کرے ، اپنے تصرفات میں تبذیر و اسراف سے کام لے ۔ ایسے اسراف میں جس کے سبب حجر کرنا واجب ہے مغنیوں کو مال دینا ، گراں قیمت دے کر کبوتر و مرغ وغیرہ خریدنا شامل ہیں اور جوئے بازی میں مال صرف کرنے یا دوسرے ایسے اخراجات کرنے پر بھی حجر واجب ہے ، جو عقل و شرع کے خلاف ہوں ' اسی طرح اگر فرد اپنا سارا مال اچھے کاموں مثلاً مدرسہ ، مسجد یا ہسپتال کی تعمیر میں صرف کر دے تو بھی وہ سفیہ قرار پائے گا اور اس پر حجر کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کار خیر کا مکلف اسی وقت بنایا ہے جب اس کی مالی حالت اس کی اجازت دیتی ہو یعنی وہ کار ہائے خیر کی وجہ سے مال خرچ کر کے نادار نہ ہو جائے ۔

مال کو اللہ نے سرمایہ حیات بتایا ہے

قرآن نے یہ بلیغ فقرہ جعل اللہ لکم قیاماً بول کر ایک بہت بڑے اجتماعی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور مال کی اہمیت اور اس کی قدر بتائی ہے ۔ میانہ روی اور اقتصاد کے موضوع پر اجتماعی زندگی میں اس سے زیادہ بلیغ بات نہیں کہی جا سکتی ہے ۔ اس میں ایک طرف اگر میانہ روی کی ترغیب اور اس کے فوائد بتائے ہیں ، دوسری طرف اسراف و تبذیر سے گریز کی تلقین ہے ۔ گویا فرمایا ہے کہ تمہارے انفرادی منافع اور تمہاری اجتماعی مصلحتوں کا مال کے ساتھ گہرا اور

بنیادی تعلق ہے۔ یہ مال جب تک راشدین اور میانہ رو انسانوں کے ہاتھوں میں رہے گا اس وقت تک یہ بہترین نتائج کا حامل ہوگا اور جب بھی مال ناعاقبت اندیش، غلط کار اور فضول و لغو میں لٹانے والوں کے ہاتھ میں ہوگا تو نہ انفرادی منافع اس کے ذریعے حاصل ہوں گے اور نہ اجتماعی مصالح کے لیے اس کی افادی حیثیت قائم رہے گی۔ یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے زندگی کی تمام شاخوں کی طرح قرآن اموال کے موضوع پر بھی اقتصاد و اعتدال کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ قرآن کی اولین خوبی ہے کہ اس کا راستہ افراط و تفریط کے درمیان رہتا ہے۔ اسی لفظ قیام کی خود قرآن نے دوسرے موقعہ پر یہ تشریح کی ہے :

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا و لم یقتروا و کان بین ذالک قواما
جب خرچ کرتے ہیں نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کمی کرتے ہیں بلکہ اس کے درمیان ہوتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اقتصاد و اعتدال کی اپنے ارشادات میں تلقین فرمائی ہے حضرت حذیفہ صحابی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

دولت مندی میں میانہ روی کتنی اچھی ہے، محتاجی میں میانہ روی کیسی اچھی ہے اور عبادت میں میانہ روی کیسی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کر قارون وقت بن کر حق سے غافل ہو جاتے نہ اتنا محتاج ہو کر پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جاتے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان و شکوہ، عز و جاہ اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اتنے دنی اور مبتذل ہو جاتے ہیں کہ صبر خودداری اور تمام شریفانہ اعمال کھو دیتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے اور نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گرنا چاہیے۔

تقابلی مطالعہ

مال کے بارے میں حفاظت مال کے قرآنی نقطہ نظر پر شاید کچھ کو حیرت ہو لیکن شاید ان کو پتہ نہیں ہے کہ قرآن ہی میں اسی مال کا مختلف عنوانوں سے ذکر آیا ہے کہیں تجارت، کہیں لین دین، کہیں رہن، کہیں وصیت، کہیں وراثت، کہیں عورتوں کا مہر، کہیں اموال کی حفاظت کے

لیے گواہی یہ ساری تصریحات بتا رہی ہیں کہ قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے۔ قرآن نے مال کو نہیں مال کے غلط استعمال کو برا کہا ہے۔ قرآن نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ مالدار کے لیے آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے (انجیل متی) اور یہ بھی نہیں بتایا کہ دیکھو میں تم سے کہتا ہوں کہ سوئی کے ناکہ سے اونٹ کا گزر جانا ممکن ہے مگر مالدار کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہا کہ تم اللہ اور مال کی خدمت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس نے بتایا ہے کہ جنت ان پارساؤں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال خوش حالی اور تنگدستی میں خرچ کرتے ہیں۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ کرو۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ وارزقوا ھم فیھا واکسو ھم وقولوا لھم قولا معروفاً اور اس مال میں سے ان سفہاء کو کھلاتے پلاتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کہتے رہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسی سرمایہ سے ان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو۔ ان کی راحت و آسائش کے سامان کرتے رہو اور بجائے ان کے ہاتھ میں دے دینے کے ان سے تسلی کی باتیں کرتے رہو کہ یہ بلکہ تمہاری ہی ہے تمہاری ہمدردی کا تقاضا ہے کہ اسے تمہارے ہاتھ میں نہ دیا جائے بلکہ انتظار کیا جائے کہ تم میں پوری طرح سمجھ آجائے ان کی یہ سفاہت ان کے نان و نفقہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

رزق بولا ہے مگر اخراجات کی ساری صورتیں مراد ہیں ان کا کھانا، ان کا رہنا اور ان کی خانہ آبادی وغیرہ لباس کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عموماً لوگ اس میں بے پروائی اور تساہل سے کام لیتے ہیں اور یہ فرمایا کہ فیھا اس میں سے یہ نہیں فرمایا منہا اس سے۔ اس میں اشارہ ہے کہ مال اور سرمایہ کو کھلا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ اسے کاروبار میں لگا کر اس کے منافع سے ان کے اخراجات کو پورا کیا جائے تاکہ اصل مال محفوظ رہے اور قول معروف میں ان کی تربیت کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت بتائی ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ یہاں قول معروف سے مراد تادیب و تنبیہ ہے۔ اور قفال مروزی کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں کی سی معاشرت اختیار نہ کرو بلکہ ان کو نیکیوں کی طرف توجہ دلاتے رہو اور بتاتے رہو کہ اسراف مال کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

اور اگر آیت میں سفہاء سے مراد یتامیٰ ہوں جیسا کہ سعید بن جبیر کی رائے ہے تو پھر آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم جو تمہیں دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کے سپرد کر دو تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اگر وہ بالکل نادان اور بے سمجھ ہوں پھر بھی جو کچھ ان کا ہے ان کو دے دو۔ اگر وہ

ابھی ناداں ہے تو سرپرست کا فرض ہے کہ وہ اس کا مال اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھے البتہ اس کو کھلاتے اور پہناتے اور اس کی دلداری کرتا رہے تاکہ اس کو اطمینان رہے کہ یہ نگرانی اس کے فائدے کے لیے ہے۔ ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کی ہر چیز اس کو ملنی ہے۔

یتامیٰ کی عقل وشعور کا جائزہ

۱۴۔ اور یتیموں کے عقل وشعور کا جائزہ لیتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں صلاحیت واہلیت دیکھو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو۔ یعنی یتیموں کو سدھاتے اور آزماتے رہو۔ بلوغ کے وقت تک پھر بلوغ کے بعد اگر ان میں اپنے نفع ونقصان کی سمجھ اور حفاظت اور انتظام مال کا سلیقہ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔ یتیموں کے سدھانے اور آزمانے کی عمدہ صورت یہی ہے کہ کم قیمت پر معمولی چیزوں کی ان سے خرید وفروخت کرائی جائے اور اس کا طریقہ اُن کو بتایا جائے اس سے معلوم ہوا کہ نابالغ کی بیع وشرا ولی کی اجازت سے دُرست ہے۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہی ہے اور اگر بالغ ہو کر بھی اس میں ہوشیاری نہ آئے تو امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پچیس برس کی عمر تک انتظار کرو۔ اس عرصہ میں جب اس کو سمجھ آجائے مال اس کے حوالہ کر دو ورنہ پچیس سال پر ہر حال میں اس کا مال اس کو دے دو پوری سمجھ آئے یا نہ آئے[1]

اس ارشاد میں دو ہدایتیں ہیں ایک قرآن کے منطوق سے معلوم ہو رہی ہے اور دوسری قرآن کے مدلول سے۔ جو بات اس آیت میں مدلول سے معلوم ہو رہی ہے یہ ہے کہ قرآن نے یتیموں کا جائزہ لینے کی ہدایت کی ہے۔

یہ جائزہ لینا کیا ہے؟ اصل ارشاد میں ابتلا آیا ہے۔ اس کے معنے آزمانے، جانچنے کے ہیں۔ اس کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے، کچھ کہتے ہیں کہ ابتلا یہ ہے کہ وصی اس کی اخلاقی حالت کا بغور مطالعہ کرے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں تک اپنے فرائض کی ادائیگی کر سکتا ہے اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ جائزہ لینا یہ ہے کہ کچھ سرمایہ دے کر اس سے کاروبار کرائے تاکہ وصی کو حقیقتِ حال کا پتہ لگ جائے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ ابتلا یہ ہے کہ گھر کے نظامِ خرچ کو دیکھے اور اس کو بتائے کہ اخراجات کا نظام کیسے چلتا ہے۔ لیکن ابو بکر الجصاص کہتے ہیں کہ ابتلا مخصوص نہیں

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بلکہ عمومی ہونا چاہیے اور ہر پہلو سے ہونا چاہیے۔ ان کی عقل کا ان کے حالات اور ان کے تصرفات میں ان کی مہارت کا بھی، سب چیزوں میں جائزہ ہونا چاہیے اور یہ اختیار، ابتلا اور جائزہ ولی اور وصی کی جانب سے ہو۔ یہ جائزہ لینے کی ہدایت بتا رہی ہے کہ ان یتامیٰ کے معاملات چھپنے میں اولیاء کی اجازت سے جائز ہیں۔ ان کے تصرفات پر ان کے لین دین اور ان کے کاروبار پر قطعاً کوئی قدغن نہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ اگر ولی کی اجازت سے خرید و فروخت کرے تو جائز ہے۔ یہی امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔

دوسری ہدایت جو اس آیت کے منطوق سے معلوم ہو رہی ہے یہ ہے کہ یتیموں کو ان کا مال حوالہ کرنے کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ وہ بالغ ہو جائیں دوسرے یہ کہ ان میں رشد یعنی مال کے استعمال کرنے کی صحیح صلاحیت اور اہلیت آجائے۔ پہلی شرط کی حد تک سب کا اتفاق ہے بلوغ کی عمر حنفیہ کے یہاں لڑکے کے لیے ۱۸ سال ہے اور لڑکی کے لیے ۱۷ سال ہے۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام اعظم ابو حنیفہ کے دونوں شاگردوں ابو یوسف اور امام محمد کی رائے میں بلوغ کی عمر ۱۵ سال ہے اور اسی پر احناف کے یہاں عمل ہے اور اصل بلوغ کی علامات انزال اور حیض ہیں اگر یہ نہ ہوں تو پھر مفتی بہ ۱۵ سال ہے۔ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری شرط یعنی رشد کے بارے میں ائمہ کے نقطہ ہائے نظر مختلف ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک مالی تصرفات اور معاملات میں صلاحیت کو رشد کہتے ہیں جبکہ امام شافعی اور امام کے نزدیک رشد میں مالی تصرفات کی معقولیت کے پہلو بہ پہلو مالک کا صالح اور راست باز ہونا بھی ضروری ہے۔ علامہ نووی منہاج الطالبین میں رقمطراز ہیں:

> رشد، دین اور مال دونوں میں صالح ہونے کا نام ہے لہٰذا صاحب رشد وہ ہے جو ایسے حرام کام نہ کرے جس سے اس کی راست بازی (عدالت) ختم ہو جائے اور تبذیر نہ کرے مثلاً تجارتی معاملات میں کھلا نقصان گوارا نہ کرے اور اپنے مال کو سمندر میں نہ ڈالے یا ایسے حرام کاموں میں نہ صرف کرے صحیح رائے یہ ہے کہ صدقہ اور کار ہائے خیر یا خوراک اور لباس میں اپنی حیثیت سے زیادہ مال خرچ کرنا تبذیر نہیں ہے۔

اور علامہ ابن قدامہ المغنی میں لکھتے ہیں:

> اور رشد کے معنے یہ ہیں کہ مالک اپنے مال کو بے فائدہ کاموں میں صرف ہونے سے بچائے مثلاً غنا، قمار، حرام اشیاء اور آلات لہو کے خریدنے سے

اور اس مال کو فساد کا ذریعہ نہ بنائے۔ ایسا کام کرنے والا صاحبِ رشد نہ قرار پائے گا کیونکہ یہ اپنے مال کی تبذیر اور اسے غیر مفید کاموں میں ضائع کرتا ہے۔

اور اس شرط یعنی رشد کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رشد نہ پایا جائے تو یتیم کے ولی کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رشد پایا جائے یا نہ پایا جائے اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اور امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالہ کیے جانے کے لیے بہرحال رشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

بہرحال اس آیتِ قرآنی میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مالکانہ تصرفات کے لیے رشد ضروری ہے اور مالک سفیہ ہو تو اسے مالکانہ تصرفات کا موقعہ نہ دینا چاہیے۔ فقہائے سفہ اور رشد کی جو تعریفیں کی ہیں ان کا مطالعہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

بلاغت کا ایک عجیب نکتہ

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع و لا تؤتوا السفہآء اموالکم میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے اموال کو اپنے پاس رکھنے کا حکم ہے وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف ہے کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو، اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو حکم ہے کہ یتیموں کو مال واپس کریں وہاں مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی ہے ادفعوا الیہم اموالہم تم ان کا مال ان کو واپس کر دو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسے اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا چن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔

مالِ یتامیٰ میں اسراف اور بدار

۱۳۔ اور اس خوف سے کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں ان کے مالوں کو فضول خرچی کر کے جلدی جلدی نہ کھا پی ڈالو۔ یعنی یتیم کے مال کو ضرورت سے زیادہ صرف کرنا منع ہے مثلاً ایک پیسے کی جگہ دو پیسے صرف کر دو اور یہ بھی منع ہے کہ اس بات سے گھبرا کر کہ یتیم بڑے ہو کر اپنا

مال ہم سے لے لیں گے خرچ کرنے میں جلدی کرنے لگو خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کے مال کو بقدرِ ضرورت اور بوقتِ ضرورت صرف کرنا چاہیئے [1]

اس آیت میں یتیموں کے مال میں دو باتوں سے روکا ہے ایک اسراف دوسرے بدار۔ اسراف قرآن حکیم کی ایک جامع اصطلاح ہے اس کا اطلاق ہر ایسے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو لیکن صرف مال کے سلسلے میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں جس غرض کی تکمیل مال کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے۔ اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے قاموس میں ہے کہ سرف قصد یعنی میانہ روی کی ضد ہے اور جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ کردار میں حد سے بڑھ جانے کا نام اسراف ہے۔ انفاق میں کبھی کمیت اور کبھی کیفیت کے لحاظ سے اسراف ہوتا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا معنی معیار کے اعتبار سے زائد از ضروریات مال صرف کرنے کا۔

بدار یہ ہے کہ مال کو جلدی جلدی ختم کر دیا جائے۔ قرآن نے ان دونوں سے منع کیا ہے اور کرنے والے یہ دونوں کام صرف اس اندیشہ سے کریں کہ یتامیٰ اگر بڑے ہو جائیں گے تو ہمیں ان کا مال ان کو دینا پڑے گا یعنی متولیوں کو جو یتیم کے مال کو بد دیانتی اور اسراف سے خرچ کریں اور جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلدی جلدی خرچ کر کے برابر کر دیں کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا کرنہ بیٹھیں تنبیہہ فرمائی ہے۔

یتیم کے غریب ولی کو حقِ خدمت

۱۴ - اور یاد رکھو کہ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو اسے چاہیے کہ یتیم کے مال سے بالکل پرہیز کرے اور جو حاجتمند ہو وہ بقدرِ حاجت دستور کے مطابق لے سکتا ہے۔ یعنی یتیم کا ولی اس کا مال اپنے خرچ میں نہ لائے اور اگر یتیم کی پرورش کرنے والا محتاج ہو تو البتہ اپنی خدمت کرنے کے موافق یتیم کے مال میں سے دستور کے موافق لے مگر غنی کو کچھ لینا ہرگز جائز نہیں ہے [2] مطلب یہ ہے کہ سرپرست اگر مستغنی آدمی ہو تو اس کو یتیم کے مال میں سے کچھ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر غریب ہو تو دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے [3]

سادے لفظوں میں منشا یہ ہے کہ صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو ان

لہ ۲ لہ افاداتِ شیخ الاسلام ۳ تدبر قرآن

کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق ہے اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی قانونی اجازت ہے۔

اکل بالمعروف کا نظری اور واقعاتی تجزیہ

منصفانہ معاوضہ یا دستور کے مطابق سے قرآن کے معروف کی تشریح کی گئی ہے لیکن شارحین اور فقہا نے اس موضوع پر مختلف خیالات پیش کیے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ معروف کے مطابق لینے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے موقعہ پر مال یتیم میں سے قرض لے لے، خوش حالی آنے پر ادائیگی کرے۔ یہ فاروق اعظم، عبداللہ ابن عباس، عبیدہ ابن جبیر، شعبی، مجاہد اور ابوالعالیہ کی رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ متولی اگر حاجت مند ہو تو ضرورت کے مطابق اس کو لینا جائز ہے اور اس کے ذمہ یہ قرض نہیں کیونکہ یہ اس کی نگرانی کا حق ہے لیکن اس کی کیفیت میں یہ بتایا ہے کہ بھوک کی مقدار میں کھائے اور کپڑے صرف ستر کے ڈھانپنے تک استعمال کرے۔ قیمتی کپڑوں کی ہرگز اجازت نہیں ہے اور امام شعبی فرماتے ہیں کہ منافع میں سے کھائے اصل سرمایہ کو ہاتھ نہ لگائے، جانور موجود ہوں تو ان کا دودھ استعمال کر سکتا ہے لیکن خود جانور کو کھانے اور فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اکل بالمعروف کا یہ مجرد نظریاتی تجزیہ بات کو پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔ اب ہم چند ایسی احادیث کا مطالعہ کریں گے جو نادار متولی کے لیے یتیم کے مال سے معروف کے مطابق فائدہ اٹھانے کی اجازت ثابت کرنے کے ساتھ اس کے تصور کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔

ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں ہے؛

> ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک یتیم کا سرپرست ہوں، فرمایا کہ تم یتیم کے مال میں سے لے سکتے ہو بشرطیکہ اسراف نہ کرو اور یتیم کے مال کو جلدی ختم کرنا مقصد نہ ہو اور اپنے سرمایہ کو بچا کر رکھنا پیشِ نظر نہ ہو۔

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر کے سوال کے جواب میں بھی حضور انور نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔ ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکل بالمعروف کی اجازت کا مقصد انسان کو یتیم کے مال میں ایک معتدل اور متوازن روش پر قائم رکھنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اس معاملہ میں ذمہ داری کی ضرورت اور نزاکت کو محسوس کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ذمہ داریوں کی نوعیت جائداد کی حیثیت مقامی

حالات کے اعتبار سے ایسا فائدہ اٹھائے جو معقولیت کی حدود کے اندر ہو۔

یتیم کے مال پر گواہی

۱۵۔ پھر جب تم یتیموں کے مال ان کے سپرد کرو تو تمہیں ان پر گواہ بنا لینا چاہیے اور دیکھو محاسبہ کے لیے بس اللہ کا محاسبہ کافی ہے۔ یعنی جب کسی بچہ کا باپ مر جاتے تو چاہیے کہ چند مسلمانوں کے روبرو یتیم کا مال لکھ کر امانت دار کو سپرد کر دیں۔ جب یتیم بالغ اور ہوشیار ہو جائے تو اس تحریر کے موافق اس کا مال اس کے حوالے کر دیں اور جو کچھ خرچ ہوا ہو اس کو سمجھا دیں اور جو کچھ یتیم کے حوالہ کیا جائے گواہوں کو دکھلا کر حوالہ کر دیں۔ تاکہ کسی وقت اختلاف ہو تو بسہولت طے ہو سکے اور اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کا حساب لینے والا کافی ہے اس کو کسی حساب اور شہادت کی حاجت نہیں ہے یہ سب باتیں تمہاری سہولت اور صفائی کی وجہ سے مقرر فرمائیں۔ جاننا چاہیے کہ یتیم کا مال لینے اور دینے کے وقت گواہ کرنا اور اس کو لکھ لینا مستحب ہے۔[1]

اس آیت میں شہادت کی نوعیت کے بارے میں فقہاً کا اختلاف ہے۔ مالکیہ اور شوافع اسے واجب کہتے ہیں جبکہ احناف اسے مستحب قرار دیتے ہیں۔ گویا اول الذکر کے خیال میں یہاں امر وجوب کے لیے ہے اور آخر الذکر اس امر کو محض استحبابی اور ارشادی کہتے ہیں۔ سیاق قرآنی میں اب تک یہاں جس قدر اوامر گزرے ہیں ان پر بھی سب متفق ہیں کہ قطعاً تحریم کی رہنمائیں۔ پھر عقلی طور پر اگر شہادت کا منشا اور مقصد رفع نزاع بالقول قاضی ثناء اللہ پانی پتی دفع تہمت اور انقطاع خصومت ہے یا بقول علامہ قرطبی مال کی حفاظت اور زوال تہمت ہے تو پھر یہاں شہادت کو ضروری ہونا چاہیے اور اگر شہادت کا مقصد صرف آئندہ دعووں سے حفاظت ہے جیسا کہ علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں کا خیال ہے تو پھر یہاں شہادت کا درجہ استحبابی ہونا چاہیے۔

دراصل بنائے اختلاف صرف یہ نہیں ہے واقعی صورت حال یہ ہے کہ متولی، ولی اور وصی کی حیثیت میں فکری اختلاف ہے۔ شوافع کی نظر میں متولی کی حیثیت وکیل کی ہے جبکہ احناف کی رائے میں متولی کی حیثیت امین کی ہے۔ حیثیت کے اسی اختلاف کی وجہ سے محققین احناف نے صاف کہہ دیا ہے کہ متولی اور وصی جو یتیم کے مال میں سے حق خدمت لے گا وہ بطور اجرت نہیں ہے جبکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شوافع کے نزدیک یہ بطور اجرت ہے۔ اور اسی بنا پر اگر وصی یتیم کے بالغ ہونے کے بعد یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں یتیم کا مال دے چکا ہوں یا میں اس پر سارا خرچ کر چکا ہوں تو اس کی صداقت کو تسلیم کیا جائے گا اور اس سے گواہی کا مطالبہ نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ امین ہے لیکن امام مالک اور شافعی اس کے دعویٰ کو بغیر شہادت نہیں مانیں گے کیونکہ یہ وکیل ہے۔ ابوبکر الجصاص نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا قانونی جائزہ لیا ہے۔ مال یتیم اور اس کی نگرانی کی حد تک قرآن نے جو اہمیت دی ہے کہ اس نے اس موضوع پر یہاں بارہ حکم دیے ہیں ان میں چار نہی ہیں اور آٹھ امر ہیں۔ یہ اہمیت بتا رہی ہے کہ متولی کی حیثیت صرف امین ہی کی نہیں ہے بلکہ اس پر امین سے بڑھ کر ذمہ داری ہے یہ یتیم کے مال کو صرف محفوظ رکھنے کا نہیں بلکہ اسے بڑھانے کا بھی ذمہ دار ہے۔ اسے حق الخدمت لینے کی بھی اجازت ہے وہ اس کے اموال کا نگران اور تنظیم میں سے یتامیٰ کے امتحان لینے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔ جنسی بلوغ کے ساتھ عقلی بلوغ ہو جانے پر اسے مال سپرد کرنے کا بھی حکم ہے اور سپرد کرتے وقت اسے گواہ بنا لینے کی بھی ہدایت ہوئی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ
نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿٧﴾ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾
وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ
فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ
أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾ ع ١٢

مردوں کے لیے اس مال میں حصّہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، چاہے تھوڑا ہو یا بہتا اور یہ حصّہ خدا کا مقرر کردہ ہے۔ اور جب تقسیم کے موقع پر

کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو، اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔[۱۲] اور لوگوں کو اس بات کو سوچ کر ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔[۱۳] جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔[۱۴]

قانونِ وراثت کا اجمالی تصور اور اس کے اصول

یتامیٰ کے تحفظِ حقوق کے بعد اب یہ تمہید ہے اس قانونِ وراثت کی جس میں مردوں اور عورتوں کے ان کے والدین اور اقرباء کے ترکے میں سے حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ ظلم میں یتیم بچے اور عورتیں ایک سا سرے جیسے ہیں، اہلِ عرب جیسے یتیم بچوں کو حقوقِ وراثت سے محروم کرتے تھے ویسے ہی عورتوں کو بھی وراثت کا حقدار قرار نہ دیتے تھے۔ ان کا ذہن یہ بن گیا تھا کہ وراثت تو صرف گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرنے والے کا حصہ ہے اور جہاں عورت ہونا اور یتیم ہونا دونوں جمع ہو جائیں وہاں ظلم حد درجہ بے باک ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایسا ہی واقعہ زمانۂ نبوت میں پیش آگیا۔ اوس بن ثابت

کا انتقال ہوگیا۔ وارثوں میں دو لڑکیاں ایک بچہ اور ایک بیوی چھوڑ گئے۔ عرب کے دستور کے مطابق ان کے چچا زاد بھائیوں نے آکر مرحوم کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اولاد اور بیوی کو کچھ نہ دیا۔ عورت تو عورت ہونے کی وجہ سے وراثت کی حقدار نہ تھی اس لیے بیوی اور دونوں بچیاں تو یوں ہی محروم ہوگئیں اور لڑکا نابالغ ہونے کے جرم میں محروم ہوگیا۔ اوس بن ثابت کی اہلیہ نے یہ بھی چاہا کہ چچا زاد بھائی ان دونوں لڑکیوں سے شادی کر لیں مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوتے۔ یہ صورت حال اوس کی اہلیہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کر دی اور اپنے بچوں کی بے کسی اور بے بسی کی شکایت کی۔ ابھی تک قرآن میں قانون وراثت نازل نہ ہوا تھا اس لیے آپ نے توقف فرمایا آپ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی اس ظالمانہ رسم کو ضرور بدلے گی۔ اس آیت میں ان ہی حالات کی عکاسی کی گئی ہے اور واضح طور پر قانونی وراثت کے پانچ بنیادی اور اہم نکتے بتادیے ہیں۔ ایک یہ کہ میراث صرف مردوں ہی کا حصہ نہیں بلکہ عورتیں بھی اس کی حقدار ہیں۔ دوسرے یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ کتنی کم ہو حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے صرف ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری ہوگا۔ چوتھے یہ کہ میراث کا حق دار اس وقت ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ کر مرا ہو۔ پانچویں یہ کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

ان ہی پنجگانہ اصول پر قانون میراث کی ساری عمارت قائم ہے۔

۱۱۔ مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو ۔ اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو چاہے تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ خدا کا مقرر کردہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے یہ رسم تھی کہ بیٹیوں کو چھوٹی ہوں یا بڑی میراث نہ دیتے تھے اور بیٹے جو نابالغ ہوتے تھے ان کو بھی میراث نہ ملتی۔ صرف مردوں کو جو بڑے اور دشمنوں سے مقابلے کے کام کے ہوتے تھے وہ وارث سمجھے جاتے تھے جس کی وجہ سے یتیم بچوں کو میراث سے کچھ نہ ملتا تھا۔ ان کے بارے میں یہ آیت اتری جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ اور دیگر قرابت والوں کے مال متروکہ میں سے مردوں یعنی بیٹوں کو خواہ وہ بچے ہوں یا جوان ان کو حصہ ملے گا اور عورتوں یعنی بیٹیوں کو بھی بالغ ہوں یا نابالغ ہوں ماں باپ وغیرہ اقارب کے ترکہ میں سے ان کا حصہ دیا جائے گا اور یہ حصے مقرر کیے ہوئے ہیں جن کا دینا ضروری ہے خواہ مال تھوڑا ہو یا بہت۔ اس سے اہل جاہلیت کی مذموم رسم کا ابطال ہوگیا اور یتیموں وغیرہ کی حفاظت فرما کر ان کی حق تلفی کو روک دیا۔ اس آیت میں حق والوں کا حق اور اس کا تقرر اور تعین بالاجمال بتلایا

گیا ہے آئندہ رکوع میں وارثوں کے حصہ کی تفصیل آتی ہے ۔

قرابت وراثت کی بنیاد ہے

وراثت کا بہت گہرا تعلق خاندانی نظام اور عائلی زندگی سے ہے ۔ وراثت کا نظام خاندان کو تسلسل بخشنے اور اسے ایک وحدت کے طور پر برقرار رکھنے میں بہت اہم حصہ لیتا ہے ۔ خاندان کے مختلف افراد کے درمیان باہمی تعاون اور خدمت کا جو تعلق قائم ہے اسے باقی رکھنے اور مستحکم کرنے میں جہاں طبعی اور جذباتی عوامل کو دخل ہے وہاں مادی اور معاشی عوامل بھی کچھ اہم نہیں ہیں ۔

اسلام کے قانونِ وراثت اور محروم افرادِ خاندان کی کفالت کے بارے میں اس کے ضوابط کا ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے معاشی زندگی میں خاندانی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے ۔ جن رشتہ داروں کو ایک فرد کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ میں حصہ دار بنایا گیا ہے ۔ انہی رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اس فرد کی زندگی میں بہ شرطِ ضرورت اس کی کفالت کریں ۔ اس طرح اسلام میں خاندان کا ادارہ فرد کے بنیادی مفادات کا محافظ اور اس کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کا کفیل بنایا گیا ہے ۔

اس اُصول کا تقاضا ہے کہ استحقاقِ وراثت کی بنیاد ولادت اور قرابت ہو ۔ قرآن کی اس آیت نے اسی حقیقت کو مما ترک الوالدان والاقربون کہہ کر بے نقاب کیا ہے یعنی وراثت کا استحقاق دو وجہ سے ہوتا ہے ایک ولادت ، دوسرے قرابت ۔ چونکہ قرابت کے لفظ کا معنوی دائرہ بے حد وسیع تھا اس لیے اس کو اقربون کہہ کر تنگ کر دیا یعنی وراثت کے لیے مطلق قرابت کافی نہیں ہے بلکہ رشتہ میں اقرب ہونا شرط ہے ۔

اقرب کی شرط کیوں لگائی گئی ہے ؟ اس لیے کہ اگر اقربیت کو شرط نہ مانا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت دُنیا کی انسانی برادری پر تقسیم ہوگی ۔ کیونکہ اولادِ آدم ہونے میں سب کو قرابت حاصل ہے ۔ اقربون لاکر قرآن نے اس ضابطہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر نزدیک و دُور کے رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کی موجودگی میں قریب کو اور قریب کی موجودگی میں بعید کو اور بعید کی موجودگی میں ابعد کو حصہ نہ دیا جائے گا ۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ انتقالِ ملکیت کی یہ صورت ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرابت کی بنا پر ہے اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب ہوں ان کو وراثت کا زیادہ حقدار سمجھا جاتے بلکہ جس کا میت سے قریب تر خونی رشتہ ہو گا وہ حقدار ہو گا اگرچہ وہ دولت مند ہو۔

اگر اس قرآنی اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ یتیم پوتا اگرچہ بیٹے کے مقابلہ میں زیادہ ضرورت مند ہو لیکن اقربیت کے اس قرآنی اصول کی وجہ سے وہ مستحقِ وراثت نہیں ہو سکتا وہ اولوالقربیٰ میں داخل ضرور ہے مگر بیٹے کی موجودگی میں اقرب نہیں ہے۔ ہاں اس کی ضرورت کی خاطر دوسرے انتظامات کیے جائیں گے جیسا کہ آنے والی آیت اسی قسم کے انتظام کی رہنمائی کر رہی ہے۔

آیت میں مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ یہ ضابطہ بھی بتا دیا کہ میت کے اموال و املاک میں جو کچھ جتنا کچھ بھی ہے سب قابلِ تقسیم وراثت ہے[1]۔

آیت کے بالکل آخر میں نَصِيبًا مَّفْرُوضًا فرما کر وراثت کو انتقالِ ملکیت کی تمام صورتوں سے ممتاز کر دیا اور بتا دیا کہ اس صورت کو تمام معاملاتی معاہداتی صورتوں سے ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی شرط نہیں ہے۔ یہ انتقال مالک کی مرضی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات اس کے علی الرغم اللہ سبحانہٗ کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان رشتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر میت کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو منتقل ہوں۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حصے ہیں، ان میں نہ فرد کو اور نہ ادارے کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

محروم الارث رشتہ داروں کی دلداری

۱۲۔ اور جب تقسیم کے موقعہ پر کنبہ کے لوگ اور یتیم و مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ یعنی تقسیم میراث کے وقت برادری اور کنبے کے لوگ جمع ہوں تو جو رشتہ دار ایسے ہوں جن کو میراث میں حصہ نہیں پہنچتا۔ جو یتیم و محتاج ہوں

[1] معارف م ش ملخصاً

ان کو کچھ کھلا کر رخصت کر دیا کوئی چیز ترکہ میں سے حسب موقع ان کو بھی دے دو کہ یہ سلوک کرنا مستحب ہے اور اگر مال میراث میں سے کچھ کھلانے پلانے کا موقعہ نہ ہو مثلاً وہ یتیموں کا مال ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی تو ان لوگوں کو معقول بات کہہ کر رخصت کر دو یعنی نرمی سے عذر کر دو کہ یہ مال یتیموں کا ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی ہے اس لیے ہم مجبور ہیں۔ ابتدائے سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ تمام قرابت والے درجہ بدرجہ سلوک اور مراعات کے مستحق ہیں اور یتامیٰ اور مساکین بھی اور جو قریب یتیم اور مسکین بھی ہو تو اس کی رعایت اور بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ اس تقسیم میراث کے وقت ان کو حتی الوسع کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے وارث نہ ہو تو حسن سلوک سے محروم نہ رہیں[1]

خطاب آیت کے وارثوں سے ہے اور ان کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقعہ پر جو دُور نزدیک کے رشتہ دار اور کنبہ کے غریب مسکین لوگ اور یتیم بچے آ جائیں۔ ان کے ساتھ تنگ دلی نہ ہو تو۔ میراث میں از روئے شرع ان کا حصہ نہیں ہے تو نہ سہی۔ وسعتِ قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان کو کچھ نہ کچھ دے دو اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں[2]

مطلب یہ ہے کہ جو دُور کے رشتہ دار اور یتیم و مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم ہوں۔ اگر وہ تقسیم میراث کے موقعہ پر آ جائیں تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فرض ہے کہ اس مال میں سے باختیار خود کچھ حصہ ان کو بھی دے دیں جو ان کے لیے ایک قسم کا صدقہ اور باعثِ ثواب ہے۔ اور ایسے وقت میں جبکہ ایک مال بغیر کسی محنت کے محض اللہ کے فضل سے ان کو مل رہا ہو تو صدقہ کا داعیہ خود بھی دل میں ہونا چاہیے۔ اسی کی ایک نظیر قرآن میں ایک جگہ اور ہے، ارشاد ہے:

كلوا من ثمره اذا اثمر وآتوا حقه يوم حصاده

باغ کے پھل دیتے وقت اس کا پھل کھاؤ اور کٹائی کے وقت اس کا حق نکال کر فقراء اور مساکین کو بھی دو۔

خلاصہ یہ کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دُور کے رشتہ دار یتیم و مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا قانون کے مطابق میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے تو ان کے آ جانے سے تنگدل نہ ہو بلکہ جو مال اللہ نے تمہیں بلا محنت دیا ہے اُس میں سے بطور شکر ان کو بھی کچھ دے دو اور یہ غنیمت سمجھو کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

خرچ کا ایک موقعہ مل گیا۔ اس موقعہ پر ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دے دینے سے ان دُور کے رشتہ داروں کی دل شکنی اور حسرت کا ازالہ ہو گیا اور اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آ گیا۔ اس کے چچاؤں اور پھوپھیوں کو چاہیے کہ اس کو اپنے حصّہ میں سے بخوشی کچھ دے دیں [1]

بے بس اور کمزور اولاد

۱۳۔ اور لوگوں کو اس بات کو سوچ کر ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے پس چاہیے کہ وہ خدا سے ڈریں اور راستی کی بات کریں۔ یہ ارشاد اصل میں تو یتیم کے ولی اور وصی کے لیے ہے درجہ بدرجہ اوروں کو بھی اس کا خیال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مرنے کے بعد جیسا ہر کوئی اس بات سے ڈرتا ہے کہ میری اولاد کے ساتھ سختی اور بُرائی سے معاملہ کیا جاتے۔ ایسا ہی تم کو بھی چاہیے کہ یتیم کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اپنے بعد اپنی اولاد کے ساتھ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو اور یتیموں سے سیدھی اور اچھی بات کہو یعنی جس سے ان کا دل نہ ٹوٹے اور ان کا نقصان نہ ہو بلکہ ان کی اصلاح ہو۔ [2]

یہ فطرتِ انسانی سے ایک قسم کی اپیل ہے کہ جس طرح اگر تم مر جاؤ اور تمہاری چھوٹی اولاد رہ جائے تو تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے اس پر رحم کریں اور اس کے کفیل ہوں اسی طرح تم بھی مسکینوں اور یتیموں کی خبرگیری کرو۔ آیت فلیتقوا اللہ کے ذریعے تقویٰ پر زور دیا گیا ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں کہ کہیں ان کے خود چھوٹے بچوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہ آجاتے اور یہ مطلب ہے کہ اس کا پورا اہتمام کریں کہ مرنے والے کا ترکہ اس کی اولاد کو پورا پورا پہنچ جاتے اور ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کریں جس میں اولاد کے حصے پر کوئی ناگوار اثر پڑتا ہو۔ اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی مسلمان کو کوئی ایسی وصیت کرتے دیکھیں جس سے اس کی اولاد اور دوسرے وارثوں کو نقصان کا خطرہ ہو تو آپ پر ضروری ہے کہ اس کو ایسی وصیت سے روکیں جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو پورا مال یا آدھا مال صدقہ کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ پورا مال یا آدھا مال صدقہ کر دیا جاتا تو

---

[1] معارف م ش [2] افادات شیخ الاسلام

وارثوں کا حصہ ختم کر دیا جاتا۔ نیز اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ یتیم بچوں کے اولیاء ان کے مال کی حفاظت اور پھر بالغ ہونے کے بعد ان کو پورا پورا دینے کا اہتمام کریں۔ اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں اور سوچ لیں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ لوگ اچھا معاملہ کریں اور وہ پریشان نہ ہوں تو ان کو دوسروں کی اولاد کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے [1]

یتامیٰ کا مال کھانے کی سنگین سزا

۱۴۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ آیات متعددہ سابقہ میں یتیموں کے مال کے متعلق مختلف طریقے سے احتیاط برتنے کا حکم دیا اور ان کے مال میں خیانت کو بڑا گناہ بتایا تھا۔ اب اخیر میں مال یتیم میں خیانت کرنے پر وعید شدید بیان فرما کر اس حکم کو خوب موکد کر دیا کہ جو کوئی یتیم کا مال بلا استحقاق کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے یعنی اس کھانے کا انجام یہ ہوگا اور جملہ اخیر میں اس کو ظاہر کر دیا [2]

مطلب یہ ہے کہ بلا استحقاق شرعی ایسا کرتے ہیں اور یہی ظلم ہے۔ اگر شرعی حق کے ساتھ ایسا کریں یعنی فقیر ہوں اور اجرت کے طور پر کچھ کھالیں تو اس کا حکم پہلے گزر چکا ہے اور جس طرح یتیم کا مال خود کھانا حرام ہے دوسروں کو کھلانا بھی حرام ہے بلکہ اس کے مال میں سے صدقہ خیرات کرنا بھی حرام ہے۔ ہمارے یہاں لوگ اس بلا میں مبتلا ہیں کہ نابالغوں کا مال تیجے، دسویں اور چالیسویں کے نام سے کھاتے اور کھلاتے ہیں یہ سب حرام ہے۔ صاحب معارف القرآن کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیتے ہیں۔ بعض تانبے اور پیتل کے برتن تقسیم کیے بغیر فقیروں کو دے دیتے ہیں۔ حالانکہ ان سب میں نابالغ یتیم بچوں اور غیر حاضر ورثاء کا حق ہے۔ ایسے ہی میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازے کے اوپر ڈالی جاتی ہے وہ کفن میں شامل نہیں ہے اس کو میت کے ترکہ سے خریدنا جائز نہیں کیونکہ وہ مال مشترک ہے کوئی شخص خود اپنی جانب سے چادر ڈال دے تو جائز ہے۔ بعض جگہ نماز جنازہ پڑھانے والے امام کے لیے کفن ہی کپڑے میں سے جا نماز تیار کی جاتی ہے۔ اور یہ

---

[1] معارف م ش [2] افادات شیخ الاسلام

جانماز دام کرلے دی جاتی ہے۔ یہ کفن کی ضرورت سے زائد ہے۔ وہ یتیم کے مشترک مال میں سے، اس کا خریدنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں میں میت کے غسل کے لیے برتن خرید ے جاتے ہیں پھر ان کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اوّل تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر خرید لیے جائیں تو توڑنا جائز نہیں ہے۔ ایسے ہی ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا اور صدقہ و خیرات کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا ہے۔ اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں۔ پہلے ترکہ تقسیم کیا جائے اس کے بعد اگر وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے حق میں صدقہ و خیرات کریں تو ان کو اختیار ہے۔ تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر صدقہ و خیرات نہ کریں کیونکہ جو یتیم ہیں ان کی اجازت تو نابالغ ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں اور جو بالغ ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دلی سے اجازت دیں۔ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جو دینے والا طیب خاطر سے نہ دے لے

اور یہ ارشاد کہ یتیم کا مال کھانے والے آگ کھاتے ہیں یہ انجام کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ اعمال جو جسم اور مادے سے بالکل الگ ہیں اس عالم میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن اور حدیث دونوں میں آئی ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے دکھایا گیا کہ کچھ لوگ آگ کے انگارے کھا رہے ہیں اور وہی انگارے ہگ رہے ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے تھے۔ اس قسم کے اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا۔ یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔ اسی طرح ظلماً یتیم کا کھایا ہوا مال آگ کی صورت میں نمودار ہوگا۔

معارف مرشش

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ
نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً
فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ
إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ
الثُّلُثُ ۚ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ
نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تم کو ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو
عورتوں کے برابر ہے[۱۵]۔ اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کو ترکہ
کا دو تہائی حصہ دیا جائے اور اگر لڑکی ایک ہی ہو تو ترکہ میں سے
اسے آدھا دیا جائے[۱۶]۔ اگر میّت اولاد والی ہو تو اس کے والدین
میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر میّت صاحبِ

اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور اگر میت کے بھائی بہن بھی موجود ہوں تو والدہ چھٹے حصہ کی حقدار ہو گی۔" یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ پہلے میت کی وصیت پوری کردی جائے اور اس کا قرض ادا کردیا جائے۔ تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی مگر تم نہیں جانتے کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کی جانب سے حصے مقرر ہوتے ہیں اللہ بہت بڑے علم اور بہت زیادہ دانائی والا ہے۔[19]

قانونِ میراث کی تفصیل

قانونِ وراثت کے اجمالی تصور کے بعد یہ قانونِ میراث کی تفصیل ہے۔ تفصیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہاں قانونِ وراثت کی جزئیات بیان ہوں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہاں وراثت کے اصولی کلیات کو پیش کیا جائے گا۔ یہی قرآن کی شانِ جامعیت ہے یعنی اس کے جامع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام کلیات کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ علامہ شاطبی غرناطی اپنی مشہور کتاب الموافقات میں لکھتے ہیں:

قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور جامعیت یہی ہے کہ اس میں

اصول و کلیات کو جمع کر دیا گیا ہے۔

وراثت نام ہے خونی رشتہ کی بنا پر ملکیت کے ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہو جانے کا۔ تملیک کی یہ صورت دوسری تمام صورتوں سے اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی اور طیب خاطر شرط نہیں ہے جبکہ دوسری تمام صورتوں میں یہ بنیادی شرط ہے۔ یہ تملیک مالک کی رضامندی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات مالک کی مرضی کے خلاف قرآن و سنت کے حکم کے تحت ہوتی ہے۔ قرآن و سنت نے ان رشتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر مرنے والے کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو ملیں گے۔ بعض مغربی ممالک کے توریث اولاد اکبر کے قانون کے برخلاف یہ ضابطہ مرنے والے کی جائداد کو عموماً متعدد افراد کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔

چونکہ وراثت پر بعض بنیادی اعتراض کیے گئے ہیں اس لیے اس پر اجمالی بحث بے محل نہ ہو گی۔

وراثت پر پہلا اعتراض اور اس کا جواب

جان لاک اور جان اسٹارٹ مل نے وراثت کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ بات تصورِ ملکیت کے منافی ہے یا کم از کم یہ کہ اس سے اخذ نہیں کی جا سکتی کہ مالک کی ملکیت اس کی مرضی سے قطع نظر لازماً چند متعین رشتہ داروں کا حق قرار پائے۔ ملکیت کا تصور یہ چاہتا ہے کہ مالک کو اس بات کا حق دیا جائے کہ وہ اپنے آپ اپنی جائداد جس کو چاہے منتقل کر دے۔ گویا وصیت کا مطلق حق تصورِ ملکیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ اعتراض ملکیت کے مطلق تصور پر مبنی ہے اور اس لیے قرآن کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔ اولاد، ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزا کے خونی رشتہ کو ترکہ کی تقسیم کی بنیاد بنانے کے بجائے پورے ترکہ پر وصیت نافذ کرنے کا حق ملکیت کے اسی مطلق تصور سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں فرد کی ملکیت دراصل نیابتی ملکیت ہے اصل مالک اللہ سبحانہ ہے جس نے فرد کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے مال و املاک بطور ذرائع عطا کیے ہیں۔ جب وہ زندگی پوری کر چکا تو اس کے چھوڑے ہوئے مال کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔ اب اسے بہرحال دوسروں کے کام آنا ہے۔ یہ ذرائع کن لوگوں کو کس نسبت سے عطا کیے جائیں۔ اس کا فیصلہ کرنے کا حق اصل مالک ہی کو ہے۔ اگر فرد کو وصیت کے ذریعے اپنی ساری املاک اپنے منشا کے مطابق دوسروں کو منتقل کرنے کا حق

دیا جاتا تو کوئی ضروری نہ تھا بلکہ اس کا بہت کم امکان تھا کہ وہ انسانی زندگی کے ان تمام مصالح کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا۔

وراثت میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے کہ جن رشتہ داروں کو فرد کے مرنے کے بعد حصہ دار بنایا گیا انہی رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے کہ اس فرد کی زندگی میں بہ شرط ضرورت اور بقدر ضرورت اس کی معاشی کفالت کریں۔ اسی کو نفقات واجبہ کہتے ہیں۔ اگر ترکے میں مختلف رشتہ داروں کے اضافی حقوق نہ متعین کیے جاتے بلکہ مالک کو وصیت کا مطلق حق دے دیا جاتا تو یہ اصول قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس بنا پر قرآن نے ورثائے کے اضافی حصے متعین کر لیے اور مالک کو اس میں کسی قسم کے ردو بدل کا اختیار نہیں دیا ہے۔

وراثت پر دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس طرح ایک فرد کو بغیر اس کی محنت کے اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ لائق ہے یا نالائق مفت دولت ملتی ہے جو انصاف کے خلاف اور مصالح کے منافی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ مرنے والے کا ترکہ ریاست کے خزانہ میں داخل کر دیا جائے۔ سوشلسٹ مفکرین بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ اعتراض بھی ملکیت کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر ظاہر کرتا ہے جو اسلام کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ معترضین کا موقف یہ ہے کہ کسی فرد کو بغیر محنت کے ملکیت نہ حاصل ہو۔ بغیر محنت کے ملکیت کا حصول وہ صرف ریاست کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ملکیت صرف محنت پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق چند مفید انسانیت اعمال و وظائف سے بھی ہے جو ملکیت کے شرعی استعمال سے وابستہ ہیں۔ وارث کو جو دولت بغیر محنت کے ہاتھ آتی ہے وہ بالعموم اس کے کسی قریبی رشتہ دار کی محنت کا پھل ہوتی ہے۔ اس رشتہ دار کو اپنی زندگی میں بہ شرط ضرورت اپنے ہونے والے وارث کے پھل سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی سماجی نظام اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ ہر فرد اپنی محنت کے پھل سے خود ہی فائدہ اٹھائے کسی دوسرے کو اس سے فائدہ نہ پہنچے۔ انسان صرف اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے محنت نہیں کرتا بلکہ اپنی اولاد اپنے ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزا کی کفالت یا امداد بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دولت ایسے افراد کے کام آئے جن کا اس سے مستفید ہونا نہ صرف یہ کہ مالک کے نزدیک

پسندیدہ تھا بلکہ جن کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ اس کی معاشی جدوجہد، دولت کمانے، پس انداز کرنے اور بطور ترکہ چھوڑ جانے کا ایک زبردست محرک تھا۔

اگر وراثت کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور مرنے والے کی ساری املاک سرکار کو منتقل کر دی جائیں تو کسبِ دولت کا ایک اہم محرک ختم ہو جائے گا

اسلام نے اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ انفرادی ملکیت مفادِ عامہ کے تابع رہے۔ اسلامی ضابطہ میراث کی برکات سے سماج کا بہت بڑا حصہ مستفید ہوتا ہے نہ کوئی محدود طبقہ۔ اس کے تحت بہت سے بے سہارا بچوں اور بچیوں، بیواؤں، عمر رسیدہ بوڑھوں اور کمزور و بے سہارا لوگوں کو سہارا مل جاتا ہے۔

وراثت میں اولاد کا حصہ

۱۵۔ تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تم کو ہدایت کرتا ہے کہ۔ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اوپر اقاربِ میت کے وارث ہونے کا ذکر تھا اور ان کے حصوں کے تقرر اور تعیین کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ اب اقارب اور ان کے حصوں کی تفصیل ہے۔ نیز اس سے پہلے یتیموں کے حق میں تشدد اور تاکیدات کا ذکر ہو رہا تھا جس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اقاربِ میت میں اگر کوئی یتیم ہو تو اس کا حصہ دینے میں بہت ہی احتیاط اور اہتمام چاہیے۔ اہلِ عرب کی قدیم رسم کے موافق ان کو میراث سے محروم کر دینا سخت ظلم اور بڑا گناہ ہے۔ اب اقارب میں سب سے پہلے اولاد کے حصہ کو بیان فرمایا کہ اگر کسی میت کی اولاد بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو ان کی میراث دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک لڑکا دو لڑکیوں کے برابر حصہ پائے گا۔ اور اگر ایک بیٹا دو بیٹیاں ہوں گی تو نصف مال بیٹے کا اور نصف دو بیٹیوں کا ہو گا اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو گی تو دو ثلث بیٹے کا اور ایک ثلث بیٹی کا ہو گا۔[1]

یہاں چند حقائق قابلِ غور ہیں۔

اوّلاً، یوصیکم اللہ کہہ کر یہ یاد دلایا ہے کہ یہ احکام کسی بندے کے تجویز کیے ہوئے نہیں حکیمِ مطلق اور دانائے غیب حاکم برحق کے ارشاد کیے ہوئے ہیں۔ اور پھر اسے اپنی وصیت سے تعبیر کیا ہے۔ وصیت کا صحیح مفہوم عربی زبان میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی پر یہ ذمہ داری ڈالے کہ جب

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

فلاں صورت پیش آئے تو وہ فلاں طریقہ یا فلاں طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس میں وصیت کرنے والے کی پیش بینی، خیر خواہی اور شفقت کا پہلو بھی مضمر ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک عہد اور معاہدے کی ذمہ داری بھی پائی جاتی ہے لفظ کے ان تمام مضمرات کو ادا کرنے کے لیے اُردو میں کوئی لفظ نہیں ترجمہ میں ہدایت کا لفظ بھی اس کے مفہوم پر پوری طرح حاوی نہیں ہے لیکن بہرحال گزارہ ہو سکتا ہے۔

ثانیاً، اس آیت میں ایک قانونِ عام بیان فرما دیا کہ ہر لڑکے کو لڑکی سے ڈبل حصہ ملے گا خواہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہو اور چاہے ایک لڑکا اور متعدد لڑکیاں ہوں اور چاہے متعدد لڑکے اور ایک لڑکی ہو۔ اس کے لیے یہ بلیغ تعبیر اختیار فرمائی ہے للذکر مثل حظ الانثیین لڑکے کو دو لڑکیوں جیسا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ للانثیین مثل حظ الذکر دو لڑکیوں کو ایک لڑکے جیسا۔ یا للانثی نصف حظ الذکر عورت کا حصہ مرد سے آدھا ملے گا۔ اس میں اس رواجی ذہن کی تردید ہے جو عورتوں کو وراثت سے محروم کرتا تھا۔

ثالثاً، یہ بات کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں دوگنا کیوں دیا گیا۔ اس میں حکمت کیا ہے۔ شارحین قرآن نے اس پر مختلف انداز میں دادِ تحقیق دی ہے۔

چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بار سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشرت میں کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے تمام مرد ہی پر ڈالی ہیں۔ عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مرد ہی بیوی کے نان و نفقہ کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ قرآن نے واضح طور پر یہ بات بتا دی ہے کہ اپنے خلقی اوصاف کے لحاظ سے مرد ہی اس کا اہل ہے کہ وہ خاندان کا قوام ہو اور یہ قوامیت خاندان کے نظم اور اس کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے کچھ حقوق میں ترجیح ہو۔[2]

لیکن آئیے ذرا اس موضوع پر ایک اور پہلو سے غور فرمائیے یہ صحیح ہے کہ قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی نہیں پیدا کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ ولھن مثل الذی علیھن اور یہ بھی درست ہے کہ جہاں

---

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن

تک معیشتی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے۔ قرآن نے مرد و عورت دونوں کے استقلال کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن

اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ وراثت میں قرآن نے حقداری کی حد تک مرد و عورت دونوں کی برابری کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر

اس کے باوجود ترتیب اور تقسیم حقوق میں عورت کو مرد سے نصف دیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ نہیں ہے کہ عورت کمزور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی کی رائے ہے۔ اگر یہی بات ہو تو پھر معاملہ برعکس ہونا چاہیے یعنی کمزور کو ڈبل اور طاقتور کو سنگل ملنا چاہیے۔ اور اس بات میں بھی کوئی خاص وزن نہیں ہے کہ مرد کو خاندانی زندگی میں قوام بنایا ہے اور یہ بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت نسل کے ساتھ کوئی اور کام کرے۔

واقعی وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت کو اپنے باپ کی میراث میں لڑکے کے مقابلہ میں آدھا اس لیے دیا گیا ہے کہ عورت کو مہر کی صورت میں شوہر کی جانب سے جو رقم ملنے والی ہے وہ اس کمی کو پورا کر دے گی اسے واقعات کی دنیا میں مثال سے یوں سمجھئے کہ رشید کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے دو بالغ بچے حمید اور فریدہ چھوڑے ہیں اور اس کا ترکہ تین ہزار روپیہ ہے، ظاہر ہے کہ دو ہزار حمید کو ملیں گے اور ایک ہزار فریدہ کو۔ دونوں کی شادی ہوئی ہے۔ حمید کو اپنی بیوی کو ایک ہزار مہر دینا ہے اور فریدہ کو اپنے شوہر سے ایک ہزار مہر لینا ہے۔ حمید پر اپنے بیوی کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے لیکن فریدہ پر اپنے بھی نان و نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مہر کے بارے میں پڑھ چکے ہو۔ واتوا النساء صدقاتھن نحلۃ اور آگے پڑھو گے واتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا اب آپ ہی خدا لگتی انصاف سے فرمائیے کہ کس کو زائد ملا؟ لڑکی کو یا لڑکے کو۔ لڑکے کے پاس صرف ایک ہزار ہے اور اس میں اس پر خانگی ذمہ داریاں ہیں اور لڑکی کے پاس دو ہزار ہیں اور اس پر خرچ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لڑکے پر مہر کی ذمہ داری ہے اس لیے اس کو ڈبل دیا گیا ہے لڑکی کو مہر لینا ہے اس لیے اس کو سنگل دیا گیا ہے اور یہ وجہ ہے کہ

شوہر کے مرجانے پر بیوی کو چوتھائی اور آٹھواں دیا ہے اور بیوی کے مرجانے پر شوہر کو اس کا ڈبل یعنی نصف اور چوتھائی دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بیوی کے مرجانے پر شوہر کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر دینا ہے اور شوہر کے مرجانے پر بیوی کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر لینا ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ لڑکی کفالتی ذمہ داریوں کے لحاظ سے تنہا ہے برخلاف لڑکے کے کہ اس پر اپنی اور بیوی دونوں کی ذمہ داریاں ہیں جس کی ذمہ داریاں ڈبل ہیں۔ اس کو بروئے انصاف حصہ بھی ڈبل ملنا چاہیئے۔

ما بعدا اگرچہ لفظ اولاد عام ہے۔ لیکن اسلامی قانون کی تشریحات میں اس سے کچھ خارج کیے گئے ہیں مثلاً کافر بیٹا، باپ کا قاتل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد۔

کافر اولاد وارث نہیں

والدین مسلمان ہوں اور اس کی اولاد کافر ہو۔ مسلمان والدین کی میراث کافر اولاد کو نہیں ملتی ہے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ دینی اختلاف وراثت سے مانع ہے۔ صدر اوّل سے آج تک مسلمانوں کا اس پر عمل ہے۔ یہ گویا عملاً سنتِ متواترہ ہے۔ صحیحین میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موضوع پر یہ قیمتی ارشاد گرامی ہے لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ اسی پر اُمّت کا اجماع ہے۔ یہی ائمہ اربعہ اور عامہ فقہاء کا مسلک ہے۔

یہی حکم مرتد کا بھی ہے یعنی وہ جو برضا و رغبت اسلام کو چھوڑ دے وہ بھی اس میں داخل نہیں ہے اور مسلمان والدین کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔

اپنے والدین کا قاتل وارث نہیں ہوتا

یعنی ایسا لڑکا جو اپنے باپ کا قاتل ہو وہ باپ کی میراث کا حقدار نہیں ہے۔ یہ گویا قاتل کو مالی سزا ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے جو سرمایہ پر قبضہ کرنے کے لیے اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں ایک تازیانہ ہے۔ قتل کے ساتھ وارث کی راہ اگر کھول دی جاتی تو انسانی زندگی کا دین وسلام خطرہ میں پڑ جاتا۔ احناف کی رائے میں ہر وہ قتل جس کی سزا قصاص یا کفارہ ہو وراثت سے مانع ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت کا یہی فیصلہ ہے اور حضرت عمرؓ کے حوالہ سے حضور انور کا ارشاد گرامی بھی موطا امام مالک میں یہی نقل ہو کر آیا ہے کہ لیس لقاتل شیئ قاتل کا کوئی حصہ نہیں ہے احناف کے یہاں قاتل کے وراثت سے محروم ہونے کے لیے جیسے یہ ضروری ہے کہ قتل ناحق ہو

ایسے ہی یہ بھی ضروری ہے کہ قاتل عاقل و بالغ ہو، نابالغ نے اگر قتل کر دیا اور مجنون سے اگر یہ حرکت سرزد ہو گئی تو وہ محروم نہ ہوگا اور قتل ناحق کا مطلب یہ ہے کہ اس پر کوئی قانونی حق نہ ہو۔ اگر قانونی حق ہو مثلاً قصاص یا حد میں کسی بیٹے نے عدالت کے فیصلہ کے بعد قتل کیا یا باپ اپنے بیٹے پر حملہ آور ہوا اور بیٹے نے دفاع کیا اور قتل ہو گیا۔ اس قتل سے لڑکا وراثت سے محروم نہ ہوگا۔

حضور انور کے ترکہ میں وراثت نہیں

حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ حدیث اور اجماع اہل حق سے اس آیت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں، اسی لیے صدیق اکبر نے فدک وغیرہ کو میراث میں تقسیم نہیں کیا۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہم یعنی انبیاء علیہم السلام کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ سب راہ خدا میں صدقہ ہے۔ اگر اس حدیث کو خبر واحد تسلیم کر لیا جائے پھر بھی چونکہ صدیق اکبر نے حضور انور سے بلاواسطہ سنی تھی اس لیے ان کی حد تک قرآن عزیز کی طرح قطعی ہے۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ اس حدیث سے انبیاء کے اموال و املاک کا وقف ہونا ثابت ہوتا ہے اور وقف میں بالاجماع میراث نہیں۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ عام انسان جب مر جاتے ہیں تو ان کا ترکہ ان کے عزیزوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کی شان یہاں بھی مختلف نظر آئی۔ ان کی میراث کسی کو نہیں ملتی ہے وہ سب راہ خدا میں صرف کی جاتی ہے۔ سبحان اللہ جو ہستیاں اپنی حیات میں دنیوی طمع کا کوئی داغ اپنے ساتھ نہیں رکھتی ہیں ان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر اس داغ کے لگانے کی کوئی دشمن کوشش کر سکے۔ جو پورے زمانۂ دعوت میں یہ اعلان کرتے رہتے لا اسئلکم علیہ اجراً اور جو ذات گرامی اپنے اور اپنی اولاد کے حق میں زکوٰۃ کو یہ کہہ کر حرام قرار دیتی رہی ہے لا تحل لمحمد ولا لاٰل محمد وہ یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ دنیا کو یہ کہنے کا موقعہ دے کہ ذات نبوت اپنی اولاد کے لیے سرمایہ چھوڑ گئی۔ یہی نبوت کے خصائص میں سے ایک خصوصیت ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ان کی موت عام بشر تو در کنار شہداء کی موت سے بھی کتنی ممتاز ہے۔ شہداء کے حق میں قرآن عزیز نے اگرچہ لفظ حیات بولا ہے اور ان کو رزق ملنے کی

---

[1] بیان القرآن

بھی بشارت دی ہے۔ اور شہدا کو احیاء عند ربھم کہنے کے باوجود ان کی بیویوں کو نکاح کرنے سے نہیں روکا اور ان کے ترکہ کو عام انسانوں کی طرح تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ لیکن نبوت کے حق میں ان کو اتنا اہم سمجھا گیا کہ ازواج مطہرات پر ہمیشہ کے لیے یہ پابندی لگا دی گئی ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا اس میں نبوت کا احترام تھا کیونکہ نبوت کے والد ہونے کی نسبت ساری امت کے ساتھ تھی اس لیے تمام امت کے حق میں نبی کی ازواج کو مائیں کہا گیا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ نبی ہونے کی وجہ سے جہاں دوسری ساری شانوں میں آپ اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں تو ترکہ میں بھی اگر اللہ نے آپ کو یہ نمایاں خصوصیت دی ہے کہ اس میں میراث نہیں یہ پوری امت کا مشترکہ سرمایہ ہے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ اس لیے آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم نبوت کے حق میں عام مخصوص البعض ہے۔ حدیث نبوی چونکہ قرآن کی شرح کرتی ہے۔ اس لیے اس کا یہ حق ہے کہ احکام عامہ قرآنی کے معنے بتلاتے ہوئے یہ رہنمائی کرے کہ اس کے سب افراد مراد ہیں یا بعض۔ اس تشریح کو عرف اصول میں تخصیص کہتے ہیں۔ علماء اصول کی اس میں گفتگو ہے کہ :

عام اپنے افراد کو یقینی اور قطعی بتاتا ہے یا ظنی، جمہور اور اکثر کا مذہب یہ ہے کہ ظنی، جو لوگ قطعی مانتے ہیں وہ قرآنیات کے عام حکم کو خبر واحد سے خاص نہیں کرتے اور جو ظنی مانتے ہیں وہ خبر واحد سے بھی تخصیص کر لیتے ہیں لیکن یہ اختلاف بھی اس صورت میں ہے جبکہ عام کی تخصیص کسی حکم سے نہ ہو چکی ہو۔ اگر پہلے بھی کوئی تخصیص ہو چکی ہے تو پھر آیت تخصیص کی کر لینا درست ہے۔ (تلویح)

اگرچہ پیش نظر معاملہ میں دونوں صورتیں درست ہیں لیکن ہم یہاں دوسری صورت اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ آیت پہلے ہی مخصوص البعض ہے، فی اولادکم کی عموم سے ان کو سب مستثنیٰ کرتے ہیں۔

۱۔ بیٹا غلام ہو۔

۲۔ بیٹا قاتل ہو۔

۳۔ بیٹا کافر ہو۔

بہ اتفاق اس آیت کے عموم سے خارج ہیں۔ یعنی یہ اولاد اپنے باپ کی میراث سے حصہ پائے گی جیسے یہ افراد سب کے نزدیک اس آیت کے عموم سے مستثنیٰ ہیں۔ ایسے ہی نبی کی وراثت بھی مستثنیٰ ہے۔ دلیل اس تخصیص کی وہی حدیث ہے جو امام بخاری نے بروایت ابی بکر صدیق

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کلینی نے بروایت امام ابو عبد اللہ موقوف اور مرفوع روایت کی ہے حدیث یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکناہ صدقۃ

حضور کا ارشاد ہے ہم نبیوں کا کوئی وارث نہیں ہم جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں صدقہ ہے۔

اولاً، چونکہ یہ ارشاد صدیق اکبر نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے اس لیے علم قطعی اور یقینی ہے۔ اور جو بات حضور انور سے بلاواسطہ براہ راست سنی جائے اس پر عمل کرنا فرض ہے اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

تواتر اور عدم تواتر کا سوال ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی اور حضور کا ارشاد گرامی دوسروں کے واسطہ سے ان کو پہنچا۔ اور جو شخص خود براہِ راست حضور انور سے سُن رہا ہے اس کے حق میں یہ ارشاد متواتر سے زیادہ قطعی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ مشاہدہ عینی سے بھی یقینی ہے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

ثانیاً، خبر واحد ہونے کی صورت میں اس حدیث کے راوی صرف حضرت ابوبکر ہی نہیں بلکہ دفتر حدیث میں یہ ارشادِ نبوت حضرت حذیفہ، حضرت زبیر، حضرت ابو الدرداء، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عباس، حضرت عثمان، اور حضرت علی سے بھی روایت ہو کر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ارشادِ نبوت تمام صحابہ میں شہرت رکھتا تھا، اور اپنی پشت پر تواتر کی پوری طاقت رکھتا تھا اور حدیث متواتر سے قرآن کی تخصیص سب مانتے ہیں۔

اس آیت میراث کی لا نورث ما ترکناہ صدقۃ سے تخصیص ٹھیک ایسے ہی کی گئی ہے جیسے انما الصدقات للفقراء والمساکین کے عموم سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل کی لا تحل لمحمد ولا لآل محمد تخصیص کی گئی ہے۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد کو زکوٰۃ اور صدقات کا لینا حرام ہے۔

ذرا اس آیت پر اس پہلو سے بھی ایک نظر ڈالیے کہ آیت کا سیاق و سباق یہ بتلا رہا ہے کہ یوصیکم اللہ فی اولادکم میں حکم صرف اُمت کے لیے ہے۔ ذاتِ نبوت اس میں شریک نہیں ہے۔ اس سے پہلے فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع میں اُمت مخاطب ہے کیونکہ حضور انور کی ذات گرامی سورۂ احزاب کی آیت یا ایھا النبی انا احللنا لک ازواجک اللاتی آتیت اجورھن کی وجہ سے چار کی تحدید سے مستثنیٰ ہے۔ سورۂ احزاب کی یہ آیت علانیہ کہہ رہی ہے کہ حضور انور

کے لیے چار سے زیادہ بھی نکاح جائز ہے ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ اُمت کو یہاں حکم ہو رہا ہے کہ اٰتوا النساء صدقٰتهن نحلة عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دو۔ آیت اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے مستثنیٰ اور خاص ہیں جیسا کہ سورۃ احزاب کی یہ آیت ان وهبت نفسها للنبي ان اراد النبي ان يستنكحها خالصة لك من دون المؤمنين بتا رہی ہے کہ حضور انور نکاح میں مہر کی قید سے مستثنیٰ ہیں۔

اور سنیے یہاں اُمت کو خطاب ہے فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة. یہ آیت بتا رہی ہے کہ عورتوں میں عدل سب پر واجب ہے لیکن سورۃ احزاب کی آیت ترجي من تشاء منهن وتؤوي اليك من تشاء کہہ رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

آخر ان سب استثناؤں پر اگر ہمیں حیرت نہیں ہوتی تو میراث کے استثناء پر تعجب کیوں ہے مال و جائداد میں میراث کا جاری ہونا اُمتیوں کا حکم ہے ذات نبوت اس سے مستثنیٰ ہے[1]

ہم نے یہاں اشارات کیے ہیں ان شاء اللہ اس پر تفصیلی مباحث پارہ ۲۸ سورۃ حشر میں بشرط حیات آئیں گے۔

دو سے زیادہ لڑکیوں کا حصّہ

۱۶۔ اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کو دو تہائی ترکہ دیا جائے گا اور اگر لڑکی ایک ہی ہو تو کل ترکہ میں سے لسے آدھا دیا جائے گا یعنی اگر کسی میت نے اولاد میں صرف عورتیں یعنی بیٹیاں ہی چھوڑیں، بیٹا نہیں چھوڑا تو وہ اگر دو سے زیادہ ہوں تب بھی ان کو دو تہائی ملے گا اور اگر ایک ہی لڑکی چھوڑی تو اس کو میت کے ترکہ کا نصف ملے گا۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ للذکر مثل حظ الانثیین کے ذیل میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایک بیٹی کو ایک بیٹے کے ساتھ ایک ثلث ملے گا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کے ساتھ بطریق اولیٰ ثلث ملے گا کیونکہ بیٹے کا حصّہ بیٹی سے زیادہ ہے تو جب بیٹے کی وجہ سے اس کا حصّہ ایک ثلث سے کم نہیں ہوا تو دوسری بیٹی کی وجہ کیسے کم ہو سکتا ہے۔ چونکہ دو بیٹیوں کا حکم پہلی آیت سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے اس آیت میں دو بیٹیوں سے زائد کا حکم بتا دیا۔ تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کر دو بیٹیوں کا حق جب ایک

[1] معارف قرآن ص ۱

بیٹی سے زیادہ ہے تو شاید تین یا چار بیٹیوں کا حق دو بیٹوں سے زائد ہوگا۔ یہ بات ہرگز نہیں بلکہ بیٹیاں جب ایک سے زیادہ ہوں گی دو ہوں یا دس ان کو دو ثلث ہی ملے گا۔

اب تک اولاد کے وارث ہونے کی دو صورتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ لڑکا اور لڑکی دونوں طرح کی اولاد ہو۔ دوسری یہ کہ صرف دختری اولاد ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک ہو یا ایک سے زائد۔ اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ صرف پسری اولاد ہو اس کا حکم یہ ہے کہ ساری میراث اس کو مل جائے گی خواہ بیٹا ایک ہو یا زائد ہو[1]

مولانا محمد ادریس نے اسے اس طرح سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ بیان کیا ہے لیکن دو لڑکیوں کا حصہ صراحۃً بیان نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت للذکر مثل حظ الانثیین سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے یعنی دو تہائی تو اس سے خود یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ دو لڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہے۔

نیز اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں ایک لڑکی اور تین اور تین سے زیادہ لڑکیوں کا حکم بیان فرمایا اور بہنوں کی میراث میں دو بہنوں کا دو تہائی حصہ بیان کیا فان کانتا اثنتین فلھما الثلثان۔ لہٰذا جب دو بہنوں کا حصہ دو تہائی ہے تو دو لڑکیوں کا حصہ بدرجہ اولیٰ دو تہائی ہونا چاہیے۔ کیونکہ لڑکیاں بہ نسبت بہنوں کے زیادہ قریب ہیں[2]

یہاں تک صرف نظریاتی بحث ہے آیئے اسی کا واقعات کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

حضرت جابر کہتے ہیں کہ سعد بن ربیع کی بیوی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! سعد بن ربیع کی دو لڑکیاں ہیں اور ان کا باپ آپ کے ہمراہ جنگ اُحد میں اللہ کو پیارا ہو گیا اور ان کا جو سرمایہ تھا وہ سارا کا سارا ان کے چچا نے لے لیا ہے اور سعد کی بیٹیوں کو کچھ نہیں دیا ہے بغیر مال کے ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ پھر جب سورۃ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضور انور نے فرمایا کہ اس عورت اور لڑکیوں کے چچا کو بلاؤ۔ آپ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ دونوں لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی دے دو ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف ص ا۔

وہ تم خود رکھ لو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر سعد کی جائداد ۲۴ ہزار ہے تو ۱۶ ہزار روپیہ لڑکیوں کو اور تین ہزار روپیہ لڑکیوں کی والدہ کو اور باقی پانچ ہزار روپیہ چچا کو ملے گا۔

اب یہ آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ دو لڑکیوں کے لیے دو تہائی کو منطوق قرآنی سے اخذ کر لیجیے جیسا کہ شیخ الاسلام اور مولانا ادریس نے کیا ہے اور جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی کی رائے ہے اور چاہے اسے ارشادِ نبوت سے واقعات کی روشنی میں معلوم کر لیجیے جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کا میلان ہے اور یا پھر دو بہنوں پر قیاس کر کے دو بہنوں کو دو تہائی حصہ دیجیے حضرت مولانا اشرف علی کا میلان بھی منطوقِ قرآنی کی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ اور اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے۔ ایک تہائی سے نہ گھٹتا۔ لہٰذا جب دوسری بھی لڑکی ہے تب تو تہائی سے کسی طرح گھٹ نہیں سکتا۔ اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں پس ایک تہائی اس کا بھی ہوگا دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا [1]

میراث میں والدین کا حصہ

۱۷۔ اگر میت اولاد والی ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر میت صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی موجود ہوں تو والدہ چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی۔ اب ماں باپ کی میراث کی تین صورتیں بیان فرماتے ہیں۔

اوّل یہ کہ میت کی اولاد ہو بیٹا ہو یا بیٹی تو میت کے ماں باپ کو ترکہ میت میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میت کی اولاد کچھ نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو اس کی ماں کو ایک ثلث ملے گا یعنی باقی دو ثلث اس کے باپ کو ملیں گے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں خواہ حقیقی ہوں یا صرف

[1] بیان القرآن

باپ یا صرف ماں میں مشترک ہوں اور اولاد بالکل نہ ہو تو اب اس کی ماں کو چھٹا ملے گا۔ یعنی باقی سب اس کے باپ کو ملے گا۔ بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا اور اگر صرف ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو ثلث ملیں گے[1]

تیسری صورت میں ماں کا حصہ ثلث $\frac{1}{3}$ کی جگہ سدس $\frac{1}{6}$ ہو گیا۔ فرائض کی زبان میں اس کو حجب نقصان کہتے ہیں۔ حجب کے معنے روکنے کے ہیں۔ یہ رکاوٹ دو طرح ہوتی ہے ایک یہ کہ کسی کو دوسرے کی وجہ سے ساری میراث سے محروم کر دیا جائے اسے حرمان کہتے ہیں جیسے برادر زادہ محروم ہو جاتا ہے جبکہ برادر موجود ہو۔ برادر محروم ہو جاتا ہے جب اپنا بیٹا موجود ہو، پوتا محروم ہو جاتا ہے جب بیٹا موجود ہو، دادی محروم ہو جاتی ہے جب ماں موجود ہو، سوتیلی بہن محروم ہو جاتی ہے جب حقیقی بھائی موجود ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی کے حصہ کو دوسرے کی وجہ سے کم کر دیا جائے یہاں ماں کا حصہ اسی بنا پر کم ہوا ہے۔

یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جن کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوا ہے ان کو کچھ نہیں ملا ہے اور بھائیوں کی موجودگی میں باقی باپ کو مل جائے گا۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ بھائیوں کا ہونا اگرچہ ماں کو تیسرا حصہ حاصل کرنے میں روک ہے مگر بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ماں کا جو حصہ کم ہوا ہے وہ بھائیوں کو ملے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قرآن یہاں بھائیوں کے بارے میں خاموش ہے۔ اس لیے جمہور کی بات بقول سید رشید رضا منطوق قرآنی کے زیادہ قریب ہے۔ ایسے ہی اس موضوع پر بھی عبداللہ ابن عباس کی راہ جمہور سے الگ ہے جبکہ بھائی بہن دو ہوں۔ جمہور والدہ کو $\frac{1}{6}$ دے کر باقی باپ کو دیتے ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ لفظ اخوۃ عربی میں دو پر نہیں جمع پر بولا جاتا ہے۔ اکثر صحابہ کی جمہور کو حمایت حاصل ہے اور اسی پر صدر اول سے اب تک عمل ہے۔ ہاں ان کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو گی تو وہ ماں کے تیسرے حصہ پانے میں رکاوٹ نہ ہوں گے۔ حاصل یہ ہے کہ بھائی بہن ہونے کی صورتوں میں ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ سے $\frac{1}{6}$ ہو جائے گا۔ اس طرح ماں کے حصہ میں سے جو $\frac{1}{6}$ لیا گیا ہے وہ باپ کے حصہ میں ڈالا جاتے گا کیونکہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اگر میت کے والدین زندہ ہوں تو اس کے بھائی اور بہنوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا۔

ماں باپ کا حق اگرچہ اولاد سے کہیں زیادہ ہے لیکن اللہ سبحانہ نے میت کے ترکہ میں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ماں باپ کا حصہ اولاد کے حصہ سے کم رکھا ہے کیونکہ جب آدمی صاحب اولاد ہو کر مرتا ہے زیادہ تر اس عمر میں اس کے والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں اور ان کی عمر کا تھوڑا حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ ان کو زیادہ مال کی ضرورت نہیں ہوتی بخلاف اولاد کے کہ وہ کم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں نیز ماں باپ کے پاس اپنا اندوختہ اور اپنے والدین کا کچھ ترکہ بھی ہوتا ہے اور میت کی اولاد کا سرمایہ سردست صرف باپ کی کمائی ہوتی ہے اس لیے شریعت نے بہ نسبت ماں باپ کے اولاد کا زیادہ حصہ رکھا ہے۔

حقوق متقدمہ علی المیراث

۱۸۔ یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ پہلے میت کی وصیت پوری کر دی جائے اور اس کا قرض ادا کر دیا جاتے۔ یعنی جس قدر وارثوں کے حصے گزر چکے ہیں۔ یہ سب میت کی وصیت اور اس کے قرض کو جدا کرنے کے بعد وارثوں کو دیے جائیں گے۔ اور وارثوں کا مال وہی ہوگا جو بقدار وصیت و قرض کے نکال لینے کے بعد باقی رہے گا اور نصف اسی کا مراد ہے نہ کہ تمام مال کا۔

سب سے پہلے میت کے مال سے اس کا کفن دفن ہونا چاہیے۔ اس سے جو کچھ بچے وہ اس کے قرض میں دیا جائے۔ پھر جو باقی رہے اس کو میت کی وصیت پورا کرنے میں ایک تہائی تک خرچ کیا جائے اس کے بعد جو کچھ رہے وارثوں پر تقسیم کیا جائے[1]

میت جو مال چھوڑ کر مرے اس مال سے چار حقوق وابستہ ہیں اوّل تجہیز، دوم قرض کی ادائیگی، سوم وصیت، چہارم ورثہ میں تقسیم۔

سب سے پہلا اور بنیادی حق تجہیز ہے، تجہیز میں میت کو غسل دینا، کفن دینا، قبرستان تک پہنچانا اور دفن کرنا سب داخل ہیں۔ اگر مرنے والا سرمایہ چھوڑ کر مرا ہے تو درجہ کفایت میں ان کی پابجائی سب سے پہلے ضروری ہے۔ اگر میت نے ترکہ نہیں چھوڑا تو پھر ان کاموں کی پابجائی کی ذمہ داری اس پر آتی ہے جس کے ذمہ اس کے اقربا میں سے اس کا نان و نفقہ واجب ہے اگر اقربا میں ایسا کوئی موجود نہ ہو تو پھر اس کی ذمہ داری کا بوجھ اسلامی حکومت کے سرکاری خزانے

[1] افادات شیخ الاسلام

پر ہے۔ اگر حکومت کے سرکاری خزانہ میں بھی کچھ نہ ہو تو پھر اس فرض کو عام مسلمان ادا کریں گے۔ بیوی خواہ غنی ہو یا فقیر اس کی تجہیز اس شخص پر ہے جس کے ذمے اس کی زندگی میں اس کا نان و نفقہ واجب ہوتا ہے۔ یہ قاضی ابو یوسف، امام مالک اور امام شافعی کی رائے ہے۔ امام محمد، امام شعبی اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ شوہر کے ذمے بیوی کی تجہیز نہیں ہے لیکن فتویٰ قاضی ابو یوسف کے قول پر ہے یعنی شوہر کے ذمے بیوی کا کفن دفن ہے۔

علامہ ابن عابد شامی رقمطراز ہیں

شوہر کے ذمہ بیوی کو کفن دینا اور اس کی تجہیز ہے لیکن یہ دونوں مسنون طریقہ پر ہوں، علی ہذا خوشبو، غسل کی اجرت، قبرستان تک لے جانا اور دفن کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ لیکن وہ چیزیں جو بطور بدعت معاشرے میں موجود ہیں ان کی ذمہ داری شوہر پر نہیں۔ مثلاً قرآن خوانی کا انتظام، تین دن کا کھانا وغیرہ۔

دوسرا حق قرض کی ادائیگی ہے۔ تجہیز و تکفین کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ میت کے ذمہ قرض کیا ہے۔ کاروباری زندگی میں اس کو کیا دینا ہے۔ کسی کا نقد لیا ہوا سرمایہ اس کے ذمہ کیا ہے۔ اس کے کارخانے میں اگر کاریگر، مزدور اور ملازم ہیں تو ان کی تنخواہیں کتنی ہیں۔ اس کی بیوی کا مہر کتنا ہے اور قرضوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ زمانۂ صحت کے ہوں مرض وفات کے قرض، زمانۂ صحت کے قرضوں کے بعد ادا کیے جائیں گے۔

ان کے علاوہ وہ قرض جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے مثلاً زکوٰۃ، نذر، صدقہ، کفارہ، روزوں کا فدیہ اور حج بدل کی ادائیگی، حنفیہ کا مذہب اس میں یہ ہے کہ جب تک میت وصیت نہ کرے اس کی ادائیگی واجب نہیں ہے۔ اگر وصیت ہو تو صرف ایک تہائی ادائیگی ہو گی۔

تیسرا حق وصیت ہے، کسی کو بلا عوض بعد از موت مالک بنانے کا نام وصیت ہے۔ یہاں قرآن میں بار بار من بعد وصیۃ کی تاکید، تکرار اور زور بتا رہا ہے کہ کوئی وصیت ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے لیکن عام خیال یہی ہے کہ وصیت واجب نہیں محض مستحب ہے۔ ہم البقرہ میں حاشیہ ۱۱۵ میں بتا آئے ہیں کہ آیت وصیت اور آیت میراث میں مفاہمت ممکن ہے اور آیت میراث یعنی یوصیکم اللہ آیت وصیت کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف کی شرح ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا تھا مگر چونکہ اس وصیت میں کمی زیادتی کرنا انسانی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا اس لیے

خدائے عالم الغیب نے اس وصیت کی آپ ہی شرح فرمادی بلکہ اس فعل کو جو اس کی شرح میں مستعمل ہوا خاص اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا یوصیکم اللہ اس جگہ یحکم، یامر اور یقضی جیسے الفاظ کو چھوڑ کر یوصی لانا اس بات کی طرف اشارا ہے کہ ایصاء اس فعل وصیت کی شرح ہے جس میں اجمال تھا۔ اب آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اپنے وارثوں کے حق میں جن کے حصے اللہ نے متعین فرما دیے ہیں۔ یہ وصیت کرنا تم پر فرض ہے کہ اپنے حصے شریعت کے مطابق لیں کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ لیکن ان ورثاء کے علاوہ اور لوگ بھی میت کے دور و نزدیک کا تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں ان کی نسبت قانونِ وراثت نے کوئی وصیت نہیں کی ہے بلکہ یہ میت کے اختیار، صوابدید پر موقوف ہے من بعد وصیۃ میں اسی کی طرف اشارا ہے لیکن اس وصیت کو کھلا اور آزاد نہیں چھوڑا بلکہ اس پر بھی ایک تہائی کی پابندی لگادی۔ تہائی کی قید سے غیر مضار کی شرح ہوگئی یعنی وصیت کسی کو نقصان نہ دیتی ہو اور وارث کے حق میں لا وصیۃ لوارث کی قید لگا کر یوصیکم اللہ کو کتب علیکم کی شرح بنادیا۔ خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ جن کے حق میں اللہ نے حصے مقرر کر دیے ان کی نسبت تو مقررہ حصص کے لیے وصیت کی ضرورت نہیں ہے ان کی وصیت وہی ہے جو اللہ نے کر دی ہے اور جن لوگوں کے حصص مقرر نہیں ہیں ان کے حق میں میت کو تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے، مثلاً کوئی یتیم پوتا موجود ہے اور وہ اپنے چچا یا تاے کی موجودگی کی وجہ سے محروم الارث ہے اس کے لیے وصیت کرے لیکن یہ وصیت کل ملکیت میں سے ⅓ یا اس سے کچھ کم میں کرے۔

وصیت واجبہ

علامہ شیخ حسنین مخلوف مفتی دیارِ مصریہ نے اپنی کتاب المواریث میں یہ عنوان قائم کیا ہے اور لکھا ہے کہ جمہور کے نزدیک اپنے سرمائے کے کسی حصہ کے بارے میں کسی کے لیے وصیت نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر محدثِ مغرب نے تصریح کی ہے۔ اگر ایک شخص اپنا ایک حقیقی بیٹا اور ایک دوسرے بیٹے کا بچہ جس کی وفات مرنے والے کی زندگی میں ہو گئی ہے چھوڑ کر مرتا ہے تو اس پوتے کو نہ بطور وراثت کچھ ملتا ہے اس لیے کہ وہ حقیقی بیٹے کی موجودگی میں قانونِ وراثت کی رو سے وارث نہیں ہے اور نہ از راہِ وصیت کچھ ملتا ہے کیونکہ جمہور کی رائے میں وصیت واجب نہیں ہے۔ اسی الجھن اور مشکل کا حل بعض ائمہ سلف کی آراء کی مدد سے یہ تلاش کیا گیا ہے کہ وصیت کے ذریعے

اس کا علاج کیا جائے۔ مصری حکومت نے سنہ ۴۶ء میں قانونِ وصیت نافذ کیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں سے اس پوتے کو بطورِ وصیت حصہ دیا جائے جس کا باپ دادا کی زندگی میں وفات پاگیا اور اس حصہ کی مقدار ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔ اور یہ بھی اسی قانون کی ایک ڈیلی دفعہ ہے کہ اس وصیت کا نفاذ تمام وصایا پر مقدم کیا جائے اور اسی کو وصیت واجبہ کہتے ہیں۔

اس دفعہ کے لیے جو علمی سہارا تلاش کیا گیا ہے یہ ہے کہ اگرچہ جد اکہ اصول میں فخر الاسلام بزدوی نے تصریح کی ہے کہ عام شہریوں کے حق میں وصیت کا وجوب نہیں ہے ہاں ان لوگوں کے حق میں استحباب ہے جن کے اقرباء اور والدین قانونِ وراثت کی رُو سے حقدار نہ ہوں اور جمہور کی رائے یہی ہے کہ وصیت کا وجوب منسوخ ہے لیکن یہاں کچھ اکابر ایسے بھی ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ وصیت کا یہ وجوب ورثاء کے حق میں منسوخ ہے لیکن ان اقربا اور والدین کے حق میں وجوب باقی ہے جو قانونِ وراثت کی رُو سے محروم ہوتے ہیں۔ قتادہ اور جابر بن زید کا یہی مذہب ہے۔ ظاہریہ میں حافظ ابن حزم بھی غیر وارث اقرباء کے لیے وصیت کے وجوب کو مانتے ہیں۔ مصری قانون نے غیر وارث کے لیے وجوب وصیت کا پروانہ اسی بنیاد پر دیا ہے۔ اسی کو وہ وصیتِ واجبہ کہتے ہیں۔

یہاں آیت میں وصیت کا ذکر قرض پر مقدم کیا گیا ہے کہ وصیت بھی اپنی ذات کے لحاظ سے میراث کی طرح ہے یعنی جیسے میراث نام ہے تملیک بلا عوض کا ایسے ہی وصیت نام ہے مالک کی جانب تملیک بلا عوض کا۔ میراث بھی بعد الموت اور وصیت بھی بعد الموت ہوتی ہے۔ ورثاء کے لیے وصیت کی پابجائی شاق ہوتی ہے اور اس بنا پر ممکن تھا کہ ورثاء نظر انداز کر جائیں اس لیے وصیت کا پہلے ذکر کر دیا یا یوں کہہ دو کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے پر ضروری نہیں ہے یا یوں کہو کہ وصیت کو پہلے اس لیے ذکر کیا ہے کہ جب کوئی وصیت کرے گا تو اس میں قرض کا ذکر تو خود کرے گا اس لیے صرف وصیت کی تعمیل میں قرض کی ادائیگی آجاتی ہے۔ ورنہ حکم کے اعتبار سے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔ یعنی اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے وہ ادا کیا جائے پھر وصیت پوری کی جائے گی اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

ترکہ کی تقسیم اللہ کے حکم سے ہے

۱۹۔ تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی مگر تم نہیں جانتے ہو کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ قریب ہے۔ یہ اللہ کی جانب سے حصے مقرر ہیں اور اللہ بڑے علم اور بہت

زیادہ دانائی والا ہے ۔ آیات بالا میں دو میراث کا ذکر کیا ہے اولاد کی اور والدین کی ۔ اب ارشاد ہوتا ہے کہ چونکہ یہ بات تم کو معلوم نہیں ہے کہ کس سے تم کو نفع پہنچے گا اور کتنا نفع پہنچے گا اس لیے تم کو اس میں دخل نہ دینا چاہیے جو کچھ کسی کا حصہ اللہ نے مقرر فرما دیا ہے اس کی پابندی کرو کہ اس کو تمام چیزوں کی خبر بھی ہے اور بڑا حکمت والا بھی[1]

قرآن حکیم کی اس آیت نے بتا دیا ہے کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے ، اس میں کسی کو رائے زنی یا کمی بیشی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور ہمیں پورے اطمینانِ قلب سے اس کو قبول کر لینا چاہیے ۔ ہمارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے[2]

گویا یہ جواب ہے ان سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ کے قانون میں رہ گئی ہے[3]

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے یہ تنبیہہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے نہ مالک کو اس میں کسی قسم کے ردّ و بدل کا اختیار ہے اور نہ اور کسی اجتماعی ادارے کو ۔ مالک کی خواہشیں ، برادری کا رواج اور حکومت کا قانون جو بھی اس تقسیم میں مزاحم ہو کر آئے گا اس کی مزاحمت خدا کی حکمت اور علم سے مزاحمت ہے ۔ جو لوگ اس کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں خواہ وہ تیونس ، انڈونیشیا ، الجزائر ، مصر ، شام ، ایران اور پاکستان میں کہیں اٹھاتے ہیں وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں ۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] معارف م ش [3] تفہیم القرآن

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ
فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ
وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً
أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ
فَإِنْ كَانُوْا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُّوصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اور تمہاری بیویاں جو کچھ ترکے میں چھوڑ کر جائیں اس میں سے آدھا
حصہ تمہیں ملے گا بشرطیکہ ان کے اولاد نہ ہو، اور اولاد ہونے
کی صورت میں تمہیں چوتھائی ملے گا لیکن یہ اس وقت ملے گا

جبکہ پہلے اس کی وصیت کی تعمیل کردی جائے یا قرض جو انہوں نے
چھوڑا ہے اس کی ادائیگی ہو جائے [20]۔ اور تمہارے چھوڑے ہوئے
سرمایہ میں ان کا چوتھائی حصہ ہے بشرطیکہ تمہارے اولاد نہ
ہو اور اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں حصہ ہے، بعد
اس کے کہ تمہاری وصیت کی تعمیل ہو جائے اور قرض کی ادائیگی
ہو جائے [21]۔ اگر مورث مرد ہو یا عورت کلالہ ہو مگر اس کا بھائی یا
بہن ہوں تو بھائی بہن میں سے ہر ایک کو چھٹا ملے گا [22]۔ اور اگر
بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب کل ترکہ کے تہائی
میں شریک ہوں گے جبکہ وہ وصیت پوری کردی جائے جو
مرنے والے کی جانب سے کی گئی ہے اور قرض کی ادائیگی ہو
جائے بشرطیکہ وہ نقصان دہ نہ ہو [23]۔ یہ اللہ کی طرف سے حکم
ہے اور اللہ دانا اور بہت بردبار ہے [24]۔

عائلی زندگی اور وراثت

وراثت کا بہت بڑا تعلق خاندانی نظام کے ساتھ عائلی زندگی سے بھی ہے۔ والدین اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ میاں اور بیوی کا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس طرح والدین کی تفصیل بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا۔ اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں بلکہ پوری عائلی زندگی کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔ وراثت جیسے خاندان کو تسلسل بخشنے اور اسے وحدت کے طور قائم رکھنے میں بہت اہم حصہ لیتی ہے، اسی طرح عائلی زندگی کے استحکام میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے، میاں بیوی کی رفاقت کو قرآن باہمی اخلاص و محبت کا تعلق قرار دیتا ہے اور اس کو خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتا ہے۔ شوہر زندگی میں بیوی کے معاشی مفادات کا محافظ اور بیوی شوہر کی عزت و آبرو کی نگران بن کر رہتی ہے۔ مرنے کے بعد شوہر بیوی کا ترکہ اس لیے پاتا ہے کہ اس نے زندگی میں اس کے معاشی مفادات کی ذمہ داری قبول کی ہے اور بیوی شوہر کا ترکہ اس لیے پاتی ہے کہ وہ پوری زندگی شوہر کی خدمت کرتی رہی ہے۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں، رشتہ داریوں کی جڑ بھی ازدواجی تعلق ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ وجود میں نہ آتا اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ اور اس نقطہ نظر سے دنیا میں زوجین کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان باہمی کفالت اور خدمت کا جو تعلق قائم ہے اسے باقی رکھنے اور مستحکم کرنے میں جہاں طبعی اور جذباتی عوامل کو دخل ہے وہاں مادی اور معاشی عوامل بھی کچھ کم نہیں۔ اسلام کے قانون وراثت کا اس روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے خاندانی زندگی میں ازدواجی زندگی کو کتنی اہمیت دی ہے

زوجین کا حصہ

۲۰۔ اور تمہاری بیویاں جو کچھ ترکہ میں چھوڑ کر جائیں اس میں سے آدھا حصہ تمہیں ملے گا بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اولاد ہونے کی صورت میں تمہیں چوتھائی ملے گا۔ لیکن یہ اس وقت ملے گا جبکہ پہلے اس کی وصیت کی تعمیل کر دی جائے یا قرض جو انہوں نے چھوڑا ہے اس کی ادائیگی ہو جائے

اب زوجین کی میراث کو بیان فرمایا ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کے مال میں سے آدھا ملے گا اگر عورت کے کوئی اولاد نہ ہو اگر عورت کے اولاد ہے خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو اور اسی مرد سے یا پہلے شوہر سے ہو تو مرد کو عورت کے ترکہ میں سے ایک چوتھائی ملے گا قرض اور وصیت کے بعد[1]

بیوی کی میراث

اس آیت میں اولاً شوہر کی وراثت بتائی گئی ہے کہ شوہر کو بیوی کی جانب سے جو میراث ملتی ہے وہ دو طرح کی ہے۔

اول نصف یعنی آدھی یہ اس وقت شوہر کو ملے گی جب بیوی کی اولاد نہ ہو اولاد میں بیٹا، وہ نہ ہو تو بیٹے کا بیٹا نیچے تک، بیٹی، وہ نہ ہو تو بیٹے کی بیٹی۔

دوم چوتھائی یہ اس وقت ملے گا جبکہ بیوی کے کوئی اولاد ہو اس سے یا پہلے شوہر سے ہو۔ یہ یاد رہے کہ ولد کا اطلاق مورث کی اس فرع اصل پر ہوتا ہے جو عصبہ ہو کر وارث بننے والی ہو یا فرض کے ذریعے پہلے کی مثال بیٹا اور دوسرے کی مثال بیٹی اور بیٹے کی بیٹی۔ ایسے ہی فرع جو وارث ہو جیسے بیٹی کا بچہ اس پر ولد کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ابوبکر الجصاص یوصیکم اللہ فی اولادکم کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ لفظ ولد کا اطلاق محض صلبی اولاد پر ہوتا ہے، لڑکا ہو یا لڑکی، اور پوتے پر اس وقت ہوتا ہے جب حقیقی لڑکا موجود نہ ہو اور بیٹی کی اولاد پر ولد نہیں بولا جاتا۔

بیوی نے اگر انتقال کے وقت شوہر اور حقیقی بہن وارث چھوڑے ہیں تو شوہر کو نصف ہی ملے گا کیونکہ ولد موجود نہیں اور باقی نصف بہن کو مل جائے گا۔

اور اگر وفات کے وقت وارث شوہر اور پوتا ہو تو شوہر کو چوتھائی ملے گا اور باقی پوتے کو مل جائے گا۔

اور اگر وفات کے وقت شوہر کے ساتھ صرف اپنی بیٹی کا لڑکا وارث چھوڑا ہے تو شوہر کو نصف ملے گا اور باقی بیٹی کے لڑکے کو ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے ملے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور اگر مرنے والی کے بعد ورثہ میں شوہر ہو، حقیقی بھائی ہو اور مرنے والی کا وہ بیٹا موجود ہو جس نے اسے قتل کیا ہے تو شوہر کو آدھا اور بھائی کو آدھا اور بیٹا ماں کا قاتل ہونے کی وجہ سے محروم الارث ہو گا۔ عامہ صحابہ اور جمہور ائمہ کی یہی رائے ہے۔

شوہر کی میراث

۱۲۱ - اور تمہارے چھوڑے ہوئے سرمایہ میں ان کا چوتھائی ہے بشرطیکہ تمہارے اولاد نہ ہو اور اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں ہے۔ بعد اس کے کہ تمہاری وصیت کی تعمیل ہو جائے اور قرض کی ادائیگی ہو جائے۔ یعنی اسی طرح عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے چوتھائی ملے گا۔ اگر مرد کی اولاد کچھ نہ ہو۔ اور اگر مرد کے اولاد ہے خواہ اسی عورت سے ہو یا پہلی بیوی سے ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ ملے گا خاوند کے اس مال میں سے جو وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد بچے گا۔ مال کی ہر قسم میں سے نقد ہو یا جنس سلاح ہو یا زیور، حویلی ہو یا باغ، باقی رہا عورت کا مہر وہ میراث سے جدا قرض میں داخل ہے یہ کل دو صورتیں ہوئیں جیسا کہ مرد کی میراث میں دو صورتیں تھیں[1]

خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں اولاد ہونے کی صورت میں وہ ¼ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ⅛ کی حصہ دار ہوں گی اور یہ ¼ یا ⅛ سب بیویوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا[2]

اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بیوی کا مہر ادا ہو گیا ہے یا نہیں۔ اگر بیوی کا مہر واجب الادا ہے تو دوسرے قرضوں کی طرح اولاً کل مال میں سے دین مہر ادا کیا جائے گا اس کے بعد میراث تقسیم ہو گی مہر لینے کے بعد عورت میراث میں بھی حصہ لے گی۔ اگر میت کا مال اتنا ہے کہ مہر ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا پھر دوسرے قرضوں کی طرح پورے مال سے مہر ادا کرنا ہو گا اور کسی وارث کو کوئی حصہ نہ ملے گا[3]

اس آیت میں بیوی کی وراثت بتائی کہ بیوی کو شوہر کی جانب سے جو میراث ملتی ہے وہ دو طرح کی ہے۔

اول ربع یعنی چوتھائی، یہ اس وقت جبکہ شوہر اپنے وارثوں میں اپنی کوئی اولاد نہ چھوڑ کر مرے۔ یہ اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، پوتا ہو یا پوتی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم [3] معارف م شفی

دوسرے ثمن یعنی آٹھواں یہ اس وقت جبکہ شوہر کے اولاد ہو خواہ اس بیوی سے یا دوسری بیوی سے ہو۔

اگر شوہر کی وفات ہوئی اور اس نے ایک اپنا بیٹا اور بیوی وارث چھوڑے تو بیوی کو ۱/۸ ملے گا اور باقی بیٹے کو۔

اگر شوہر بیوی اور اپنی بیٹی کی بیٹی چھوڑ کر مرا تو بیوی کو چوتھائی ملے گا اور باقی بیٹی کی بیٹی کو ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے ملے گا۔

میاں بیوی میں وراثت کی شرط

زوجیت کی بنا پر وراثت کا استحقاق پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ دونوں میں ازدواجی تعلق اسلامی قانون کے مطابق صحیح ہو باطل اور فاسد نہ ہو۔ باطل وہ تمام صورتیں جو قرآن نے حرام کردی ہیں۔ یعنی محرمات میں سے کسی سے نکاح کرلینا۔ مسلمان عورت کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہونا۔ اور فاسد یہ کہ شرائط نکاح میں سے کسی شرط کا نہ ہونا۔

۲۔ دونوں میں نکاحی تعلق وقت وفات فی الواقع یا حکماً موجود ہو۔ فی الواقع تو سب جانتے ہیں۔ حکماً یہ کہ شوہر نے بیوی کو طلاق رجعی دی ہو اور بیوی عدت گزار رہی ہو کہ شوہر کی وفات ہو جائے، یا بیوی کی وفات ہو جائے دونوں اس صورت میں میراث کے حقدار ہوں گے اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

عراوین اور عمریتین

آیئے اب پورا خلاصہ گوش گزار فرما لیجئے۔ اگر بیوی مرگئی اور صاحب اولاد ہے تو شوہر کو چوتھا اور اگر صاحب اولاد نہیں ہے تو نصف۔ اور اگر شوہر مرگیا ہے اور بیوی زندہ ہے اور اولاد نہیں ہے تو بیوی کو چوتھا اور اگر اولاد ہے تو آٹھواں حصہ۔ ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اسی حصہ میں شریک ہوں گی۔ لیکن اس صورت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ شوہر، بیوی ہوں اور ان کے والدین بھی تو پھر حصوں کی تقسیم کیسے ہوگی۔ صورتیں دو ہوں گی۔

شوہر مرگیا ہے ورثہ میں بیوی، ماں اور باپ چھوڑے ہیں۔ اور بیوی مرگئی ہے اور ورثہ میں شوہر اور ماں باپ چھوڑے ہیں۔ دوسری صورت میں اگر شوہر کو آدھا دیا جاتا ہے اور ایک تہائی

ماں کو تو باپ کا حصہ ½ رہ جاتا ہے جو ماں سے نصف ہے۔ اور اگر اولاد میں لڑکیاں ہوں، والدین بھی ہوں اور شوہر بھی تو لڑکیوں کو دو تہائی چاہیے اور والدین کو ایک تہائی تو خاوند کو کچھ نہیں ملتا ہے پہلی صورت میں یعنی اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند یا بیوی ہو تو اکثر یہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی پہلے اپنا حصہ لیں گے اور باقی کی ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی والد کو دیا جائے گا اس طرح حصص ٹھیک ہوں گے۔ یہی صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہی حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی کا کہنا ہے اور یہی عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت فرماتے ہیں۔ فقہاء سبعہ، ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ ابن القیم فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب اور زید بن ثابت نے یہاں شوہر کی موجودگی کو اس پر قیاس کیا ہے جبکہ شوہر موجود نہ تھا۔ اس وقت باپ کے لیے ماں کا ڈبل ہوتا ہے۔ اور شوہر اور بیوی کے حصہ لینے کے بعد باقی مال کو کل مال تصور کر کے یہ فیصلہ دیا ہے یہ بہترین قیاس ہے۔

بہرحال وہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی کو دے کر باقی مال ماں باپ کے حصص کے لیے کل قرار پائے گا اور ان کے حق میں ترکہ وہی ہے جو خاوند اور بیوی کو دینے کے بعد باقی رہ جائے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ باقی ماترک نہیں ہے اس لیے یہ فیصلہ درست نہیں ہے، لیکن آپ کی یہ خلش بے محل ہے کیونکہ ماترک ہر ایک کے لیے الگ الگ ہے۔ اگر قرض ہو تو پہلے قرض ادا ہونا چاہیے، قرض ادا ہو جانے کے بعد بھی ماترک ہے۔ اور اگر وصیت ہو تو اسے پورا کرنا چاہیے اب بھی ماترک ہے۔ اسی طرح اگر خاوند اور بیوی ہو تو پہلے ان کو ملنا چاہیے۔ اب بھی ماترک ہے۔ اب اس ماترک میں سے ماں کو ایک تہائی اور دو تہائی باپ کو ملنا چاہیے اور بقیہ اولاد کو۔ جس انداز سے اللہ سبحانہٗ نے حصے مقرر فرمائے ہیں وہ خود اس اصول کی صداقت کے گواہ ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ صرف اولاد ہو، والدین بھی ہوں۔ پھر بتایا کہ والدین ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ تیسری صورت یہ بتائی کہ شوہر یا بیوی ہو تو ظاہر بات ہے کہ جس طرح ماں باپ کو دے کر بقیہ اولاد کو ملتا ہے اسی طرح اگر شوہر اور بیوی کے ساتھ والدین ہوں تو شوہر اور بیوی کو دے کر ماں باپ کو دیا جائیگا

فرائض میں طوا،

فرض وہ حصہ کہلاتا ہے جو شرعاً ترکہ میں وارث کے لیے مقرر ہے۔ قرآن کے مقرر کردہ فرض صرف چھ ہیں۔ آدھا، چوتھائی، آٹھواں، دو تہائی، تہائی اور چھٹا۔ یعنی نصف، ربع، ثمن، ثلثان، ثلث اور سدس۔

اصحاب فرض بارہ ہیں میاں بیوی یہ دونوں علاقہ زوجیت کی وجہ سے وارث ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قرابت اور نسبت کی وجہ سے جو وارث ہونے ہیں یہ ہیں۔ باپ، ماں، بیٹی، لڑکے کی بیٹی، سگی بہن، اخیافی بہن، اخیافی بھائی، دادا، دادی۔

کچھ ایسے ہیں جن کے حصے مقرر نہیں ہیں لیکن اصحاب فرض سے جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ لے لیتے ہیں یا اصحاب فرض نہ ہونے کی صورت میں سب کچھ لے لیتے ہیں۔ ان کو عصبات کہتے ہیں تشریح شیخ الاسلام کے افادات میں آرہی ہے۔

کچھ ایسے ہیں جو نہ اصحاب فرض ہیں اور نہ عصبات ہیں ان کو ذوی الارحام کہتے ہیں۔

ترکہ کی تقسیم کے موقعہ پر سب سے پہلے ان کے آگے رکھا جائے گا جن کے حصص قرآن نے مقرر کر دیئے ہیں۔ ہر فرض والے کو اس کا حصہ دیا جائے گا۔

اصول مسائل سات ہیں ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۲، ۲۴۔

کبھی اصحاب فرض کے حصے اصل مسئلہ کے برابر ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے وارثوں میں ایک شوہر اور ایک حقیقی بہن چھوڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ صاف ہے کل مال کو برابر تقسیم کر کے ایک شوہر کو اور ایک بہن کو دیں گے۔ یہ تو فرض اور حصص میں برابری کی مثال ہے۔

کبھی اصحاب فرض کو دے کر حصص بچ جائیں گے مثلاً ایک شخص مرا ہے اس نے ورثہ میں ایک بیوی، دو بیٹیاں اور ایک حقیقی بھائی چھوڑا ہے بیوی کو $\frac{1}{8}$، بیٹیوں کو دو تہائی دے کر پھر بچا ہے مثلاً ۲۴ میں سے دو تہائی ۱۰ بیٹیوں کو دیا اور ۳ بیوی کو، اب ۵ باقی رہ گئے یہ بھائی کو دیئے جائیں گے اس کو فریضہ عادلہ کہتے ہیں۔

کبھی اصحاب فرض کو دینے کے بعد حصص باقی رہیں گے مگر لینے والا حقدار کوئی نہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص مرا ہے اس نے دو بہنیں اور ایک ماں وارث چھوڑے ہیں۔ دو بہنوں کو اگر دو تہائی اور ماں کو چھٹا دیتے ہیں اور ۲۴ میں سے ۱۶ بہنوں کو اور ۴ ماں کو دیتے ہیں تو چار پھر بھی باقی رہتے ہیں اور عصبہ کوئی نہیں ہے اس کو فریضہ ناقصہ کہتے ہیں۔

کبھی اصل مسئلہ پر حصص زیادہ ہو جاتے ہیں مثلاً ایک شخص نے مرتے وقت ورثہ میں بیوی دو لڑکیاں اور والدین چھوڑے۔ اگر بیوی کو آٹھواں اور لڑکیوں کو دو تہائی اور ماں باپ کو ایک تہائی دیتے ہیں حصے پورے نہیں ہوتے مثلاً ۲۴ میں سے ۳ بیوی کو اور ۱۶ لڑکیوں کو دے دیئے گئے تو پھر

والدین کے ۸ نہیں بچتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مشکل کا حل یہ پیش کیا تھا کہ ۲۴ کی جگہ ۲۷ بنائے جائیں جن میں سے ۱۶ لڑکیوں کو دیئے جائیں آٹھ ماں باپ کو تین بیوی کو، اسی کو عول کہتے ہیں اور اس مسئلہ کو عائلہ بولتے ہیں۔ عول کا سہرا بھی بقول ابن عباس حضرت عمر ہی کے سر پر ہے اور یہ بھی اولیات عمر بن الخطاب سے ہے۔

ابن قدامہ نے مغنی میں مسائل کی تین قسمیں کی ہیں عادلہ عائلہ اور ردیہ، شمس الدین سرخسی نے المبسوط میں ردیہ کو ناقصہ کے نام سے پکارا ہے۔

اخیافی بہن بھائیوں کی میراث

۲۲۔ اگر مورث مرد ہو یا عورت کلالہ ہو مگر اس کا کوئی بھائی یا بہن ہو تو بھائی بہن میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہاں سے اخیافی بھائی بہن کی میراث کا ذکر ہے جو کہ صرف ماں میں شریک ہوں سو جاننا چاہیے کہ باپ اور بیٹے کے ہوتے ہوتے بھائی اور بہن کو کچھ نہیں ملتا۔ ہاں اگر باپ اور بیٹا نہ ہوگا تو بھائی اور بہن کو میراث ملے گی۔

بھائی اور بہن تین طرح کے ہیں۔ سگے جو ماں اور باپ دونوں میں شریک ہوں جن کو عینی کہتے ہیں۔ یا وہ سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو علاتی کہتے ہیں، یا وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں۔ اس آیت میں آخری قسم یعنی اخیافی کا ذکر ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کی قرأۃ میں و لہ اخ او اخت کے ساتھ من الام کا کلمہ صریح موجود ہے اور اس تفسیر پر سب کا اجماع ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس میت کے خواہ مرد ہو یا عورت ماں باپ بیٹا بیٹی کچھ نہ ہو اور اس کا بھائی یا بہن اخیافی ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا ملے گا۔ مرد و عورت یعنی اخیافی بھائی بہن کا حصہ برابر ہے کمی زیادتی نہیں۔ باقی رہے دو قسم کے بھائی بہن یعنی عینی اور علاتی تو ان دونوں قسموں کا حکم مثل اولاد کے ہے۔ بشرطیکہ میت کے باپ بیٹا کچھ نہ ہو مقدم عینی ہے وہ نہ ہو تو پھر علاتی۔ اسی سورت کے آخر میں ان دونوں کی میراث کا ذکر آئے گا۔[1]

کلالہ کی معنوی تحقیق

کلالہ جس کا نہ والد ہو نہ اولاد ہو، یہ تکللہ النسب سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نسب نے اس کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گھیر لیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو نہ میت کا والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ باپ بیٹا آدمی کے دو کنارے ہیں تو جب مرتے وقت نہ باپ چھوڑے نہ بیٹا تو گویا دونوں کنارے اس کے مٹ گئے، اس لیے اس کو کلالہ کہتے ہیں۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ جو چیز گھیرے اس کو اکلیل کہتے ہیں اور میت کو کلالہ اس وجہ سے کہا کہ دوسرے وارث اس کو گھیر لیتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاحی زبان میں کلالہ وہ میت ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو، یعنی نہ اوپر کا رشتہ ہو نہ نیچے کا، صدیق اکبر نے کلالہ کی یہی تعریف کی ہے۔ اور ابن کثیر فرماتے ہیں، یہی حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت کا کہنا ہے، تابعین میں امام شعبی، نخعی، حسن بصری، قتادہ، جابر بن زید اور الحکم کی بھی یہی رائے ہے۔ اہل مدینہ، اہل کوفہ، اہل بصرہ کا یہی فیصلہ ہے، فقہاء سبعہ اور ائمہ اربعہ کا یہی موقف ہے بلکہ بتانے والوں نے تو بتایا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔ اس کے برعکس اہل لغت کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو میت کا نہ باپ ہو اور نہ اولاد ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ بظاہر اصطلاح شریعت اور اہل لغت کے مابین تضاد ہے مگر ہیں دونوں صحیح کیونکہ جس میت کا بلاواسطہ وارث نہ ہو دوسرے وارث ہوں تو میت کا رشتہ دوسروں سے کمزور ہوگا کیونکہ بالواسطہ ہوگا۔ اسی لیے ان وارثوں کا رشتہ میت سے کمزور ہوگا جو میت کی اولاد میں سے نہ ہوں اور باپ بھی نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کلال کے معنے ضعف کے ہیں اور بالواسطہ رشتہ بلاواسطہ رشتہ کے مقابلے میں ایک کمزور رشتہ ہے۔ اس لیے دونوں پر اطلاق صحیح ہے۔

دراصل کلالہ کی اصل کلال ہے اور کلال کے معنے کمزوری کے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے:

فآلیت لا ارثی لہا من کلالۃ

ولا من حفا حتی تلاقی محمدا

جب تک اونٹنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچائے گی مجھے اس کی تھکاوٹ اور فرسودگی پر رحم نہ آئے گا۔ اسی سے وہ تلوار جو کند ہو گئی ہو کلیل اور اسی طرح وہ زبان جس میں گویائی نہ ہے اور وہ آنکھ جس کی بینائی کمزور ہو جائے کلیل کہلاتی ہے۔ اسی سے وہ کمزور جو اپنا بوجھ نہ اٹھا سکے کل کہلاتا ہے۔ خدیجۃ الکبریٰ نے حضور انور سے کہا کلا انک لتحمل الکل، ہرگز نہیں آپ تو ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں جو خود کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے اور یہی معنے ہیں اس ارشاد کے کہ من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک کلا فالی وعلی۔ جو شخص مال و اسباب چھوڑ جائے گا وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو بوجھ چھوڑ کر جائے گا وہ میرے ذمہ ہے۔ توسیع استعمال کے

بعدعرف میں کلالہ سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو منقطع الطرفین ہوں نہ ان کے والدین ہوں اور نہ اولاد، اور جو شخص آباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو اس کو بھی کلالہ کہا جاتا ہے ایک شاعر کہتا ہے،

ورثتم قناة الملك غير كلالة

عن ابني مناف عبد شمس وهاشم

عبدمناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے تم کو حکومت کا نیزہ میراث میں تو ملا ہے مگر تم خود ان کی خصوصیات سے بے بہرہ ہو (راغب) قریب کے رشتے کو چھوڑ کر دور کے رشتہ دار کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ احادیث میں کلالہ مورث اور وارث دونوں کے لیے بولا گیا ہے شیخ الاسلام نے یہاں یہ بات لطیف فرمائی ہے کہ:

کلالہ کی جو تفسیر کی گئی ہے کہ باپ اور بیٹا نہ ہو سب کو مسلم ہے مگر امام ابوحنیفہ دادی اور پوتی کی بھی نفی کرتے ہیں اور جو حکم باپ بیٹے کا ہے وہی حکم دادی اور پوتی کا ہے اور حضرات صحابہ کے وقت سے یہ اختلاف علماء میں چلا آتا ہے۔

بہرحال اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے اخیافی بھائی اور بہن مراد ہیں۔ یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہیں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔

وراثت میں ایک سے زیادہ بہن بھائی کا حکم

۲۳۔ اور اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب کل ترکہ کے تہائی میں شریک ہوں گے جبکہ وصیت پوری کردی جائے جو مرنے والے کی جانب سے کی گئی ہے اور قرض کی ادائیگی ہوجائے بشرطیکہ وہ نقصان رساں نہ ہو۔ یعنی اگر اخیافی بہن یا بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کو ایک تہائی مال میراث میں ملے گا اور پہلی صورت میں سدس اور دوسری صورت میں ثلث جو دیا جائے گا تو وصیت اور دین کے بعد جو باقی رہے گا اس کا سدس اور ثلث دیا جائے گا اور وصیت میراث پر جب مقدم ہوگی کہ اوروں کو نقصان نہ پہنچایا ہو اور نقصان کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت ہو دوسرے یہ کہ جس وارث کو میراث میں سے حصہ ملے گا اس کے لیے کچھ وصیت بھی کر جائے۔ یہ دونوں صورتیں درست نہیں ہیں۔ البتہ اگر سب وارث اس کو قبول کرلیں تو خیر ورنہ یہ وصیت مردود ہے یہاں چونکہ وارثوں سے اندیشہ تھا کہ ترکہ میت میں سے میت کا دین اور وصیت ادا نہ کریں اور

تمام مال آپ ہی رکھ لیں اس لیے میراث کے ساتھ بار بار دین اور وصیت کا حکم تاکیداً بیان کیا گیا ہے اور وصیت چونکہ تبرع و احسان ہے اور بسا اوقات کوئی شخص معین اس کا مستحق نہیں ہوتا اور اس وجہ سے اس کے ضائع ہونے کا قوی احتمال تھا اس لیے بغرض اہتمام و احتیاط وصیت کو ہر جگہ دین سے پہلے ذکر کیا حالانکہ وصیت کا درجہ دین کے بعد ہے جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے۔ نیز وصیت حق مورث ہے۔ جیسے تجہیز و تکفین بخلاف وراثت اور دین کے کہ وہ دوسروں کا حق ہے تو اس حیثیت سے وصیت دین سے مقدم ہے اور یہاں جو غیر مضار کی قید لگائی ہے یہ قید مقامات سابقہ میں بھی معتبر ہوگی [1]

آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے مگر کچھ مباحث باقی ہیں ان پر بحث ضروری ہے۔

اسلام میں وصیت کا مقام

اول یہ کہ قرآن نے اس رکوع میں بار بار وصیت کے لیے پورا کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس تاکید اور تکرار کی توجیہات تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہو لیکن یہ بات یہاں سمجھنے کی ہے کہ وصیت کے ذریعے مالک اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے ترکہ کا ایک حصہ متعین فرد یا افراد کی ملکیت ہو جائے۔

وصیت کی درستگی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک یہ کہ ایک تہائی میں ہو دوسرے یہ کہ کسی وارث کے لیے نہ ہو۔

اول یعنی ایک تہائی کی تحدید جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاف اور واضح ارشاد سے ثابت ہے اور تمام مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔

> سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے میں مکہ میں تھا اور آپ کو یہ بات ناپسند تھی کہ کوئی اس جگہ مرے جہاں سے اس نے ہجرت کی تھی چنانچہ آپ نے فرمایا۔ اللہ ابن عفراء پر رحم فرمائے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اپنے سارے مال کے بارے میں وصیت کر جاؤں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پھر نصف مال کی حد تک؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ پھر ایک تہائی مال کی، آپ نے فرمایا کہ ہاں ایک تہائی بھی بہت ہے تو اپنے ورثا کو مالدار

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چھوڑ جائے یہ بات اس سے اچھی ہے کہ انہیں محتاج چھوڑے اور وہ لوگوں سے مانگتے پھریں۔[1]

ایک تہائی ترکہ کی حد تک اسلام نے وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثا کے موجود ہونے کی وجہ سے ترکہ میں حصہ دار نہیں ہوتا جیسا کہ وصیت واجبہ کے عنوان میں بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے بارے میں بتائے ہیں۔ یا اس سے تعلق یا کسی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترکہ میں اسے بھی حصہ ملے۔ حق وصیت کے ذریعے مالک کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں کچھ مال چھوڑ جائے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے کسی کمزور کو سہارا دینے، رفاہِ عامہ یا دینی کاموں کے نگران کسی ادارے کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔ وصیت کے محرکات زیادہ تر یہی ہیں اور عملاً ان اغراض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے اس حق کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر کسی فرد کا کوئی وارث نہ ہو تو احناف کے نزدیک وہ اپنے پورے ترکہ پر وصیت کا حق استعمال کر سکتا ہے[2] کیونکہ اس حق کی تحدید کا اصل مقصد ورثا کے حق کا تحفظ ہے۔ لیکن امام مالک اور امام اوزاعی اس صورت میں بھی ایک تہائی سے زائد میں وصیت کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ جب کوئی متعین فرد اس کا وارث نہیں ہے تو یہ پوری قوم کا سرمایہ ہے اور اس شخص کو لوگوں کے حق کو کالعدم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

دوم، وصیت کا حق ورثا کے علاوہ دوسروں کو مال منتقل کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی جو وارث کی حیثیت سے ترکہ کے ایک حصہ کا حقدار ہو۔ وارث کے حق میں وصیت عملاً اس تناسب میں ترمیم کر دیتی ہے جس کے مطابق مال کو شرعاً تقسیم ہونا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت فرماتے وقت اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

شرجیل بن حسنہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوامامہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ نے ہر حقدار کے لیے اس کا حق مقرر کر دیا ہے لہٰذا کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت نہیں ہے۔[3]

---

[1] بخاری کتاب الوصایا۔ [2] احکام القرآن ج ۲ بدائع الصنائع ۷ ہدایہ المجید ج ۲ [3] ابوداؤد۔

جمہور فقہا کے نزدیک اگر تمام ورثا اس پر رضامندی کا اظہار کریں تو کسی وارث کے حق میں بھی وصیت کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک وارث کے حق میں وصیت سے ممانعت کا مقصد دوسرے ورثا کے حق کا تحفظ ہے۔ اگر وہ بخوشی اپنے حق کے ایک حصہ سے دوسرے وارث کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں تو اس کی ممانعت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی ہے۔ لیکن الجصاص نے لکھا ہے کہ وصیت میں صرف وصیت کرنے والے کی زندگی میں ورثہ کی اجازت کافی نہیں ہے۔ اصل اجازت یہ ہے کہ مرنے کے بعد ورثا اس اجازت کو برقرار رکھیں [1]

وصیت میں ضرار

غیر مضار یعنی نقصان رساں نہ ہو۔ وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ مثلاً وصیت نامہ میں کسی اجنبی کے لیے مال کا اقرار کرے یا کسی کے قرض کا فرضی تذکرہ کردے۔ اور مقصد یہ ہو کہ محض حقداروں کو حق سے محروم کردے۔ ایک حدیث موقوف میں اس قسم کے اضرار کو کبائر میں شمار کیا ہے۔ الاضرار فی الوصیۃ من الکبائر، یعنی وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔ مضار خود ضرار سے بنا ہے اور حضور انور نے پوری اسلامی زندگی کے بارے میں یہ ضابطہ بتایا ہے کہ لاضرر ولا ضرار فی الاسلام ضرر کے معنے دوسرے کو نقصان پہنچانا اور ضرار کہتے ہیں نقصان کے بدلے میں نقصان کرنا اسلام میں دونوں کی ممانعت ہے۔ یہ حدیث اگرچہ روایتی طور پر درجہ حسن میں ہے مگر یہ آیت قرآنی اور دوسری آیات اس کی صحت کی بہت بڑی ضمانت ہیں۔ ہمارے فقہاء نے اسے ایک کلیہ کے طور پر اختیار کرکے عام شہری زندگی کے لیے اس سے ایک سے زیادہ قاعدے اور ضابطے بنائے۔ لیجئے آپ بھی کچھ سن لیجئے۔ ایک قاعدہ ہے۔

ضرر اور نقصان کی بقدر امکان مدافعت کی جائے گی۔ یہ قاعدہ بتارہا ہے کہ نقصان کے اندیشے کے تحت اس سے بچاؤ کی تدبیر بقدر استطاعت اختیار کی جائے گی۔ وبا کے پھیلنے کے اندیشے سے مکانوں، بازاروں اور گلیوں کی صفائی ایسی لیے کی جاتی ہے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جہاں اندیشہ نقصان ہو وہاں بقدر امکان نقصان سے بچنے کے وسائل اختیار کیے جائیں گے۔

[1] احکام القرآن

اجتماعی زندگی میں جرائم کی سزائیں اسی لیے دی جاتی ہیں۔ فساد اور بدامنی کی تمام راہوں پر قدغن اسی لیے قائم کیا جاتا ہے۔

انفرادی زندگی میں مفلس مدیون پر پابندی اسی لیے ہے۔ مشترکہ جائیداد کی ایک حصہ دار کے مطالبہ پر جبری تقسیم بھی دفع ضرر کے لیے ہے۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ نقصان کو لازماً مٹایا جائے گا۔ یعنی نقصان ہو جانے کے بعد اس کا ازالہ ناگزیر ہے۔ اجتماعی زندگی میں اگر کسی کا پرنالہ راہ گزرنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے تو پرنالہ کو ہٹایا جائے گا۔ گلیوں میں جانور باندھنے سے روکا جائے گا۔ اور انفرادی زندگی میں اگر کسی شخص کے درخت کی شاخیں کسی پڑوسی کے گھر میں لٹک کر اسے نقصان دے رہی ہیں تو ان کو ہٹایا جائے گا۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ نقصان کو نقصان کے ذریعے نہیں ہٹایا جائے گا۔ نقصان کا ازالہ ایک نقصان کو رونما کرکے نہ کیا جائے گا کیونکہ یہ ازالہ نہیں ہے غریب باپ کے نان نفقہ کی ذمہ داری کا بوجھ غریب بیٹے پر نہ ڈالا جائے گا۔

ایک اور قاعدہ ہے بڑے نقصان کو چھوٹے نقصان کے ذریعے ہٹا دیا جائے گا۔ غریب رشتہ داروں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری سرمایہ دار اقارب پر ڈالی جائے گی۔ اگر کسی کی مرغی کسی کا قیمتی موتی کھا گئی تو موتی والا مرغی کی قیمت دے کر اسے ذبح کرنے کا مجاز ہے۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ دو برائیوں اور نقصانوں میں سے معمولی کو اختیار کر لیا جائے گا یا اس کو یوں کہہ دیجئے کہ جب دو برائیاں متعارض ہو جائیں اور ہلکی برائی کو گوارا کرکے بڑی برائی دور کی جا سکتی ہے تو ہلکی کو قبول کر لیا جائے گا۔

عورت مرگئی ہے پیٹ میں بچہ ہے، بچہ کی زندگی کی توقع ہے تو بچہ کی خاطر مردہ عورت کا پیٹ چاک کر دیا جائے گا۔ آپ کسی کو برائی میں مبتلا دیکھتے ہیں اور آپ انکار منکر کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کو اندیشہ ہے کہ اگر ان کو روکا گیا تو یہ ڈاکہ ماریں گے یا اور کوئی سنگین جرم کریں گے۔ تو آپ کو تبلیغ ملتوی کر دینی چاہیے۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ عمومی ضرر کو ہٹانے کے لیے خصوصی نقصان برداشت کر لیا جائے گا۔ بازار میں ان پڑھ ڈاکٹر دکان کھولے ہوئے ہے۔ عوامی نقصان کی خاطر اس کی پریکٹس پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ لوگوں نے اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کر لی عوام کو نقصان سے بچانے کی خاطر مجسٹریٹ کو حق ہے کہ ذخیرہ اندوزوں کے سٹاک کو کھلے بازار فروخت کرنے پر مجبور کرے۔

فقہاء نے قیمتوں کے کنٹرول کا جواز بھی اسی سے نکالا ہے۔ محلہ میں آگ لگ گئی ہے عمومی نقصان سے بچنے کے لیے آگ کے قریب مکانات کا گرادینا جائز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ضرار صرف قرض اور وصیت ہی میں ناجائز نہیں بلکہ زندگی کی تمام شاخوں میں ممنوع ہے مگر خاص طور پر کلالہ کے معاملہ میں اللہ سبحانہ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ اس میں عموماً یہ میلان پیدا ہوتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور نسبتاً دور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کر دے۔

قانون وراثت کا خلاصہ

۴۲ - یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ دانا اور بہت بردبار ہے۔ شروع رکوع سے یہاں تک جو میراثیں بیان فرمائی ہیں وہ پانچ ہیں، بیٹا، بیٹی اور ماں باپ، زوج اور زوجہ، اور اخیافی بھائی ہیں۔ ان پانچوں کو ذوی الفروض اور حصہ دار کہتے ہیں۔ ان پانچوں کی میراث کو بیان فرما کر بطور تاکید فرما دیا کہ یہ حکم ہے اللہ کا اس کی تعمیل ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے، کس نے اطاعت کی، کس نے نافرمانی کی، کس نے میراث وصیت و دین میں حق وانصاف کے موافق کیا، کس نے بے انصافی کی اور ضرر پہنچایا، باقی ظلم و بے انصافی کی سزا میں تاخیر ہونے سے کوئی شخص دھوکہ میں نہ پڑ جائے کیونکہ حق تعالیٰ کا حلم بھی بہت کامل ہے۔

جاننا چاہیے کہ ذوی الفروض کے سواجن کا بیان ہو چکا ایک دوسرے قسم کے وارث ہیں جن کو عصبہ کہتے ہیں ان کے لیے کوئی حصہ مثل نصف ثلث وغیرہ مقرر نہیں ہے بلکہ ذوی الفروض سے جو کچھ بچ رہے گا وہ ان کو ملے گا مثلاً اگر کسی کے عصبہ ہو اور ذوی الفروض میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا تمام مال عصبہ کو ملے گا اور اگر دونوں ہوں تو ذوی الفروض کو دے کر جو کچھ بچے گا وہ عصبہ کو ملے گا اور اگر کچھ نہ بچا تو عصبہ کو کچھ نہ ملے گا۔

عصبہ کسے کہتے ہیں

عصبہ اصل میں تو وہ ہے جو مرد ہو عورت نہ ہو اور اس میں اور میت میں عورت کا واسطہ بھی نہ ہو۔ اور اس کے چار درجے ہیں اوّل درجہ میں بیٹا اور پوتا ہے دوسرے درجہ میں باپ اور دادا تیسرے درجہ میں بھائی اور بھتیجا ہے، چوتھے درجہ میں چچا اور اس کا بیٹا یا اس کا پوتا۔ اگر کسی

شخص ہوں تو جو میت کے زیادہ قریب ہے وہ مقدم ہوگا جیسے پوتے کے مقابلہ میں بیٹا، بھتیجے کے مقابلہ میں بھائی مقدم ہے۔ پھر سوتیلے سے حقیقی مقدم ہے اور ان چاروں کے سوا اولاد میں اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہوتی ہے یعنی بیٹے کے ساتھ بیٹی اور بھائی کے ساتھ بہن بھی عصبہ ہوگی۔ یہ عصبہ اصلی نہیں ہے بلکہ غیر اصلی ہے اولاد اور بھائیوں کے سوا عورت عصبہ نہ ہوگی۔ مثلاً چچا کا بیٹا عصبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہو کر چچا زاد بہن عصبہ نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں قسم مذکورہ بالا یعنی ذوی الفروض اور عصبہ کے سوا امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ایک وارث کی تیسری قسم ذوی الارحام ہیں یعنی ایسی قرابت والے کہ ان میں اور میت میں عورت کا واسطہ ہو اور ذوی الفروض میں نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہو جیسے نواسا، نانا اور بھانجا، ماموں، خالہ، پھوپھی اور ان کی اولاد، جب کسی میت کے ذوی الفروض اور عصبہ کوئی بھی نہ ہوگا تو اس کی میراث ذوی الارحام کو ملے گی۔ تفصیل کتب فرائض میں مذکور ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سبحانہ دانا و بُردبار ہے شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ مقام چونکہ حکم، فرمان اور قانون کا ہے اس لیے مقام کے لحاظ سے یہاں علم و حکمت کا ذکر ہونا چاہیے اگر گناہوں کی معافی، توبہ کی قبولیت کا ذکر ہوتا تو پھر علم و حلم کا ہوتا تو مناسب تھا۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ علم و حکمت کو چھوڑ کر علم و حلم کا حوالہ دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہاں صفت علم لا کر متنبہ کیا ہے کہ اللہ کی حدود، اللہ کے قوانین کی نافرمانی کرنے والوں کو اللہ خوب جانتا ہے اور اس علم کے نتیجے میں قانون کی حدود توڑنے والوں کی ضمناً سزا کی طرف اشارہ آ گیا ہے اس لیے اللہ کی صفتِ حلم کا اس وسوسہ کا ازالہ کرنے کے لیے ذکر کیا ہے کہ عذاب اور گرفت میں تاخیر اس لیے نہیں ہوگی کہ اللہ کو تمہاری قانون شکنیوں اور نافرمانیوں کا علم نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اللہ کی ذات حلیم ہے اور حلیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذاتِ گرامی جو نافرمانی پر سزا میں جلدی نہ کرے۔

اور اسے یوں بھی سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا اظہار دو وجہ سے کیا گیا ہے ایک یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی بچ نہ سکے گا، دوسرے یہ کہ اللہ نے جو حصے جس طرح مقرر کر دیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کیونکہ بندوں کی مصلحت جس چیز میں ہے اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور اللہ کی صفت حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے تاکہ وہ مشقت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں [1]

.....

[1] تفہیم

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا
خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں[۲۵]۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چل رہی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہے گا اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے[۲۶]۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے گا[۲۷]۔ اسے اللہ آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے[۲۸]۔

حدود میں طاعت و عصیان

قانونِ وراثت بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اللہ و رسول کی طاعت کو سراہا گیا ہے اور اس کی جزا بتائی گئی اور خدا اور رسول کے عصیان کو بُرا کہا گیا ہے اور اس کی سزا کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہوتا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو اپنی رعایا نہیں بناتی ہے لیکن اگر کوئی شخص برضا و رغبت اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جاتا ہے کیونکہ رعایا بننے کے معنے ہی اس کے قانون کو قبول کرنے کے ہیں۔

یہ آیت ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت میں تبدیلی کو جائز سمجھیں یا ان دوسری قانونی حدود کو توڑ دیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں اور اسے اپنا علمی کارنامہ قرار دیں جیسے آج کل ایران، انڈونیشیا، مصر، تیونس، الجزائر اور پاکستان میں عائلی قوانین کے نام پر ہو رہا ہے۔ اللہ اکبر اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی اہلِ ایمان نے قانونِ ازدواج اور قانونِ وراثت میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کے ثبوت کے لیے ان قومی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کے بیانات ان کے مضامین، ان کے اعلانات و منشور اور ان کی عملی کارروائیاں اور اقدامات اور وہ معاملہ جو یہ لوگ ان جماعتوں کے ساتھ کرتے ہیں جو ان رجحانات پر تنقید کرتی ہیں بالکل کافی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ نومبر ۱۹۶۳ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے اپنے ڈھاکہ کے اجلاس میں اس عائلی قانون کو منظور کیا اور ان تمام ترمیموں کو جو اس بنیاد پر پیش کی گئی تھیں کہ یہ قانون قرآن و سنت کے نصوص، تصریحات اور اجماع و تعامل کے خلاف ہے مسترد کر دیا۔ اسلام کے منصوص و اجماعی مسائل کے بارے میں ان رہنماؤں کا یہ رویہ تعدی حدود اللہ کا شاہکار ہے۔

اس قانونِ وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ کہیں عورتوں کو طلاق ہونے پر میراث کا حقدار بنایا جا رہا ہے، کہیں صلبی اولاد کی موجودگی میں پوتوں کو میراث دی جا رہی ہے کہیں سرے سے میراث کی تقسیم کو چھوڑ کر مشترک

خاندانی جائداد کا اعلان ہو رہا ہے کہیں عورتوں اور مردوں کا برابر حصہ بنایا جارہا ہے اور اب کہیں میت کے ترکہ میں وفات ٹیکس کا اضافہ ہو رہا ہے اور کہیں یہ کہا جارہا ہے کہ وراثت کا طریقہ ختم کرکے مرنے والے کا ترکہ ریاست کے خزانے میں داخل کردیا جائے۔ انا اللہ فالی اللہ المشتکی۔

۲۵۔ یہ اللہ کی حدود ہیں۔ حد اس آڑ اور روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کو آپس میں ملنے سے روکے۔ تلک اسم اشارہ ہے اور اس کا مشارالیہ وہ تمام احکام ہیں جو شروع سورت سے یہاں تک بیان ہوئے ہیں یعنی معاشرتی، عائلی اور وراثت کے قوانین، ان کو یہاں حدود اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں بلکہ اللہ کے قوانین ہیں۔ قرآن نے اسی لفظ سے مشتق لفظ محادّہ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جو خدا کی حدود کو نہیں مانتے اور ان کے مقابلہ میں کچھ دوسری حدیں مقرر کر لیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:

ان الذین یحادون اللہ و رسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلھم
بلاشبہ وہ لوگ خوار کردیے جائیں گے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل و خوار کردیے گئے ہیں۔

مشہور مفسر قرآن ابن جریر طبری نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے یعنی وہ لوگ جو اللہ کی حدود اور اس کے فرائض کے معاملہ میں اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کی جگہ دوسری حدود مقرر کرتے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اس کی تشریح یوں کی ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول سے مخاصمت اور جھگڑا کرتے ہیں یا ان کی مقرر کی ہوئی حدوں کے سوا دوسری حدیں خود وضع کرلیتے ہیں یا دوسروں کی وضع کردہ حدوں کو اختیار کرتے ہیں۔ علامہ آلوسی بغدادی نے بیضاوی کی اس تفسیر سے اتفاق کرتے ہوئے شیخ الاسلام کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں ان سربراہان مملکت اور حکام کے لیے سخت وعید ہے جنہوں نے شریعت کی مقرر کردہ حدود کے خلاف بہت سے احکام وضع کرلیے ہیں اور ان کا نام قانون رکھا ہے۔ اس مقام پر علامہ آلوسی شرعی قوانین کے مقابلے میں وضعی قوانین کی آئینی حیثیت پر مقابلہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اس شخص کے کفر میں تو کوئی شبہ نہیں ہے جو اس قانون کو مستحسن اور شریعت کے مقابلہ میں افضل قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زیادہ حکیمانہ اور قوم کے لیے زیادہ مناسب اور موزوں ہے اور جب کسی معاملہ میں اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ و رسول کا فیصلہ اس بارے میں یہ ہے تو اس پر اسے غصہ آجاتا ہے جیسا کہ ہم کچھ ان لوگوں سے ملے ہیں جن پر

اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی طاعت

۲۶ - اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔
آلوسی لکھتے ہیں کہ جو بھی احکام و فرائض میں اللہ و رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے یہ جزا ملے گی۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ تقسیم میراث میں جو بھی اللہ و رسول کی حدود کو مانے گا اور ان پر عمل کرے گا ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ جو بھی ان حدود و فرائض میں اللہ و رسول کی طاعت کرے گا نہ کسی وارث کو اس کے حصہ سے زیادہ دے گا اور نہ کسی کو اس کے حصہ سے کم دے گا بلکہ اللہ کے حکم اس کے فیصلہ اور اس کی تقسیم کو اپنائے گا اس کو یہ جزا ملے گی۔
اس آیت میں قرآن نے اللہ و رسول کی طاعت کو کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو کچھ لوگوں کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت طاعت کے سمجھنے میں پیش آئی ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد آیات اس معنے کی ہیں کہ رسول کی طاعت کرو۔ اور یہ بھی قرآن میں ہے کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے۔ اس سے آج کل کے کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ رسول کی طاعت صرف قرآن تک محدود ہے۔ قرآن سے باہر اس کی کوئی طاعت نہیں ہے اور اس فریب خوردگی کی اساس ان کی یہ فکری گمراہی ہے کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچانا ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ اس کا حق ہے ان کے خیال میں رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے۔
شاید ان کو یہ دھوکہ اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے ہوا ہے جس کے لفظی معنے قاصد اور پیغامبر کے ہیں لیکن یہ لوگ خیال نہیں کرتے ہیں کہ جہاں قرآن میں ان کو رسول کہا گیا ہے وہاں نبی خبر پانے والا بھی تو کہا گیا ہے۔ بشیر خوشخبری دینے والا نذیر ڈرانے والا، سراج منیر روشن کرنے والا چراغ، صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ، مصطفیٰ، مبین، معلم، مزکی، داعی الی اللہ، حاکم، مطاع، آمر اور ناہی بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب رسول کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ قرآن پہنچانے والا ہے جس کو قرآن کے مفہوم و معنی سے

ایک معمولی قاصد کی طرح کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس کے پیغام کے مفہوم و معنے کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر ایرے غیرے کو حق حاصل ہے اور اس کی حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر شخص مدعی ہے۔ مگر خود صاحب پیغام کو اپنی رسالت کے وقت نہ مفہوم و معنے کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا۔ ان ھذا لشیء عجاب۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث انشاءاللہ بشرط حیات آپ کو پانچویں پارے میں ملیں گے۔

خدائی حدود سے تجاوز

۷۲۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے گا۔ قرطبی نے تجاوز کے معنے مخالفت کرنے کے بتاتے ہیں اور علامہ آلوسی نے یہاں جائز سمجھنے کی قید کا اضافہ ضروری سمجھا ہے۔ شاید موصوف یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں معتزلہ کی حمایت نہیں ہے کیونکہ اشاعرہ اور معتزلہ میں یہ مسئلہ نزاعی ہے کہ آیا گنہگار مسلمان بھی ہمیشہ جہنم میں رہے گا یا نہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں دخول تو گناہوں کی پاداش میں ہوگا مگر خلود نہ ہوگا۔ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ خلود بھی ہوگا۔ اشاعرہ کی حمایت میں قرطبی نے یہاں یہ نوٹ لکھا ہے کہ اگر یہ گناہ کبیرہ ہے تو پھر لفظ خلود مدت کے لیے بطور استعارہ ہے اور حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں اس آیت میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ایک مطیع کامل دوسرا عاصی کامل۔ اور ایک قسم اس میں غیر مذکور ہے یعنی اعتقاداً مطیع ہو اور عملاً تقصیروار ہو، بظاہر عاصی کامل سے مراد کافر ہے۔ اس تاویل کی بھی ضرورت اسی لیے پیش آئی ہے کہ گنہگار کے لیے اشاعرہ کے نزدیک خلود نہیں ہے۔

دراصل یہاں حالتیں دو ہیں ایک یہ کہ انسان طبیعت اور ماحول سے مغلوب ہو کر گناہ کرتا ہے دوسری یہ کہ طبیعت اور ماحول پر غالب ہو کر گناہ کرتا اور اس حالت میں وہ گناہ کو گناہ ہی تصور نہیں کرتا ہے۔ ان بزرگوں کو اپنے ماحول میں جن سے سابقہ پڑا ہے وہ بلاشبہ ایسے ہوں گے۔ لیکن آپ اس شخص کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جو رواج کے مقابلہ میں برملا یہ کہہ رہا ہو میں اسلام کا قانون وراثت نہیں مانتا۔ اور اقتدار کے نشہ میں علانیہ یہ کہتا ہو کہ قرآن کے یہ قوانین اس دور کے لیے نہیں ہیں۔ یہ لوگ یقیناً مغلوب نہیں بلکہ غالب ہیں۔
تعدی حدود اللہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہاری عائلی زندگی اور وراثت کے لیے اللہ کی حدود

ہیں جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے اردگرد حد بندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے ہو کہ کوئی ان حدوں کو توڑے اور اگر کوئی ان حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی عزت وغیرت کے لیے ایک چیلنج تصور کرتے ہو اسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے اردگرد حدیں قائم کر دیں۔ ان کو توڑنا اور ان سے تجاوز کرنا یہ اللہ کی عزت وغیرت کو چیلنج کرنا ہے اور جو اس کی عزت کو ہاتھ لگاتا ہے اس کا انجام جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۸۔ اللہ اس کو آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔ یعنی تمام احکام مذکورہ سابقہ متعلق حقوق یتامیٰ وصیت اور میراث اللہ کے مقرر فرمودہ ضابطے اور قاعدے ہیں اور جو کوئی طاعت کرے گا احکام الٰہی کی جن میں حکم وصیت و میراث بھی داخل ہے اس کے لیے ہمیشہ کو جنت ہے اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اور حدودِ خداوندی سے بالکل خارج ہو جائے گا وہ ہمیشہ کو ذلت کے ساتھ عذاب جہنم میں گرفتار رہے گا۔[1] میراث اور یتامیٰ کی بحث کو ان دو آیتوں پر ختم کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ معاملات قرآن کی نظر میں بے حد اہمیت والے اور بہت ہی غور طلب ہیں۔ ان میں کوتاہی سنگین گناہ ہے۔ اور قرآن کے مقابلہ میں رسوم اور قانون کو ترجیح دینا اور ان پر اڑنا کفر ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہوں[29] تو ان کے بارے میں اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو۔[30] اگر چار گواہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے[31] اور جو دو مرد تم میں سے اس بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ۔[32] پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح حال کر لیں تو انہیں چھوڑ دو بلاشبہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے

والا مہربان ہے۔[۳۲]

رذائل میں اصل فاحشہ ہے

جن برائیوں سے قرآن نے بچنے کا حکم دیا ہے ان میں اوّلین درجہ فاحشہ کا ہے یعنی جس کی برائی کو ہر عقلمند آدمی جانتا اور مانتا ہے اور جس کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی و دنیوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت و اقبال کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں جہاں رذائل کی تحریم کا اعلان ہے وہاں فواحش کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں سب حرام ہیں ارشاد ہے انما حرم ربی الفواحش ما ظہر منہا وما بطن یعنی اللہ نے بدکاری کی ساری باتیں جو کھلے طور پر ہوں یا چھپا کر کی جائیں حرام کر دی ہیں۔

یہاں عورتوں کا ذکر پہلے لانے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ میراث میں عورتیں ہی موضوع بنی ہوئی تھیں اور ان ہی کی میراث کو بتانا اصل مقصود تھا۔ اس لیے اس موقعہ پر بھی بات کا آغاز ان ہی سے کیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں ان مفاسد کے دروازے بند کیے گئے تھے جو مال کی حد سے بڑھی ہوئی طمع سے پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے میں فساد اور قطع رحم کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آگے جنسی انتشار اور شہوانی بے قیدی پر پابندی عائد کی جا رہی ہے اس لیے کہ یہ بے قیدی بھی حرص مال کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ معاشرے کو بازیچۂ شیطان بنا دیتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ یہ سورت ۳ھ سے لے کر ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ اُحد کی شکست نے اطراف و نواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں اور گھر کے منافقوں کی ہمتیں زیادہ بڑھا دی تھیں اور اہل ایمان ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں یہ تو ممکن نہ تھا کہ اسلامی حدود و تعزیرات کا نفاذ ہو اور نہ ہی یہ بات قرین مصلحت تھی کہ فواحش کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے اس لیے کہ اس سے بدکاری کے اس رجحان کو شہ ملتی تھی جو اس وقت عرب سوسائٹی میں رائج تھا۔ اس لیے یہاں بجائے کسی سنگین

سزا کے عمر قید کی سزا تجویز فرما دی۔ یہ سزا فی الجملہ خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے مفید تھی۔ اور یہیں سے آئندہ سنگین سزا کے لیے یہ کہہ کر راہ یجعل اللّٰہ لھن سبیلا زمین ہموار کر دی۔

۲۹۔ اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہوں اصل ارشاد میں فاحشہ آیا ہے اس کی جمع فواحش آتی ہے اور اسی کی دوسری صورت قرآن میں فحشا بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبح اور برائی کے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی جو حد اللہ سبحانہ نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا برائی پایہ کر جو برائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ فحشا اور فاحشہ ہے قرآن نے زنا اور لواطت دونوں کو فاحشہ کہا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ سبحانہ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کر دی ہیں۔ اب جو ان حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی۔ امام رازی رقمطراز ہیں کہ یہاں باتفاق مفسرین فاحشہ سے مراد زنا ہے۔ اگرچہ نسا کا لفظ عام ہے مگر کم کی اضافت نے اسے اہل ایمان کی عورتوں کے ساتھ خاص کر دیا ہے یعنی مسلمان عورتیں اگر اس جرم کا ارتکاب کر لیں تو ان کا حکم کیا ہے۔ اور غالباً اس تخصیص کی وجہ اس پس منظر میں ہے جس سے اہل ایمان اس وقت دوچار تھے۔ اور یہی اس اضافت ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان عورتیں شادی شدہ ہوں، کیونکہ تمہاری عورتوں کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمہاری بیویاں، اگر اہل ایمان نہیں اور شادی شدہ نہیں ہیں پھر وہ اس جرم کا ارتکاب کرتی ہیں تو قرآن یہاں ان کی سزا کے بارے میں خاموش ہے۔

یہاں یتامیٰ اور مواریث کو بیان کر کے اب دیگر احکام متعلقہ اقارب کو بتلایا جاتا ہے پہلے عورتوں کے متعلق چند باتیں ارشاد ہوتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی تادیب و سیاست ضروری ہے اور ان پر کسی قسم کی تعدی اور ظلم بھی نہ کیا جائے۔ اہل جاہلیت کے یہاں عورتوں کی بابت دونوں باتوں میں بہت بے اعتدالیاں ہوتی تھیں اور اس آیت میں تادیب کے بارے میں حکم ہے کہ اگر کسی کی بیوی کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو جائے تو ایسا کرنا چاہیے [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نصابِ شہادت اور اس کی تفصیل

۴۲۰ - قرآن کے بارے میں اپنے میں سے چار گواہوں کی گواہی لو۔ یعنی اس کے لیے مسلمانوں میں سے چار گواہ عاقل بالغ آزاد قائم ہونے چاہئیں۔ چار اس لیے کہ معاملہ سنگین اور نازک ہے۔ اس کی سنگینی تو یہی ہے کہ یہ بدترین کردار کا مظاہرہ ہے اور نزاکت یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت کی آبرو اور عزت کا سوال ہے اور صرف عورت کا نہیں بلکہ اس کے شوہر کی آبرو کا سوال ہے نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کے وقار کا معاملہ ہے۔ نیز جب کردار کے ہیرو دو ہیں تو گواہی بھی ایک کے لیے دوہری چاہیے اس کا مجموعہ یقیناً چار ہو گا۔ کیونکہ قرآن میں شہادت کا نصاب دو سے کم نہیں ہے۔ مخاطب عام اہل ایمان ہیں۔ عوامی حالات کی کفالت عوام ہی کرتے ہیں اور اسی کفالت کے پیش نظر حکام کا مقرر کرنا عوام کا کام ہے اور حکام عوام کی جانب سے نیابتہً احکام نافذ کرتے ہیں اور حدود قائم کرتے ہیں۔ چار گواہوں سے مرد مراد ہیں۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ زمانۂ نبوت اور زمانۂ خلافت ابوبکر وعمر میں اس قسم کے معاملات میں عورتوں کی شہادت ناقابل قبول ہوتی تھی۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن میں جو ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت لینے کی اجازت دی ہے اس کا تعلق حدود سے نہیں بلکہ دیوانی معاملات سے ہے۔ اس میں ایک قسم کی بہت گہری معاشرتی مصلحت ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن چاہتا ہے کہ عورتوں کو ایسے مواقع اور مناظر سے بھی دور رکھا جائے جہاں فواحش کے جرائم اور ان کی سزاؤں کے نظارے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مناظر بھی انسان کے جذبات ومیلانات پر اثر انداز ہوتے ہیں:

یہ شہادت علمی اور خبری نہ ہو بلکہ عینی ہونی چاہیے۔ اس میں اندازہ وتخمین نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ چار شہادتیں ہوں،

۱۔ مسلمان ہوں غیر مسلم نہ ہوں،
۲۔ آزاد ہوں غلام نہ ہوں،
۳۔ عاقل ہوں مجنون نہ ہوں،
۴۔ بالغ ہوں نابالغ نہ ہوں،

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

۵۔ مرد ہوں عورتیں نہ ہوں،
۶۔ علمی گواہی نہ ہو یعنی گواہ ہوں۔
شرائط میں اس سنگینی کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا کردار پورے خاندان کے وقار کو دھکا لگا دیتا ہے۔
اور سوسائٹی میں ایسے کردار کا آدمی بے آبرو ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ فاحشہ کا مرتکب ہے جس کے معنے بہت بڑی برائی کے ہیں۔ اور یہ اس بُرائی کی سنگینی تو ہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ زنا نہ کرو بلکہ فرمایا ولا تقربوا الزنا زنا کے قریب نہ جاؤ۔ یہ نصیحت جس انداز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت ہے۔

بدکاری پر عورت کو عمر قید کی سزا

۳۱۔ اگر چار گواہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے یعنی اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہیے۔ گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً بالکل روک دیا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مر جائے۔ یا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی حکم اور سزا مقرر فرمائے۔ اس وقت تک زانیہ کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد سورۃ نور میں اس کی حد نازل ہوئی کہ باکرہ کے لیے سو کوڑے اور ثیبہ کے واسطے سنگسار کرنا ہے[۱] جمہور شارحین قرآن نے آیت کی یہی تشریح کی ہے اور اس ارشاد او یجعل اللہ لھن سبیلا کا یہی مطلب بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے آئندہ زنا کی سزا نازل فرمائے گا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ گھروں میں روکنا کوئی حد نہیں ہے بلکہ حد زنا نازل ہونے تک روکنے کا حکم ہے۔ عبادہ ابن الصامت کی اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں آئی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے سے لے لو، میرے سے لے لو۔ بلاشبہ اللہ نے ان کے لیے راہ بنا دی ہے کہ باکرہ لڑکی اور غیر شادی شدہ لڑکا یہ کام کریں گے تو ان کے سو دُرّے اور شہر بدر کی سزا ملے گی اور ثیبہ یہ کام کرے گی تو اسے سو دُرّے اور سنگساری

[۱] افادات شیخ الاسلام

سزا دی جائے گی۔ قاضی ثناءاللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ یہ گھروں میں روک لینے کا حکم اب بھی باقی ہے۔ ہر شخص کو حد کے قائم ہونے تک گھر میں روکا جائے گا۔ ہدایہ میں ہے کہ حاکم زانی کو عدالتی تحقیقات تک محبوس رکھے گا اور جرم ثابت ہونے کے بعد سزا دے گا۔

مردوں کے لیے بدکاری پر تادیب

۳۲ - جو دو مرد تم میں سے اس بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ۔ یعنی دو شخص خواہ ایک مرد اور ایک عورت ہو، خواہ دونوں مرد ہوں، اگر فعل بد کریں تو ان کی سزا عملاً ایذا دینا ارشاد فرمایا زبان سے یا ہاتھ سے بقدر ضرورت ان کو تنبیہہ و تادیب کرنے کا حکم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک زنا اور لواطت کی سزا اور لواطت دونوں کا حکم یہی تھا کہ حاکم اور قاضی کے نزدیک زجر و عبرت کے لیے جتنی سزا اور شتم و ضرب مناسب ہو اتنی سزا دی جائے۔ اس کے بعد حسب وعدہ حد زنا جب نازل ہوئی تو لواطت کے لیے کوئی جدا حد مقرر نہ فرمائی وہی سزا باقی رہی جو پہلے تھی یا اس کی سزا تلوار سے قتل کرنا یا کسی اور طریقے سے مار ڈالنا ہے۔

اس آیت کو بہت سے علماء نے زنا پر محمول کیا ہے اور بعض نے لواطت پر اور بعض نے دونوں کو شامل رکھا ہے[1]

ان دونوں آیتوں کی تشریح میں علماء تفسیر مختلف الخیال ہیں۔ جمہور کا خیال تو یہی ہے کہ ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورت کے بارے میں ہے اور ان کی یہ سزا تجویز ہوئی ہے کہ انہیں تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ ان دونوں کو اذیت دی جائے یعنی مارا پیٹا جائے سخت سست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد و عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ ان کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔

اہل عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی۔ اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانون تعزیرات بنا کر دفعۃً ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعزیری قوانین کا خوگر بنانے کے لیے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں پھر بتدریج زنا، قذف اور سرقہ کی حدیں مقرر کیں اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی حکومت میں نافذ تھا[1]

بے حیا عورتوں پر پابندی

بے حیا عورت کے متعلق قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اس کی بے حیائی ظاہر ہو چکی ہو تو اس پر پابندی عائد کر دی جائے اور خیال رکھا جائے کہ وہ گھر کی چار دیواری سے نکلنے نہ پائے کیونکہ اس کا نکلنا ہر اعتبار سے نقصان دہ ہے یا عورت خود بے حیائی کے کام کا موقع ڈھونڈ نکالے گی یا بُرے مرد خواہ مخواہ اسے چھیڑیں گے۔ گو وہ نہ بھی جائے کیونکہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ جس نے ایک مرتبہ زنا کر لیا اس سے دوبارہ اس جُرم کا ارتکاب بعید نہیں ہے۔ ہاں شادی کے ذریعے اگر شادی نہیں ہوئی ہے اصلاح کی اُمید کی جاتی ہے۔ قرآن کی اس آیت سے لگانے والوں نے عورتوں پر یہ پابندی لگائی۔ چنانچہ صاحب کشاف علامہ زمخشری نے لکھا ہے:

> یہ بھی جائز ہے کہ یہ آیت منسوخ نہ ہوا اور حد کا ذکر یہاں اس لیے چھوڑ دیا گیا ہو کہ یہ کتاب وسنت سے معلوم ہے اور یہاں اس کی تاکید کی جا رہی ہو کہ زناکار عورتوں پر حد کے اجراء کے بعد گھروں میں رہنے کی پابندی لگادی جائے کہ اب وہ سزا سے محفوظ ہیں جو گھر سے نکلنے اور مردوں سے اختلاط کا نتیجہ ہے[2]

یعنی یہ ضروری ہے کہ زناکار مرد اور عورت کے ساتھ سلوک اس طرح ہو کہ وہ محسوس کریں کہ جو کچھ کیا بہت بُرا کیا، اتنا بُرا کہ سماج اور سوسائٹی بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی ہے اور اس طرح وہ اپنے کیے پر پچھتائے کسی لفظ سے اس کے بُرے فعل پر تائید کا پہلو نہ پیدا ہونے پائے تاکہ دوسروں پر بھی یہ معاملہ اثر انداز ہو۔

سحاقت اور لواطت

امام رازی نے ابو مسلم اصفہانی سے ان آیات کی یہ تشریح نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں

---

[1] تفہیم [2] کشاف

دو عورتوں کے باہمی ناجائز تعلق کی سزا بتائی ہے اس کو سحاقت کہتے ہیں اور دوسری آیت میں دو مردوں کے درمیان ناجائز تعلق کا ذکر کیا ہے اس کو لواطت کہتے ہیں۔ ان آیات میں زنا کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی پہلی آیت کے بارے میں رائے پڑھ چکے ہیں کہ اس کے منسوخ ہونے کے قائل نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں عدالت کی تحقیقات تک محبوس کرنے کا حکم ہے دوسری آیت کے بارے میں وہ ابومسلم اصفہانی کے ہمنوا ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

میرے نزدیک الذان یاتیانہا کا مصداق وہ لوگ ہیں جو عمل قوم لوط کرتے ہیں۔

خواہ امام مجاہد نے بھی آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ اس تفسیر پر لوگوں نے دو اعتراض کیے ہیں۔ ایک یہ کہ فاحشہ کی تفسیر سحاقت اور لواطت سے کرنی اجماع کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر آیت کی یہ تفسیر ہوتی تو صحابہ کرام لواطت کی حد میں مختلف الخیال نہ ہوتے۔ پہلے اعتراض کا جواب امام رازی نے یہ دیا ہے کہ امام مجاہد کا تفسیر کرنا بتا رہا ہے کہ اجماع نہیں ہے۔ تفسیر و تشریح قرآن کے موضوع پر کسی آیت کی نئی تاویل و تشریح جو متقدمین سے منقول نہ ہو ممنوع نہیں ہے اور صحابہ کے اختلاف کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام ضرورت کے وقت قرآن کی تشریح و تفسیر کرتے تھے ورنہ وہاں تفسیر قرآن کا کوئی حلقہ نہ تھا۔ ابومسلم اور قاضی ثناء اللہ کے علاوہ دیگر اکابر نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ قرآن کا انداز تعبیر کچھ اسی کا مؤید ہے۔ یہ بھی زنا کی طرح معاشرے میں شاہراہ پر پیش آنے والے مسائل ہیں۔ ان کو گلیاں اور پگڈنڈیاں کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی انسانی زندگی کے لیے قانون و اخلاق کی شاہراہ ہے۔ ہاں یہ بات وزنی ہے کہ صحابہ نے لواطت کی سزا میں کیوں اختلاف کیا ہے اس کا جواب صاف اور واضح یہ ہے کہ چونکہ قرآن نے فاذوھما میں ایذا کے چہرۂ اجمال سے پردہ نہیں اٹھایا اور اس کو حکام کے صوابدید اور اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا اس لیے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بھی اختلاف ہوگیا۔

زنا کے مبادی سے تحفظ

پہلی آیت میں الفاحشہ سے مراد زنا نہیں بلکہ مبادی زنا ہیں یعنی بے حیائی، یہاں قرآن نے راہ بتائی ہے کہ کس طرح عورتوں کو زنا سے بچانے کے لیے وقت پر اس کا انسداد کرنا چاہیے۔ علاج یہ ہے کہ جب کسی عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ثابت ہو تو اس کا فوری علاج یہ ہے کہ ان کو گھروں میں بند کر دیا جائے یعنی ان کی آزادی سلب کر دی جائے اور ان کو باہر نکلنے سے قطعاً روک دیا جائے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے اور وہ راہ تو بہ ہے اور اگر بے نکاحی

عورتیں ہیں تو شادی سے بھی ان کی حالت سدھر سکتی ہے۔ اس طرح آزادی کے روک دینے سے دو غرضیں حاصل ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان کو خود بدی میں مبتلا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کے لیے نمونہ بد نہیں بنتی ہیں اور مردوں کے لیے ایسا کردار پیدا ہونے پر سزا کو فہمائش تنبیہہ اور زجر تک محدود رکھا ہے۔

آیت کی یہ تشریح کچھ جاندار اور معنے خیز نہیں ہے۔

کیا یہ آیات منسوخ ہیں

جمہور شارحین قرآن نے ان آیات کی جو تشریح کی ہے اس کی بنیاد پر یہ آیات قرآنی منسوخ ہیں۔ لیکن دوسرے اکابر اس کو منسوخ نہیں مانتے ہیں۔ جو لوگ اسے منسوخ کہتے ہیں ان میں اختلاف ہے کہ ناسخ کیا ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ یہ آیت صحیح مسلم کی عبادہ ابن الصامت والی حدیث البکر بالبکر جلد مائۃ و تغریب عام والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم سے منسوخ ہے۔ اور پھر یہ حدیث منسوخ ہے قرآن کی آیت فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ سے اور آیت منسوخ ہے رجم سے۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ قرآن کی یہ آیت قرآن کی دوسری آیت سے جو سورۃ نور میں ہے منسوخ ہے۔ لیکن امام رازی نے علامہ خطابی صاحب معالم السنن کا اپنی تفسیر میں ایک بیان نقل کیا ہے۔ اس بیان میں علامہ خطابی نے جمہور کے موقف کی حمایت کے باوجود یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس آیت اور حدیث میں قطعاً کوئی نسخ نہیں ہے سنیے آپ بھی لطف اٹھائیے، فرماتے ہیں۔

> اس آیت اور حدیث عبادہ میں قطعاً نسخ نہیں ہوا کیونکہ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ امساک فی البیوت کا عرصہ تمہید ہے ان کے لیے اللہ کی جانب سے راہ پیدا ہونے تک راہ کی حد تک آیت قرآنی مجمل ہے۔ ارشاد نبوت جو عبادہ ابن الصامت کے حوالہ سے آیا ہے وہ اسی اجمال کا بیان ہے اور یہی حدیث قرآن کی آیت فاجلدوا کل واحد کے لیے مخصص بھی ہے گویا ارشاد نبوت بیک وقت ایک آیت قرآنی کے لیے بیان اور دوسری آیت کے لیے مخصص بن کر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ زیادہ اچھا ہے اس سے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آیت حدیث سے منسوخ ہے اور حدیث قرآن کی آیت جلد سے منسوخ ہے۔

بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ شارحین قرآن کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ان آیات میں جس برائی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود زنا ہے اور جس سزا کا حکم دیا گیا ہے وہ اوائل اسلام میں دی جاتی تھی۔

بعد کو جب سورۂ نور نازل ہو گئی تو زنا کی حد مقرر ہو گئی اور یہ سزا باقی نہیں رہی لیکن ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ان آیات میں اور سورۂ نور میں ایک ہی جرم کی سزائیں نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ دو مختلف جرائم کا ذکر کیا گیا ہے یہاں جس بدچلنی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود وہ بدچلنی ہے جو دو عورتیں اور دو مرد آپس میں کریں اور سورۂ نور میں زنا کا ذکر ہے بس دونوں احکام اپنی جگہ باقی ہیں[1]

درستگی اعمال کے بعد کچھ نہ ہو

۳۳۔ اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح حال کر لیں تو انہیں چھوڑ دو بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے یعنی اس کے بعد اگر وہ بدکاری سے توبہ کر لیں اور آئندہ کو اپنے اعمال کو درست کر لیں تو اب ان کے پیچھے نہ پڑو اور زجر و ملامت سے ستانا چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے والا اور ان پر مہربانی فرمانے والا ہے تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے[2] یہاں توبہ اور اصلاح کے دو لفظ آئے ہیں۔ توبہ کے معنے بدکاری سے علم و عمل اور حال کے اعتبار سے ہٹ جانا اور اصلاح کے معنے آئندہ درست رہنے کا عزم کر لینا۔ علماء نے لکھا ہے کہ توبہ کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ گناہ سے ہٹ جائے اور آئندہ نہ کرنے کا عزم جازم کرے یہ دونوں شرطیں اس آیت سے معلوم ہو رہی ہیں اور تیسری شرط ان دونوں کا لازمہ ہے یعنی جو کر چکا ہے اس پر ندامت ہو ظاہر ہے جو کسی مقام سے ہٹ کر اپنے لیے دوسرا مقام تجویز کرتا ہے وہ اسی لیے کرتا ہے کہ اسے اپنے کیے پر ندامت ہے۔ لیکن کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر گناہ سے توبہ کرنے کے بعد پھر وہی گناہ کرتا ہے تو کیا اس کی توبہ باطل ہو جاتی ہے اگرچہ کچھ نے یہی سمجھا ہے لیکن حافظ ابن القیم نے محققین کا خیال یہی بتایا ہے کہ پہلی توبہ ٹھیک ہے اپنی جگہ ہے اس کا موجودہ گناہ موجودہ ہے پرانا نہیں ہے۔ اگر اس نے پہلی بار توبہ پورے عزم سے کی ہے تو گناہ کے پھر ارتکاب سے پہلے گناہ کا وبال واپس نہ آئے گا۔

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ
يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ
عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ
حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ
يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٨﴾

اللہ کے حضور ان ہی لوگوں کی توبہ کو قبولیت حاصل ہوتی ہے جو برائی کی کوئی بات یا کام نادانی اور حماقت میں کر گزرتے ہیں اور پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں، ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نظر عنایت متوجہ کرتا ہے وہ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے"۔ اور ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو برائیاں کیے جاتے ہیں تا آنکہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اب میں نے توبہ کر لی۔ اور

اسی طرح ان لوگوں کی بھی کوئی توبہ نہیں جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں ان ہی لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ [۳۵]

توبہ اور اس کی قبولیت کی شرطیں

انسان کے تمام کاروبار میں اصل چیز اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی بدکرداری و بدعنوانی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرے اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی خدا کی محبت کی آغوش میں لاکر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت کس طرح گنہ گار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمتِ الٰہی کے اس پُرجوش نظارہ کی جو کیفیت قرآن میں نظر آتی ہے وہ کہیں نہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا۔ مسند احمد میں حضرت علی کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے:۔

اللہ سبحانہٗ اس مومن بندے سے محبت رکھتا ہے جو فتنوں میں مبتلا ہے اور ہمیشہ توبہ کرتا ہے۔

جب گناہ بندہ کی طبیعت ہے تو پھر توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیے۔ لہٰذا اگر وہ غلط علم، غلط افتادِ طبع اور غلط ماحول سے طرح طرح کے فتنوں کا شکار ہوتا رہتا ہے مگر کبھی اپنی توبہ کی صفت کو فراموش نہیں کرتا تو وہ ارحم الراحمین کی نظر میں کیوں نہ پیارا ہو۔ یہاں محبت اس کے

تکرار جرم پر نہیں بلکہ اس کی صحت توبہ پر ہے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا کہ گنہ گار اپنے گناہوں پر اصرار کریں بلکہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو نادم و شرمسار رہیں وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر کو دھو کر اس کی جگہ آپ سے آپ لے گی یبدل اللہ سیاٰتھم حسنات اور یہی اس کی شان رحمت کا تقاضا ہے۔ یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں تو ان کو بھی بشارت ہے۔ ابوطالب مکی نے قوت القلوب میں مقامات یقین نو بتائے ہیں ان میں اوّلین درجہ توبہ ہے۔ صاحب عوارف نے مقامات کے ذکر میں توبہ کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ امام غزالی نے احیاء میں توبہ کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ توبہ نام ہے تین بالترتیب چیزوں کے ہونے کا۔ علم، حال اور عمل، شیخ مرتضیٰ زبیدی نے ان تینوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس پر بہت عمیق اور دلچسپ تحقیق فرمائی ہے اور متعدد عنوانوں کے تحت توبہ پر بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔ لیکن توبہ کس کے لیے اور کس شرط کے ساتھ ہے۔ قرآن کی ان آیات میں اسی سوال کا جواب ہے۔ اور یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ گزشتہ آیت میں یہ بتایا تھا کہ جو لوگ بدکاری کے مرتکب ہوں جب وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں تو ان کو کچھ نہ کہو۔ اس آیت میں توبہ کی قبولیت کی شرط بتائی جاتی ہے۔

۳۴۔ اللہ کے حضور ان ہی لوگوں کی توبہ کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے جو برائی کی کوئی بات یا کام نادانی اور حماقت میں کر گزرتے ہیں پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نظر عنایت متوجہ کرتا ہے وہ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی توبہ تو بے شک ایسی چیز ہے کہ زنا اور لواطت جیسے سنگین جرم بھی اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے جیسا کہ پہلی آیت سے معلوم ہوا لیکن اس کا بھی ضرور لحاظ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے قبول توبہ کا ذمہ لیا ہے وہ اصل میں ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ناواقفیت اور نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے ہیں مگر جب اپنی خرابی پر متنبہ اور مطلع ہوتے ہیں تو جبھی نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، سو ایسوں کی خطائیں اللہ ضرور معاف کر دیتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کس نے نادانی سے گناہ کیا اور کس نے اخلاص سے توبہ کی اور حکمت والا ہے، جس توبہ کا قبول کرنا موافق حکمت ہوتا ہے اس کو قبول فرما لیتا ہے۔

جہالت اور قریب کی قید سے معلوم ہوگیا کہ جو شخص گناہ کو کرے نادانی سے اور تنبیہہ کے بعد توبہ کرے جلدی سے تو بقاعدہ عدل و حکمت اس کی توبہ مقبول ہونی ضروری ہے اور جس نے جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ اللہ کی نافرمانی پر جرأت کی یا اطلاع کے بعد اس نے توبہ میں تاخیر کی اور پہلی ہی حالت پر قائم رہا تو بقاعدہ عدل و انصاف اس کی خطا اصل میں معافی کے قابل نہیں ہے

اس کا قبول کرلینا محض اللہ کا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی توبہ کو قبول کرلیتا ہے یہ اس کا احسان ہے مگر ذمہ داری صرف پہلی صورت میں ہے باقی میں نہیں ہے[1]

اس آیت میں جہالت اور قریب کی قیدیں معنے خیز اور بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ جہالت کے معنے یہاں نہ جاننے اور عدم علم کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنے اس حماقت اور بیوقوفی کے ہیں جس کے تحت آدمی وہ کام کر بیٹھتا ہے جو تقاضائے عقل کے خلاف ہوتا ہے۔ اس معنے کے لحاظ سے اللہ کی ہر نافرمانی جہالت ہے خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ عربی میں جہل وجہالت ان معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔

الا لا یجهلن احد علینا فنجهل فوق جهل الجاهلینا

خبردار کوئی ہمارے خلاف حماقت کا مظاہرہ نہ کرے پھر ہم بھی تمام احمقوں سے زیادہ حماقت کا اظہار کریں گے۔

یہ جہالت یعنے حماقت تین وجہ سے ہوتی ہے، طبیعت کی غلط افتاد ماحول اور گردوپیش کی ناہمواری اور معلومات کی کمی سے یعنی غلط معلومات، طبیعت کے تقاضے اور رسوم وضوابط کی پیچیدہ وستی سے انسان حماقت کرتا ہے اور اس حماقت کے تحت اللہ کی نافرمانی کرتا ہے۔ الغرض اس دُنیا میں خدا کی ہر نافرمانی خواہ بالارادہ ہو یا بلاارادہ حماقت اور جہالت ہے۔ ابوحیان اندلسی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ صحابہ اور تابعین کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص بالارادہ کوئی گناہ کرے اور جان بوجھ کر کرے توبہ کا دروازہ اس کے لیے بھی کھلا ہوا ہے اور کون ہے جو جان بوجھ کر نہیں کرتا ہے اس لیے آیت کے معنے یہ نہیں کہ جو لوگ نادانی سے گناہ کرتے ہیں ان کی توبہ قبول ہوگی ورنہ نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حماقت سے گناہ کر بیٹھتے ہیں اور اس پر اصرار نہیں کرتے اور فوراً توبہ کر لیتے ہیں اللہ ان کی توبہ قبول کرلیتے ہیں اور فوراً کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کے فوراً بعد ہی توبہ ہوگی تو قبول ہوگی ورنہ نہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی موت تک فوراً کا مصداق ہے کیونکہ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے قیامت بھی آنے والی ہے وہ بھی قریب ہے۔ ارشادِ نبوت ہے کہ جب تک غرغرہ کی حالت نہ ہو توبہ قبول ہے۔

اس آیت میں من قریب کا لفظ بڑھا کر اس طرف بھی اشارہ کردیا ہے کہ انسان کی ساری زندگی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھوڑی ہے اور موت جس کو وہ دُور سمجھتا ہے وہ بہت قریب ہے[1]

قریب کی دو حالتیں ہیں ایک یہ کہ زندگی سے نااُمیدی ہو جائے لیکن ابھی تک عالمِ آخرت کے احوال اور اہوال نظر نہیں آئے اس حالت کو یاس کہتے ہیں اور دوسری حالت یہ ہے کہ احوال بھی نظر آنے لگیں اس کو حالت بِاس کہتے ہیں۔ پہلی حالت میں کافر کا ایمان اور گنہ گار کی توبہ دونوں مقبول ہیں اور دوسری حالت میں دونوں مقبول نہیں ہیں۔ محققین کا مذہب یہی ہے اور ظاہر قرآن سے بھی سمجھ میں آتا ہے[2]

امام بخاری فرماتے ہیں کہ زنا و سرقہ کے بعد اگر زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسلام نصیب ہو جائے یا ان گناہوں سے توبہ کرے تو اس کے یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

ایک بے حد اہم سوال

یہاں اہل علم میں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر ایک شخص کسی گناہ سے ایسی حالت میں توبہ کرتا ہے جب اس کی زندگی میں دوسرے بے شمار گناہ موجود ہیں اور ان پر اصرار بھی ہے کیا ایسی حالت میں اس گناہ سے توبہ صحیح ہے جس کے بارے میں توبہ کر رہا ہے مثلاً ایک شخص سود سے توبہ کرتا ہے لیکن وہ نماز بھی نہیں پڑھتا، جھوٹ بھی بولتا ہے، زنا بھی کرتا ہے، چوری بھی کرتا ہے تو کیا اس حالت میں اس کی سود سے توبہ کو شرف قبولیت مل جائے گا۔ یہ موضوع اگرچہ تفصیل طلب ہے لیکن حافظ ابن القیم نے فیصلہ کن اور راجح بات جو بتائی ہے وہ گوش گزار فرمالیجئے۔ فرماتے ہیں۔ ایسے گناہ سے تو توبہ صحیح نہیں جبکہ اسی قسم کے گناہ اس کی زندگی میں موجود ہوں ہاں ایسے گناہوں سے توبہ درست ہے جبکہ دوسری قسم کے گناہوں سے اس کا دامن آلودہ ہو۔ اسے مثال سے سمجھئے ایک شخص سود خوار بھی ہے اور شرابی بھی، سود سے توبہ کرتا ہے مگر شراب سے باز نہیں آتا۔ سود سے اس کی توبہ درست ہے اور ایک شخص سود کھاتا ہے اور سود کی دو قسموں میں سے ربا فضل سے توبہ کرتا ہے مگر ربا اصلی نسیئہ سے توبہ نہیں کرتا، یا افیم سے توبہ کرتا ہے مگر شراب پیتا رہتا ہے اس کی توبہ درست نہیں ہے اس کی پوزیشن اس شخص سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ جو حمیدہ نامی عورت سے زنا کی توبہ کرتا ہے مگر نسیمہ نامی سے منہ کالا کرتا رہتا ہے۔ یا انگوری شراب سے توبہ کرتا ہے مگر دوسری

---

[1] معارف م شی [2] بیان القرآن

شرابیں پیتا رہتا ہے۔ اس کی توبہ توبہ نہیں ہے۔ یہ گناہ سے توبہ نہیں کر رہا ہے بلکہ گناہ کی ایک نوع سے ہٹ کر دوسری نوع کی طرف جانے کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ یہ ہرگز اس شخص کی طرح نہیں جو معصیت کی ایک جنس سے توبہ کر رہا ہو جبکہ معصیت ہی کی دوسری جنس میں مبتلا ہو۔ شراب سے توبہ کرتا ہے اور چوری میں مبتلا ہے اس کی شراب سے توبہ قابل قبول ہے۔ جس گناہ سے توبہ کرے گا اس کی توبہ صحیح ہے اور جس سے نہ کرے گا اس کا مواخذہ ہوگا۔

جرائم پیشہ لوگوں کی توبہ

۳۵۔ اور ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں جو برائیاں کیے جاتے ہیں تا آنکہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اب میں نے توبہ کرلی اور اسی طرح ان لوگوں کی بھی کوئی توبہ نہیں ہے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں ان ہی لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر گناہ کیے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے یہاں تک کہ موت ہی نظر آگئی تو اس وقت کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کی توبہ قبول ہوگی جو کفر پر مرگئے اور اس کے بعد عذاب آخرت کو دیکھ کر توبہ کریں ایسے لوگوں کے واسطے عذاب شدید تیار ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ دونوں آیتیں جو توبہ کے قبول ہونے اور نہ ہونے کے موضوع پر یہاں آئی ہیں۔ ہم نے ان کا جو مطلب بتایا ہے یہ بعض اکابر محققین کی تحقیق کے مطابق ہے اور اس میں یہ خوبی ہے کہ قید جہالت اور لفظ قریب دونوں اپنے ظاہری معنی پر ہیں اور علی اللہ کے معنے بھی آسانی سے بن گئے۔ اور اس موقعہ پر قبول اور عدم قبول توبہ کے ذکر فرمانے سے جو مقصد ہے یعنی توبہ کیف ما اتفق مقبول نہیں۔ اور توبہ کی چند صورتیں ہیں۔ اور ان کی مقبولیت میں باہم فرق ہے تاکہ کوئی توبہ کے اعتماد پر معاصی پر جری نہ ہوجائے۔ یہ مقصد بھی اس صورت میں خوب حاصل ہوجاتا ہے مگر مفسرین حضرات کے علی العموم جو ان آیتوں کا مطلب ارشاد فرمایا ہے تو قید جہالت کو قید اتفاقی اور شرطی نہیں بلکہ قید واقعی فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گناہ ہمیشہ نادانی اور حماقت سے ہوتا ہے اور قریب کے معنے یہ لیتے ہیں کہ حضور موت سے پہلے جس قدر وقت ہے وہ قریب ہی ہے کیونکہ دُنیا کی زندگی قلیل ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا توبہ قبول کرنے کا وعدہ ان سے ہے کہ سفاہت اور عدم انجام بینی سے گناہ کرلیتے ہیں اور پھر موت کے آنے سے پہلے تائب ہوجاتے ہیں اور جو لوگ کہ موت کا مشاہدہ کرچکے ہیں اور نزع کی حالت کو پہنچ چکے ہیں یا جو لوگ کفر پر مرچکے ان کی توبہ ہرگز قبول

نہ ہوگی۔ اس تقریر کے موافق توبہ کرنے والوں کی دو صورتیں ہیں۔ جو تقریر اول میں مذکور ہوئیں شق اول یعنی قبول توبہ میں شمار ہوں گی۔

جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالم آخرت کے دیکھنے سے پہلے کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ حسب تقریر اول صورت اولی میں تو قبول توبہ قاعدہ عدل وانصاف کے موافق ہے اور دوسری صورتوں میں قبول توبہ اس کا محض فضل ہے۔[1]

یہاں توبہ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ توبہ کے معنے رجوع اور پلٹنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا ہے اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنے رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظرِ عنایت جو پھر گئی تھی وہ ازسرِ نو اس کی طرف منعطف ہوگئی۔[2]

اس تفصیل سے توبہ کے بارے میں چند اہم حقائق واضح ہو کر سامنے آگئے۔

توبہ کی توفیق اور قبولیت

۱۔ بندہ کی توبہ اللہ کی دو توبوں کے درمیان ہوتی ہے۔ ایک بندے کی توبہ سے پہلے اور ایک اس کے بعد۔ اللہ کی جانب سے پہلی توبہ یہ ہے کہ وہ بندے کو اپنی بارگاہ میں توفیق توبہ ارزانی فرماتا ہے۔ اور دوسری توبہ یہ کہ اللہ سبحانہٗ بندے کی توبہ کو شرف قبول عطا فرماتا ہے۔

تاب علیہم لیتوبوا ان اللہ ھو التواب الرحیم

مہربان ہوا ان پر اللہ تاکہ وہ توبہ کریں یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اولاً اللہ نے ان پر مہربانی کی اس کی یہ مہربانی ان کی توبہ کا سبب ہوئی اور پھر جب انہوں نے توبہ کی تو اللہ نے اس کو شرف قبول بخشا۔ گویا اللہ کی اولین مہربانی یعنی توبہ ان کی توبہ کی علت ہوئی۔ اس لحاظ سے اللہ بھی تواب ہے بندہ بھی تواب ہے۔ بندے کی توبہ اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اللہ کی طاعت و فرماں کی طرف پلٹنا ہے اور اللہ کی توبہ کی دو قسمیں ہیں ایک توفیق دوسرے قبولیت۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم۔

اسباب گناہ نہ ہوں پھر توبہ

۲۔ گنہگار اگر اسبابِ معصیت نہ ہونے کے بعد توبہ کرے کیا اس کی توبہ درست ہے؟ مثلاً جھوٹ بولنے والا، تہمت لگانے والا، جھوٹا گواہ اگر ان کی زبانیں گنگ ہو جائیں یا کٹ جائیں کہ اب جھوٹ بولنا ان کی قدرت میں نہیں ہے۔ زانی اگر نامرد ہو جائے کہ اب زنا پر قادر نہیں ہے، چور کے ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں کہ اب چوری پر قدرت ختم ہے یعنی معصیت کے اسباب و دواعی بھی اگر ناپید ہو جائیں تو پھر اس کی پہلے گناہوں سے توبہ صحیح ہے یا نہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کی توبہ صحیح نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ ان کی توبہ بھی صحیح ہے۔ اس لیے کہ توبہ کے سارے ارکان موجود ہیں اور ان میں سے اپنے کیے پر ندامت اس کی قدرت میں ہے۔ حضور انور نے ندامت کی اسی قوت کو اس ارشاد سے واضح کیا ہے جو مسند احمد میں ہے یعنی الندم توبۃ ندامت توبہ ہے جب ندامت اور پشیمانی موجود ہے اور یہی توبہ کے ارکان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا نفس بھی اسے اپنے کیے پر ملامت کر رہا ہے تو توبہ کے صحیح نہ ہونے کے کوئی معنے نہیں۔ شریعت میں نیت صحیح ہونے پر عاجز عن الطاعۃ کو فاعلِ طاعت کے مرتبہ میں رکھا ہے۔ حدیث صحیح ہے۔

بندہ جب بیمار ہو جاتا ہے یا مسافر ہو جاتا ہے تو اس کے لیے زمانہ صحت اور قیام ہی کا عمل لکھا جاتا ہے۔

توبہ کی صحت کا دار و مدار

۳۔ کیا توبہ کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جس گناہ سے توبہ کر رہا ہے وہ پھر کبھی نہ ہو۔ اس میں فیصلہ کن اور صحیح رائے یہی ہے کہ توبہ کی صحت کی یہ شرط نہیں ہے۔ توبہ کی صحت کا دار و مدار اس پر ہے۔ ۱۔ گناہ سے ہٹ جائے، ۲۔ جو کچھ کر چکا اس پر ندامت کا اظہار کرے، ۳۔ آئندہ نہ کرنے کا عزم جازم کرے۔ اگر توبہ کے وقت میں نہ کرنے کا عزم جازم موجود ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسی گناہ سے اس کا دامن آلودہ ہو جاتا ہے تو یہ اس کا گناہ پر نیا اقدام ہے اس کا پہلی توبہ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ معاملہ کی بنیاد اس قانون پر ہے کہ بندہ جب کسی گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور پھر اسی گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے تو کیا توبہ سے پہلا گناہ جس سے توبہ کی تھی پھر واپس آ جاتا ہے۔ اگر مر جائے کیا دونوں کی سزا کا مستحق ہوگا؟ یا پہلا ختم ہو چکا ہے دوسری بار کے گناہ کی سزا ملے گی؟

اس سوال کے جواب میں کہنے والوں نے اگرچہ بہت کچھ کہا ہے مگر اہل السنۃ والجماعۃ اس سوال کا جواب ایک ہی دیتے ہیں کہ جس گناہ سے پہلے توبہ کر چکا ہے واپس نہ ہوگا وہ توبہ سے ختم ہو کر کالعدم ہو چکا ہے اب وہ معدوم موجود نہ ہوگا۔ اب جو کچھ ہے وہ موجودہ گناہ ہے اور اس کو از سر نو کرتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ توبہ کی صحت کے لیے موت تک عصمت شرط نہیں ہے صحت توبہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ندامت ہو اور بالفعل گناہ سے ہٹ جائے اور نہ کرنے کا عزم کرے۔ یہ تین چیزیں گناہ کو ناپید کر دیتی ہیں۔ گناہ کی حیثیت ارتداد کی نہیں ہے جس سے تمام اعمال حیات کالعدم ہو کر رہ جاتے ہیں یہ کفر ہی ہے جو تمام نیکیوں کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ گناہ سابقہ نیکیوں کو رائیگاں نہیں کرتا۔ آخر توبہ ہی تو حسنات میں عظیم تر حسنہ ہے اگر یہ گناہ سے ناپید ہوتی ہے تو دوسری نیکیاں بھی ختم ہو سکتی ہیں، ایسا سوچنا بھی غلط ہے اس سے تو خوارج اور معتزلہ کے مسلک کی بو آتی ہے۔ خوارج تو گناہ سے کافر بتا کر جہنم میں پہنچاتے ہیں اور معتزلہ کافر تو نہیں بتاتے مگر فاسق بتا کر گنہ گار کو ہمیشہ جہنم میں رکھتے ہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں دونوں راہیں غلط ہیں۔ عقل و نقل اور تقاضائے عدل کے خلاف ہیں واللہ لا یظلم مثقال ذرۃ،

قرآن میں اللہ سبحانہ نے توبہ کی قبولیت کو استغفار اور عدم اصرار پر ضرور معلق کیا ہے لیکن پھر نہ کرنے کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ توبہ کا استمرار خود توبہ کے کمال اور اس کے نافع ہونے کی شرط ہے لیکن ماضی کی توبہ کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے مطابق یہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص مختلف حالات میں عداوت الٰہی اور محبت کا گہوارہ ہو نماز پڑھتا ہے مگر روزہ نہیں رکھتا۔ ایک کی جزا اور دوسرے کی سزا ملے گی بلکہ ایک ہی شخص مختلف حالات میں اخلاص و نفاق اور ایمان و کفر کا جامع ہو۔ قرآن میں اہل ایمان کے لیے مقارنت شرک بتایا ہے یا یوں کہہ دیجئے مقارنت شرک کے باوجود اہل ایمان کہا ہے حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

> اگر اس شرک کے ساتھ نبوت کا بھی انکار ہو تو ایسا ایمان قطعاً سود مند نہیں ہے لیکن اگر نبوت کی تصدیق کرتا ہے اور مختلف انواع کے شرکوں کے دھبے دامن کو لگے ہوتے ہیں تو ان کے دھبے ان کو ایمان بالرسل اور ایمان بالیوم الآخر سے نہیں نکالیں گے یہ لوگ بہت بڑی وعید کے مستحق ہیں۔ ان کا شرک دو قسم کا ہے خفی اور جلی، خفی تو معاف ہو جائے گا مگر جلی کو اللہ توبہ کے بغیر معاف نہ کرے گا۔[1]

[1] مدارج السالکین

توبہ کے بعد سابق درجہ

۳۰۔ یہ پہلے سُن چکے ہو کہ توبہ یقین کے مقامات میں سے اولین مقام ہے اور اس سے خواہ کوئی کمال کے کتنے درجات طے کر جاتے بے نیاز نہیں ہے لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ گناہ سے توبہ کے بعد کیا بندہ گناہ سے پہلے مقام پر پہنچ سکتا ہے یا نہیں صوفیا اور عرفا کا اس میں اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ پہنچ جاتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ نہیں، حافظ ابن تیمیہ نے یہاں بڑے پتے کی بات بتائی ہے کہ یہ اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قابلیت کی بات ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو نہیں پہنچتے، کچھ ایسے ہیں جو پہنچ جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پہلے سے زیادہ اونچے مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔

کافر و عاصی کا تقابلی مطالعہ

کافر کا کفر سے توبہ کرنا اور عاصی کا معصیت سے توبہ کرنا دونوں صورت کے اعتبار سے یکساں ہیں مگر وزن کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ کافر کے لیے بھی قرآن نے عفو و کرم کے قانون کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اگر وہ باز آجائیں تو ان کے پچھلے قصور سب معاف کر دیے جائیں گے۔

ایسے ہی قرآن نے گنہ گاروں کی مغفرت کی خبر بھی سنائی:

لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعاً

مایوس نہ ہو اللّٰہ کی رحمت سے اللّٰہ سارے گناہ بخش دے گا۔

ان آیات میں اللّٰہ تعالیٰ نے بتایا کہ معافی کا قانون کیا ہے؟ فرمایا جو لوگ گناہ جذبات سے مغلوب ہو کر یا ماحول سے مجبور ہو کر یا راہ سے بے خبر ہو کر کرتے ہیں لیکن جب عمل کی اس جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں ایسے بندوں کے لیے میری رحمت کا دروازہ ہمہ وقت کھلا ہے۔ گناہ خواہ کیسے ہوں سب معاف ہو جائیں گے۔ ہاں وہ لوگ جو خدا سے بے خوف اور بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جاتے ہیں اور ملک الموت کے سامنے آنے پر معافی مانگتے ہیں ان کی توبہ توبہ نہیں ہے۔ اب امتحان کی مہلت پوری ہو چکی ہے اور کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ چکا ہے اب توبہ کا موقع نہیں ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا۟ ٱلنِّسَآءَ كَرْهًا ۖ وَلَا
تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا۟ بِبَعْضِ مَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ
بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ
فَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدتُّمُ
ٱسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَءَاتَيْتُمْ إِحْدَىٰهُنَّ قِنطَارًا فَلَا
تَأْخُذُوا۟ مِنْهُ شَيْـًٔا ۚ أَتَأْخُذُونَهُۥ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٢٠﴾
وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُۥ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ
مِنكُم مِّيثَٰقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾

اے اہل ایمان! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کو زبردستی اپنی میراث بنالو، اور نہ یہ حلال ہے کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ لینے کی خاطر ان کو تنگ کرو، ہاں اگر وہ علانیہ بدکاری کا ارتکاب کریں[٣٦]، اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے رہو سہو،

پھر اگر تمہیں وہ ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اسی میں تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو[۳۷]۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کرو تو چاہے تم نے اُسے ڈھیروں ڈھیر مال دیا ہو اُس میں سے کچھ واپس نہ لینا، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے[۳۸]۔ آخر تم اسے کیسے لوگے حالانکہ تم دونوں ایک دوسرے سے میاں بیوی کے تعلقات رکھ چکے ہو اور تمہاری بیویاں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں[۳۹]۔

عرب جاہلیّت کے مکروہ رواج کی اصلاح

جیسے اسلام سے پہلے عام طور پر یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ مال و جائداد کی وراثت میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن نے اس گمراہی کا ازالہ کیا اور یہ اصول قائم کیا کہ حقدار ہونے کی حیثیت سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح عرب جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو ناانصافیاں کی جاتی تھیں ان میں سے ایک ناانصافی یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شخص مر جاتا تو جیسے اس کا مال و متاع وارثوں کے قبضے میں چلا جاتا اسی طرح اس کی بیویوں پر بھی وہ قابض و متصرف ہو جاتے،
دوسرے مختلف طریقوں سے عورتوں کو مجبور کیا جاتا کہ اپنا مہر چھوڑ دیں،

تیسرے یہ کہ ان کی یہ سر توڑ کوشش ہوتی تھی کہ جو کچھ مال و متاع عورتوں کے قبضے میں ہے مردوں کے قبضے میں چلا جائے۔

چوتھے یہ کہ بعض اوقات بیوی کا کوئی قصور نہ ہوتا اور وہ شوہر کو پسند نہ ہوتی لیکن وہ اسے طلاق دے کر اس لیے جدا نہ کرتا تاکہ زیور اور مہر جو اسے دے چکا تنگ آکر واپس کر دے۔ قانونِ وراثت بیان کرنے کے بعد حدود سے تعدی کا "قانون" بیان کیا تھا۔ پھر اس قانون کی خاص صورتیں بیان کیں۔ ان میں ایک صورت یہ تھی کہ مرد یا عورت بدکاری کے مرتکب ہو جائیں ان کی سزا بیان کر کے بتایا کہ اگر مرد توبہ کر لیں تو پھر کچھ نہ کہو، اس کے بعد توبہ کی قبولیت کی شرطیں بتائی ہیں اب عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔

۲۶ ۔ اے اہلِ ایمان تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کو زبردستی اپنی میراث بنا لو اور نہ یہ حلال ہے کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ لینے کی خاطر ان کو تنگ کرو، ہاں اگر وہ علانیہ بدکاری کا ارتکاب کریں۔ حسب بیان سابق عورتوں کی بد افعالی کی بابت تادیب و سیاست کا حکم دے کر اب اہلِ جاہلیت کی اس ظلم و تعدی کو روکا جاتا ہے جو وہ عورتوں پر طرح طرح سے کرتے تھے۔ من جملہ ان صورتوں کے ایک صورت یہ تھی کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی عورت کو میت کا سوتیلا بیٹا یا بھائی یا اور کوئی وارث لے لیتا۔ پھر چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا یا بغیر نکاح ہی اپنے گھر میں رکھتا یا کسی سے نکاح کر کے اس کا مہر کل یا بعض لے لیتا یا ساری عمر اس کو اپنی قید میں رکھتا اور اس کے مال کا وارث ہوتا یہ آیت اس کے بارے میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مر جائے تو اس کی عورت اپنے نکاح کی مختار ہے میت کے بھائی اور اس کے کسی وارث کو یہ اختیار نہیں ہے کہ زبردستی اپنے نکاح میں لے لے نہ وہ عورت کو نکاح سے روک سکتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر خاوند کے ورثہ سے جو اس کو ملا تھا کچھ پھیر دے۔ ہاں اگر صریح بدچلنی کریں تو ان کو روکنا چاہیے[1]

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم عورت کو میت کا ترکہ سمجھ کر اس کے وارث بن جاؤ اور زبردستی اس سے نکاح کر لو یا کسی دوسرے سے نکاح کرا دو اور اس کا مہر خود کھا جاؤ یا ان کو نکاح سے روکے رکھو تاکہ جب وہ مر جائیں تو ان کے مال کے وارث بن جاؤ[2]

اس آیت میں کرھاً بمعنے جبر کی قید بطور شرط نہیں ہے یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] معارف م ا۔

کی رضامندی سے ان کا مالک بن جانا درست ہے بلکہ یہاں واقعہ کے لیے ضروری ہے کہ عورتوں کی جان و مال کا بلا وجہ شرعی و عقلی مالک بن بیٹھنا ظاہر ہے کہ جبراً ہی ہو سکتا ہے اس پر کوئی ہوش و عقل والی عورت خوش کب ہو سکتی ہے۔ (بحر محیط) اسی بنا پر شریعت نے اس معاملہ میں عورت کی رضامندی کو مؤثر قرار نہیں دیا۔ کوئی عورت اگر حماقت سے کسی کی مملوکہ بننے پر رضامند بھی ہو جائے تو اسلامی قانون اس پر راضی نہیں کہ کوئی آزاد انسان کسی کی ملک ہو۔

یہاں یہ نکتہ بلاغت خاص طور پر توجہ کے لائق ہے کہ ظلم و فساد سے ممانعت کے لیے عام تعبیر اور انداز بیان کو چھوڑ کر عدم تحلیل کی تعبیر اختیار کی ہے یعنی بجائے اس کے کہ یوں کہتے کہ ظلم نہ کرو۔ یوں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے لیے یہ ظلم حلال نہیں ہے اس میں اس کے شدید اور سنگین گناہ ہونے کے ساتھ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی نے کسی بالغ لڑکی سے بغیر اس کی رضا اور رغبت کے شادی کر بھی لی تو شرعاً وہ حلال نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر تصور ہوگا۔ ایسے رشتہ سے نہ ان میں ازدواجی تعلق قائم ہوگا اور نہ ہی وراثت و نسب کے علائق ہوں گے۔

ٹھیک اسی طرح اگر کسی نے کسی عورت کو مجبور کر کے اس سے دیا ہوا مہر واپس لے لیا یا واجب الاداء مہر کو جبراً معاف کرا لیا تو یہ جبری واپسی یا معافی شرعاً ناقابل اعتبار ہے۔[1]

زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھو کہ اس آیت میں جاہلیت عرب کی اس ناپاک اور قبیح رسم کی اصلاح کی ہے کہ ان کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ مورث کی جائداد اور اس کے مال مویشی کی طرح اس کی بیوی بھی وارث کی طرف وراثت میں منتقل ہو جاتی تھی۔ حد یہ ہے کہ باپ کی منکوحہ بیوی پر بھی بیٹے قبضہ کر لیتے۔ قرآن نے یہاں کھول کر بتا دیا کہ عورت متروکہ جائداد نہیں ہے بلکہ آزاد ہے اس کے ساتھ وراثت کا معاملہ جائز نہیں یہ انسان ہے مال نہیں ہے وہ اپنی مرضی کی مالکہ اور شریعت کی حدود میں آزاد ہے۔

دوسرے فقرے لا تعضلوھن کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ مہر یا میراث پر قبضہ کرنے کی خاطر عورتوں کو تنگ نہ کرو۔ عضل کے معنے تنگ کرنے، زچ کرنے اور روکنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو ناپسند ہو اور چھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آئے تو اس سے اپنا دیا دلایا واپس لینے کے لیے اس کو تنگ نہ کرے۔ یہ جملہ نیا جملہ ہے اس کے ذریعے عورتوں کو تنگ نہ کرو

[1] معارف م شفیع۔

ان کو نقصان پہنچانے کی ممانعت کی گئی اور نقصان پہنچانے کی نوعیت کو بھی کھول کر بتا دیا کہ عورت کو مہر کے نام پر یا دوسرے طریقہ پر جو کچھ بھی دے چکے ہو خواہ وہ کتنا ہو اس تنگ کرنے کے پس منظر میں اس کا واپس لینا مقصد ہو یہاں دو چیزیں ہیں' ایک عورت کو تنگ کرنا اور دوسرے دیے ہوتے سامان کو واپس لینے کے لیے تنگ کرنا۔ اصل منشا تنگ کرنے اور نقصان پہنچانے کی ممانعت ہے اور دی ہوئی چیز واپس لینے کی علت واقعات کے تحت ہے۔ کیونکہ اسی موضوع پر البقرہ میں آیت نمبر ۲۳۱ گزر چکی ہے ۷۰ تمسکوا ھن ضرارا لتعتدوا اس میں تصریح ہے کہ عورت کو نقصان پہنچانا منع ہے اور عورت کی دی ہوئی چیز کے بارے میں آیت ۲۲۹ میں کھول کر بتایا ہے کہ ۷ یحل لکم ان تاخذوا مما اتیتموھن شیئا عورتوں کو دی ہوئی چیز کو واپس لینا تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔

عورتوں کو شوہر کے انتخاب میں اختیار

تنگ کرنے کی یہاں بھی ممانعت ہے اور آیت ۲۳۲ البقرہ میں بھی ممانعت ہے فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف تم اس میں رکاوٹ نہ بنو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ دستور کے مطابق راضی ہوں۔ ان تصریحات کی موجودگی میں آیت قرآنی کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ کسی حال اور کسی وقت بھی تم عورت کو تنگ کرنے، اس کی راہ میں رکاوٹ بننے اور اس کی آزادی کو سلب کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن میں عضل سے منع کیا گیا ہے۔ عضل کے معنے تنگ کرنے اور رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔ اسی سے الداء العضال ناقابل علاج بیماری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شادی کے معاملہ میں عورتوں کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالو۔ خطاب شوہروں کو ہو یا اولیاء کو اور یا پھر سارے مسلمانوں کو اس سے سمجھ میں یہی آرہا ہے کہ قرآن نے چونکہ جوان لڑکی کو نکاح کرنے کی آزادی دی ہے۔ اولیاء کو، شوہروں کو اور عام مسلمانوں کو اس آزادی کے سلب کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اگر بالغہ لڑکی کا یہ حق ہی تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ اپنے ازدواجی معاملہ میں آزاد ہے تو یہ کہنا ہی بے معنے ہے کہ تم ان کی ازدواجی زندگی میں رکاوٹ نہ بنو۔

عورتیں جن کو پاکستان کے ماحول میں ہم مجبور سمجھتے ہیں قرآن نے ان کو اتنا مجبور نہیں کیا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ بالغ لڑکوں کی طرح بالغ لڑکیوں کو بھی اس باب میں بڑی حد تک آزادی ہے۔ نکاح کے باب میں بالغ لڑکیوں کی رضا اور ان کی اجازت ہر حالت میں ضروری ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

شوہر دیدہ عورت کی شادی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کا حکم حاصل نہ کر لیا جائے اور کنواری عورت کا نکاح بھی اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ حاصل کر لی جائے ۔ (صحیح بخاری)

دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ واضح ارشاد ہے :

شوہر دیدہ عورت خود اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حقدار ہے اور کنواری کے نکاح کے وقت اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے ۔ (صحیح مسلم)

تیسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں ارشاد ہے :

وہ عورت جو شوہر دیکھ چکی ہو بذاتِ خود ولی سے زیادہ حقدار ہے اور کنواری سے اس کا باپ اجازت حاصل کرلے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے ۔ (مسلم)

ان ارشادات میں جو لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے اور جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر ذرا سنجیدگی سے غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورتوں کو شادی کے باب میں مختار بنایا گیا ہے اور یہی لا تعضلوھن کا منشا ہے یہ صرف نظریہ نہیں آیئے ذرا سے واقعات کی روشنی میں بھی پڑھ لیجئے ۔ حضرت خنساکے والد نے کسی شخص سے ان کی شادی کردی ۔ حضرت خنسا کو یہ رشتہ پسند نہ آیا ۔ دربارِ نبوت میں حاضر ہوئیں ، اور درخواست کی ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خنسا کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو رد فرما دیا ۔ بخاری باب اذا زوج ابنتہ وھی کارھۃ فنکاحہ مردود ۔

دوسرا واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس بیان فرماتے ہیں کہ ایک جوان لڑکی حضور انور کی خدمت گرامی میں آئی اور بیان کیا کہ میرے باپ نے جس سے میری شادی کی ہے وہ مجھے پسند نہیں ہے ۔ حضور انور نے اس عورت کو اختیار دیا جی چاہے باقی رکھو اور جی چاہے رد کر دو ۔

ابن ماجہ باب من زوج ابنتہ وھی کارھۃ

باپ کو بھی جبر کا اختیار نہیں

ایک واقعہ بریدہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان عورت دربارِ نبوت میں حاضر ہوئی اور بیان کیا کہ میرے والد محترم نے میری شادی میرے چچازاد بھائی سے کردی ، وہ مجھے پسند نہیں ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس نکاح کو باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے ۔ عورت نے یہ سن کر اطمینان کی سانس لی اور بولی کہ

میرے ماں باپ نے جو کچھ کیا اس کی اجازت دے چکی ہوں۔ لیکن اس وقت سوال اور حضور سے جواب حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کو سبق دوں کہ باپ کے ہاتھ میں یہ نہیں ہے کہ بالغ لڑکی کی رضا حاصل کیے بغیر شادی کردے الفاظ یہ ہیں،

اردت ان تعلم النساء ان لیس الی الاباء من الامر شیئ

میں چاہتی ہوں کہ عورتوں کو پتہ لگ جائے کہ ان کے باپ دادا کے ہاتھ میں ان کی شادی کے معاملہ میں کچھ نہیں ہے۔

ان ارشادات و واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ بالغ عورت کو شادی کے معاملہ میں تنگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ شوہر کے انتخاب میں اسے پورا اختیار حاصل ہے۔

اختلاف کے وقت عورت قابل ترجیح

یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ اگر عورت کی رائے اور ولی کی رائے میں ٹکراؤ ہو جائے تو ایسے مواقع پر کیا فیصلہ کیا جائے۔ اس سوال کے جواب میں دو حرفی بات یہ ہے کہ عورت کی مرضی مقدم ہوگی اور اسی کی رائے کو شرعاً ترجیح ہوگی کیونکہ شادی عورت کی ہو رہی ہے عفت و عصمت کا تعلق عورت سے ہے۔ ولی کی نہ شادی ہو رہی ہے اور نہ اس کے نباہنے کی ذمہ داری اس پر ہے۔ زمانہ نبوت کے فیصلے اور واقعات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی رضا کو ترجیح دی۔ باپ کا کیا ہوا نکاح بھی رد فرما دیا مگر عورت کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں فرمایا۔ پھر قرآن نے عورت کو اپنا معاملہ نمٹانے کی پوری آزادی دی ہے۔ عورت انسان ہے عقل و فہم کی مالک ہے وہ کوئی عضو معطل نہیں کہ بغیر ولی کی اجازت کے کوئی کام نہ کر سکے۔

ولی کو حق مشورہ اور اس کا لحاظ

نابالغہ لڑکی کا نکاح البتہ اس کی اجازت کے بغیر ولی کر سکتا ہے اس کے معاملہ میں باپ کو بھی اختیار ہے اور دوسرے اولیاء کو بھی، مگر باپ کا اختیار اتنا مضبوط ہے کہ بلوغ کے بعد لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا خود اپنا بیان ہے کہ میری شادی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ہوئی جب میری عمر چھ سال کی تھی۔ (ابن ماجہ)

دراصل نکاح کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے جو کچھ کیا جائے خوب سوچ سمجھ کر کیا جائے۔

ولی بھی اپنی حدتک اطمینانی شکل پیدا کرلیں اور جس کی شادی ہو رہی ہے وہ بھی سکون قلب پالیں۔ اس لیے نکاح میں حتی الوسع عورت اور ولی دونوں کی موافقت ضروری ہے تاکہ کام خوش اسلوبی سے انجام پا سکے۔ اس موضوع پر سید انور شاہ کشمیری کی رائے بے حد قیمتی ہے لیجئے آپ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں،

ایسے معاملات میں جن کا تعلق جماعت سے ہے شریعت نے طرفین کی رعایت ملحوظ رکھی ہے اور ایسے موضوع پر مجموعہ احادیث کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، صرف ایک جانب کو سامنے رکھ کر جو فیصلہ بھی ہوگا اس سے مراد قانون تک پہنچنا مشکل ہے مثلاً زکوٰۃ کا معاملہ ہے اس معاملہ کا زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ وصول کنندہ دونوں سے تعلق ہے۔ زکوٰۃ دینے والے کے متعلق آیا ہے کہ اگر اس کے پاس زکوٰۃ وصول کنندہ ہے تو وہ اسے خوش کرے جو مانگے دے اور دوسری طرف زکوٰۃ وصول کنندہ کو ہدایت ہے کہ خبردار لوگوں کا بہترین مال زکوٰۃ میں نہ لینا۔ مظلوم کی دعا سے ڈرو، اس کے اور خدا کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔ خود میاں بیوی کے مسئلہ پر غور کیجئے۔ ایک طرف بیوی کو حکم ہے کہ شوہر کو خوش رکھو مگر دوسری طرف شوہر کو بتایا جا رہا ہے کہ تم میں کمال ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور اپنی بیوی کے لیے بہترین ہو۔

ٹھیک اسی طرح عورت اور اس کے ولی کا معاملہ ہے۔ عورت کو کہا جا رہا ہے کہ تمہارے نکاح میں ولی کا حق ہے اور اس قدر حق ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے نکاح باطل ہے اور ولی سے کہا جا رہا ہے کہ عورت اپنے حق کی تم سے زیادہ حقدار ہے گویا ولی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس موضوع سے متعلق تمام ارشادات اگر پیش نظر ہوں تو فیصلہ یہی ہوگا کہ دونوں پر ذمہ داری ہے کہ ایک دوسرے کی بات کا پاس رکھیں۔ عورت کو ولی کی بات کا اور ولی کو عورت کی رضا کا۔ نہ ولی اس حد تک زیادتی کرے کہ عورت اپنے جائز حق سے محروم ہو جائے اور نہ عورت اتنی بے راہ روش اختیار کرے کہ ولی اور خاندان کے لیے باعث ننگ و عار ہو جائے۔

خاندان کی حد تک بالغہ عورت پر ولی کو جبر کا بالکل اختیار نہیں ہے۔ ولی اور عورت کی رائے میں جب اختلاف ہو تو بالغہ عورت کی رائے کو ترجیح ہوگی جس کی قرآن و حدیث سے تائید ہے۔[1]

حضرت مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کی یہ رائے صرف اسی ایک مسئلہ میں نہیں بلکہ ہر اجتماعی مسئلہ میں قابل عمل اور لائق ترجیح ہے۔ انہوں نے جو بات فرمائی ہے وہ منشاء شریعت کو تمام کر رہی ہے۔

---

[1] فیض الباری

حضرت حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ نے اس کی جو لطیف ترجمہ بیان کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اگرچہ انداز بیان مختلف ہے اور یہ بے غبار حقیقت ہے کہ سید انور شاہ کا انداز سب سے اچھا اور عمدہ ہے فرماتے ہیں:

نکاح میں تنہا عورت کی رائے جائز نہیں ہے کیونکہ ان کا غور و فکر نسبتہً زیادہ ہمت نہیں رکھتا۔ پھر مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ہے۔ ارباب حل و عقد مرد ہی ہیں پھر معاملہ ایسا ہے کہ عورت انجام دے تو بے حیائی سے تعبیر ہو اور اشتیاق و نکاح میں تمیز قائم رکھنے کی خاطر اولیاً کا ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی شہرت ہو سکے۔ اس لیے عورت کو ولی کی رائے لینی چاہیے مگر ولی کو یہ بھی اختیار نہیں ہے کہ صرف اپنی رائے سے عورت کی شادی کر دے کیونکہ معاملہ عورت کا ہے اور اپنا معاملہ جو خود عورت سمجھتی ہے مرد نہیں سمجھ سکتا ہے۔ نفع و نقصان عورت کو پہنچنے والا ہے اس لیے حکم اس سے لینا ضروری ہے۔[1]

امام نووی شافعی المذہب ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ لڑکی کی رائے کو ولی کی رائے پر ترجیح ہو گی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

عورت کا حق ولی کے حق سے زیادہ موکد ہے اگر ولی کسی کفو سے اس کی شادی کرنا چاہے اور لڑکی آمادہ نہ ہو تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر خود عورت کسی کفو سے شادی کرنے کا ارادہ کرے اور اس کا ولی راضی نہ ہو تو ولی کو مجبور کیا جائے گا۔ اگر ولی اصرار کرے گا تو عدالت اس کی شادی کر دے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا حق موکد اور راجح ہے۔[2]

بہرحال عورت بالغہ کو تنگ نہیں کیا جا سکتا اور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

عورتوں کو تنگ کرنے کا جواز

یہاں ایک استثناء بھی ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فاحشہ سے مراد عبداللہ ابن عباس، قتادہ اور الضحاک کی رائے میں شوہر کی نافرمانی اور کج خلقی ہے۔ اور یہی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ [2] شرح مسلم نووی

عبداللہ ابن عباس کا خیال ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں عورتوں کو کسی حال میں اور کسی وقت تنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن ہاں اگر وہ تمہاری طاعت نہ کریں اور نا دب وغیرہ سے بھی درست نہ ہوں تو پھر تمہیں اس کی اجازت ہے کہ تم ان کو تنگ کرو اور تنگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ اگر تم اسے اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہو تو اس وقت تک نہ کرو جب تک وہ تمہارا دیا ہوا مال واپس نہ کرے یا واجب الادا مہر کو معاف نہ کرے۔ لیکن فاحشہ کے ہونے کے لیے صرف گمان اور شبہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ واضح اور صاف ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی بات اس سے صادر نہیں ہوئی تو وہ بدستور اپنی وفاداری اور پاک دامنی پر قائم ہے تو صرف دیا ہوا سرمایہ واپس لینے کی خاطر اسے تنگ کرنا جائز نہیں اور یہ عقل انصاف اور شرافت کے بالکل منافی ہے، قابل نفرت چیز صرف اخلاقی فساد ہے خواہ یہ زنا کی صورت میں ہو جیسا کہ امام حسن کی رائے ہے اور چاہے شوہر کی نافرمانی، بدزبانی اور مشتبہ چال چلن کی صورت میں ہو۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ پنجم کے آغاز ہی میں آرہی ہے یعنی اگر فاحشہ سے شوہر کی نافرمانی مراد ہے تو تنگ کرنے کا پیمانہ قرآن نے خود جو بتایا ہے وہ پانچویں پارے میں آرہا ہے اور اگر زنا مراد ہے تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس کی سزا قاضی کا فرض ہے۔

عورتوں سے حُسنِ معاشرت

۲۷۔ اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو سہو۔ پھر اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اسی میں تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور سلوک سے معاملہ رکھو۔ جاہلیت میں جیسا ذلت اور سختی کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اس کو چھوڑ دو۔ پھر اگر تم کو کسی عورت کی کوئی خو اور عادت خوش نہ لگے تو صبر کرو شاید اس میں کوئی خوبی بھی ہو اور ممکن ہے کہ تم کو ناپسندیدہ ہو کوئی چیز اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے کوئی بڑی منفعت دینی یا دنیوی رکھ دے لہٰذا تمہیں تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے اور بدخو کے ساتھ بدخوئی نہ کرنی چاہیے [1]

اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ عورتوں کے ساتھ معاشرت اور رہن سہن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بہترین ہونا چاہیے، دوسری یہ کہ مردوں کو اگر ان کی بیویاں ناپسند ہوں اور طبیعت کے تقاضے کے خلاف معلوم ہوں تو ایسے وقت میں جذبات کی جگہ عقل سے کام لینا چاہیے اور ناگواری کو برداشت کرنا چاہیے کیونکہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ انسان کو اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں کوئی منفعت پوشیدہ ہو جو اس کے لیے دین و دنیا دونوں میں موجب خیر و برکت ہو اور سب سے اہم حکیمانہ نکتہ وہ ہے جس کی طرف اس ارشادِ نبوی میں اشارہ ہے:

کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت کو اس لیے مبغوض نہ رکھے کہ اس کی کوئی عادت ناگوارِ خاطر ہے کیونکہ اگر عادت ناپسند ہے اس کی تو کوئی دوسری عادت پسندیدہ ہو گی۔ (مسلم باب الوصیۃ بالنساء)

اور یہ واقعہ ہے کہ بُرے پہلوؤں کے ساتھ بھلائی کے پہلو بھی عموماً عورتوں میں پائے جاتے ہیں لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ برائیوں کی تلافی بھلائی کے پہلو سے کرتا ہے۔ زندگی میں یہ کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں کہ میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں شیطان کو ورغلانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے۔ پھر اس وقت اور بھی جبکہ عورتیں نازک طبع تند خو اور تلون مزاج ہوتی ہیں اس لیے قرآن نے ان حقائق و واقعات سے چشم پوشی نہیں کی۔ عورتوں کی فطری کمزوری کو پیشِ نظر رکھ کر مردوں کو اس سلسلے میں مفید ہدایتیں دی ہیں تاکہ مرد و عورت کی باہمی زندگی میں ناخوشگواری نہ آنے پاتے اور اگر عورتوں کے کسی قول و فعل سے کوئی اذیت پہنچے تو حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کریں اور صبر و تحمل سے کام لیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر عورت خوبصورت نہ ہو یا اس میں کوئی ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے حتی الامکان اسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں کچھ دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسنِ صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اگر اسے اپنی خوبیوں کے اظہار کا موقعہ ملے تو وہی شوہر جو ابتدا میں محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا اس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی کچھ باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقعہ دے تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی برائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے لہٰذا یہ بات مناسب نہیں ہے کہ

ازدواجی زندگی کا رشتہ منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے یلے عورت میں کمزوریاں ہی نہیں بہت سی خوبیاں بھی ہیں جو مرد کو بہت بھاتی ہیں اور جن سے مرد کو قلبی سکون و اطمینان میسر ہوتا ہے اس لیے عورت کی ایک پہلو کی کمزوری کو سامنے ہی نہ رکھنا چاہیے۔

تجربات کی دنیا میں اسے ماننا پڑے گا کہ عورت عموماً جفاکش قناعت پسند، شوہر پر جان چھڑکنے والی، بچوں کی پرورش پر نثار، گھریلو معاملات کی بہترین منتظم اور اخلاص و وفا کی پیکر ہوتی ہے کہا جاسکتا ہے کہ عورت میں کمزوری سے زیادہ خیر اور بھلائی کے پہلو ہیں۔

عورت کی محنت و جفاکشی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب گردش زمانہ کی وجہ سے مصائب کا ہجوم ہوتا ہے اور اس کا شوہر کسی وجہ سے مصیبت و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ جدید تحقیق نے بھی اسے ثابت کر دیا ہے۔ علامہ لومبروز لکھتے ہیں:

> حمل اور وضع کی شدید تکلیف پر غور کرو اور دیکھو عورت دنیا میں کیسے کیسے آلام اور مصائب کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو ان تمام تکلیفوں کی کیونکر متحمل ہو سکتی درحقیقت نوع انسانی کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بنی نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی یلے

بیوی کو دے کر کچھ واپس نہ لو

۲۰ ۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر و تو چاہے تم نے اسے ڈھیروں ڈھیر مال دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لو کیا تم بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے۔ اسلام سے پہلے یہ بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی چاہتا کہ پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کرے تو پہلی عورت پر تہمت لگاتا اور مختلف طریقوں سے اس پر زیادتی اور سختی کرتا کہ مجبور ہو کر مہر واپس کر دے اور نکاح جدید میں کام آئے یہ آیت اس کی ممانعت میں نازل ہوئی کہ جب پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری کرو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اب اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان باندھ کر اور صریح ظلم کر کے پہلی بیوی سے وہ مال لینا چاہتے ہو یہ ہرگز جائز نہیں یلے

لہ تفہیم القرآن ۲ہ مسلمان عورت ۳ہ افادات شیخ الاسلام

چونکہ پہلی آیت میں یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ اگر عورت نافرمان اور بدخو ہو تو اس سے مہر واپس لے کر یا مہر معاف کرا کے طلاق دینا جائز ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اگر عورت نافرمان اور بدخلق نہ ہو اور شوہر کسی ضرورت سے موجودہ بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو شوہر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنا دیا ہوا مال بیوی سے واپس لے یا واجب الادا مہر کو واپس کرائے کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں ہے خواہ یہ رقم کتنی خطیر کیوں نہ ہو۔ قرآن نے اسی مال کی واپسی کو بہتان اور اثم مبین قرار دیا ہے۔ بہتان اس لیے کہ جب تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ دیا ہوا مال صرف اس وقت واپس لیا جاسکتا ہے جب عورت فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کرے تو یہ جاننے کے باوجود تمہارا عورت سے مال واپس لینا اس بات کا اعلان ہے کہ تمہاری بیوی نے فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چاہے تم یہ بات زبان سے نہ کہو مگر تمہارا کردار یہی کہہ رہا ہے اور اس طرح تم اپنے کردار سے اس پر بہتان لگا رہے ہو[1]۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے حالات کے تقاضوں سے اس فیصلہ پر پہنچ ہی گیا ہے کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کرے تو وہ یہ کسی حال میں نہ کرے کہ جو کچھ اس نے پہلی بیوی کو دیا ہے اس کو واپس لینے کی کوشش کرے یہاں تک کہ اگر اس کو ڈھیروں ڈھیر سونا بھی دیا ہے پھر بھی اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے واپس لینے کی کوشش کرے۔

قنطار کے متعلق ہم تیسری جلد میں بحث کر چکے ہیں۔ استعمال میں اس سے مراد مال کثیر ہوتا ہے جیسے ہم منوں مال، ڈھیروں مال بولتے ہیں۔ عربی میں اسی مفہوم کو قنطار سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ آیت کا منطوق تو یہ ہے کہ اگر تم ڈھیروں مال دے چکے ہو پھر بھی اس کی واپسی کا مطالبہ درست نہیں ہے اگر یہاں مال سے مراد مہر ہے تو اس سے مہر کی زیادتی کے لیے پروانہ مترشح ہوتا ہے حالانکہ ارشاد نبوت میں مہر کی زیادتی کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ آیت دلیل ہے مہر میں زیادتی کے لیے جواز کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آیت قرآنی مہر کے بارے میں نص نہیں ہے عورت کو شوہر کی جانب سے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف مہر ہی نہیں ہے مہر کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ ہدایا، تحف، سوغات اور عطایا سب ہی کچھ خوشگوار تعلقات میں دیے جاتے ہیں اور پھر یہاں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور مبالغہ تمثیل کے درجے میں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بناء مساجد کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ جس نے اللہ کی خاطر مسجد بنائی

[1] معارف م شش ملخصاً

خواہ چیل کے آشیانے جیسی ہو اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا ظاہر ہے کہ یہ تمثیل میں تشبیہ ہے تشبیہ و تمثیل سے احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں ۔

کچھ لوگوں نے اپنے اس فکر کو درست بنانے کے لیے اس واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک بار مسجد میں سر منبر مہر کی زیادتی سے روکا لیکن ایک ضعیفہ کے کہنے پر اس کا جواز تسلیم کر لیا بحضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا جواز کر مان لینا اس لیے تھا کہ مخاطب اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں۔ اس سے مہر کی زیادتی کا مکروہ نہ ہونا معلوم ثابت نہیں ہوتا اور نہ حضرت عمر پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے [1]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت عمر کی جانب سے کسر نفسی اور تواضع کا اظہار تھا اور تواضع سے مقصود معاشرے میں قرآن فہمی کی صلاحیت کی حوصلہ افزائی تھی۔ آپ حضرت کے جواب کو پڑھیں تو آپ بھی ایسا ہی سمجھیں گے۔ مسروق کی روایت جسے حافظ ابو یعلیٰ موصلی اور سعید بن منصور نے امام شعبی کے حوالہ سے پیش کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں اللھم عفوا کل الناس افقہ من عمر۔ ورنہ مہروں میں زیادتی کی کراہت کے لیے جو موقف فاروق اعظم نے اختیار کیا تھا وہ اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ مسند امام احمد میں ابوالعجفاء السلمی کے حوالہ سے جو روایت آتی ہے اس میں صاف طور پر ہے کہ :

> عورتوں کے مہر میں گرانی نہ کرو، مہر کی زیادتی اگر دنیا میں بڑائی کی اور اللہ کے یہاں تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ حقدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ آپ نے اپنی بیٹیوں میں سے کسی بیٹی کا اور اپنی بیویوں سے کسی بیوی کا نکاح میں بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں باندھا [2]

بعض روایات میں ساڑھے بارہ اوقیہ آتا ہے ایک اوقیہ چالیس درہم کا بارہ اوقیہ چار سو اسی درہم اور ساڑھے بارہ اقیہ پانچ سو درہم ہوئے۔ یہ روایت مسند احمد کے ساتھ سنن اربعہ میں موجود ہے۔

اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو امت کو ہدایات ملی ہیں ان میں یہی تلقین ہے۔ ایک ارشاد ہے کہ بہترین بیوی وہ ہے جس کا مہر معمولی ہو۔ ایک اور ارشاد ہے عورت کی برکت یہ ہے کہ معاملہ آسان ہو اور مہر تھوڑا ہو۔ ایک اور حدیث ہے سب سے عظیم برکت والی

---

[1] بیان القرآن [2] ابن کثیر

وہ بیوی ہے جس کا مہر معمولی ہو۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ معاشرے میں مہروں کی زیادتی شادی کی قانونی وسعتوں پر پابندی عائد کرتی ہے اور شادی پر پابندی شہری زندگی بدکاری اور بدچلنی کو رواج دے رہی ہے۔

نکاح زوجین کے درمیان پختہ عہد ہے

۲۹ ۔ آخر تم لے کیسے لوگے حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے میاں بیوی کے تعلقات رکھ چکے ہو اور تمہاری بیویاں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں ۔ یعنی جب مرد اور عورت نکاح کے بعد مل چکے اور صحبت کی نوبت آچکی تو اس کے معاوضہ میں تمام مہر دینا مرد پر واجب ہو چکا تو اب کس وجہ سے مرد اس مہر کو واپس لے سکتا ہے اور درصورت مہر ادا نہ کرنے کے کیسے اس کے مہر کو دبا سکتا ہے اب تو بجز اس کے کہ عورت ہی اپنی خوشی سے معاف کر بیٹھے کوئی صورت رستگاری کی نہیں ہو سکتی اور وہ عورتیں تو بہت مضبوط اور گاڑھا اقرار تم سے لے چکی ہیں جس کی وجہ سے وہ تمہارے قبضہ و قدرت میں آچکی ہیں اور تم ان سے پورے فائدے اٹھا چکے۔ ورنہ تمہیں ان پر تصرف کا کیا اختیار تھا اب اس قدر تکمیل اور قبضہ کامل اور تصرف تام کے بعد عورتوں کے مہر کو واپس لینا یا ان کا مہر نہ دینا کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جیسے مجامعت کے بعد پورا مہر شوہر کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے ایسا ہی اگر مجامعت کی تو نوبت نہ آئے مگر خلوت صحیحہ ہو گئی پھر بھی پورا مہر واجب الادا ہوگا۔ ہاں اگر خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہ آئے اور شوہر نے طلاق دے دی تو پھر نصف مہر ادا کرنا ہوگا [1]

اصل ارشاد وقد افضی بعضکم الی بعض آیا ہے اس کے معنے کسی کے پاس پہنچا اور اس کے ساتھ تنہائی میں ہونا ہے۔ اسی طرح افضی الی فلان بسرہ کے معنے ہیں اس نے فلانے کے آگے اپنے سارے بھید بے نقاب کر دیے۔ یہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی نہایت جامع اور اور شائستہ تعبیر ہے دونوں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن اور احساسات و جذبات کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایک دوسرے سے مخفی نہیں رہتا۔ اسی لیے دو مرد ایک کپڑے میں سوئیں　　یا دو عورتیں ایک کپڑے میں سوئیں اس کو بھی زبان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نبوت نے افضاء سے تعبیر کیا ہے۔

لا یفضی الرجل الی الرجل ولا تفضی المرأۃ الی المرأۃ فی ثوب واحد

کوئی مرد دوسرے مرد کے ساتھ اور کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ لیٹے۔

میاں بیوی کے تنہائی کے تعلقات کے لیے بھی زبان نبوت نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

لوگوں میں اللہ کے نزدیک بدترین وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے پاس جاتے اور اس کی بیوی اس سے ملے پھر مرد اس بات کو نشر کرے[1]

اصل الفاظ یفضی الی امرأتہ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ افضاء کے اصل معنے فضا میں ہونے یعنی تنہائی اور خالی جگہ میں ہونے کے ہیں۔ اس لیے امام ابوحنیفہ نے صرف خلوت ہو جانے سے پورا مہر واجب کر دیا خواہ مجامعت ہو یا نہ ہو۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ ابن المنذر کہتے ہیں کہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوہریرہ کا یہی فیصلہ ہے۔ زرارہ بن اوفی سے ابوعبید نے نقل کیا ہے کہ خلفاء راشدین نے خلوت ہونے پر پورے مہر اور عدت کے واجب ہونے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

اس جملہ میں یہ واضح کیا ہے کہ اگر دیا ہوا مال مہر ہے تو عورت اس کی مستحق اور مالک ہو چکی ہے کیونکہ وہ اپنے کو شوہر کے حوالہ کر چکی ہے لہٰذا اب مہر کی واپسی کے کوئی معنے نہیں ہیں اور اگر دیا ہوا مال تحفہ ہدیہ کا ہے تو بھی اس کی واپسی ممکن نہیں ہے کیونکہ میاں بیوی جو آپس میں ایک دوسرے کو ہبہ کریں اس کی واپسی شرعاً ناجائز ہے۔ غرض ازدواجی تعلق ہبہ کی واپسی میں مانع ہے[2]

نکاح میثاق غلیظ ہے

آخر میں فرمایا اخذن منکم میثاقاً غلیظاً ان عورتوں نے تم سے مضبوط عہد لیا ہے ظاہر ہے کہ میثاق غلیظ سے مراد یہاں عقد نکاح ہی ہے اس کے سوا کسی اور میثاق کا نہ یہاں کوئی قرینہ ہے نہ اس کی کوئی تاریخی شہادت، پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقد نکاح کی ذمہ داری کو یہاں میثاق غلیظ سے کیوں تعبیر فرمایا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ عقد نکاح کی اصل عرفی اور شرعی

---

[1] مسلم [2] معارف م ش

حقیقت یہی ہے کہ وہ گواہوں کی موجودگی میں میاں بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا مضبوط عہد ہوتا ہے جس کے ذریعے سے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حقوق بھی حاصل کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں۔ بظاہر تو اس میثاق کے الفاظ نہایت سادہ اور مختصر ہیں لیکن اس کے مضمرات اور تضمنات بہت ہیں اور یہ مضمرات و تضمنات ہر مہذب سوسائٹی اور ہر شریعت میں معلوم و معروف ہیں۔ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ میثاق بندھتا تو ہے میاں اور بیوی کے درمیان لیکن اس میں گرہ اللہ سبحانہٗ کے حکم سے لگتی ہے اور جس طرح مخلوق اس کی گواہ ہوتی ہے خالق بھی اس کا گواہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے میثاق غلیظ ہونے میں کیا شبہ رہا۔ یہاں اس رشتہ کو اس لفظ سے تعبیر فرما کر قرآن نے اس کی اصلی عظمت ظاہر کر دی ہے کہ مرد کو کسی حال میں بھی یہ بھولنا نہ چاہیے کہ بیوی کے ساتھ اس کا تعلق کچے دھاگے سے نہیں بندھا ہے بلکہ یہ رشتہ نہایت محکم رشتہ ہے اور اس کے تحت جس طرح مرد کے حقوق ہیں اسی طرح بیوی کے بھی حقوق ہیں جن سے مرد کے لیے فرار کی گنجائش نہیں ہے اگر وہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی فتوت کو بھی رسوا کرے گا اور اپنے خدا کو بھی ناراض کرے گا[1]

---

[1] تدبر قرآن۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ
اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ
الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ
اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ
نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ
وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن کو تمہارے باپ نکاح
میں لا چکے ہوں ہاں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، بلاشبہ یہ
بڑی بے حیائی کی بات، مکروہ شیوہ اور برا دستور تھا، تم پر ان

عورتوں سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں[۴۱]، تمہاری دودھ پلانے والی مائیں، تمہاری دودھ شریک بہنیں[۴۲]، تمہاری خوشدامنیں، تمہاری بیویوں کی وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں پرورش پاتی ہیں بشرطیکہ ان بیویوں سے عقدِ نکاح کے بعد زناشوئی کا تعلق بھی ہو چکا ہو، اگر ایسا نہیں تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور تمہاری حقیقی بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کو جمع کرنا[۴۳]، ہاں جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، اللہ بخشنے والا رحمکار ہے۔[۴۴]

ازدواجی تعلقات پر پابندی

ازدواجی تعلق کیا ہے؟ کیا وہ معاشی اغراض کے لیے تعاون کی ایک بہترین شکل ہے؟ کیا وہ صنفی میلانات اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا نام ہے کیا وہ جسمانی تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے

وقت کی ضرورت ہے اکیا وہ ایسا رشتہ ہے جس کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے ۔

قرآن بتلاتا ہے کہ نکاح اجتماع کے واجبات میں سے ہے ، انفرادی زندگی کی شورشوں کے لیے سراپا تسکین وسکینت اور مردوں اور عورتوں کے لیے مودت ورحمت کا ذریعہ ہے ۔ قرآن نے نکاح کو میاں اور بیوی کے مابین میثاق کہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ عقد نکاح کی اصل عرفی اور شرعی حقیقت یہی ہے کہ وہ میاں اور بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا معاہدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر مودت ورحمت کا تعلق پیدا کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں ، مودت و رحمت ازدواجی زندگی کا خاصہ ہے ۔ مودت چاہتی ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کا احساس ہو اور رحمت چاہتی ہے رحم و شفقت کی فراوانی ہو یہ دونوں خاصے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہیں ۔ نفس انسانی کی تہذیب کی تکمیل کے لیے ضرورت تھی کہ مودت ہو اور ضرورت تھی کہ جو کچھ ہو اس میں حسن وخوبی ہو ۔ یہی ضرورت بجائے خود ازدواجی زندگی کی ایک علت ہو گئی ۔

اسی بنا پر ازدواجی تعلقات کو ان عورتوں تک محدود کر دیا جن میں زوجیت کے ذریعے مودت و رحمت کا بھرپور ظہور ہو اور جن عورتوں سے قرابت کی بنا پر پہلے ہی مودت ورحمت موجود رہے ۔ ان سے شادی پر قرآن نے پابندی لگادی ہے ۔ ساری محرمات اسی قبیل سے ہیں ۔ قرآن نہیں چاہتا کہ قرابت اور زوجیت کی محبتوں میں اختلاط ہو خواہ یہ قرابت ولادت کے ذریعے ہو یا رضاعت کے اور یا پھر سسرالی رشتہ کی راہ سے حافظ ابن القیم نے مفتاح دارالسعادۃ میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ انسانی عقل اور فطرت یہ ہرگز گوارا نہیں کرتی کہ ماں ، بیٹی ، بہن ، پھوپھی ، خالہ سے جنسی تعلق پیدا کیا جائے ۔ اس طرح انسانی زندگی حیوانی زندگی سے ممتاز ہوتی ہے ۔ یہی قانون فطرت ہے جس نے مرد و عورت میں فعل وانفعال اور جذب وانجذاب کے کچھ ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیے کہ ہر جنس دوسری جنس سے ملنے کی قدرتی طلب رکھتی ہے اور دونوں کے ملنے سے ازدواجی زندگی کی ایک کامل معیشت وجود میں آتی ہے ۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ اس لیے ہے تاکہ محبت وسکون ہو اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت اور اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں گوارا ہو جائیں ۔ پھر اسی ازدواجی زندگی سے توالد وتناسل کا سلسلہ قائم ہوتا ہے کہ ہر وجود پیدا ہوتا ہے اور ہر وجود پیدا کرتا ہے ۔ ایک طرف وہ نسب کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے پچھلوں سے جوڑتا ہے دوسری طرف صہر یعنی دامادی رشتہ رکھتا ہے جو اسے آگے آنے والوں سے مربوط کرتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک شخص کی یگانگت

وسیع دائرے کی کثرت میں پھیل جاتی ہے اور اس طرح خاندان وجود میں آجاتا ہے۔ اگر محرمات سے ازدواجی رشتہ کی اجازت دی جاتی تو یہ وسعتیں سمٹ کر رہ جاتیں اور انسانی، نوعی اور اجتماعی اقدار کی نشو و نما نہ ہوتی۔

باپ کی منکوحہ سے نکاح

۴۰۔ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن کو تمہارے باپ نکاح میں لا چکے ہیں، ہاں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، بلاشبہ یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے مکروہ شیوہ اور بُرا دستور ہے۔ جاہلیت والے اپنی سوتیلی ماں اور بعض دیگر محرمات سے بھی نکاح کر لیتے تھے، جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اس کی ممانعت کی جاتی ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرو یہ بے حیائی اللہ کے غضب اور نفرت کی بات ہے اور بہت بُرا طریقہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی سمجھدار لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے اور اس نکاح کو نکاح مقت اور اس نکاح سے جو اولاد ہوتی اس کو مقتی کہتے تھے۔ ایسے نکاح جو ہو چکے ہیں ہو چکے آئندہ ہرگز ایسا نہ ہو[1] اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جرم ہے اور قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ ابو داؤد، نسائی اور مسند احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو موت کی اور ضبطی جائداد کی سزا دی ہے اور ابن ماجہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کر دو۔ فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ امام احمد تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کیا جائے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کی ہو تو اس پر حدِ زنا جاری ہو گی اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی[2]

محرمات میں سب سے پہلے منکوحہ والد کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں یہ صورت رائج تھی، اسی لیے اس کی مذمت کے لیے انداز بھی وہ اختیار کیا ہے جو قرآن میں دوسری جگہ زنا کے لیے اختیار کیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین زنا کو صرف فاحشہ فرمایا ہے لیکن باپ کی منکوحہ سے نکاح کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

فاحشہ، مقت اور ساء سبیلا کہا ہے یعنی بے حیائی بھی ہے مکروہ شیوہ بھی ہے اور بُرا دستور بھی، یہ تینوں الفاظ یہاں بول کر تین الگ الگ اشارے کیے ہیں۔ فاحشہ یہ دستور بجائے خود اور عقلاً بھی بڑی بے حیائی کی چیز ہے مقتاً مذاق سلیم رکھنے والوں کے لیے بڑی گندی چیز تھا۔ مقت کہتے ہیں ایسی بُری چیز کہ جسے دیکھ کر ہی گھن آئے۔ خود اہل جاہلیت بھی اسے بُری نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا نام ہی نکاح المقت پڑ گیا تھا ساء سبیلاً یعنی اس کے نتائج بھی بڑے قبیح تھے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ برائی کے تین درجے ہیں عقلاً برائی، قانونی بُرائی اور عرفی بُرائی۔ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ باپ کی منکوحہ سے ازدواجی تعلق میں تینوں قسم کی برائیاں ہیں، یہ عقلی طور پر بھی بُرا ہے اس کے لیے فاحشہ بولا ہے شرعاً اور قانوناً بھی یہ کام بُرا ہے اس کے لیے مقت فرمایا ہے اور عرف وعادت اس کو بُرا سمجھتے ہیں اس کے لیے ساء سبیلاً کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ

تینوں قسم کی برائیوں کا اجتماع اگر ہو جائے تو یہ ایسی بُرائی ہے کہ اس سے اوپر کا تصور بھی نہیں ہے۔

اُصول وفروع کی حرمت

قرآن میں اگرچہ تعبیری انداز آبار آیا ہے مگر علما نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ باپ ہو یا دادا، یا اس سے اوپر کا سلسلہ اسی طرح نانا ہو یا پڑنانا یا اس کا بالا سلسلہ سب کی حُرمت برابر ہے شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

باپ کی منکوحہ کا جو حکم ہے اسی حکم میں دادے اور نانے کی منکوحہ بھی ہے کتنا ہی اوپر کا دادا اور نانا کیوں نہ ہو۔

اسی طرح بیٹے کی بیوی، پوتے کی بیوی سے نکاح دُرست نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُصول و فروع سب حرام ہیں نہ باپ بیٹے کی منکوحہ سے اور نہ بیٹا باپ کی منکوحہ سے نکاح کر سکتا ہے۔

یہاں آیت میں لفظ نکاح عقد کے معنے میں ہے۔ اگرچہ نکاح کے معنے دونوں آتے ہیں عقد کے اور صحبت کے اور دونوں معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں عُلماء کا اختلاف ہے کہ حقیقی معنے کون سے ہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ وطی اور صحبت کے معنے میں اگر لفظ نکاح آئے تو معنے حقیقی ہیں اور عقد کے معنے میں ہو تو مجازی ہیں اور شوافع کو اصرار ہے کہ عقد کے معنے حقیقی ہیں اور صحبت کے معنے مجازی ہیں۔ اگرچہ احناف نے اس آیت میں لفظ نکاح کو بمعنے صحبت

لے کر باپ کی داشتہ سے بھی نکاح حرام کیا ہے لیکن اس پر احناف اور شوافع متفق ہیں کہ باپ کی منکوحہ سے بیٹے کا نکاح مطلق ناجائز ہے خواہ باپ نے اپنی منکوحہ سے صحبت کی یا نہ کی ہو چنانچہ علامی شامی رقمطراز ہیں وتحرم زوجۃ الاصل والفرع بمجرد العقد دخل بھا اولا احناف یہاں پریشانی کا شکار ہیں۔ ایک طرف وہ باپ کی منکوحہ کو بیٹے کے لیے مطلق عقد کی بنا پر حرام قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ اسی آیت کے سہارے باپ کی مزنیہ کو محرمات میں شمار کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جمع بین الحقیقت والمجاز ناجائز ہے۔ الجصاص اور آلوسی کو اس پر اصرار ہے کہ آیت میں نکاح کے معنے وطی اور صحبت کے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر باپ کی منکوحہ صرف عقد نکاح سے ناجائز نہ ہونی چاہیے الجصاص نے اس کا حل یہ تلاش کیا ہے او جبنا التحریم بالعقد بغیر الایۃ ہم نے باپ کی منکوحہ کی تحریم عقد کی بنا پر اس آیت سے نہیں دوسری آیت سے ثابت کیا ہے۔ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں نکاح کو اس آیت میں عقد کے معنے میں لے کر باپ کی منکوحہ سے نکاح کی حرمت ثابت کی ہے اور وطی حرام سے مزنیہ کی حرمت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دوسری دلیل سے ثابت ہے۔ اور زیلعی منکوحہ اور مزنیہ دونوں کی حرمت آیت سے ثابت کرتے ہیں اور کلام منفی میں جمع بین الحقیقت والمجاز کے جواز کو مانتے ہیں لیکن دوسرے اکابر کو علامہ زیلعی سے اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال مسئلہ پیچیدہ ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح کی حرمت اجماعی ہے اور مزنیہ سے اختلافی ہے۔

علامہ کاشانی نے اس پر جامع تبصرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

> باپ کی منکوحہ کی قرآن کی اس آیت سے حرمت ثابت ہے لفظ نکاح بولا جاتا ہے اور اس سے عقد مراد ہوتا ہے خواہ باپ نے خلوت کی ہو یا نہ کی ہو کیونکہ لفظ نکاح میں جیسے عقد کے معنے ہیں ایسے ہی صحبت اور وطی کے معنے ہیں۔ دونوں معنوں کے لحاظ سے حرمت ثابت ہوگی۔ نیز باپ کی منکوحہ سے نکاح کبھی قطع رحم کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً باپ نے طلاق دے دی اور کچھ روز کے بعد اسے پشیمانی ہوتی اور اس کا ارادہ پھر نکاح کا ہوا، اگر بیٹا بھی امیدوار ہو جاتے تو یہ باپ بیٹے میں باہم کینے اور عداوت کا سامان ہوگا اور یہی قطع رحم ہے۔ باپ کے علاوہ دادا پردادا کی منکوحہ اجماع سے حرام ہے اور آیت کے مدلول سے نہ کہ منطوق سے۔

ہمیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس آیت گرامی کے منطوق سے باپ کی داشتہ اور مزنیہ کی حرمت کو ثابت کرنا ایک کمزور سہارا ہے الاستدلال بھذہ الایۃ ضعیف۔

ہاں اگر وطی حلال پر قیاس کرکے اس کی حرمت پیش کی جائے تو درست ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی کا میلان بھی یہی ہے فرماتے ہیں۔

جب باپ کی موطؤہ حکمیہ سے نکاح حرام ہے تو جو اس کی موطؤہ حقیقیہ ہو اگرچہ بغیر نکاح ہو اس سے بدرجہ اولیٰ نکاح حرام ہے۔

بہرحال اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سلف میں سے کچھ اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ الجصاص لکھتے ہیں کہ امام رازی، امام لیث بن سعد، امام ربیعہ الرای، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ زنا سے حرمت ثابت نہیں ہوتی اور کچھ کا خیال یہ ہے کہ زنا سے بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے یعنی جس عورت سے باپ نے زنا کر لیا ہے وہ بیٹے کے لیے حرام ہو گئی۔ الجصاص لکھتے ہیں کہ یہ سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، سالم بن عبداللہ، مجاہد، عطا ابن ابی رباح، ابراہیم نخعی، عامر الشعبی، حماد، ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد، زفر اور اوزاعی کا مذہب ہے۔

اسی طرح سلف میں اس موضوع پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق، ہا ہو یا بعد میں ہو جائے اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔

علاقہ نسب کی وجہ سے نکاح حرام ہے

۴۱۔ تم پر ان عورتوں سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے۔

تمہاری مائیں،
تمہاری بیٹیاں،
تمہاری بہنیں،
تمہاری پھوپھیاں،
تمہاری خالائیں،
تمہاری بھتیجیاں،
تمہاری بھانجیاں۔

سوتیلی ماں کی حرمت بیان کرنے کے بعد اب جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں ان سب کو بیان

فرماتے ہیں۔ وہ عورتیں چند قسم کی ہیں اول ان کو بیان کیا جاتا ہے جو علاقہ نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔ اور وہ سات ہیں، ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی، ان میں سے کسی کے ساتھ کسی کا نکاح جائز نہیں ہے۔ ماں کے حکم میں دادی، نانی اوپر تک کی سب داخل ہیں۔ ایسے ہی بیٹی میں پوتی اور نواسی نیچے تک کی سب داخل ہیں اور بہن میں علاتی اخیافی اور عینی سب داخل ہیں اور پھوپھی میں باپ دادا اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب آگئیں۔ اور خالہ میں ماں اور نانی اور نانی کی نانی سب کی بہن تینوں قسم کی داخل ہیں اور بھتیجی میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد داخل ہیں [1]

شیخ الاسلام نے اجمالاً جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ محرمات کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو قرابت کی وجہ سے حرام ہیں دوسرے وہ جو مصاہرت کی وجہ سے حرام ہیں، تیسرے وہ جو رضاعت کی وجہ سے حرام ہیں۔ اس آیت میں بنات الاخت تک پہلی قسم کو بیان کیا گیا ہے۔

قرابت کی وجہ سے محرمات میں پہلی قسم

قرابت کی وجہ سے جن عورتوں سے نکاح حرام ہے اس کی سات قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے پہلی قسم مائیں ہیں۔ ماں کا اطلاق سگی یا سوتیلی دونوں پر ہوتا ہے نیز اس کے مدلول میں ماں کی ماں اور باپ کی ماں بھی داخل ہے۔ علامہ کاشانی رقمطراز ہیں کہ ماں کی حرمت قرآن کی آیت کا منطوق ہے اور دادی، نانی، پردادی، پرنانی تا آخر سب کی حرمت اس آیت کا مدلول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بطور عموم مجاز اصول سب کے سب حرام ہیں۔

دوسری قسم

بیٹیاں۔ بیٹیوں سے ازدواجی تعلق حرام ہے۔ بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ بیٹی، نواسی، پڑنواسی پوتی پڑپوتی ان سب سے نکاح حرام ہے۔ اور سوتیلی جو دوسرے شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو اس کا حکم آگے آرہا ہے اور جو لڑکی گود لے کر پالی ہو اس کا حکم پارہ ۲۱ میں آرہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بطور عموم مجاز سب فروع سے نکاح ناجائز ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک عموم نص کی وجہ سے اس سے بھی ازدواجی تعلقات ناجائز ہیں۔ اور امام شافعی اس کو محرمات میں شمار نہیں کرتے۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی لڑکی کا ہونا جس کے بارے میں خود جانتا ہو کہ وہ اسی کے غلط کردار کا نتیجہ ہے۔ مذاق سلیم کبھی گوارا نہیں کرتا۔ امام شافعی کے پیش نظر اس معاملہ میں قانون کے ظاہری الفاظ ہیں جبکہ دوسرے ائمہ کے پیش نظر قانون کی روح ہے بے شک قانون میں ایسی لڑکی کو اس بدکار کی لڑکی نہیں کہا جاتا۔ اس کی وجہ تو صرف یہ ہے کہ اس طرح بدکاری کی تشہیر ہوتی ہے لیکن اس وجہ سے حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تیسری قسم

ہمشیرگان یعنی بہنوں سے بھی شادی کرنا حرام ہے۔ اس میں حقیقی اور سوتیلی بہنیں سب داخل ہیں خواہ وہ ماں سے شریک ہوں یا باپ سے شریک ہوں۔

چوتھی قسم

پھوپھیاں، پھوپھیوں سے بھی ازدواجی تعلقات ناجائز ہیں۔ علامہ کاشانی رقمطراز ہیں کہ پھوپھیوں کے مدلول میں باپ کی بہن، دادا کی بہن پڑدادا کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب داخل ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے۔

پانچویں قسم

خالائیں، خالاؤں سے نکاح حرام ہے اس کے مدلول میں ماں نانی پڑنانی سب کی بہنیں داخل ہیں۔ چاہے یہ سگی ہوں یا باپ شریک ہوں اور یا ماں شریک سگے اور سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے اور اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔ دادا کی خالہ خواہ سگی ہو یا سوتیلی اس کا بھی یہی حکم ہے۔

چھٹی قسم

بھتیجیاں، ان سے بھی نکاح حرام ہے خواہ سگی ہو یا سوتیلی ان میں کوئی فرق نہیں سگے بھائی، باپ شریک بھائی، ماں شریک بھائی کی لڑکیاں اور اولاد کی اولاد سب سے نکاح حرام ہے۔

ساتویں قسم

بھانجیاں، یعنی بھانجیوں سے نکاح حرام ہے، چاہے یہ بھانجیاں حقیقی بہن کی اولاد ہوں یا باپ شریک بہن کی یا ماں شریک بہن کی اولاد ہوں اور خواہ ان کی اولاد کی اولاد ہوں سب سے نکاح حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اصول اپنے فروع اپنے ماں باپ کے فروع اور اپنے ماں باپ کے اصول کے فروع سے نکاح حرام ہے۔

اپنے اصول سے مراد اپنے ماں باپ، اپنے دادا پردادا، نانا پرنانا، دادی پردادی، نانی پرنانی وغیرہ ہیں۔ اپنے فروع سے مراد اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد آخر تک ہے۔

والدین کے فروع سے مراد بھائی بہن اور ان کی اولاد آخر تک ہے۔ اپنی ماں اور باپ کے اصول کے فروع سے مراد چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ ہے۔ لیکن ان کی حرمت صرف ایک پیٹ تک رہتی ہے۔ اسی لیے چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ کی اولاد سے نکاح جائز ہے۔ ماں باپ کے چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ اسی چوتھی قسم میں داخل ہیں کیونکہ وہ بھی ماں باپ کے اصول کے فروع ہیں ان سے بھی نکاح حرام ہے مگر ان کی اولاد سے جو اپنے ماں باپ کی چچازاد یا ماموں زاد بھائی بہن ہوں نکاح جائز ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم میں حرمت صرف ایک بطن تک رہتی ہے۔ ایک بطن کے بعد حرمت جاتی رہتی ہے۔

نسب کی یہ چاروں قسمیں جو یہاں بیان ہوئی ہیں اسی حالت میں حرام ہیں جبکہ ان کا رشتہ نکاح حلال سے ہوا ہو۔ اور اگر ان سے رشتہ زنا وغیرہ سے ہوا ہو تو ان چاروں قسموں میں سے پہلی دو قسمیں تو بدستور حرام رہیں گی۔ یعنی اصول اور اپنے فروع یعنی زنا کے ماں باپ اور ان ماں باپ کے ماں باپ وغیرہ، آخر سلسلہ تک اور زنا کی اولاد اور اولاد کی اولاد آخر تک بدستور حرام رہیں گی۔ ہاں تیسری قسم اور چوتھی قسم میں صرف ماں کے فروع آخر تک اور ماں کے اصول کے فروع ایک بطن تک بدستور حرام رہیں گی۔ اور باپ کے فروع اور باپ کے اصول کے فروع حرام نہیں ہیں اخیافی بھائی بہن اور ماموں خالہ تو حرام ہوں گی اور علاتی بھائی بہن، اور چچا پھوپھی حرام نہ ہوں گے[1]

---

[1] فتح القدیر۔

دُودھ کے رشتہ دار

۲۴ ۔ تمہاری وُہ دودھ پلانے والی مائیں اور تمہاری دودھ شریک بہنیں ، محرماتِ نسبی کے بعد اب محرماتِ رضاعی کو بیان کیا جاتا ہے اور وہ دو ہیں ماں اور بہن ۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے رضاعت میں بھی حرام ہیں یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی ، خالہ اور بھتیجی اور بھانجی بھی حرام ہیں چنانچہ حدیثوں میں یہ حکم موجود ہے[۱]

دُودھ پینے سے ایک تعلق دُودھ پینے والے اور پلانے والے کے درمیان پیدا ہوتا ہے ۔ دُودھ کے اس تعلق کو قرآن نے نسبی تعلق جیسا قرار دیا ہے ۔ مثلاً جس عورت نے دُودھ پلایا ہے ، دُودھ پینے والے بچے کی رضاعی ماں اور اس عورت کا شوہر اس کا رضاعی باپ اور ان ماں باپ کی اولاد اس بچہ کے رضاعی بہن بھائی ہیں ۔ رضاعی ماں کی ماں ، رضاعی نانی باپ رضاعی نانا ، رضاعی ماں کا بھائی رضاعی ماموں بہن رضاعی خالہ ، اور رضاعی باپ کی ماں رضاعی دادی ، باپ رضاعی دادا ، بھائی رضاعی چچا ، بہن ، رضاعی پھوپھی غرض تمام رشتے یہاں بھی نسب کی طرح قائم ہو جائیں گے ۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دُودھ پلانے والی کے رشتہ دار تو اس بچہ کے رشتہ دار ہوں گے یعنی دودھ پلانے والی خود بھی اور اس کا شوہر بھی اور ان کے اصول و فروع بھی اور اصول کی فروع بھی ، لیکن دُودھ پینے والے کی طرف سے صرف وہ بچہ خود رشتہ دار ہوگا اور اس کی اولاد اور اگر وہ مرد ہے تو اس کی بیوی اور اگر عورت ہے تو اس کا شوہر رشتہ دار ہو جائے گا ۔ دودھ پینے والے کے اصول اور اصول کے فروع سے اس دُودھ پلانے والی کا کوئی تعلق نہ پیدا ہوگا ۔ ایک محقق فاضل نے ان تعلقات کو ایک شعر میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے ۔

از جانب شیردہ ہمہ خویش شوند ۔۔۔ و ز جانب شیر خوار ہ زوجان فروع

اس شعر کو صاحب شرح الوقایہ نے نقل کیا ہے ۔ واقعی عجیب جامع شعر ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُودھ پلانے والی کی طرف سے سب لوگ عزیز ہو جاتے ہیں اور دُودھ پینے والے بچہ کی طرف سے صرف وہ دونوں میاں بیوی اور اس بچہ کی اولاد عزیز ہوتی ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جن لوگوں میں باہم دُودھ کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے ۔ ان میں ان رشتوں میں

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

نکاح ناجائز ہے جن میں نسب کے ذریعے حرام ہے۔ یعنی نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہے دودھ کے رشتہ سے بھی حرام ہے۔ اور اس پر پوری امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں کہ ایک لڑکے اور لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔

قرآن میں اخواتکم کے بعد من الرضاعة کی قید لگا کر اشارہ موجود ہے کہ جو رشتے نسب کے ذریعے حرام ہیں وہ رضاعت کے ذریعے بھی حرام ہیں یعنی پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قرآن کے مبین ہیں اس لیے آپ نے اپنے ارشادات میں یہ بات کھول کر سمجھادی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بحوالہ عائشہ صدیقہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب، ایک روایت میں یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة یعنی جو رشتے نسب اور ولادت سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہیں۔

دودھ سے رشتہ کب قائم ہوتا ہے

دودھ پینے کے ذریعے جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ

دودھ پینے کے زمانے میں پیا جائے یعنی جس بچہ نے دودھ پیا ہے اس کی عمر دودھ پیتے وقت دو برس کے اندر اندر ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انما الرضاعة من المجاعة یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی جس زمانے میں دودھ ہی سے بچہ کی نشوونما ہوتی ہے۔

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ دودھ پلانے کی مدت کتنی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مشہور قول یہ ہے کہ دودھ پلانے کی مدت اڑھائی سال ہے اور اس مدت میں دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی، لیکن دوسرے ائمہ امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ بچہ کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ دو سال ہی کے زمانہ میں دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی۔ حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمر کا بھی یہی مسلک ہے۔ اسی پر امام محمد کا فتویٰ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رضاعت میں اعتبار صرف اس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جبکہ بچہ کا دودھ چھڑایا نہ جا چکا ہو اور دودھ ہی اس کی غذا کا دارومدار ہو۔ دودھ چھڑانے کے بعد اگر کسی بچہ نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، بشرطیکہ دودھ

دو سال پورا ہونے پر چھڑایا گیا ہو۔

کتنی مقدار سے رشتہ قائم ہوتا ہے

دُودھ پلانے کے زمانے میں دُودھ کی مقدار خواہ کتنی ہو، تھوڑی ہو یا زیادہ، ہر طرح سے رضاعت کا حکم ثابت ہو جائے گا۔ صحابہ میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، تابعین میں حسن بصری، سعید بن المسیب، طاؤس یمانی، ابراہیم نخعی، زہری اور شعبی اور ائمہ میں ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر، مالک، الثوری، الاوزاعی اور لیث کا مذہب یہی ہے بلکہ الجصاص نے لیث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے اتنی مقدار میں اگر بچہ کسی عورت کا دُودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے لیکن امام احمد بن حنبل کے نزدیک تین مرتبہ سے اور امام شافعی کے نزدیک پانچ بار پینے سے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے۔

سسرالی رشتہ میں نکاح

۴۳۔ تمہاری خوشدامنیں، تمہاری بیویوں کی وہ لڑکیاں جو تمہاری گودمیں پرورش پاتی ہیں بشرطیکہ ان بیویوں سے عقدِ نکاح کے بعد زناشوئی کا تعلق بھی ہو چکا ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور تمہاری حقیقی بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کو جمع کرنا۔ اب محرماتِ مصاہرت کا ذکر ہے یعنی علاقہ نکاح کی وجہ سے جن سے نکاح حرام ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں اوّل وہ کہ ان سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے اور وہ بیوی کی ماں یعنی خوشدامن اور اس زوجہ کی بیٹی ہے جس زوجہ سے تم نے صحبت کی ہو۔ لیکن اگر صحبت سے پہلے کسی کو طلاق دے دی ہو تو اس کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے۔ اور تمہارے بیٹوں کی عورتیں ہیں اور اس میں نیچے تک کے پوتوں اور نواسوں کی عورتیں داخل ہیں کہ ان سے کبھی تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے نکاح کی ممانعت نہ ہو بلکہ جب تک کوئی عورت تمہارے نکاح میں رہے اس وقت تک اس عورت کی ان قرابت والی عورتوں سے نکاح کی ممانعت رہی۔ جب اس عورت کو طلاق دے دی یا وہ مرگئی تو ان سے نکاح درست ہو جائے گا اور وہ زوجہ کی بہن ہے کہ زوجہ کی موجودگی میں تو اس سے نکاح نہیں ہو سکتا اور بعد میں درست ہے اور یہی حکم ہے زوجہ کی

پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی کا، یہ جو فرمایا کہ عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو کہ تمہاری پشت سے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بیٹے یا پوتے نسبی ہوں منہ بولے یعنی لے پالک نہ ہوں جس کو متبنیٰ کہتے ہیں رضاعی سے احتراز نہیں ہے [1]

دراصل یہاں چار باتیں یا قانون کی چار دفعات بیان ہوتی ہیں۔

۱۔ بیویوں کی ماؤں یعنی خوشدامنوں سے نکاح حرام ہے۔

۲۔ بیویوں کی لڑکیوں سے نکاح حرام ہے۔

۳۔ بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے۔

۴۔ ایک وقت میں دو بہنوں سے ازدواجی تعلق حرام ہے۔

بیویوں کی مائیں حرام ہیں

اول یعنی بیویوں کی ماؤں سے نکاح حرام ہے یعنی کوئی شخص اپنی خوشدامن سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا مجاز نہیں ہے خواہ صرف نکاح ہی ہوا ہو اور ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی ہو۔ اس پر ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا اتفاق ہے۔ حافظ ابوجعفر طحاوی فرماتے ہیں کہ یہاں تک جن جن عورتوں سے نکاح کی ممانعت آئی ہے سب محکمات سے ہیں اور سب کا اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی سے نکاحی تعلق جائز نہیں ہے سوائے ان عورتوں کی ماؤں کے جن سے نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے ازدواجی تعلق ختم ہو گیا ہے۔ اس میں جمہور سلف بھی کہتے ہیں کہ منکوحہ کی ماں سے نکاح حرام ہے۔ صرف حضرت علی کی رائے یہ ہے کہ جب تک رخصتی نہ ہو ساس حرام نہیں ہوتی لیکن قرطبی کہتے ہیں کہ حضرت علی کی یہ رائے محدثین کے نزدیک تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت علی بھی جمہور کے ہمنوا ہیں۔

بیویوں کی ماؤں سے صرف مائیں ہی مراد نہیں بلکہ اس کے مدلول میں بیویوں کی نانیاں، دادیاں، پڑدادیاں آخر تک خواہ نسبی ہوں یا رضاعی ہوں سب داخل ہیں۔ اور نسبی میں چاہے حقیقی ہوں، باپ شریک یا ماں شریک ہوں۔ اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے اسی طرح اس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہم بستری کی گئی ہو یا جس کے ساتھ زنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا ہو۔

بیویوں کی لڑکیاں حرام ہیں

دوم بیویوں کی لڑکیوں سے نکاح حرام ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان لڑکیوں کی ماؤں سے نکاح کے بعد رخصتی بھی عمل میں آچکی ہو۔ اگر صرف نکاح اور رخصتی سے پہلے طلاق ہو گئی یا منکوحہ مر گئی تو پھر بیوی کی بیٹی سے نکاح جائز ہے۔ ربائب جمع ربیبۃ کی ہے جس کے معنے اس زیر پرورش لڑکی کے جو اگلے شوہر سے ہو ربیبۃ اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے دوسرے شوہر کے آغوش تربیت میں ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ التی فی حجورکم (وہ جو تمہاری گودوں میں ہیں) کے الفاظ محض اس رشتہ کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے ہیں ورنہ یہ کوئی قید اور شرط نہیں۔ یعنی ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں کہ وہ تمہاری گود میں پرورش پا رہی ہے۔ ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہرحال حرام ہے خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو حجور حجر کی جمع ہے۔ اس کے معنے حفاظت کے ہیں اور چونکہ گود میں بھی بچہ کی حفاظت ہوتی ہے اس لیے اس کو حجر کہتے ہیں بلکہ یہ اس کے مرادی معنے ہیں ورنہ اصل میں لفظ حجر کے معنے روکنے کے ہیں۔ حفاظت اس لیے کہتے ہیں کہ جو شخص بچہ کو اپنی حفاظت میں لیتا ہے وہ اس کے اموال اور دیگر حالات میں تصرف سے اسے روکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو تمہاری بیویوں کے ان کے پہلے شوہروں سے ہوں ان کے حرام ہونے کی شرط یہ ہے کہ ان کی ماؤں سے نکاح کے بعد تمہارے زناشوئی کے تعلقات ہو چکے ہوں۔ یعنی ان کی رخصتی ہو چکی ہو۔ رخصتی کے لیے قرآن نے دخلتم بھن کا بلیغ استعارہ اختیار کیا ہے۔ اس سے فقہاء نے یہ بات سمجھی ہے کہ حرمت میں اصلی مؤثر جماع اور صحبت ہے اسی لیے امام ابو حنیفہ نے بتایا ہے کہ جس عورت سے ناجائز تعلق ہو جائے تو اس کے اصول و فروع بھی حرام ہو جاتے ہیں بلکہ جس عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے اس موضوع کی بہترین تشریح حضرت مولانا اشرف علی نے فرمائی ہے۔

یہ آیت اس بات میں تو نص ہے کہ حرمت مصاہرت بنت المنکوحہ کی موقوف ہے اس منکوحہ سے دخول پر اور اس حرمت کے لیے اس سے صرف نکاح کافی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ صورت دخول میں حرمت میں مؤثر کیا چیز ہے؟ نکاح بشرط دخول یا دخول محض اور دخول بشرط نکاح اور یا پھر دونوں کا مجموعہ، یہ سب احتمالات ہیں کیونکہ تتبع احکام سے سب ہیں علت مؤثرہ ہونے کی صلاحیت

معلوم ہوتی ہے چنانچہ کچھ احکام میں محض نکاح مؤثر ہے جیسے بیویوں کی ماؤں کی حرمت اور بیٹوں کی بیویوں اور باپ کی بیوی کی حرمت، اور کچھ احکام میں صرف دخول بلا نکاح ہی مؤثر ہے جیسے موطوءہ بالشبہ کا عنصر اور کچھ احکام میں دونوں نکاح اور دخول میں سے ایک بشرط الآخر موثر ہے جیسے نکاح کے بعد خلوت صحیحہ سے پورے مہر کا واجب ہونا اور کچھ احکام میں نکاح اور دخول دونوں مؤثر ہیں جیسے رجم کر اس میں صرف نکاح بشرط دخول کو موثر نہ کہیں گے اور ایسے ہی دخول کے مؤثر کہنے کا بھی کوئی قرینہ نہیں ہے۔ یہ بھی مؤثر نہیں لہٰذا مجموعہ ہی موثر ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ علت ہونے کی صلاحیت سب میں ہے اس لیے ثابت ہوا کہ ربائب کی حرمت مصاہرت کی علت صرف دخول ہے اور جب دخول کا علت موثرہ ہونا قرآن سے ثابت ہو گیا تو غیر ربائب میں بھی قیاس سے حکم متعدی ہو گا۔ اور چونکہ موطوءہ کے تمام اصول و فروع میں اسی طرح تمام اصول و فروع کے موطوآت میں کوئی تفصل کا قائل نہیں اس لیے بنات الموطوءہ میں حرمت مصاہرت کا حکم سب کے لیے یکساں ہو گا[1]

بیٹوں کی لڑکیوں سے نکاح حرام ہے

سوم بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے۔ اصل ارشاد میں الفاظ یہ ہیں وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم حلائل حلیلۃ کی جمع ہے حل سے بنا ہے جس کے معنے کھولنے اور حلال ہونے کے ہیں حلیل خاوند کو اور حلیلہ بیوی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں مطلب یہ ہے کہ بیٹے کی بیوی حرام ہے اور بیٹے کے عموم میں پوتا اور نواسا بھی داخل ہیں۔ ان کی بیویاں بھی دادا اور نانا پر حرام ہیں اور اس کے عموم میں وہ عورتیں بھی بالاجماع داخل ہیں جن سے بیٹوں نے ملک یمین یا شبہ کی بنا پر صحبت کی ہو اور امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے وہ اس کے مدلول میں داخل ہیں جن سے بیٹوں نے غیر قانونی تعلقات قائم کیے ہوں۔ الذین من اصلابکم جو بیٹے تمہاری پشتوں سے ہوں کا اضافہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس آدمی نے بیٹا بنا لیا جسے ہمارے پالک کہتے ہیں اس کی بیوی حرام نہیں ہے شوہر کی موت یا طلاق کے بعد پالک کے باپ سے نکاح کر سکتی ہے۔ حرام صرف اس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صلب سے ہو اور رضاعی بیٹا اگرچہ اس قید کی وجہ سے خارج ہے لیکن ارشادِ نبوت نے اسے داخل کر دیا ہے حضور کا فرمان ہے :

[1] بوادر النوادر

رضاعت سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو نسب سے حرام ہیں اور اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

علامہ کاشانی نے اس موقعہ پر یہ بات خوب لکھی ہے کہ آیت قرآنی میں صلب کا ذکر یہاں خاصیت کی خاطر ہے ورنہ بیٹا تو ہوتا ہی صلب سے ہے جیسے قرآن میں ہے ولا طائر یطیر بجناحیہ پرندہ تو اڑتا ہی اپنے دوبازوں سے ہے۔ اور یا بیٹوں کی قسمیں بتانے کے لیے ہے کیونکہ بیٹا صلبی بھی ہوتا ہے رضاعی بھی اور متبنی بھی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی بیوی سے طلاق کے بعد شادی کی تو کہنے والوں نے کہہ دیا کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کی ہے قرآن نے من اصلابکم کی قید یہی بتانے کے لیے لگائی ہے کہ متبنی کی بیوی حرام نہیں۔

ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح

چہارم، دو بہنوں سے ایک وقت میں ازدواجی تعلقات حرام ہیں۔ یہ اجتماع خواہ نکاح میں ہو یا ملک یمین میں ہو، ناجائز ہے۔ اور پھر یہ دو بہنیں حقیقی ہوں، علاتی ہوں، یا اخیافی، نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی، یہ حکم سب کو شامل ہے۔ ارشاد نبوت اور امت کے اجماع سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کا بھی یہی حکم ہے۔ ارشاد ہے۔

کسی بھی بھتیجی اور اس کی پھوپھی کو نکاح میں جمع نہ کیا جائے اور بھانجی اور اس کی خالہ کو بھی جمع نہ کیا جائے۔

فقہائے نے اس معاملہ میں یہ اصول بنایا ہے کہ ایسی دو عورتوں کا جمع کرنا بہر حال حرام ہے جن میں سے کوئی اگر بالفرض مرد ہو تو اس سے دوسری کا نکاح ناجائز ہو۔ فقہا نے یہ قاعدہ قرآن کی اسی آیت سے معلوم کیا ہے کہ اگر دو بہنوں سے ایک مرد فرض کرلی جائے تو اس کا نکاح بھائی بہن ہونے کی وجہ سے دوسرے کے ساتھ ناجائز ہوگا، بہر حال ایسی دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا ناجائز ہے خواہ اس طرح کرے کہ ایک ہی وقت میں ان دونوں سے نکاح کرے یا اس طرح کرے کہ ایک پہلے سے نکاح میں ہے اب دوسری سے نکاح کرلے۔ اور اگر ایک کو طلاق دے چکا تھا اس کے بعد دوسری سے نکاح کیا تو اگر اس مطلقہ کی عدت نہیں گزری تو یہ جمع بھی ناجائز ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر دونوں کے ساتھ یکدم نکاح کیا ہے تو دونوں کا نکاح باطل ہو جائے گا اور اگر ایک کے ساتھ پہلے کیا ہے اور اس کے بعد دوسری کے ساتھ تو اگر

اس کو یہ یاد نہ ہے کہ کس کے ساتھ پہلے نکاح کیا تھا پھر بھی دونوں کا نکاح باطل اور کالعدم ہوگا۔ اور اگر یاد ہے تو جس سے پہلے نکاح ہوا ہے صحیح ہوگا اور دوسری کا نکاح باطل ہو جائے گا۔

۴۴۔ ہاں جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی قانون سے پہلے زمانہ جاہلیت میں جو کچھ ہوتا رہا اس پر گرفت نہ ہوگی۔ یہ فقرہ وما نکح اباؤکم کے بعد بھی آیا اور یہاں بھی دوبارہ آیا ہے۔ دونوں جگہ مطلب ایک ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں تم جو کچھ کر چکے ہو اب اسلام کے بعد اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ مواخذہ نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نہ آخرت میں اس کی سزا ہوگی اور نہ دنیا میں، یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح ہو چکا ہے وہ اب باقی رہ سکتا ہے۔

تمدنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے قرآن میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ نادانی کے زمانے میں جو غلطیاں تم کرتے رہے ہو ان پر کوئی گرفت نہ ہوگی، بشرطیکہ اب حکم آجانے کے بعد اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لو۔ اور جو غلط کام ہیں ان کو چھوڑ دو۔ دوسرے یہ کہ زمانہ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام قرار دیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم ورواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کالعدم اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز، اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو حرام کیا گیا ہے یا دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے ان کی اولاد حرامی قرار دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حق وراثت ساقط کیا جا رہا ہے، بالفاظ دیگر قانون ماضی پر لاگو نہ ہوگا کہ اس کو بنیاد قرار دے کر تمام پچھلے رشتوں کی تحقیق ہو اور اس کی روشنی میں جائز و ناجائز کے احکام صادر ہوں۔ یہ چیز عملاً ناممکن ہے۔

الحمد للہ چوتھی جلد میرے قلم سے ۷۴۴ صفحات پر مشتمل ۲۳ رشعبان المکرم ۱۳۹۶ھ بروز جمعۃ المبارک مطابق ۲۰ راگست ۱۹۷۶ء بوقت ۸½ بجے صبح ختم ہوئی۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم و تب علينا انك انت التواب الرحيم۔